بِچھُو
انوار علیگی
copied from web
Urdufans.com

کائنات کے پہلے اور آخری
قصّہ گو کے نام

کون ہے وہ؟
اَللّٰہ جس کا نام

گفتگو

اس کتاب کو میں نے اللہ کے نام معنون کیا ہے۔ آئندہ بھی میری جو کتاب آئے گی (انشاء اللہ) اللہ کے نام سے منسوب ہو گی۔ میں شکر گزار ہوں ربّ کائنات کا جس نے مجھے بہترین تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا۔ اپنے خالق کی ثنا کے لئے میرے پاس لفظ نہیں۔ ویسے بھی ایک انسان میں اتنی استعداد کہاں کہ وہ اللہ کی تعریف (جس طرح کی جانی چاہئے) کر سکے۔ سارے سمندر روشنائی اور سارے درخت قلم بن جائیں، تب بھی اللہ کی تعریف مکمل نہ ہو۔ بس اللہ اپنی تعریف خود ہی کر سکتا ہے کہ اس کے سوا، اس کے بارے میں مکمل طور پر کوئی نہیں جانتا۔

یہ ناول اخبارِ جہاں میں ''طاغوت'' کے نام سے چھپا تھا۔ اس نام کے دو ناول شائع ہو جانے کی وجہ سے اس کا نام تبدیل کرنا پڑا۔ اب یہ ناول ''بچھو'' کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ ''طاغوت'' سے زیادہ اچھا نام ہے۔ اُمید ہے آپ کو بھی پسند آئے گا۔

میں جب بھی کوئی پراسرار ناول شروع کرتا ہوں تو پراسرار حالات میں گھر جاتا ہوں۔ اس ناول کو لکھتے ہوئے میں کچھ زیادہ ہی پریشان ہوا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ کراچی میں ''بچھو'' بالکل نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود اسکیچ بناتے بناتے اچانک کاغذ پر ''بچھو'' کا بچہ نمودار ہو گیا۔ اخبارِ جہاں کے آرٹسٹ عمران زیب اس بچھو کو شیشی میں بند کر کے میرے پاس لے آئے۔ اس بچھو کی ''ممی'' آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔ مجھے نہیں معلوم ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن ہوتا ضرور ہے کہ میں تخلیق کے دوران غیر انسانی مخلوق کی گرفت میں آ جاتا ہوں۔ یہ اللہ ہی ہے جو مجھے پراسرار مخلوق کے نرغے سے بچاتا ہے۔

''بچھو'' کا اب دوسرا ایڈیشن پیش خدمت ہے۔

ناول کی پذیرائی کا شکریہ۔

(انوار علیگی)

وہ بڑی محویت سے کام کر رہا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس کے جسم میں جھٹکا سا لگا۔ یہ اچھا ہوا کہ برش تصویر سے دور تھا۔ وہ برش سے لڑکی کے ہونٹ سنوارنے جا رہا تھا۔ اگر برش ہونٹوں پر ہوتا تو اس جھٹکے کی وجہ سے ہونٹ سنورنے کی بجائے بگڑ جاتے۔

اس نے ایک لمحہ ٹیلیفون کو گھورا' پھر ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے یہ ایک خاص وقت تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقت ٹیلیفون پر کون ہو گا؟

دو انگریزی کے رسالوں پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کا ریسیور اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھایا۔ برش اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ ریسیور کان سے لگا کر اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''جی۔''

جی کے جواب میں ایک مترنم ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس کی ہنسی لاجواب تھی۔ اگر وہ موسیقار ہوتا تو اپنی کئی دھنیں اس پر قربان کر دیتا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس کی ہنسی ٹیپ کرے اور اسے گھنٹوں سنتا رہے۔ اس کی ہنسی میں پائل کی چھنک تھی۔ بانسری کی مدھر تان تھی۔ جو سنتا اس کے کانوں میں رس گھلتا تھا۔ وہ پوچھتا کہ تم کون ہو تو وہ بولنے کے بجائے ایک بار اور ہنس دیتی۔ اس نے جب سے فون کرنا شروع کیا تھا وہ آج تک بولی نہ تھی۔ لیکن آج اس نے اپنی ہنسی سنانے کے بعد پہلی بار لب کھولے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ''رانجھن تم کیسے ہو؟''

''رانجھن؟'' اس نے بڑی حیرت سے دہرایا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے اسے رانجھن کیوں کہا۔

''ہاں' رانجھن ...... میرے رانجھن......'' ہنسی کی طرح اس کی آواز بھی بڑی پیاری تھی۔ اس کے لہجے میں پیار رچا ہوا تھا۔

''بابا میں کوئی رانجھا وانجھا نہیں ہوں۔ آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام ساحل ہے ساحل عمر...... میں ایک چھوٹا سا آرٹسٹ ہوں۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم کون ہو' تمہارا نام کیا ہے اور تم کیا کرتے ہو؟ مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں' میرے رانجھن۔'' اس نے بڑے یقین سے کہا۔ بولنے کے دوران وہ ہنستی بھی رہی۔

''مجھے جانتی ہو تو پھر ساحل کہو' رانجھن نہ کہو۔''

''تمہیں۔ساحل کہوں اور دور کھڑی نظارہ کرتی رہوں...... یہ چاہتے ہو تم؟''

''معلوم ہوتا ہے ادب سے خاصا لگاؤ ہے۔''

''ادب سے لگاؤ ہو یا نہ ہو بہر حال بے ادب نہیں ہوں میں۔''

''اتنے دن سے فون کر رہی ہو لب تم نے آج کھولے......''

''لب نہ کہو زبان کہو لب کھولے بنا بھی کیا کوئی ہنس سکتا ہے۔'' اس نے ساحل عمر کی بات درمیان سے کاٹ دی۔

''ذہین بھی ہو اچھی بات کہی تم نے۔'' وہ دل سے معترف ہوا۔

''تعریف کا شکریہ۔'' وہ پھر ہنسی...... ''اب اپنی بات پوری کرو۔''

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ اتنے عرصے تک تم صرف ہنستی رہیں۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ آخر کیوں؟ کیا میرے حال پر ہنستی تھیں۔'' ساحل عمر نے مسکرا کر کہا۔

''کسی کے حال پر ہنسنے والے دوست نہیں، دشمن ہوتے ہیں...... تمہاری دشمن نہیں، تمہاری دوست ہوں، میرے رانجھن۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسی اور پھر ساحل عمر کا جواب سنے بغیر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

ساحل عمر چند لمحے اس کی ہنسی، اس کی باتوں میں کھویا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر ریسیور بہت آہستگی سے رکھ دیا۔

وہ جو کوئی تھی بڑی انوکھی لڑکی تھی۔ یہ سلسلہ اس نے بڑے عجیب انداز میں شروع کیا تھا۔ پہلے ٹیلی فون کی ایک گھنٹی بجنی شروع ہوئی۔ ٹیلیفون کی ایک گھنٹی بجتی اور ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ ایک دو دن تو ساحل عمر نے کوئی توجہ نہ دی۔ ٹیلیفون کی خرابی سمجھ کر نظر انداز کیا۔ لیکن جب کئی دن تک ایک گھنٹی بجتی رہی اور اتفاق سے اس نے گھنٹی بجنے کا ٹائم نوٹ کیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ یہ گھنٹی ٹھیک گیارہ بجکر پانچ منٹ پر بجتی ہے۔ پھر دو گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ساحل عمر کو تیسری گھنٹی پر ٹیلی فون اٹھانے کی عادت تھی۔ کچھ دن دو گھنٹیاں بج کر ٹیلی فون منقطع ہوتا رہا۔

ایک دن اس نے دوسری گھنٹی پر ٹیلی فون اٹھایا تو دوسری طرف گہری خاموشی تھی۔ اس نے ''جی'' کہا تو ادھر سے ٹیلی فون منقطع کر دیا گیا۔ کچھ دن یہی چلتا رہا کہ وہ ٹیلی فون اٹھاتا...... جی کہتا تو اس کی آواز سن کر فوراً ٹیلی فون بند کر دیا جاتا۔

پھر ایک دن سانس کی آواز سنائی دی تو محسوس ہوا جیسے کسی نے گہری ٹھنڈی سانس لی ہو۔ کوئی سرد آہ بھری ہو۔ اس کے بعد ٹیلی فون بند...... کچھ دن کے بعد یہ گہری اور ٹھنڈی سانس ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔ پھر کچھ عرصے یہ ہنسی چلی۔ بالآخر خدا خدا کر کے یہ کفر ٹوٹا۔

اس کافر ادا نے آج اپنی ہنسی کے ساتھ آواز سنائی۔ جو کچھ کہا خوب کہا لیکن اتنا کہنے کیلئے اتنی دیر کیوں کی۔ اتنا کچھ تو وہ پہلے دن بھی کہہ سکتی تھی۔

اگر وہ پہلے ہی دن یہ سب کچھ کہہ دیتی تو وہ اس کے دماغ میں رجسٹر کس طرح ہوتی۔ اس نے بوند بوند برسنا شروع کیا اور اس کی لوح دل پر نقش ہوتی چلی گئی۔

وہ جو کوئی بھی تھی بڑی ذہین تھی، بڑی منصوبہ ساز تھی۔ وہ دھیرے دھیرے کھل رہی تھی۔ وہ کیا چاہتی تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی اس کے بارے میں ساحل عمر کچھ نہیں جانتا تھا اور اسے جاننے کی اتنی فکر بھی نہ تھی وہ ایک بے نیاز سا نوجوان تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔

اپنی انگلیوں کے درمیان پھنسا برش نکال کر وہ ٹیلی فون کے پاس سے اٹھ آیا اور بورڈ پر لگی تصویر کے سامنے بیٹھ کر اس نے رنگ کی پیالی اٹھائی۔ برش میں ہلکا سا رنگ لگایا اور اس لڑکی کے ہونٹوں کو پینٹ کرنے لگا۔

ساحل عمر کوئی معمولی پینٹر نہ تھا وہ ایک غیر معمولی آرٹسٹ تھا اور اپنی انوکھی پینٹنگز کی وجہ سے مشہور تھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ ستائیس اٹھائیس سال کا ہو گا لیکن اس کم عمری میں اس نے وہ شہرت پالی تھی جو ایک آرٹسٹ پختہ عمر میں پہنچنے کے بعد حاصل کرتا ہے۔

وہ ایک زبردست تخلیق کار تھا۔ اسے تصویریں بنانے کا جنون تھا۔ وہ ریلزم کا قائل تھا اور ریلزم بھی فینٹسی کی آمیزش کے ساتھ۔ حقیقت اور تصور کو وہ اپنی تصویروں میں کچھ اس انداز سے برتتا تھا کہ تصویر دیکھنے والا اس کی تصویر میں گم ہو کر رہ جاتا تھا۔ اسکی تصویروں میں کوئی اسرار کوئی چونکا دینے والی بات ضرور ہوتی تھی۔

یہ تصویر اس وقت جس پر وہ کام کر رہا تھا ایک خوبصورت لڑکی کا پورٹریٹ تھا۔ لڑکی دلہنوں والے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ زیورات سے لدی پھندی تھی۔ خوبصورت آنکھوں والی۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں اور ہلکی سی اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے اپنی پیشانی کی طرف دیکھ رہی ہو۔ اس کی پیشانی پر ٹیکہ نہ تھا۔ ٹیکے کی جگہ ایک بچھو بیٹھا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بچھو اس کے بالوں سے رینگتا ہوا اس کی پیشانی پر ٹھہر گیا ہو، اس کا ٹیکہ بن گیا ہو۔ یوں تو پوری تصویر میں ہی بڑی جان تھی لیکن اس بچھو کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اب چلا تب چلا۔

کام کرتے کرتے وہ ذرا سا پیچھے ہٹ کر بیٹھا تا کہ تھوڑے فاصلے سے اس کے ہونٹ دیکھ سکے کہ اتنے میں ایک مرتبہ پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ساحل عمر نے فوراً گھڑی پر نظر ڈالی۔ پونے بارہ بجے تھے رات کے اس پہر کس کو اس سے بات کرنے کی ضرورت پڑ گئی۔ یہ سوچتا ہوا وہ ٹیلی فون کے پاس پہنچا۔

ریسیور اٹھا کر اس نے ''جی'' کہا اس کی نظریں تصویر پر تھیں۔

''ہاں، شہزادے کیا ہو رہا ہے؟'' ادھر سے کسی نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''اچھا تو یہ تم ہو۔'' ساحل عمر نے اپنے دوست مسعود آفاقی کی آواز پہچان کر کہا۔ ''کہاں سے بول رہے ہو۔''

''یار گھر سے بات کر رہا ہوں۔ ابھی ابھی ایک سیشن سے فارغ ہوا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''بھائی تمہارا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ تم جہاز سے بھی بول سکتے ہو۔ ویسے بھی جہاز پر تم اس طرح سفر کرتے ہو جیسے کوئی غریب آدمی موٹر سائیکل پر سفر کرے۔ آج اسلام آباد تو کل لاہور۔ کبھی لندن تو کبھی پیرس۔'' ساحل عمر نے خوشدلی سے کہا۔

''کام ہی ایسا ہے۔ کیا کروں۔'' وہ بولا۔
''کام تو خیر جو ہے وہ ہے...... ویسے تمہیں اڑنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔ تم ایک جہاز کیوں نہیں خرید لیتے۔'' ساحل عمر نے مشورہ دیا۔
''اچھا یار اب مجھے معاف کر دے۔ دیکھ میں تیرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔''
مسعود آفاقی نے واقعی ریسیور اپنی گردن میں دبا کر دونوں ہاتھ جوڑے۔ ساحل عمر کو ہلکی سی تالی کی آواز آئی۔
''اچھا یہ بتاؤ کون تھی؟'' ساحل عمر نے موضوع بدلا۔
''کیا مطلب کون تھی؟'' مسعود آفاقی کو ساحل عمر کا سوال سمجھ میں نہ آیا۔
''او بھائی جس کے سیشن سے تم ابھی فارغ ہوئے ہو۔ اس کی بات کر رہا ہوں۔''
''ٹی وی کی ایک آرٹسٹ تھی یار۔''
''تم لوگوں کے بڑے مزے ہیں...... روز ایک نئی لڑکی۔'' ساحل عمر یہ کہہ کر زور سے ہنسا۔
''اوے...... شہزادے میں نے کوئی حرم نہیں کھولا ہوا ہے اور نہ ہی کسی ملک کا شہنشاہ ہوں۔ ایک چھوٹا سا فوٹو گرافر ہوں اور یہ لڑکیاں میرے پیشے کا حصہ ہیں۔''
''جانتا ہوں۔'' ساحل عمر بڑے سکون سے بولا۔
''جانتے ہو تو یہ بتاؤ پینٹنگ کا کیا بنا؟'' مسعود آفاقی نے پوچھا۔
''اسی پر کام کر رہا ہوں۔''
''تم تو کہہ رہے تھے کہ آج رات تم مکمل کر لو گے؟'' مسعود کے لہجے میں پریشانی تھی۔
''تو میں نے یہ کب کہا ہے کہ کام پورا نہیں ہو گا۔'' ساحل عمر نے اطمینان سے کہا۔
''تمہارے لہجے سے اندازہ ہوا...... ویسے یار آج تم اس پینٹنگ کو ضرور مکمل کر لینا۔ کل میں فاروقی صاحب کو لے کر آؤں گا۔ اصل میں کچھ دیر پہلے ان کا فون آیا تھا۔ وہ تصویر کے بارے میں معلوم کر رہے تھے۔ بھئی وہ بہت بے چین ہیں۔''
''تصویر تو تم مکمل سمجھو...... لاسٹ ٹچز لگا رہا ہوں لیکن میں ابھی یہ تصویر دوں گا نہیں انہیں؟''
''آخر کیوں؟'' مسعود آفاقی حیران ہو کر بولا۔
''تم کل فاروقی صاحب کو لے آنا...... وہ تصویر دیکھ جائیں گے۔ انہیں تسلی ہو جائے گی لیکن انہیں لے جانے نہیں دوں گا۔''
''شہزادے اس بکواس کا مطلب کیا ہے؟''
''یار' یہ تصویر کچھ زیادہ اچھی بن گئی ہے۔ دو چار دن اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔'' ساحل عمر نے سادگی سے کہا۔
''تو نہیں سدھرے گا بھائی' اصل میں تو وہ اونٹ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں......''

تیرے بارے میں یہ پتا ہے کہ کس کروٹ بیٹھے گا۔'' مسعود آفاقی نے غصے سے کہا۔ ''اس سے کہیں بہتر بات یہ ہے کہ میں انہیں پینٹنگ مکمل نہ ہونے کے سلسلے میں کوئی بہانا کر دوں۔''

''اچھا بھائی کل تم ان کو لے کر آ جانا اور تصویر لے جانا...... اب تو خوش ہو۔''

''ہاں شہزادے یہ ہوئی نہ بات...... اوکے پھر کل ملاقات ہو گی۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

ساحل عمر نے ریسیور ٹیلی فون پر آہستگی سے جمایا اور وہیں بیٹھا بیٹھا تصویر کو دیکھنے لگا۔ وہ تصویر کو بڑی باریک بینی سے دیکھ رہا تھا ایک دم اس کی بچھو پر نظر ٹھہر گئی۔

ایک لمحے کو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بچھو میں حرکت پیدا ہوئی ہو اس نے اپنی اگلی دو ٹانگیں ہلائی ہوں۔ بچھو کو ہلتے دیکھ کر ایک دم اس کے جسم میں سنسنی سی پھیلی۔ آنکھوں میں خوف جاگا۔ وہ لاشعوری طور پر پیچھے ہٹا مگر بچھو اپنی جگہ پر ساکت تھا۔ اس کی حرکت کا احساس بس ایک لمحے کا تھا۔ ساحل عمر طے نہ کر پایا کہ وہ بچھو واقعی حرکت میں آیا تھا یا یہ محض فریب نظر تھا۔

قریب آ کر اس نے بغور بچھو کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے بال برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہوا تھا۔ بچھو کے حرکت میں آنے والے خیال پر اسے ہنسی آئی۔ اسے یقین آ گیا کہ بچھو کو حرکت کرتے دیکھنا سو فیصد فریب نظر تھا۔ ویسے اپنے اس خیال پر وہ خوش تھا۔ وہ خود ہی اپنی تخلیق کے فریب میں آ گیا تھا۔ اس کی تصویر میں جان پڑ گئی تھی۔ یہ بات اس کے فن کی کامیابی کی دلیل تھی۔

اپنی تخلیق کے نشے میں مست وہ رات کے دو بجے تک کام میں لگا رہا۔ جب تصویر ہر طرح سے مکمل ہو گئی تو اس پر ایک سرشاری سی چھا گئی۔ تخلیق کی تکمیل کا کیف بالکل ہی الگ ہوتا ہے اس کیف کو، اس مزے کو، اس لطف کو صرف وہی لوگ جانتے ہیں جو تخلیقی کام کرتے ہیں۔

وہ آسودگی سے مسکرا رہا تھا اور نظر بھر بھر کر اپنے شاہکار کو دیکھ رہا تھا۔

''ساحل تم ابھی تک سوئے نہیں۔'' اماں اچانک دروازے پر آ کھڑی ہوئیں۔

''اماں، بس کام ختم ہو گیا...... سونے جا رہا ہوں۔'' ساحل عمر اماں سے مخاطب ہو کر بولا...... ''اماں ذرا اندر آؤ...... آؤ تمہیں ایک زبردست دلہن دکھاؤں۔''

''ہیں دلہن۔'' اماں کے چہرے پر ایک دم خوشی آ گئی۔ ''میں ابھی آتی ہوں، ذرا چشمہ لے آؤں۔''

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچیں۔ تکیئے کے برابر رکھا ہوا چشمہ اٹھایا اور دوپٹے سے صاف کرتی ہوئیں وہ ساحل عمر کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئیں۔

ساحل عمر نے جس کمرے کو اپنا اسٹوڈیو بنا رکھا تھا اس کمرے میں وہ کبھی داخل نہ ہوئی تھیں۔ ساحل عمر اسٹوڈیو میں نہ ہوتا تو وہ کمرہ لاک رہتا اور اگر وہ کمرے میں بیٹھا کام کر رہا ہوتا تو اماں دروازے پر کھڑے ہو کر ہی اس سے بات کر لیتیں۔ دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا۔ دروازے سے وہ تصویر نظر نہیں آتی تھی۔ جس پر ساحل عمر کام کر رہا ہوتا۔ ساحل عمر دروازے کے رخ بیٹھتا تھا۔ تصویر کی پشت دروازے کی طرف ہوتی۔ اماں کی ان تصویروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ رات کو جب بھی ان

کی آنکھ کھلتی اور وہ ساحل عمر کو اسٹوڈیو میں کام کرتا دیکھ لیتیں تو دروازے پر کھڑے ہو کر اسے ڈ
ضرور دیتی تھیں۔ حالانکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ ان کی بات کو ایک کان سے سن
دوسرے کان سے نکال دے گا۔ وہ اپنا کام کیئے بغیر ہرگز نہ اٹھے گا پر دونوں اپنی اپنی عادت سے مجبو
تھے۔

ساحل عمر بچپن سے ہی انہیں اماں کہتا تھا۔ وہ اس کی ماں نہ تھیں۔ اس گھر کی ملازمہ تھیں
اس کی آیا تھیں۔ وہ ان کی گود میں پل کر ہی جوان ہوا تھا۔ ساحل عمر نے انہیں کبھی ملازمہ نہ سمجھا تھا
وہ انہیں اپنی ماں جیسی جانتا تھا۔ اس وقت جب اس کے ماں باپ زندہ تھے اسے ماں جیسی عزت دیتا
تھا اور اب جبکہ اس کے ماں باپ اس دنیا میں نہ رہے تھے وہ اس کی ماں تھیں اور وہی اس کی باپ۔

ساحل عمر کبھی کبھی جب ان کے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتا تو وہ اس کے خوبصورت بالوں میں
انگلیاں پھیر کر اس سے سوال کرتیں۔

''ساحل بیٹا...... تم شادی کب کرو گے؟''

''اماں اسی لئے تو میں آپ کے کمرے میں آتا نہیں ہوں۔ آپ خراب خراب باتیں کر
شروع کر دیتی ہیں۔'' ساحل عمر انہیں ترچھی نظروں سے دیکھ کر کہتا۔

''بیٹا...... میرے پاؤں قبر میں لٹک رہے ہیں...... پتہ نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ اماں
میں چاہتی ہوں کہ اس گھر میں دلہن آ جائے تو میں سکون سے مر جاؤں۔'' اماں اپنی سناتیں۔

''اسی لئے تو میں شادی نہیں کرتا۔'' وہ ہنس کر کہتا۔

''کیوں آخر؟''

''میں نے شادی کر لی تو تم چل بسو گی اور میں یہ چاہتا نہیں۔'' وہ مسکرا کر اماں کی طرف
دیکھتا۔

رات کے دو بجے جب ساحل نے دلہن دکھانے کی بات کی تو وہ نہ جانے کیا سمجھیں
خوشی خوشی چہرے پر عینک چڑھائے اس کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئیں اور بولیں۔ ''لاؤ دکھاؤ' کدھر
ہے دلہن۔''

''ادھر میرے پاس آ جائیں۔'' ساحل عمر نے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ اس
کے نزدیک پہنچ گئیں تو اس نے بورڈ پر لگی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ دیکھیں۔''

تصویر دیکھ کر بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔ ''اے ماشاء اللہ...... بہت خوب...... بڑی
پیاری ہے۔''

اور جیسے ہی ان کی نظر بچھو پر پڑی۔ وہ خوفزدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ ''اس بچھو کو
مارو۔''

یہ سن کر ساحل عمر نے قہقہہ لگایا۔

''ارے' ساحل تم ہنس رہے ہو...... جلدی کرو' مارو اسے...... بھیا' میں تو چلوں یہاں سے
کہیں یہ موا میرے اوپر نہ چھلانگ لگا دے۔'' اماں تصویر سے دور ہو کر دروازے کی طرف بھاگیں۔

ساحل عمر نے بھاگتی اماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ''اماں سنو تو۔''

''اس بچھو کو مارو۔'' وہ خوفزدہ تھیں۔

''اماں' یہ بچھو نہیں ہے۔'' ساحل عمر نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

''یہ بچھو نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ میں نے چشمہ لگا رکھا ہے۔ مجھے سب دکھائی دے رہا ہے۔''

''اچھا' ایک منٹ ادھر ہی کھڑی رہو...... میں اسے مارتا ہوں۔'' ساحل عمر یہ کہہ کر اٹھا اور اس نے تصویر کے نزدیک جا کر بچھو پر ہاتھ رکھ دیا۔

اماں ''ہیں' ہیں'' کرتی رہ گئیں۔ پھر وہ بھاگ کر ساحل عمر کی جانب لپکیں۔ جب وہ نزدیک پہنچیں تو ساحل عمر نے تصویر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ بچھو اپنی جگہ جوں کا توں موجود تھا۔ تب ان پر حقیقت آشکار ہوئی۔ وہ بڑی حیرت سے اس بچھو کو دیکھنے لگیں۔

''نقلی ہے۔ ہاتھ سے بنا ہوا؟'' وہ بے یقینی سے بولیں۔

''جی اماں...... اسے میں نے بنایا ہے۔'' ساحل عمر نے خوش ہو کر کہا۔

''ارے اتنا زبردست بنایا ہے۔ بالکل اصل لگتا ہے۔ میں تو اسے دیکھ کر ڈر ہی گئی تھی۔'' اماں نے اسے خراج تحسین پیش کیا۔

بس یہی تو خوبی تھی اس میں...... لوگ اسی لئے اس کے دیوانے تھے۔ وہ خیال کو مجسم کرتا اور پھر اس جسم میں جیسے جان ڈال دیتا تھا۔ وہ سچا تخلیق کار تھا۔ انوکھا مصور تھا۔

نثار فاروقی ایک فضائی کمپنی کے ڈائریکٹر تھے۔ وہ ساحل عمر کے زبردست فین تھے۔ وہ کافی عرصے سے اس کی کوئی پینٹنگ خریدنے کے خواہاں تھے۔ وہ جب بھی کسی پینٹنگ کے خریدنے کی بات کرتے تو معلوم ہوتا کہ وہ تو پہلے ہی فروخت ہو چکی ہے۔ ساحل عمر بہت کم پینٹنگز بناتا تھا۔ اس کا موڈ نہ ہوتا تو مہینوں کوئی پینٹنگ نہ بناتا۔ پینٹنگ بنانا اس کا پیشہ نہ تھا۔ اسکے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ اس کا باپ اتنا کچھ چھوڑ گیا تھا کہ اس رقم کو فکسڈ ڈپازٹ میں رکھ کر وہ ایک شاندار زندگی بسر کر سکتا تھا لیکن اسے شاندار زندگی بسر کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ وہ ایک عام اور سادہ سی زندگی گزارنے کا خواہاں تھا۔ پیسے کو وہ بالکل منہ نہ لگاتا تھا۔ پیسہ اس کی ضرورت تو تھا لیکن دین دھرم نہ تھا۔ جو تصویر وہ بناتا تھا وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے بناتا تھا۔ فروخت کرنے کے لیے نہیں لیکن لوگ اس کی پینٹنگ چھوڑتے ہی نہ تھے۔ ہزار خوشامدیں کر کے اور منہ مانگے پیسے دے کر پینٹنگ اٹھا کر لے جاتے تھے۔

نثار فاروقی بھی اس کی کوئی تصویر حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے۔ اس کے لیے انہوں نے مسعود آفاقی کو پکڑا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مسعود ساحل عمر کا گہرا دوست ہے۔ مسعود نے ساحل سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ وہ اب جو پینٹنگ بنائے گا وہ نثار فاروقی کے حوالے کی جائے گی۔ دوست کی بات ٹالنا ساحل عمر کی فطرت میں نہ تھا۔ پھر دوست بھی مسعود آفاقی جو اس پر جان دیتا تھا۔

ساحل عمر یوں تو خاصا سوشل تھا۔ جان پہچان والوں کا ایک وسیع حلقہ رکھتا تھا لیکن اس

کے دوستوں کا حلقہ بہت محدود تھا۔ بس اس کے دو ہی دوست تھے ایک مسعود آفاقی اور دوسرے ناصر مرزا۔

ناصر مرزا ایک چھوٹی سی فرم کے مالک تھے۔ وہ ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار کرتے تھے۔ شکار ان کا شوق تھا۔ یہ شوق انہیں اپنے والد عرفان مرزا سے ورثے میں ملا تھا۔ مضبوط کاٹھی کے آدمی تھے۔ کسرتی جسم کے مالک۔ قد آور...... جو انہیں ایک مرتبہ دیکھتا ان کی شخصیت سے مرعوب ہوئے بنا نہ رہتا۔ چالیس سے اوپر عمر ہو گی لیکن اپنی اصل عمر سے کم دکھائی دیتے تھے۔ شکار کے علاوہ روحانیت میں خاص شغف رکھتے تھے اور کچھ درک بھی تھا۔

یہ تینوں دوست ہفتے میں ایک بار ضرور اکٹھا ہوتے تھے۔ اگر فلم دیکھنے کا موڈ ہوتا تو مسعود آفاقی کے گھر میں ڈیرا جمایا جاتا۔ تاش کھیلنے اور کھانے پینے کا پروگرام ہوتا تو اس کے لئے ناصر مرزا کا گھر مخصوص تھا۔ اگر موسیقی سننا ہوتی' میوزک اور آرٹ پر گفتگو کرنا ہوتی نئی کتابوں پر تبصرے اور نت نئے موضوعات پر بات کرنا ہوتی تو اس کے لئے ساحل عمر کا گھر حاضر تھا۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ کسی کے گھر نہ جاتے آؤٹنگ پر نکل جاتے۔ سمندر تینوں کو پسند تھا۔ عام طور سے وہ سمندر کا ہی رخ کرتے یا پھر کسی ہوٹل میں بیٹھ جاتے۔

تینوں کی عمروں میں اگرچہ فرق تھا لیکن ذہنی ہم آہنگی اتنی تھی کہ بعض اوقات بولے بغیر ہی وہ ایک دوسرے کی بات سمجھ جایا کرتے تھے۔ کسی کو اپنی عمر کا احساس نہ تھا۔ ساحل کو چھوٹے ہونے کا اور ناصر مرزا کو بڑے ہونے کا۔

صبح کو مسعود جب نثار فاروقی کے ساتھ ساحل کے گھر پہنچا تو وہ شہزادے تکیے میں منہ دیئے سو رہے تھے۔ نثار فاروقی کو مسعود نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اس کے بیڈروم میں گھس گیا۔ اماں سے معلوم ہوا تھا کہ وہ رات کو کافی دیر سے سویا ہے لیکن اتنی دیر سے بھی نہ سویا تھا کہ اٹھ نہ سکے۔

مسعود نے اماں کو چائے بنانے کو کہہ دیا تھا۔ پھر اس نے ڈیک میں ایک کیسٹ لگا کر اسے پوری آواز میں کھول دیا اور خود اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر اس کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔

ڈیک کی آواز نے ساحل کے اعصاب جھنجھنا دیئے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جب اس نے مسعود کو کانوں میں انگلیاں ٹھونسے اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو اس کے منہ پر تکیہ کھینچ کر مارا اور جلدی سے ڈیک آف کر دیا۔ اس سے پہلے کہ ساحل کچھ بولتا مسعود گویا ہوا۔

''شہزادے تمہیں شرم نہیں آتی...... لوگوں کو دعوت دے کر خود سوئے پڑے ہو؟''

''فاروقی صاحب آ گئے ہیں کیا؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''جی۔'' مسعود آفاقی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''کہاں ہیں؟''

''ڈرائنگ روم میں بٹھا آیا ہوں اور ماں کو چائے بنانے کو کہہ دیا ہے۔ اب آپ براہ کرم

منہ ہاتھ دھو کر جلدی سے ڈرائنگ روم میں آ جائیں۔
''چلو ٹھیک ہے۔ تم جب تک ان سے گپ شپ لگاؤ میں پانچ منٹ میں آیا۔''
اس نے تیار ہونے میں واقعی پانچ منٹ سے زیادہ نہ لگائے۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چائے کے تین کپ رکھے تھے۔
نثار فاروقی نے اسے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھا تو احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ساحل عمر نے جلدی سے ٹرے میز پر رکھی۔ آگے بڑھ کر بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور خوشدلی سے بولا۔ ''سر تشریف رکھئے۔''
پھر اس نے ان کے سامنے چائے کی پیالی رکھی۔ مسعود نے اپنا کپ خود ہی اٹھا لیا۔
''تصویر کا کیا بنا؟'' فاروقی نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔
''بن گئی۔'' ساحل عمر نے مختصراً جواب دیا۔
''واہ کیا خبر سنائی...... پھر دکھائیں نا۔'' فاروقی صاحب کپ میز پر رکھ کر کھڑے ہو گئے۔
''فاروقی صاحب، ایسی بھی کیا بے صبری...... چائے تو پی لیں۔ اب تصویر کہیں نہیں جاتی۔'' مسعود نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن انہیں کہاں صبر تھا۔ دو لمبے گھونٹوں میں انہوں نے اپنی چائے ختم کر دی اور صوفے پر بیٹھے لگے پہلو بدلنے۔ ساحل عمر ان کی بے قراری دیکھ کر جلد ہی اٹھ گیا اور انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

نثار فاروقی نے تصویر دیکھی تو حال سے بے حال ہو گئے۔ کئی بار ساحل عمر کا ہاتھ چوما اور وہیں بیٹھے بیٹھے ایک بھاری رقم کا چیک لکھ دیا۔ چیک کاٹ کر انہوں نے بڑے ادب سے ساحل عمر کو پیش کیا اور بولے۔ ''اسے اپنی تخلیق کا معاوضہ نہ سمجھنا۔ یہ تصویر انمول ہے۔ اس چیک کو ایک حقیر نذرانہ سمجھنا۔''

ساحل عمر نے شکریہ کہہ کر ان کے ہاتھوں سے چیک اٹھا لیا اور بغیر دیکھے تہہ کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اس نے تصویر پیک کر کے ان کے حوالے کر دی اور وہ دونوں تصویر لے کر چلے گئے۔

باہر کا گیٹ بند کر کے پلٹا تو اماں کو دروازے پر کھڑے پایا۔
''اماں کیا ہوا؟'' اس نے دور ہی سے پوچھا۔
اماں نے بجائے جواب دینے کے کان پر ہاتھ رکھا۔
''اچھا......'' وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اماں کے نزدیک آ گیا اور بولا ''کس کا فون ہے؟''
''کوئی لڑکی ہے۔'' اماں نے بتایا۔
لڑکی کا نام سن کر اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ گھڑی میں گیارہ بج کر چھ منٹ ہو رہے تھے۔ ایک مخصوص وقت تھا لیکن یہ دن کا وقت تھا اور دن میں اس کا کبھی فون نہ آیا تھا۔ وہ سوچتا ہوا اپنے اسٹوڈیو کی طرف بڑھا۔

''ہائے رانجھن کہاں تھے؟'' ادھر سے مترنم ہنسی کے ساتھ کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔
''دوستوں کو چھوڑنے باہر تک گیا تھا؟'' اس نے بتایا۔
''ہم کون ہیں آپ کے؟'' سوال ہوا۔
''اب سے بارہ گھنٹے پہلے میری آپ سے پہلی مرتبہ بات ہوئی تھی۔ اتنی جلدی کوئی رائے قائم کر سکتا ہے۔ میں تو آپ کے نام تک سے واقف نہیں شخصیت تو دور کی بات ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔
''کسی کو جاننے کے لئے ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔
''اتنا سمجھ دار نہیں ہوں میں۔'' ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔
''اچھا' میرے ناسمجھ رانجھن' میری ایک بات سنو۔''
''ہاں کہو۔''
میں نے کوریئر سے تمہارے لئے کچھ بھیجا ہے اسے قبول کرو' پھر میں رات کو اپنے وقت پر تم سے بات کروں گی۔ اچھا او کے۔'' اس نے ساحل عمر کا جواب بھی نہ سنا اور فون بند کر دیا۔
ساحل عمر ریسیور پکڑے کافی دیر سوچتا رہا کہ اس نے کیا بھیجا ہوگا لیکن اندازہ نہ کر پایا۔ ریسیور رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اماں اس وقت کچن میں تھیں۔ وہ دوپہر کا کھانا تیار کر رہی تھیں یوں تو ساحل عمر نے اماں کی مدد کے لئے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی جو صبح سے رات تک اماں کے ساتھ ہوتی تھی۔ سارے کام وہی کرتی تھی لیکن ساحل عمر کے لئے کھانا وہ خود تیار کرتی تھیں۔ کچن میں جا کر اس نے اماں سے دو چار ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ پھر وہ اپنے بیڈ روم میں آ گیا اور میوزک سننے لگا۔
کوئی ساڑھے بارہ بجے کے قریب گھر کی بیل ہوئی تو وہ باہر گیا۔ گیٹ پر کوریئر کا ایک باوردی بندہ کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت گفٹ پیک تھا۔
''سر آپ کے لئے۔'' وہ ادب سے بولا۔
گفٹ پیک ریسیو کر کے وہ اندر آیا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر اس نے بڑے اطمینان سے پیک کو کھولا اندر سے جو کچھ نکلا وہ اسے حیران کرنے کے لیے کافی تھا۔ تحفے کو دیکھ کر اسے یاد آیا کہ آج اس کی سالگرہ ہے۔
اس نے سالگرہ کا ایک خوبصورت کارڈ' اور بڑا حسین سا کیک بھیجا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اتنی ذاتی تاریخ اس لڑکی نے کس طرح معلوم کر لی۔ اس نے سالگرہ منانے کا سلسلہ کئی سال سے بند کر رکھا تھا۔ ممی پاپا کے انتقال کے بعد وہ اپنی سالگرہ کا دن جیسے بھول ہی گیا تھا۔ والدین کی موت کے بعد سالگرہ منانے کو اس کا جی نہ چاہا...... لیکن آج اس لڑکی نے کیک اور کارڈ بھیج کر اس کی یادوں کے بند دریچوں کو کھول دیا تھا۔
اماں جو بڑی خاموشی سے یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے قریب آ کر ایک پلیٹ اور اس میں چمکتی چھری رکھ دی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ چند لمحے وہ خاموشی سے ساحل عمر کو دیکھتی رہیں۔ اس نے بھی ایک نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

پھر اماں دھیرے سے مسکرائیں اور بولیں۔ ''کیک کاٹو بیٹا' تمہیں سالگرہ مبارک ہو۔''
''اچھا اماں۔'' ساحل عمر نے چھری اٹھا کر کیک کاٹا' ایک چھوٹا سا پیس نکال، کر اس نے اپنے ہاتھ سے اماں کو کھلایا۔ اماں نے بھی اسے اپنے ہاتھ سے کیک کھلایا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔
ساحل عمر کر اچانک یہ احساس ہوا کہ اس کی ممی پاپا اس کے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔
اماں چائے بنانے کچن میں گئیں۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔
ساحل عمر بوجھل قدموں سے ٹیلیفون کی طرف بڑھا۔ ریسیور اٹھا کر اس نے کہا۔ ''جی۔''
''یار ساحل...... ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' ادھر مسعود آفاقی تھا۔
''کیا ہوا؟'' ساحل نے پوچھا۔
''ابھی فاروقی صاحب کا فون آیا تھا۔'' مسعود آفاقی نے بتایا۔ ''یار تم نے کس قسم کی تصویر بنا کر ان کے حوالے کر دی۔ ان کے تو ہوش اڑے ہوئے ہیں۔''
''آخر ہوا کیا؟ کچھ بولو تو......'' ساحل عمر پریشان ہو کر بولا۔
جواب میں مسعود آفاقی نے جو کچھ بتایا...... اس پر کوئی ذی ہوش یقین نہیں کر سکتا تھا۔ خود ساحل عمر سناٹے میں آ گیا تھا۔ ''ایسے کیسے ہو سکتا ہے یار۔''

☆......☆......☆

ایک ناقابل یقین بات تھی۔
مسعود آفاقی نے نثار فاروقی کے حوالے سے بتایا کہ جب نثار فاروقی نے گھر پہنچ کر تصویری پیکنگ کھولی تاکہ گھر کے لوگوں کو یہ شاہکار تصویر دکھا سکیں اور پھر یہ طے ہو کہ اسے کمرے میں کس جگہ لگانی ہے تو وہ تصویر کا چہرہ دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گئے۔ دلہن کی پیشانی پر بیٹھا وہ بچھو غائب تھا۔ بچھو کی جگہ اس کا سفید عکس موجود تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے دلہن کی پیشانی سے اس بچھو کو نوچ کر پھینک دیا ہو۔
نثار فاروقی ابھی حیران کھڑے اس تصویر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ ان کی ایک بیٹی نے اچانک چیخ کر کہا۔ ''ڈیڈی بچھو۔''
نثار فاروقی نے ہاتھ سے تصویر چھوڑ دی اور بولے۔ ''کہاں ہے؟''
''ڈیڈی تصویر کے پیچھے۔'' بیٹی خوفزدہ ہو کر بولی۔
نثار فاروقی نے اپنی بیٹی کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کر کے احتیاط سے تصویر الٹ دی لیکن تصویر کے پیچھے بچھو موجود نہ تھا۔ انہیں خیال آیا کہ بیٹی کو ایسے ہی وہم ہوا ہے لیکن بیٹی نے ان کے اس خیال کی سختی سے تردید کی۔ وہ اس بات پر ڈٹی رہی کہ اس نے یقینی طور پر تصویر کے پیچھے بچھو دیکھا ہے۔ اگرچہ یہ ایک ناقابل یقین خیال تھا لیکن احتیاط کے طور پر کمرے کا کونا کونا چھان مارا گیا۔ بچھو کا کوئی سراغ نہ ملا۔
تب پریشان ہو کر نثار فاروقی نے مسعود کو فون کیا اور سارا قصہ بتایا۔ مسعود نے اس قصے کو

ساحل عمر کے گوش گزار کیا۔ ساحل کو یقین نہ آیا۔ اس نے ساری بات سن کر کہا۔ ''ایسے کیسے ہو سکتا ہے یار؟''

''میری خود عقل نہیں کام کر رہی۔'' مسعود نے فکر مند ہو کر کہا ''لیکن فاروقی صاحب خاصے پریشان تھے۔''

''ان سے کہو پریشان نہ ہوں۔ تصویر مجھے واپس کر دیں۔ ان کا چیک میری پینٹ کی جیب میں جوں کا توں پڑا ہے۔ یقین کرو میں نے اس کی رقم بھی نہیں دیکھی۔''

''او نہیں شہزادے...... وہ رقم کیلئے پریشان نہیں اتنی تمناؤں اور آرزوؤں کے بعد انہیں تمہاری پینٹنگ ملی اور وہ انہیں ضرورت سے زیادہ پسند بھی آئی لیکن اس پینٹنگ کا حشر کیا ہوا۔'' مسعود نے کہا۔ ''ویسے یار' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہوا کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے اس بچھو کو ایک کاغذ پر بنا کر دلہن کی پیشانی پر چپکا دیا ہو اور وہ وہاں سے اکھڑ گیا ہو۔''

''اگر ایسا ہوتا تو پھر پریشانی والی بات نہیں تھی۔ میں تصویر پر دوسرا بچھو بنا کر چپکا دیتا لیکن وہ بچھو تصویر پر بنا ہوا تھا اور اس پر میں نے بہت محنت کی تھی۔ اس محنت کا نتیجہ عجیب پراسرار انداز میں نکلا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیا ہوا ہے۔'' ساحل عمر پریشانی سے بولا۔

''میں نے فاروقی صاحب سے تصویر واپس لانے کو کہا ہے جیسے ہی وہ آتے ہیں۔ میں تصویر لے کر آتا ہوں تم گھر پر ہی ہونا؟'' مسعود نے پوچھا۔

''ہاں میں گھر پر ہوں۔ کہیں جا بھی رہا ہوتا تو ایسی خبر سن کر رک جاتا۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ ساحل عمر نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اس نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس پر اسرار واقعہ کی کوئی توجیہہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پراسرار واقعہ کی توجیہ ہوتی کب ہے۔ ان معاملات میں عقل کہاں کام کرتی ہے۔ کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی اور وہ تو بچپن ہی سے اس قسم کے واقعات کا شکار تھا۔

بچپن کا وہ واقعہ ابھی تک اس کے ذہن پر نقش تھا۔ وہ چیتے سے مشابہ دھاریوں والی بلی اب بھی کبھی کبھی اس کے خوابوں میں چھلانگیں مارتی نظر آ جاتی تھی۔ اسے یہ بات آج بھی اچھی طرح یاد تھی کہ وہ چیتے کی شکل والی بلی کب اس کے پیچھے لگی تھی۔ وہ چھٹی کا دن تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور دوپہر کا وقت' ساحل عمر اپنے ایک دوست کے ساتھ کرکٹ کھیل کر آ رہا تھا۔ بیٹ اس کے کندھے پر تھا اور وہ ایک ہاتھ سے گیند اوپر اچھالتا اور اس کو کیچ کرتا اپنے دوست کے ساتھ باتیں کرتے چل رہا تھا کہ ایک دم لڑکھڑا گیا۔ اچانک ہی کوئی چیز اس کے پیروں میں آ گئی تھی۔

جب ساحل عمر نے سنبھل کر ادھر ادھر دیکھا کہ وہ کس چیز سے ٹکرایا تو اسے نزدیک ہی ایک بلی کھڑی ہوئی نظر آئی۔

وہ اس کو دیکھ کر عجیب انداز سے میاؤں' میاؤں کر رہی تھی۔ ساحل عمر نے بیٹ سڑک پر مار کر اسے دھمکانے کی کوشش کی تو وہ بجائے بھاگنے کے اس کے نزدیک آ گئی اور کسی پالتو بلی کی طرح اس کے قدموں میں لوٹنے لگی۔ وہ بڑی تیزی اور سختی سے اپنا بدن اس کی ٹانگوں سے رگڑ رہی تھی اور

اس کے دائیں بائیں گھوم رہی تھی۔

ساحل عمر اگرچہ بلیوں سے نہیں ڈرتا تھا لیکن اس وقت اس کو خوف محسوس ہوا اور وہ تیزی سے اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ اس کا دوست بلی کے نزدیک آنے سے پہلے ہی فرار ہو چکا تھا۔

ساحل عمر بھاگتے ہوئے جب بھی پلٹ کر دیکھتا کہ وہ بلی اس کے پیچھے آ رہی ہے یا نہیں تو اس کو اپنے تعاقب میں پاتا۔ اس دن وہ بلی اس کے پیچھے پیچھے گھر کے گیٹ تک آئی اور اس کے گھر میں داخل ہو جانے کے بعد واپس لوٹ گئی۔

اس کے بعد تو وہ چیتے نما بلی مستقل اس کے پیچھے لگ گئی۔ وہ گھر سے کھیلنے کیلئے نکلتا تو اس بلی کو گیٹ پر اپنا منتظر پاتا۔ وہ اس کے ساتھ ہو لیتی۔ ایک بار "میاؤں میاؤں کر کے اس کی ٹانگوں سے اپنا بدن رگڑتی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ یا آگے پیچھے چلنے لگتی۔

وہ صبح اسکول گاڑی میں جاتا تھا۔ اس کی ممی اسے اسکول چھوڑتی تھیں اور وہی لے کر آتی تھیں۔ جب وہ گاڑی میں جا رہا ہوتا تو وہ بھی سڑک کے کنارے کھڑی ہوتی یا بھاگتی ہوئی دکھائی دے جاتی۔

پھر ایک دن اس کی ممی نے اس بلی کو ساحل عمر کی ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہوا یہ کہ اسکول کی چھٹی ہوئی تو ساحل کی ممی گاڑی کے باہر ساحل کی آمد کی منتظر تھیں کہ انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سامنے سے ساحل عمر چلا آ رہا ہے اور ایک بلی اس کے تعاقب میں ہے۔ کبھی وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹتی، کبھی اچھل کر آگے چلی جاتی۔ ساحل نزدیک پہنچتا تو وہ اس کی ٹانگوں کے درمیان سے نکل جاتی۔ ساحل عمر لڑکھڑا جاتا۔ کبھی وہ اس کی دائیں ٹانگ سے اپنا جسم رگڑتی گزر جاتی اور کبھی بائیں ٹانگ پر پنجے آزمائی کرتی۔

"جب ساحل عمر گاڑی کے نزدیک پہنچا تو اس بلی نے ایک نظر اس کی ممی کی طرف دیکھا۔ میاؤں کی آواز نکالی اور ایک گاڑی کے نیچے گھس گئی۔

ممی نے حسب معمول اس سے بستہ لیا۔ ہلکا سا گلے لگایا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے بٹھایا اور پھر گھوم کر اپنی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اس کا بستہ پچھلی سیٹ پر ڈال دیا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"ساحل یہ بلی کون تھی؟" ممی نے ایک نظر اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کچھ اس طرح سوال کیا جیسے انہوں نے کسی لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا ہو۔

"ممی پتہ نہیں۔" ساحل عمر نے بے نیازی سے کہا۔ "یہ کافی عرصے سے میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔"

"لیکن تم نے مجھے کبھی بتایا نہیں، میں نے اسے پہلی بار تمہارے ساتھ دیکھا ہے۔" وہ بولیں۔

"آپ نے اسے پہلی بار اس لئے دیکھا ہے کہ یہ آج پہلی بار اسکول گیٹ پر ملی ہے۔"

"ہیں" ممی نے چونک کر ساحل عمر کی طرف دیکھا۔ "اس سے پہلے کہاں ملتی رہی ہے۔"

''گھر کے گیٹ کے آس پاس گھومتی رہتی ہے جیسے ہی میں باہر نکلتا ہوں میرے پیچھے لگ جاتی ہے۔'' ساحل عمر نے بتایا۔

''آخر یہ تم سے چاہتی کیا ہے۔''

''ممی شاید مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔'' ساحل عمر نے یہ بات اتنی معصومیت سے کہی کے ممی بے اختیار ہنس پڑیں اس کا گال تھپتھپائے بنا نہ رہ سکیں۔ وہ بڑے پیار سے بولیں۔''ناٹی۔''

ساحل عمر بچپن میں ذہین ہی نہیں خوبصورت بھی تھا۔ خوبصورت تو وہ خیر سے آج بھی تھا لیکن بچپن میں اسکے چہرے پر جو بھولپن تھا اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ انتہائی خوبصورت اور چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں۔ ہلکے براؤن بال سرخ وسفید رنگت' بچپن میں اسے جو بھی دیکھتا پیار کئے بنا نہ رہتا۔ اس میں ایک خاص کشش تھی۔

شاید یہی کشش اس بلی کو ساحل کے نزدیک کھینچ لائی تھی۔ وہ بلی گھر سے باہر اس کی منتظر رہتی تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ ساحل عمر کے ساتھ کبھی گھر میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی وہ کبھی گھر کے کسی گوشے میں دکھائی دی تھی۔ وہ بس گھر کے باہر اس کا پیچھا کرتی تھی اور اس کے قدموں میں لوٹتی تھی۔ ممی نے ساحل کے پاپا عمر عابد سے اس بلی کا ذکر کیا تو وہ تھوڑے سے فکر مند ہوئے اور بولے''کہیں وہ ہمارے بیٹے کو نقصان نہ پہنچا دے۔''

''ابھی تک تو اس نے کوئی نقصان پہنچایا نہیں ہے۔ بس وہ اس کی ٹانگوں میں گھستی ہے۔ اس کے گرد چکر کاٹتی ہے۔ آگے پیچھے چلتی ہے اور اسے گھر تک پہنچا کر اپنا رستہ لیتی ہے۔'' ممی نے بتایا۔

''تم نے دیکھا ہے اس بلی کو؟'' عمر عابد نے پوچھا۔

''ہاں' میں نے دیکھا ہے' بالکل چیتے جیسی شکل کی ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''کیوں پیچھے لگی ہے اس کے...... کیا ساحل اس کو کچھ کھلاتا پلاتا ہے۔''

''بقول ساحل وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔'' ممی نے ہنس کر بتایا۔

''اچھا۔'' عمر عابد بھی ہنسنے لگے۔ ''پھر جلدی اس بلی کا گھر معلوم کرو تا کہ ہم اس کا رشتہ لے کر چلیں۔''

''اس بلی کی حرکات بے ضرر تھیں۔ اس نے ساحل عمر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ تو آج تک اس کے گھر میں بھی داخل نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھر سے باہر ہی اس کے تعاقب میں رہتی تھی۔ آگے پیچھے گھومتی' اس کی ٹانگوں سے لپٹتی' اس کے قدموں میں لوٹتی' اس چیتے نما بلی کا اس تواتر سے ساحل عمر کا پیچھا کرنا باعث پریشانی ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دو دن کی بات ہوتی تو اسے نظر انداز کر دیا جاتا لیکن اسے پیچھے لگے ہوئے دو ماہ ہونے کو آئے تھے۔ اس کی ممی پاپا اب فکر مند رہنے لگے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے بیٹے کا اس بلی سے کس طرح پیچھا چھڑوائیں۔''

''پھر ایک دن مولوی صاحب نے اس بلی کو ساحل کی ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے دیکھ لیا۔ مولوی صاحب گھر پر ساحل عمر کو قرآن شریف پڑھانے آتے تھے۔ ایک دن ان کی آمد پر ساحل نے

گیٹ کھولا تو وہ بلی جو گیٹ پر اس کی منتظر تھی چھلانگ لگا کر ساحل کے نزدیک پہنچ گئی اور اس کے چاروں طرف گھوم کر اپنا بدن اس کی ٹانگوں سے رگڑنے لگی۔ مولوی صاحب نے بغور اس بلی کو دیکھا اور پھر اپنی سائیکل لے کر اندر آ گئے۔

ساحل عمر گیٹ بند کر کے اندر جانا چاہ رہا تھا لیکن وہ بلی اسے گیٹ بند کرنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔ وہ اس بری طرح اس کی ٹانگوں سے لپٹ رہی تھی کہ وہ گیٹ بند نہیں کر پا رہا تھا۔ اتنے میں ساحل کی ممی گھر کے دروازے پر آ گئیں۔ انہوں نے بلی کو دیکھا تو وہ بھاگتی ہوئی گیٹ پر آئیں۔ ممی کو آتا دیکھ کر وہ بلی چند لمحے کو ساکت ہوئی تو ساحل عمر نے جست لگا کر گیٹ بند کر دیا۔

کچھ دیر باہر سے میاں میاؤں کی آوازیں آتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔

ممی گھر کے اندر چلی گئیں اور ساحل عمر مولوی صاحب کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

مولوی بھاحب، ساحل عمر سے بلی کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ وہ بلی کو اس عجیب وغریب انداز سے لپٹتا دیکھ کر کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ ابھی وہ ساحل سے بلی کے بارے میں بات ہی کر رہے تھے کہ عمر عابد اندر آ گئے۔

''مولوی صاحب مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔'' عمر عابد مولوی صاحب سے مخاطب ہوئے۔ ان کا لہجہ فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

''جی فرمایئے۔'' مولوی صاحب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''ابھی آپ نے اس بلی کو گیٹ پر دیکھا ہو گا یہ دو ماہ سے ساحل کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں؟'' عمر عابد خاصے پریشان تھے۔

''آپ پریشان نہ ہوں، میں ایک دو دن میں اس کا بندوبست کروں گا۔'' مولوی صاحب نے بڑے یقین سے کہا۔

''اور انہوں نے واقعی ایسا کر دکھایا، تیسرے دن انہوں نے ایک تعویذ اور شیشی میں پڑھا ہوا پانی لا کر دیا۔ تعویذ ساحل عمر کے بازو پر باندھ دیا گیا اور پڑھا ہوا پانی پندرہ دن تک پینے کی ہدایت کی۔

ساحل عمر دوسرے دن شام کو جب کرکٹ کھیلنے کیلئے باہر نکلا تو خلاف توقع بلی کہیں دکھائی نہ دی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا میدان میں پہنچ گیا۔ میدان میں پہنچا تو اچانک اسے وہ دکھائی دی۔ وہ چھلانگیں بھرتی ہوئی ساحل عمر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''ساحل وہ تمہاری دوست۔'' ایک لڑکے نے ساحل عمر کی توجہ بلی کی طرف دلائی۔

''ہاں دیکھ رہا ہوں۔'' ساحل عمر بڑے سٹائل سے بیٹ کندھے پر رکھے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

وہ چیتا نما بلی چار قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ ساحل کو بڑی حیرت ہوئی کیونکہ آج تک ایسا نہ ہوا تھا۔ وہ بلی اسے دیکھ کر اس طرح جھپٹتی تھی جیسے جا[illegible] یا دیکھ کر کوئی مسافر۔

اس بلی نے بڑی بے چارگی سے اسے دیکھا۔ دو چار بار درد بھری میاؤں میاؤں کی آواز نکالی اور پھر ایک طرف دوڑتی چلی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہو گئی۔

پھر وہ بلی اسے کبھی نہ دکھائی۔ البتہ آج بھی کبھی کبھی وہ اس کے خوابوں میں چھلانگیں مارتی دکھائی دیتی ہے۔

''بیٹا کھانا نکالوں؟'' اماں نے پوچھا۔

ساحل عمر ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا بچپن کی یادوں میں گم تھا۔ اماں کے پوچھنے پر سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر اس نے نظر دوڑائی۔ دو بج رہے تھے۔ یہ اس کے کھانے کا وقت تھا۔ وہ آرٹسٹ ضرور تھا لیکن زندگی کے معاملات میں کوئی بے ترتیبی نہ تھی۔ اس کی زندگی میں بڑا نظم وضبط تھا۔ اسے اچھی خاصی بھوک لگ رہی تھی۔ سامنے ہی کیک رکھا تھا۔ اس نے چھری سے تھوڑا سا کیک کاٹ کر منہ میں رکھا اور اماں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہاں اماں کیوں نہیں۔'' ابھی وہ کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ بیل ہوئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مسعود، نثار فاروقی کو لے کر آ گیا ہے۔ اس نے گیٹ کھولا تو واقعی وہ دونوں گیٹ پر موجود تھے۔ مسعود کے ہاتھ میں کاغذ میں لپٹی ہوئی تصویر تھی۔

ساحل نے مسعود سے پینٹنگ لے لی اور دونوں کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ پینٹنگ اس نے ایک صوفے کی پشت سے لگا کر کھڑی کر دی۔ نثار فاروقی کے چہرے پر خجالت سی تھی۔ وہ چور سے بنے ہوئے تھے۔ اتنی تمناؤں اور آرزوؤں کے بعد تو انہیں ساحل کی پینٹنگ نصیب ہوئی تھی اور وہ پینٹنگ چند گھنٹوں بعد ہی واپس کرنا پڑ رہی تھی۔

''سر آپ پریشان نہ ہو۔ آپ کا چیک میری جیب میں قطعاً محفوظ ہے اور شاید آپ کو یقین نہ آئے میں نے اب تک اس چیک کی رقم بھی چیک نہیں کی ہے۔ آپ کی یہ امانت بغیر دیکھے ہی لوٹا رہا ہوں۔ قبول فرمائیے۔'' ساحل عمر نے اپنی جیب سے تہہ کیا ہوا چیک نکالا اور بہت احترام کے ساتھ انہیں پیش کر دیا۔

نثار فاروقی نے وہ چیک بغیر کسی پس و پیش کے اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ مسعود کو ان کے اس رویے پر بڑی حیرت ہوئی لیکن ساحل ذرا بھی حیران نہ ہوا۔

چیک واپس کر کے وہ اپنی پینٹنگ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے پینٹنگ پر ڈھکا ہوا کاغذ ایک جھٹکے سے الگ کر دیا۔

نثار فاروقی اور مسعود کی بیک وقت نظریں اس تصویر پر پڑیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو حیران نظروں سے دیکھنے لگے جبکہ ساحل عمر کے چہرے پر سوال ابھر آیا۔ یہ سوال چند لمحوں کیلئے اس کے چہرے پر جھلکا۔ اس نے مڑ کر دونوں کو دیکھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس مسکراہٹ میں بڑی جان تھی۔

وہ تصویر جوں کی توں تھی۔ وہ بچھو اس کی پیشانی پر موجود تھا۔ ساحل عمر بہت نزدیک سے اپنی پینٹنگ کا معائنہ کر رہا تھا۔ تصویر سے بچھو کے الگ ہونے کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ حتیٰ کہ اس نے بچھو پر اپنی انگلی پھیر کر بھی دیکھا۔ اس کی مکمل طور پر تشفی ہو گئی۔

''مسعود تم نے تو مجھے فون پر کچھ اور بتایا تھا۔'' ساحل عمر اطمینان سے صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

''مجھے نثار صاحب نے جو بتایا تھا وہ میں نے تمہیں بتایا۔'' مسعود نے اپنی صفائی پیش کی۔

نثار فاروقی کی حالت غیر تھی۔ ان کا سانولا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے اس تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ تصویر پر بچھو موجود تھا۔ یہ کیسے ہو گیا تھا۔ گھر پر تو یہ بچھو اس کی پیشانی پر نہ تھا اور یہ بات گھر کے تمام لوگوں نے نوٹ کی تھی۔ بلکہ ان کی بیٹی نے تو اس بچھو کو تصویر کی پشت پر چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ کیسا فریب تھا۔ کیا پورا گھر فریب نظر کا شکار ہو گیا تھا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' نثار فاروقی نے بمشکل کہا۔ ''یہ سب کیا ہوا ہے میں نہیں جانتا۔''

''سر آپ ساری بات بھول جائیں۔ میری پینٹنگ مجھ تک پہنچ گئی۔ آپ کو آپ کی رقم واپس مل گئی۔ حساب برابر ہو گیا۔'' ساحل عمر یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

اب نثار فاروقی کیلئے وہاں بیٹھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ وہ بھی کھڑے ہو گئے اور پھر خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھے۔

''میں انہیں گیٹ تک چھوڑ آتا ہوں۔'' مسعود نے آہستہ سے کہا اور ان کے ساتھ باہر نکل گیا۔

ساحل عمر ان دونوں کے جانے کے بعد بڑے پیار سے اپنی بنائی ہوئی پینٹنگ کو دیکھنے لگا۔ اس تصویر میں بڑی کشش تھی۔ کوئی خاص بات تھی۔ ایسی خاص بات کہ آدمی اس تصویر کو یک نظر دیکھ لے تو پھر اس پر سے نظر ہٹانا مشکل ہو جاتی۔ ایک تو دلہن بہت خوبصورت تھی دوسرے ٹیکے کی جگہ بیٹھا ہوا بچھو آدمی کو دم بخود کر دیتا تھا۔

تصویر دیکھتے دیکھتے اس نے طے کر لیا کہ وہ اس پینٹنگ کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کرے گا۔

''یار شہزادے یہ کیا ڈرامہ ہے؟'' مسعود ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''چلے گئے؟'' ساحل نے پوچھا۔

''ہاں۔'' مسعود نے جواب دیا۔

''کچھ کہہ رہے تھے؟'' ساحل عمر نے سوال کیا۔

''نہیں کچھ نہیں بولے۔ البتہ پریشان اور شرمندہ سے ضرور تھے۔'' مسعود آفاقی نے بتایا۔

''میں تمہیں ایک بات بتاؤں، یقین کرو گے۔'' ساحل عمر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''ہاں بولو۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بچھو غائب ہونے کا قصہ سفید جھوٹ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ جوش میں آ کر تصویر

لے تو گئے لیکن بعد میں تصویر ان کو پسند نہ آئی۔ اس لئے ڈرامہ کر کے واپس کر گئے۔'' ساحل عمر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''خیر کوئی بات نہیں۔ میں اس تصویر کی واپسی پر خوش ہوا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں اسے ویسے بھی دو چار دن اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا لیکن اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس تصویر کو میں کسی کو نہیں دوں گا۔ چاہے کوئی اس تصویر کا معاوضہ ایک کروڑ روپے ہی کیوں نہ دینے کو تیار ہو جائے۔''

''یار میں اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں۔'' مسعود بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔
''ایک کروڑ روپے معاوضے والی بات کو؟'' ساحل نے پوچھا۔
''او نہیں یار۔'' مسعود آفاقی نے تصویر کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تصویر پسند نہ آنے کی بات کر رہا ہوں۔ وہ تمہارے شیدائی ہیں اگر انہیں تصویر پسند نہ آتی تو وہ فوراً چیک کاٹ کر نہ دیتے۔ دوسرے تصویر لے جاتے ہوئے وہ بہت خوش تھے۔ مجھ سے مشورہ کرتے رہے کہ یہ تصویر اپنے گھر میں لگائیں یا اپنے آفس میں۔ پھر ایک بات اور ہے اگر انہیں تصویر واپس کرنا ہوتی تو ایسا بچگانہ ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم مانو نہ مانو لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس تصویر سے خوفزدہ ضرور ہوئے ہیں۔''

''اچھا لعنت بھیجو اس ذکر پر آؤ اندر چلو۔ آؤ تمہیں کیک کھلاؤں۔'' ساحل عمر نے تصویر اٹھائی اور ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

''ایک بات بتاؤ' کیا تم نے اپنی سالگرہ منائی ہے۔'' مسعود نے چلتے ہوئے شکایتی لہجے میں کہا۔

''نہیں بھئی...... سالگرہ مناتا تو کیا تمہیں نہ بلاتا۔'' ساحل عمر نے وضاحت کی۔
''پھر کیک کہاں سے آ گیا؟'' مسعود نے پوچھا۔
''کسی نے بھیجا ہے۔'' ساحل عمر نے لطف لیتے ہوئے بتایا۔
''کس نے؟'' مسعود نے پوچھا۔ وہ حیران تھا۔
''نام تو خیر سے مجھے بھی معلوم نہیں۔'' ساحل عمر نے کہا۔
''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''
''سب کچھ ہو سکتا ہے' تم کیک کھاؤ' تمہیں نام سے کیا لینا ہے۔'' ساحل عمر نے اس کے ہاتھ میں چھری دیتے ہوئے کہا۔

مسعود آفاقی نے کیک کا چھوٹا سا پیس کاٹ کر منہ میں رکھا اور انگلی چاٹتا ہو بولا۔ ''شہزادے کیک تو زبردست ہے۔''
''مجھے امید ہے کہ وہ بھی زبردست ہو گی۔'' ساحل عمر مسکراتے ہوئے بولا۔
''بھائی کون؟''
''وہی ٹیلیفون والی۔'' ساحل عمر نے بتایا۔
''ہیں'' مسعود آفاقی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ''اس نے بھیجا ہے یہ کیک؟''

''ہاں جی۔'' ساحل عمر نے بڑے پرسکون انداز میں کہا۔
''شکاری کو بتایا؟'' مسعود نے سوال کیا۔
''ناصر مرزا کو۔'' ساحل عمر نے وضاحت چاہی۔
''ہاں۔'' مسعود نے اثبات میں گردن ہلائی۔
''ملاقات ہو گی تو بتاؤں گا۔'' ساحل عمر نے کہا۔
''اور یار دیکھا تم نے۔'' مسعود کی آواز میں ہلکا سا خوف تھا۔ وہ اس تصویر کو جو ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر رکھی تھی بغور دیکھ رہا تھا۔ ساحل عمر بھی اس تصویر کو دیکھنے لگا۔ اسے کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔
''کیا ہوا؟'' ساحل نے پوچھا۔
''بھائی کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔'' مسعود کے لہجے میں خوف تھا۔
''ہوا کیا' بولو تو۔'' ساحل عمر پریشان تھا۔
''یار اس بچھو کو میں نے ہلتا ہوا محسوس کیا ہے؟'' مسعود نے بتایا۔
''اب تمہیں کیا ہوا؟'' ساحل عمر نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔
''یار میں سچ کہہ رہا ہوں ایک لمحے کو ایسا محسوس ہوا جیسے بچھو نے اپنا سر ہلایا ہو۔''
''لیکن بچھو تو اپنی جگہ جوں کا توں موجود ہے۔'' ساحل نے تصویر پر نظر جماتے ہوئے کہا۔
''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔'' مسعود آفاقی نے تصویر کے نزدیک جاتے ہوئے کہا۔
''لیکن جو میں نے دیکھا وہ بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ تم جانتے ہو میں فوٹو گرافر ہوں۔ میری نظریں بہت تیز ہیں۔''
''خدا کے واسطے مسعود مجھے الجھاؤ مت۔'' ساحل عمر نے احتجاج کیا۔
''تمہیں الجھا نہیں رہا میں خود الجھ گیا ہوں۔'' مسعود کی نظریں تصویر پر تھیں۔ ''ساحل یار تم نے کمال کیا ہے۔ یہ بچھو اس قدر شاندار بنایا ہے کہ ہر لمحہ یوں لگتا ہے جیسے اب حرکت میں آ جائے گا۔ یہ تم نے کسی ریفرنس سے بنایا ہے؟''
''ہاں' ایک انگلش رسالے میں چھپی ہوئی تصویر سے بنایا ہے۔'' ساحل نے کہا۔ ''ذرا وہ ریفرنس دکھاؤ۔'' مسعود بولا۔
''آؤ' اسٹوڈیو میں آ جاؤ' وہیں پڑا ہے وہ ریفرنس'' یہ کہہ کر ساحل عمر نے اپنی پینٹنگ اٹھا لی اور وہ دونوں اسٹوڈیو میں داخل ہو گئے۔ مسعود ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور ساحل ریفرنس ڈھونڈنے لگا۔ جب دو چار منٹ تک ساحل کو ریفرنس نہیں ملا تو مسعود نے پوچھا۔ ''نہیں مل رہا؟''
''یار ابھی تک تو میرے سامنے ہی پڑا تھا۔ پتہ نہیں کدھر گم ہو گیا۔''
''چلو چھوڑو۔'' مسعود نے بے نیازی سے کہا۔
''ایک منٹ۔'' ساحل عمر کو جیسے کچھ خیال آیا۔ وہ اٹھ کر ٹیلیفون کے نزدیک پہنچا۔ ٹیلیفون انگلش کے دو موٹے رسالوں پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے ٹیلیفون اٹھا کر فرش پر رکھا اور ایک موٹا رسالہ اٹھا

کر اس کے ورقوں میں ریفرنس تلاش کرنے لگا۔ وہ ریفرنس اس رسالے میں رکھا نظر آ گیا۔

''مل گیا۔'' ساحل عمر نے رسالے سے ریفرنس نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو۔''

مسعود نے وہ ریفرنس اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے بغور دیکھنے لگا۔ ایک ہاتھ تھا' ہاتھ پر وہ بچھو تھا اور پس منظر میں ناریل کے درخت تھے اور کچھ گول جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ یہ ہاتھ زنانہ تھا اور کسی افریقن عورت کا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ عورت اس بچھو کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر کسی کو دکھا رہی ہو۔ ہاتھ کیونکہ قریب تھا اس لئے وہ بچھو بہت واضح تھا۔

''فوٹوگرافی کے اعتبار سے یہ ایک بہت اچھا ایکسپوژر ہے لیکن تمہارے بچھو میں جو جان ہے وہ اس میں نہیں ہے۔'' مسعود نے اس کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور اس لڑکی کا ریفرنس کہاں ہے۔

''یہ لڑکی میں نے کئی ریفرنس دیکھ کر بنائی ہے۔ کہیں سے آنکھیں لی ہیں کہیں سے ہونٹ لئے ہیں کہیں سے ناک لی ہے اور کچھ میں نے اپنے خوابوں سے لیا ہے۔'' ساحل عمر نے انکشاف کیا۔

''خوابوں سے!'' مسعود نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں' میں نے اس لڑکی کو اپنے خوابوں میں کئی بار دیکھا ہے۔ اس تصویر میں تو اس کے حسن کا پچاس فیصد بھی عکس نہیں۔ وہ لڑکی مجھے کسی پہاڑی علاقے میں نظر آتی ہے۔ صاف آسمان' برف پوش پہاڑیاں' سبزی مائل پانی اور وہ لڑکی۔''

''وہ لڑکی جہاں نظر آتی ہے کیا وہ علاقہ تمہیں دیکھا ہوا لگتا ہے؟'' مسعود نے پوچھا۔

''نہیں' اس طرح کے علاقے میں میں آج تک نہیں گیا۔'' ساحل نے بتایا۔

''ایک بات میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی۔ یہ اتنی پیاری سی لڑکی کی پیشانی پر بچھو بٹھانے کی آخر تمہیں کیا سوجھی؟'' مسعود نے سوال کیا۔

''مسعود آفاقی' یہ تخلیق کا معاملہ ہے۔ یہ بٹن دبانے والوں کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آتا۔''

''اچھا۔'' مسعود آفاقی نے اس کے طنز کا برا نہیں مانا۔ وہ ہنس کر بولا۔ ''یار مجھے تو تو کوئی اہرام مصر کی بھٹکی ہوئی روح لگتا ہے اس طرح کا کام وہی کر سکتی ہے۔''

اس کی یہ بات سن کر ساحل عمر نے زوردار قہقہہ لگایا۔ مسعود بھی اس کے قہقہے میں شامل ہو گیا۔

''اچھا بھائی میں اب چلتا ہوں۔ اس ہفتے کی ملاقات ناصر مرزا کے یہاں ہے نا۔'' مسعود نے تصدیق چاہی۔

''ہاں بالکل۔'' ساحل عمر نے تصدیق کی۔

''شہزادے' میں تمہاری اس پینٹنگ کو ایکسپوز کرنا چاہتا ہوں۔'' مسعود نے پینٹنگ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شوق سے جب چاہے کرلو۔'' ساحل عمر نے خوشدلی سے کہا۔

مسعود کے جانے کے بعد اس نے اسٹوڈیو والے کمرے کو لاک کیا اور اپنے بیڈ روم میں جا کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر میں ہی اسے نیند نے آ لیا۔

''وہ نہ جانے کب تک سوتا رہا کہ اماں نے اسے آ کر جگا دیا۔'' ساحل اٹھو آخر کب تک سوؤ گے۔''

''اماں کیا وقت ہوا ہے؟'' ساحل نے پوچھا۔

''آٹھ بج رہے ہیں رات کے۔'' اماں نے بتایا۔

''ہیں' اتنی دیر ہو گئی مجھے سوتے ہوئے۔''

''تو اور کیا؟'' اماں نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی آیا ہے تم سے ملنے۔''

''کون ہے؟'' ساحل عمر نے بیڈ چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی بالکل نیا بندہ ہے' اس سے پہلے نہیں دیکھا۔'' اماں نے بتایا۔

''اماں تم نے اسے بتایا نہیں کہ میں سو رہا ہوں۔''

''بتا دیا تھا لیکن وہ واپس گیا ہی نہیں' کہنے لگا میں ان کے جاگنے کا انتظار کروں گا۔ جب وہ جاگ جائیں تو آ کر بتا دیجئے گا۔ میں یہیں دروازے پر کھڑا ہوں۔ مجھے بہت ضروری کام ہے۔ میں ان سے ملے بغیر نہیں جا سکتا۔ تب میں نے سوچا کہ یہ دروازے پر کہاں کھڑا رہے گا۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم کھول کر بٹھا دیا۔ وہ دو گھنٹے سے تمہارا منتظر ہے اور تم ہو کہ سوئے چلے جا رہے تھے۔ مجبوراً مجھے آ کر تمہیں اٹھانا پڑا۔ کسی مہمان کو اس قدر انتظار کرانا کوئی اچھی بات تھوڑی ہی ہے۔ کیوں ساحل؟'' اماں نے ساحل سے تائید چاہی۔

''اماں...... آپ بالکل صحیح فرما رہی ہیں۔'' ساحل کے پاس تائید کئے بنا کوئی چارہ نہ تھا ''میں فریش ہو کر آتا ہوں۔ مہمان کیلئے چائے وغیرہ بنوا دیں۔''

''ٹھیک ہے تم منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔'' اماں نے خوش ہو کر کہا۔

ساحل عمر جب فریش ہو کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ شخص اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک درمیانے قد کا گٹھے ہوئے جسم کا مالک شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیض اور شیشے لگی کوٹی پہنی ہوئی تھی۔ سر پر ایک مخصوص ٹوپی تھی جس پر ایک پر لگا ہوا تھا۔ وہ شخص ایک نظر میں شمالی علاقہ جات کا رہنے والا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک پروقار سنجیدگی تھی۔

''معاف کیجئے گا۔ آپ کو میرا خاصا انتظار کرنا پڑا۔ میں شرمندہ ہوں۔'' ساحل عمر نے معذرت چاہی۔

''اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔'' اس شخص نے دو قدم آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ بڑا مضبوط اور بھاری تھا۔ ''میں تو ان خاتون کا بڑا احساس مند ہوں کہ انہوں نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا لیا ورنہ اگر مجھے پوری رات باہر کھڑے ہو کر انتظار کرنا پڑتا تو کرتا۔''

''ایسا' آپ کو مجھ سے کیا کام آ پڑا۔ میں ایک معمولی آرٹسٹ ہوں۔ کوئی سرکاری افسر

نہیں۔'' ساحل عمر نے ہنستے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''آپ تشریف رکھئے۔''

میز پر ایک درمیانے سائز کا چرمی بیگ رکھا تھا اس نے اس کی زپ کھول کر ایک سفید رنگ کا بڑا لفافہ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کیلئے ایک تصویر لایا ہوں۔ یہ تصویر آپ کو پینٹ کرنا ہو گی۔''

ساحل عمر کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ وہ کوئی کمرشل آرٹسٹ نہ تھا۔ اس کا پیشہ بھی آرٹ نہ تھا۔ تصویر بنانا اس کا شوق تھا۔ وہ اپنی مرضی سے تصویریں بناتا تھا اور یہ شخص اس سے فرمائشی تصویر بنوانے آ پہنچا تھا۔ ایک اجنبی شخص اور کہتا تھا کہ یہ تصویر آپ کو بنانا ہو گی۔

ساحل عمر نے وہ لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور انکار کرنے سے پہلے اس نے سوچا کہ ایک نظر اس تصویر کو دیکھ لے تاکہ یہ تو معلوم ہو سکے کہ وہ اس سے کیا بنوانے کا خواہش مند ہے۔

جب ساحل عمر نے وہ تصویر لفافے سے نکالی تو اس تصویر کو دیکھ کر ایک لمحے کو اسے سانپ سونگھ گیا۔

ایک خوف سا اس پر طاری ہو گیا۔ اس تصویر نے ایک لمحے میں ہزاروں منظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزار دیئے۔ اسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ اپنے سینکڑوں خواب اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔

اسے وہ چیتے نما بلی یاد آ گئی جو اسے دیکھتے ہی اس کے پیروں سے لپٹنے لگتی تھی۔ وہ بلی آج بھی اسے خوابوں میں جست لگاتی دکھائی دے جاتی تھی لیکن اب اس کا سائز بدل چکا تھا۔ اب وہ ایک مکمل چیتا بن چکی تھی اور یہ چیتا اکثر اسے خواب میں دکھائی دیتا تھا۔ بہت تیز دوڑتا ہوا جیسے کسی کا تعاقب کر رہا ہو۔

یہ شخص جس چیز کی تصویر بنوانے آیا تھا وہی تھا۔ جنگل میں ایک چیتا کھڑا ہوا تھا اس چیتے کی نظریں تصویر اتارنے والے کی طرف تھیں۔ یہ ایک دس بارہ سائز کی تصویر تھی۔ جس فوٹو گرافر نے بھی اتاری تھی خوب اتاری تھی۔ ساحل عمر نے جیسے ہی چیتے کی آنکھوں میں دیکھا ''میاؤں میاؤں'' کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں چند لمحوں کو سنائی دیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اپنی پہچان کرائی ہو۔ وہ تو اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔

''جی ساحل عمر صاحب؟'' اس شخص نے بڑے مودبانہ انداز میں اسے متوجہ کیا۔

''جی جناب۔'' ساحل عمر نے تصویر سے نظریں ہٹا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''فرمایئے۔''

''اس تصویر کو آپ کتنے دن میں بنا لیں گے؟'' اس نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' ساحل عمر نے اسے غور سے دیکھا وہ بھی اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی کہ ساحل عمر زیادہ دیر اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ وہ مسکرا دیا۔

''میرا نام بازغر ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''بازغر...... کیسا انوکھا نام ہے؟'' ساحل عمر نے کہا۔

''بالکل آپ کی بنائی ہوئی تصویروں کی طرح۔'' بازغر مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی تھی۔

''کیا آپ نے میری کوئی تصویر دیکھی ہے؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

"ساحل صاحب میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ یہ تصویر کتنے دن میں بنالیں گے۔"
اس نے ساحل کا سوال سنا ان سنا کر دیا۔

"بازغر صاحب آپ نے یہ بات کیسے طے کر لی کہ میں اس تصویر کو بنانے سے انکار نہیں کروں گا۔" ساحل عمر نے پوچھا "میں کمرشل آرٹسٹ ہوں نہ پیشہ ور پینٹر...... کیا آپ یہ بات جانتے ہیں؟"

"میں سب جانتا ہوں بازغر نے بڑی بے نیازی سے کہا۔" میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اس تصویر کو پینٹ کرنے سے انکار نہیں کریں گے۔"

"کیوں آخر...... ایسی کیا خاص بات ہے اس میں۔"

"یہ کیا ہے اس میں کیا انوکھی بات ہے یہ تو آپ خود بھی جان گئے ہوں گے۔ اگر آپ اس تصویر کو پینٹ کرنے سے انکار کر سکتے ہیں تو کر کے دکھایئے۔" اس نے چیلنج کیا۔

یہ ایک انتہائی اشتعال انگیز بات تھی لیکن اس نے یہ بات اتنے دھیمے لہجے میں اتنے مہذبانہ انداز میں کہی کہ اس کے لہجے پر غصہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ساحل عمر ایک انتہائی نازک مزاج آرٹسٹ تھا۔ ایسی بات کسی اور نے کہی ہوتی تو وہ اب تک اس تصویر کے چار ٹکڑے کر کے اس کے ہاتھ میں تھما چکا ہوتا۔ اس کے اس چیلنج پر ساحل عمر نے چاہا کہ وہ انکار کر دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے تصویر کو دیکھتے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اسے ضرور پینٹ کرے گا اور یہ اس نے کیوں طے کر لیا تھا اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

"میں انکار نہیں کر سکتا۔ میں انکار کیوں کروں؟ مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ میں جن تصویروں کو بنانا پسند کرتا ہوں یہ ان میں سے ایک ہے" ساحل عمر نے بڑی سادگی سے کہا۔

"شکریہ، ساحل عمر۔ آپ بہت عظیم آرٹسٹ ہیں۔ میں اپنے گستاخ جملے کی معافی چاہتا ہوں۔" بازغر نے بڑے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں مسٹر بازغر۔" ساحل عمر نے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے میں آپ کے چیلنج کی وجہ اب تک نہیں سمجھ سکا۔"

"ساحل عمر صاحب یہ ایک عجیب وغریب چیتا ہے۔" بازغر نے اس کا سوال پھر نظر انداز کر دیا۔ "بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ اس کا نام تھکال ہے۔"

"تھکال...... !بڑا پراسرار نام ہے۔" ساحل عمر نے حیران ہو کر کہا۔

بازغر نے جواب میں کچھ نہ کہا وہ چند لمحے خاموش رہا۔ اس کی نظریں ڈرائنگ روم کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ کھیلی۔ اس نے ساحل عمر کی طرف اپنا چہرہ گھمایا اور بولا "کیا میں آپ کا اسٹوڈیو دیکھ سکتا ہوں۔"

فوراً ہی ساحل عمر کی زبان پر لفظ "نہیں" آیا۔ اس کے اسٹوڈیو میں آج تک کوئی اجنبی آدمی داخل نہیں ہوا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ بازغر اس کے اسٹوڈیو میں داخل ہو لیکن وہ لفظ "نہیں" کو

زبان سے ادا نہیں کر پایا۔ اس نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ ''جناب! مجھے بہت خوشی ہو گی آپ کو اپنا اسٹوڈیو دکھا کر۔'' اسے اپنے اس جملے پر اپنے اس لہجے پر بڑی حیرت ہوئی کیونکہ یہ انداز ساحل کے لئے بالکل اجنبی تھا۔

وہ بازغر کو اپنے ساتھ لے کر اٹھا۔ اس کا اسٹوڈیو لاک تھا۔ اس نے اپنا کمرہ کھولا۔ اندر جا کر لائٹ جلائی اور بازغر کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ''آیئے۔''

''اوہ..... شکریہ' ساحل عمر آپ بڑے مہربان شخص ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے آج تک کسی اجنبی شخص کی اتنی پذیرائی نہ کی ہو گی۔'' بازغر اسٹول پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنا چرمی بیگ گود میں رکھ لیا۔

چیتے کی تصویر والا لفافہ ساحل عمر کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے وہ لفافہ ایک رسالے کے درمیان رکھ دیا۔ پھر بازغر سے مخاطب ہوا۔ ''مسٹر بازغر یہ تصویر آپ کو کب چاہئے اور اس کا سائز کیا ہو گا۔''

''یہ دونوں باتیں میں نے آپ پر چھوڑ دیں۔ خود فیصلہ کیجئے۔'' بازغر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ جب چاہیں بنا دیں۔''

''میں اس تصویر کو کافی بڑے سائز میں بناؤں گا۔ ہو سکتا ہے لائف سائز میں بناؤں۔ تقریباً ایک ماہ لگے گا۔ جلدی بھی بنا سکتا ہوں لیکن میں اس تصویر کو پورے سکون سے بنانا چاہتا ہوں۔'' ساحل عمر نے بتایا۔

''ٹھیک ہے جب تصویر بن جائے تو مجھے فون پر اطلاع کر دیجئے گا میں آ کر لے جاؤں گا۔ میرا فون نمبر لکھ لیجئے۔''

بازغر نے جو نمبر بولا وہ ساحل عمر نے ایک پنسل سے رسالے پر نوٹ کر لیا۔

''یہ آپ کا کوئی نیا شاہکار ہے؟'' بازغر نے بورڈ پر لگی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا جو ایک اخباری کاغذ سے ڈھکی ہوئی تھی۔

''جی میری بالکل نئی تصویر ہے میں نے اسے کل ہی مکمل کیا ہے؟'' ساحل عمر نے بتایا۔

''اوہ کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔'' بازغر نے بڑے مودبانہ انداز میں پوچھا۔

''جی ضرور۔'' یہ کہہ کر ساحل عمر بورڈ کے نزدیک آیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس پر لگا کاغذ الگ کر دیا۔

بازغر اس تصویر کو دیکھتے ہی چونک اٹھا ایک دم اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ غصے سے بولا۔ ''تو یہاں تک پہنچ گیا۔ تیری یہ جرات ہو گئی کہ تو رشاملوک کی پیشانی کا ٹیکہ بن گیا۔ ٹھہر میں ابھی تجھے بتاتا ہوں۔''

ساحل عمر ابھی سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ بازغر کو تصویر دیکھ کر اچانک کیا ہو گیا ہے کہ ایک دم اس کی نظروں کے سامنے منظر بدلا۔ بازغر جو چند لمحوں پہلے بڑے سکون سے بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ یکلخت اسٹول سے اٹھ کر تصویر کی طرف جھپٹا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس بچھو کو اپنے ہاتھ میں

پکڑنا چاہا۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہیں آپ' یہ اصلی بچھو نہیں ہے۔'' ساحل عمر نے اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہی لیکن ہوا یہ کہ بجائے بازغر کی غلط فہمی دور ہونے کے خود اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ اس کی نگاہوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ بازغر کے جھپٹتے ہی وہ بچھو بڑی تیزی سے پلٹ کر بھاگا اور بورڈ کے پیچھے جا کر کہیں گم ہو گیا۔ تصویر کی پیشانی پر اب محض اس کا نشان باقی رہ گیا تھا۔ جیسے کسی نے اس بچھو کو بڑی صفائی سے نوچ کر پھینک دیا ہو۔

اسے فوراً نثار فاروقی کا خیال آیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اور ان کی بیٹی نے جو دیکھا وہ ٹھیک تھا۔ اس نے خواہ مخواہ انہیں جھوٹا سمجھا اور ان کے بارے میں الٹی سیدھی رائے قائم کر لی۔

بازغر بچھو کے بورڈ کے پیچھے جاتے ہی خود بھی بورڈ کے پیچھے پہنچ گیا وہ بڑی تیزی سے اس بچھو کو تلاش کر رہا تھا لیکن اب بچھو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ساحل عمر نے اس بچھو کو پلٹ کر تصویر کے پیچھے جاتے دیکھا تھا۔ اسے بورڈ کے پیچھے ہونا چاہیے تھا لیکن وہ وہاں نہ تھا۔ دونوں نے مل کر پورا کمرہ چھان مارا اور وہ کہیں نہیں تھا۔

بازغر کی حالت دیکھنے والی تھی۔ اس کی آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ ساتھ ہی کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ وہ کچھ ایسے جملے بول رہا تھا۔ ساحل عمر جن کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ بازغر جو بڑے شوق سے اس کا اسٹوڈیو دیکھنے آیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد زیادہ دیر نہیں رکا۔ وہ اپنا چرمی بیگ اٹھا کر بڑی تیزی سے گھر سے نکل گیا۔ ساحل عمر اسے چھوڑنے گھر کے گیٹ تک آیا لیکن جب تک ساحل عمر گیٹ تک پہنچا وہ گیٹ سے باہر جا چکا تھا۔

ساحل عمر گیٹ بند کر کے واپس اپنے اسٹوڈیو میں آیا اور تصویر دیکھ کر پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ بچھو اس دلہن کی پیشانی پر ٹیکہ بنا جوں کا توں موجود تھا۔ بالکل تصویر کی طرح۔ ساحل عمر نے ڈرتے ڈرتے اسے چھو کر دیکھا۔ اس میں کوئی جنبش نہ ہوئی لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ساحل عمر نے جو کچھ دیکھا تھا وہ کیا تھا؟

اس بچھو کو دیکھتے ہی بازغر کیوں غضبناک ہو کر اس پر جھپٹا تھا۔ اس نے ایک عجیب سا نام لیا جو اس وقت اس کے ذہن سے اتر گیا تھا۔ یہ لڑکی تو ایک طرح سے اس کی تخلیق ہے۔ کسی کی آنکھیں' کسی کی ناک اور کسی کے ہونٹ۔ یہ تو کوئی لڑکی نہیں۔ جب یہ کوئی لڑکی نہیں تو پھر اس کا کوئی نام کیسے ہو سکتا ہے۔

اور اس نے یہ مصیبت کیا پال لی ہے۔ اس بچھو میں اچانک جان کیسے پڑ جاتی ہے۔ یہ کہاں غائب ہو جاتا ہے اور پھر اپنی جگہ واپس کیوں آ جاتا ہے۔ بازغر کی اس سے کیا دشمنی ہے یہ بچھو کیا چیز ہے ساحل عمر جوں جوں سوچتا جا رہا تھا الجھتا جا رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت اسے اپنی گرفت میں لینے کے لئے کوشاں ہے۔ ایک عجیب پر اسرار سا چکر شروع ہو گیا تھا۔

''کیا ہوا بیٹا...... خیر تو ہے؟'' اماں اسے اسٹوڈیو میں پریشان حال بیٹھا دیکھ کر دروازے پر

آ کھڑی ہوئیں۔
"کچھ نہیں اماں۔"
"کون تھا یہ؟"
"وہ اماں ایک تصویر بنوانے آیا تھا۔"
"کس کی تصویر؟" انہوں نے پوچھا۔
ساحل عمر نے رسالے سے لفافہ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ اماں نے لفافہ کھول کر تصویر باہر نکالی اور اسے دیکھتے ہی چونک گئیں۔
"ہیں یہ تو وہی بلی ہے جو بچپن میں تم پر عاشق ہوگئی تھی۔"
"اماں چشمہ لگا کر دیکھیں۔ یہ بلی نہیں چیتا ہے...... چیتا۔" ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔
"اتنی اندھی نہیں ہوں نظر آ رہا ہے مجھے یہ چیتا ہے۔ اسے اگر چھوٹا کر دو گے تو یہ وہی بلی بن جائے گا۔" اماں نے بڑے یقین سے کہا۔
"ہاں اماں تم نے صحیح پہچانا...... میں نے بھی اسے ایک نظر دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔" ساحل عمر نے کہا۔

اب اس بات میں کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ یہ چیتا اس بلی کا "انلارجمنٹ" تھا۔ اس چیتے کو ساحل عمر جانے کتنی مرتبہ خواب میں چھلانگیں مارتا دیکھ چکا تھا۔ اس چیتے کی تصویر میں بڑی دلکشی تھی۔ کوئی ایسی بات تھی کہ آدمی دوبارہ اسے نظر بھر کر دیکھنا چاہتا تھا اور پھر دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔

ساحل عمر سوچ رہا تھا کہ اس چیتے کو وہ کس طرح بنائے۔ اس کے پس منظر میں جنگل تھا۔ کیا وہ جنگل کو اسی طرح رہنے دے یا پیچھے سے جنگل ہٹا کر چیتے کو کسی پہاڑی پر کھڑا کر دے اور پیچھے بہت دور برف پوش پہاڑ دکھا دے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اسے اس تصویر کا پس منظر بدلنے کا کیا حق ہے۔ بازغر اسے جو تصویر دے گیا ہے اسے وہی بنانا ہوگی یا پھر اس سے اجازت لینا ہوگی۔ بہت غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ تصویر کو جیسی ہے ویسا ہی بنا دینا چاہیے۔ البتہ سائز اتنا بڑا رکھا جائے کہ اسے جو دیکھے وہ اسے جیتا جاگتا محسوس کرے۔

کھانا کھا کر اس کا جی چاہا کہ وہ گھر سے باہر نکلے۔ یوں وہ چہل قدمی کا باقاعدہ عادی نہ تھا لیکن کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ کچھ دور ٹہل آئے اماں کو بتا کر وہ باہر نکلا اور چورنگی کی طرف چل دیا۔ چورنگی اس کے گھر سے خاصے فاصلے پر تھی۔ اتنے فاصلے پر کہ بندے کی ٹھیک ٹھاک واک ہو جائے۔ چورنگی پر پان بھی اچھا ملتا تھا وہ چورنگی کی طرف جاتا تو پان ضرور کھاتا تھا۔ ایک پان اماں کے لئے بندھوا لاتا۔ اماں پان کھانے کی عادی نہ تھیں لیکن ساحل عمر کا لایا ہوا پان ضرور کھا لیا کرتی تھیں۔ یہ تو خیر پان تھا اگر ساحل عمر انہیں زہر بھی کھانے کو دیتا تو وہ خوشی سے کھا لیتیں۔

ساحل عمر نے گھر سے نکلتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس خاص وقت میں ابھی خاصا وقت تھا وہ آرام سے چہل قدمی کر کے واپس آ سکتا تھا اس لڑکی کا خیال آتے ہی وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ پتہ نہیں کون ہے یہ لڑکی۔ جو کسی گرہ کی طرح بڑی مشکل سے کھلی تھی۔ ایک طویل عرصے

کے بعد اس نے لب کھولے بلکہ بقول اس کے زبان کھولی تھی۔ اس نے اس کی سالگرہ کا دن کیسے معلوم کر لیا۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی بہر حال اچھی باتیں کرتی تھی ساحل عمر کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ اس کے سامنے آئے۔

وہ تو خیر اس کے سامنے نہ آئی لیکن بازغر اسکے سامنے ضرور آ گیا وہ سڑک پر لگے ایک بڑے سے درخت کے موٹے سے تنے کے پیچھے سے اچانک اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اس طرح اچانک اسے اپنے سامنے دیکھ کر ساحل عمر ایک لمحے کو خوفزدہ ہو گیا۔

''آپ مسٹر بازغر۔'' ساحل عمر نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''ساحل صاحب پریشان نہ ہوں میں کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔''

''میرا انتظار؟'' ساحل عمر حیران ہوا۔

''جی آپ کا'' اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''تو آپ میرے گھر آ جاتے۔ آپ اس وقت بھی بڑی عجلت میں گھر سے نکل آئے تھے۔ میں پیچھے پیچھے گیٹ تک آیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''ساحل صاحب...... میں اس تصویر کو خریدنا چاہتا ہوں۔'' بازغر نے اچانک موضوع بدل دیا۔ وہ کچھ اسی طرح کی گفتگو کرنے کا عادی تھا کہ کسی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے بڑی خوبصورتی سے گول کر جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے یہی کیا۔ گھر آنے کے بارے میں کوئی جواب دینے کے بجائے اس نے ایک نیا ہی مسئلہ کھڑا کر دیا۔

''کون سی تصویر؟'' ساحل عمر نے ایسے ہی سوال کیا۔

''اعور اور رشاملوک کی تصویر۔'' بازغر نے الجھی ہوئی بات کی۔

''اس طرح کی تو کوئی تصویر میرے پاس نہیں ہے۔'' ساحل عمر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''بچھو اور لڑکی کی تصویر۔'' بازغر نے آسان زبان میں بات کی۔

''اچھا وہ پینٹنگ۔'' ساحل عمر نے تفہیمی لہجے میں کہا۔

''جو معاوضہ کہو گے ادا کروں گا مگر تمہیں وہ تصویر میری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچانا ہو گی؟''

''ایک کروڑ دے سکو گے۔'' ساحل عمر نے ایسے ہی مذاق میں کہا۔

''ایک کروڑ کم ہیں کچھ اور آگے بڑھو۔'' بازغر نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہیں، کیا واقعی آپ سنجیدہ ہیں۔'' ساحل عمر کی حیرت قابل دید تھی۔

''یہ بات کرنے کے لیے میں ایک گھنٹے سے یہاں کھڑا ہوں۔'' بازغر بولا۔

''اس تصویر میں ایسی کیا بات ہے جو آپ اس پر اتنی رقم خرچ کر دینا چاہتے ہیں۔''

''وہ اعور کا بچہ ہماری رشاملوک کی مانگ کا ٹیکہ بن جانا چاہتا ہے۔'' پھر وہی الجھی ہوئی گفتگو۔

''معاف کیجئے گا۔ میں آپ کی بات بالکل نہیں سمجھا۔''

''سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔'' اس نے ملائم لہجے میں کہا۔

"لیکن میں سمجھنا چاہتا ہوں آپ نے اس پینٹنگ کی اس قدر قیمت لگائی ہے تو اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ ضرور ہوگی۔"

"وجہ میں نے بتا دی۔"

"جو میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"میں یہاں کچھ اور سوچ کر آیا تھا لیکن ہو کچھ اور گیا۔" بازغر نے ایک مرتبہ پھر خوبصورتی سے موضوع بدل دیا۔

"مسٹر بازغر آپ کوئی معمہ وغیرہ تو نہیں نکالتے" بالآخر ساحل عمر کو کہنا پڑا۔

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوا۔

"جو بات کرتے ہیں وہ کسی معمے سے کم نہیں ہوتی۔" ساحل عمر ہنسا۔

"ساحل عمر صاحب میں پینٹنگ کے بارے میں آپ کا جواب سننا چاہتا ہوں۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"اس پینٹنگ کے بارے میں میں مصمم ارادہ کر چکا ہوں کہ کسی کو فروخت نہیں کروں گا۔ چاہے کوئی مجھے اس کا معاوضہ ایک کروڑ سے زیادہ ہی کیوں نہ دے۔" ساحل عمر نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"آپ نہیں جانتے کہ آپ کس مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہیں۔" بازغر نے ڈرایا۔

"مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ میں اپنے فیصلے اتنی آسانی سے نہیں بدلا کرتا۔"

"اوہ...... میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔" بازغر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "آپ نے انکار کر کے اچھا نہیں کیا۔ آپ نہیں جانتے کہ طاغوتی قوتیں آپکے گرد کیسا جال بن رہی ہیں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ جب آپ تہکال کی پینٹنگ بنالیں تو مجھے فون کر دیجئے گا۔ میں آ کر لے جاؤں گا اور منہ مانگا معاوضہ دے جاؤں گا۔ سب کا آقا آپکو خوش رکھے۔" یہ کہہ کر وہ درخت کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ساحل عمر کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ ساحل عمر اپنے رستے پر چل دیا۔ تھوڑا آگے جا کر جب اس نے درخت کی طرف دیکھا تو اسے بازغر نظر نہیں آیا۔ اتنی جلدی وہ کہاں گم ہو گیا۔ اس نے رک کر ادھر ادھر نظر دوڑائی تو وہ اسے سامنے چھوٹی سڑک پر کافی فاصلے پر تیز تیز قدموں سے جاتا نظر آیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس نے اتنا فاصلہ چند سیکنڈوں میں کیسے طے کر لیا۔

ساحل عمر پان کھا کر اور ایک پان لے کر گھر واپس آیا تو خاصا الجھا ہوا تھا۔ بازغر اسے اچھا خاصا پریشان کر گیا تھا۔ بچھو کی طرف اس کا جھپٹنا اور بچھو کا ایک دم تصویر کے پیچھے چلے جانا اور اس کے جانے کے بعد پھر اپنی جگہ پر واپس آ جانا اور بازغر کا گھر سے باہر اس کا انتظار کرنا۔ اس تصویر میں اس کی غیر معمولی دلچسپی اور غیر معمولی معاوضے کی پیشکش۔ یہ ساری باتیں اس کی الجھن میں اضافہ کر رہی تھیں۔

وہ اپنے اسٹوڈیو میں ایک اسٹول پر آ کر بیٹھ گیا۔ ٹیلیفون اٹھا کر اس نے اپنی گود میں لیا اور مسعود آفاقی کا نمبر ملانے لگا۔

دوسری گھنٹی پر ٹیلیفون اٹھا لیا گیا ادھر سے مسعود کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔"

''یار مسعود وہ نثار فاروقی ٹھیک کہہ رہے تھے۔'' ساحل عمر نے بات شروع کی۔
''میں سمجھا نہیں۔'' مسعود نے کہا۔
جواب میں ساحل عمر نے بازغر کی آمد سے لیکر اس کے جانے تک ساری روداد سنا دی۔
''تم نے خواہ مخواہ ان پر شک کیا۔'' مسعود نے ساری داستان سن کر کہا۔
''وہ بات ہی انہوں نے کچھ ایسی کہی کہ اس پر یقین آنا مشکل تھا ہاں اگر میں خود اپنی آنکھ سے بچھو کو پیچھے جاتے ہوئے نہ دیکھ لیتا تو اب بھی یقین نہ کرتا۔'' اس نے وضاحت کی۔
''اب تو یقین آ گیا کہ نثار فاروقی نے جو کچھ بتایا سچ بتایا تھا۔'' مسعود نے کہا ''شہزادے تم نے اس تصویر کو بیچ کیوں نہیں دیا۔ اتنے اچھے پیسے اب کون دے گا۔''
''مجھے یہ تصویر اب فروخت نہیں کرنی۔'' ساحل عمر نے دوٹوک انداز میں کہا۔
''یار' اس تصویر کا گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں۔ کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔'' مسعود آفاقی نے اندیشہ ظاہر کیا۔
''یہ بات میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ اس تصویر میں کوئی اسرار ضرور ہے۔ انجانے میں مجھ سے کوئی انوکھا کام ہو گیا ہے لیکن میں ڈرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں بچپن سے ہی اس طرح کی باتوں کا عادی ہوں۔ وہ چیتے کی شکل والی بلی پورا چیتا بن کر پہلے خوابوں میں نظر آئی تھی اب بازغر اس کی تصویر بنانے کو دے گیا ہے۔ یار اس تصویر میں بڑی کشش ہے۔ میں اسے ضرور بناؤں گا۔ ساحل عمر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔
''بچپن والی بلی بڑی ہو کر چیتا بن کر تمہارے پاس پہنچ گئی۔ خوابوں والی کو تم نے خود ہی پینٹ کر لیا۔ اب وہ لمبی زبان والی رہ گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کہیں راستے میں ہی ہو گی۔ پہنچا ہی چاہتی ہے۔'' مسعود آفاقی نے اسے یاد دلایا۔
''او...... یار معاف کر دو کس کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اس کا خیال آتے ہی جسم کا رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے۔'' ساحل ایک جھرجھری لے کر بولا۔
''کیا تم نے ناصر مرزا سے بات کی۔'' مسعود نے پوچھا۔
''نہیں تو۔''
''یار ناصر سے بات کر لو وہ ان معاملات کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہے۔''
''اب فون پر کیا بات کروں اس کے گھر تو جانا ہی ہے وہیں اطمینان سے بات کریں گے؟''
''چلو ٹھیک ہے' بہر حال اپنا خیال رکھو' اماں سے کہنا کہ وہ تم پر پڑھ کر پھونک دیں۔''
''وہ پہلے ہی مجھ پر کیا کم جھاڑ پھونک رکھتی ہیں۔ اگر میں نے ان کو کچھ بتا دیا تو وہ ہر وقت پھونکیں مارتی' میرے پیچھے گھومیں گی۔''
''یار اماں تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی جان تمہارے اندر ہے۔''

"اس میں کوئی شبہ نہیں۔" ساحل عمر نے تائید کی۔ "آج کل وہ میری شادی کے چکر میں ہیں۔ روز پیچھے پڑی رہتی ہیں۔"

"تو بھائی کر کیوں نہیں لیتے شادی۔" مسعود نے ہنس کر کہا۔

"میری بیوی ان کے لئے ملک الموت ثابت ہوگی۔" ساحل عمر نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"تمہارا مطلب ہے وہ انہیں پریشان کرے گی۔"

"او نہیں یار' بڑی بی میری شادی کے انتظار میں ہیں۔ میری شادی ہوتے ہی یہ چل بسیں گی۔" ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ محض تمہارا خیال ہے میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری شادی ہونے کے بعد وہ بچے کا انتظار شروع کر دیں گی۔" مسعود آفاقی نے ہنس کر کہا۔ "ویسے یار تم شادی کرتے کیوں نہیں ہو۔"

"لڑکی کہاں ہے؟"

"تمہارے لئے لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ کہو تو کوئی ماڈل گرل تمہاری طرف بھیج دوں؟"

"شادی کے لیے مجھے انوکھی لڑکی چاہیے۔"

"مثلاً جس کی آٹھ آنکھیں ہوں' آٹھ پاؤں ہوں' آٹھ سر ہوں' آٹھ گز کی زبان ہو۔"

"اب تم بہکنے لگے اچھا اللہ حافظ۔" ساحل عمر نے اس کا جواب سنے بغیر ہی ٹیلی فون بند کر دیا۔

ٹیلی فون بند کر کے اس نے اپنی گود سے اٹھا کر نیچے رکھا تو اچانک ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اس لمبی زبان والی کی شبیہ اس کے سامنے لہرا گئی۔

بچپن سے لڑکپن میں قدم رکھا تو ایک نئی مصیبت کو اپنے سامنے کھڑے پایا۔ بچپن میں ایک چھتے نمابلی نے اس کا پیچھا کیا۔ بمشکل اس سے جان چھوٹی۔ پھر جب وہ پندرہ سولہ سال کا ہوا تو ایک دن ایک نئی مصیبت نے اسے آ گھیرا۔

وہ ایک خاص دن تھا اس دن مکمل سورج گرہن پڑنے والا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا بارہ یا ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔ ساحل عمر مکمل سورج گرہن کے شوق میں گھر سے باہر نکل آیا اور برآمدے میں کھڑے ہو کر ایک کالا شیشہ آنکھ پر رکھ کر سورج گرہن کا نظارہ کرنے لگا۔

اسی وقت کچھ ہوا۔ ایک دم اس کے جسم میں جھٹکا سا لگا اس کے ہاتھ سے شیشہ چھوٹ گیا اور اس کا رخ بھی بدل گیا شیشہ برآمدے کے فرش پر گر کر کرچی کرچی ہو گیا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اچانک اس کو کیا ہوا۔ ایک دم اس کی نظر سامنے اٹھی تو اسے اپنے جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ سامنے آم کے درخت کے نیچے تھی ایک دم کالی بھجنگ لال انگارہ آنکھیں سفید چمکتے دانت اور ان دانتوں کے درمیان لٹکتی ہوئی ایک فٹ لمبی زبان۔ وہ بڑی تیزی سے کھڑی ہوئی اور اپنی سرخ زبان اندر باہر کر کے بانہیں پھیلائیں اور اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

ساحل عمر سورج گرہن دیکھنا بھول گیا وہ تیزی سے گھر کے اندر پہنچا اور اپنی ممی سے لپٹ

گیا۔ ممی نے ساحل عمر کی حالت دیکھی تو وہ پریشان ہو گئی۔ اس کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔ آنکھیں وحشت سے پھٹی تھیں اور پورا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

''کیا ہوا میری جان؟'' وہ پریشان ہو کر بولیں۔

''ممی...... وہ...... وہ......'' اس سے بولا نہ گیا تو اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا ہے وہاں؟ آؤ میرے ساتھ؟'' ممی اس کو اپنے ساتھ لگائے گھر سے باہر نکلیں۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر انہوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اس وقت سورج مکمل گرہن میں آ چکا تھا۔ ایکدم اندھیرا چھا گیا تھا۔

سورج گرہن کے اثرات سے بچنے کے لیے وہ اسے فوراً واپس گھر میں لے آئیں۔ اس کے بیڈروم میں آ کر ایئر کنڈیشنر کھول دیا اور اماں جو ساحل عمر کی حالت دیکھ کر پیچھے پیچھے آ گئی تھیں۔ انہیں ممی نے جوس لانے کو کہا۔ اس اثناء میں وہ ساحل عمر کو اپنے قریب کر کے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ جب جوس وغیرہ پی کر اس کی حالت سدھری تو ممی نے اس سے پوچھا۔

''بیٹا باہر تم نے کیا دیکھا تھا کہ اس قدر پریشان ہو گئے۔''

ساحل عمر نے سارا واقعہ من وعن سنا دیا۔ اس اثناء میں سور گرہن سے نکل آیا تھا۔ اب ہر سو روشنی پھیل چکی تھی۔ ممی' اماں کو لیکر باہر نکلیں۔ انہوں نے باہر لگا ہر درخت' ہر پتا چھان مارا لیکن زبان والی کا کہیں پتہ نہ لگا۔

بات آئی گئی ہو گئی چند دنوں کے بعد ساحل عمر سوتے میں ڈر گیا۔ آدھی رات کو اس کی چیخ سنائی دی۔ اس کے ممی پاپا دونوں اٹھ کر بھاگے۔ ساحل عمر سخت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے خواب میں لمبی زبان والی کو دیکھا تھا جو اس کے بیڈ کے نزدیک کھڑی تھی۔ لمبی زبان باہر کو لٹکی تھی اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چینی کا پیالہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک خنجر تھا۔ ساحل عمر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ لمبی زبان والی خنجر سے اس کے جسم میں زخم لگا کر اس خالی پیالے کو اس کے خون سے بھرنا چاہتی ہو۔

اس کے بعد وہ تواتر سے اسے نظر آنے لگی۔ کبھی خواب میں تو کبھی جاگتے میں۔ ایک ہاتھ میں چینی کا بڑا سا سفید پیالہ ہوتا اور ایک ہاتھ میں خنجر اور وہ اس کا خون نکالنے کے درپے ہوتی۔

ایک عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ مختلف عاملوں کو آزمایا گیا جھاڑ پھونک ہوئی۔ تعویذ گنڈے ہوئے۔ آٹھ نو مہینے کی کوششوں کے بعد کہیں جا کر اس لمبی زبان والی سے ساحل عمر کی جان چھوٹی۔

اس واقعہ کو گزرے ہوئے اگرچہ دس گیارہ سال ہو چکے تھے لیکن اب بھی جب کبھی اس کا خیال آ جاتا تو ساحل عمر کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے۔ کبھی کبھی اس کے دل میں خیال آتا کہ وہ اس منحوس شکل عورت کی تصویر بنائے لیکن ایسا سوچ کر ہی وہ کانپ اٹھتا۔ کوئی چیز اندر سے اسے منع کرتی۔ خبردار' اس کی تصویر ہرگز نہ بنانا ورنہ وہ گلے پڑ جائے گی۔

اس وقت بھی اس کے خیال نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس نے اپنی تازہ بنائی ہوئی تصویر پر ایک نظر ڈالی۔ وہ بچھو اپنی تمام تر خطرناکی کے ساتھ اس حسین دلہن کی پیشانی پر موجود تھا۔ ساحل عمر نے کمرے سے نکلنے کے لئے لائٹ بجھائی تو اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

ٹیلیفون کی گھنٹی کا اچانک بجنا' لائٹ کا بجھنا اور منحوس شکل عورت کا خیال۔ ساحل عمر ایک دم چونک اٹھا۔ ایک لمحے کو اس پر لرزا سا طاری ہو گیا۔ وہ لائٹ آن کر کے واپس پلٹا۔ ٹیلیفون کی اب بھی گھنٹی بج رہی تھی اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔
وہ جان گیا کہ اس وقت کس کا ٹیلی فون آیا ہے ریسیور اٹھا کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور دھیرے سے بولا۔ ''جی۔''

''ہائے رانجھن' تمہارے اس جی پر ہزار بار قربان' اس قدر خوبصورت انداز میں جی کہتے ہو کہ بس جی چاہتا ہے کہ اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں تمہیں دیکھوں اور دیکھ کر جی اٹھوں۔ کہو سالگرہ کا تحفہ پسند آیا۔'' ساتھ ہی اس کی کھنک دار ہنسی سنائی دی۔

''ہاں بڑا مزے دار تحفہ تھا کھا کر بڑا مزہ آیا۔ ایک بات پوچھوں؟'' وہ بولا۔

''جانتی ہوں کیا پوچھو گے۔ یہی نا کہ مجھے تمہاری سالگرہ کا کیسے معلوم ہوا۔''

''ہاں یہی پوچھنا چاہتا تھا۔ میں حیران ہوں کہ تمہیں میری تاریخ پیدائش کا کیسے پتہ چلا۔''

''آدمی کو کسی بات کی جستجو ہو' سچی لگن ہو' تلاش میں خلوص ہو تو ہر آرزو پوری ہو جاتی ہے۔ میرے رانجھن تمہیں یاد نہیں کہ تم نے تین چار سال پہلے کسی میگزین کو انٹرویو دیا تھا۔ اسی انٹرویو میں تم نے اپنی ڈیٹ آف برتھ بھی بتائی تھی۔ وہ پرانا رسالہ ایک دوست کے یہاں اچانک میرے سامنے آ گیا۔ بس میں نے وہاں سے تمہاری ڈیٹ آف برتھ نوٹ کر لی۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی۔ پھر توقف کر کے بولی۔ ''میری ذہانت کے قائل ہو گئے نا۔''

''میں مان گیا تمہیں'' ساحل عمر خوش ہو کر بولا۔ ''اپنا نام بتانا پسند کرو گی؟''

''میں بے نام ہوں۔ تم میرا جو چاہے نام رکھ لو۔ جس رنگ میں چاہے رنگ لو۔'' وہ ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

''ناگن کہوں؟'' ساحل عمر نے چھیڑا۔

''ہاں کہو...... لیکن اتنا یاد رکھنا سچ مچ ناگن بن جاؤں گی تمہیں ڈس لوں گی۔''

''بڑے خطرناک ارادے ہیں۔''

''میرے ارادے واقعی خطرناک ہیں جب ملو گے تو پتہ چلے گا۔''

''نام تک چھپاتی ہو اور بات کرتی ہو ملنے کی' کیا خوب چیز ہو؟'' اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

''ہائے رانجھن' ناراض کیوں ہوتے ہو بتائے دیتی ہو اپنا نام' میرا نام ورشا ہے ورشا۔''

''ورشا......'' وہ حیرت زدہ ہوا۔ ''ورشا ہو' کہاں کہاں برسی ہو؟''

''جہاں برستی ہوں کھیت کھلیان ایک کر دیتی ہوں۔ ہر چیز بہا لے جاتی ہوں' اجاڑ کر رکھ دیتی ہوں۔'' اچانک اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس کے لہجے میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ اس کے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

''گویا جنونی ہو؟'' وہ سنبھل کر بولا۔

''سچ سمجھے' میں واقعی جنونی ہوں اور آج کل تمہارے جنون میں جلتا ہوں۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ بولو' ہم کب ملیں گے۔'' اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''جب تم چاہو۔'' یہ بات بلا ارادہ اس کے منہ سے نکل گئی۔

''ٹھیک ہے پھر میں کل آ رہی ہوں تمہارے پاس میرا انتظار کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

دوسرے دن وہ عجب انداز سے اس کے سامنے آئی۔ دوپہر کے وقت اسے کوریئر سے ایک لفافہ ملا۔ لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک تصویر نکلی۔

ایک لڑکی کیمرے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔ اس کے چست لباس میں پیٹھ پر ایک پان بنا ہوا تھا اور اس پان سے گوری جلد نظر آ رہی تھی۔

اس جلد پر جو چیز نظر آ رہی تھی اسے دیکھ کر وہ پتھر کا ہو گیا۔

☆......☆......☆

پیٹھ پر جہاں پان بنا ہوا تھا اور جس سے اس کی گوری جلد جھلک رہی تھی۔ اس جلد پر ایک بچھو بنا ہوا تھا۔ جہاں بچھو بنا ہوا تھا وہاں کھال کا رنگ ہلکا براؤن سا تھا۔ بچھو کا منہ نیچے کی طرف تھا اور اس کا سائز اصل بچھو جیسا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی بلاک کے ذریعے جلد پر چھاپا گیا ہو۔

وہ لڑکی جو بھی تھی اس کی صورت کیمرے کی طرف نہ تھی۔ اس کی تصویر کمر کے نیچے تک تھی۔ وہ شاید کسی میز یا اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت چست قمیض پہنے ہوئے تھی جو پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ پسینے میں بھیگی ہونے کی وجہ سے قمیض جلد سے چپک گئی تھی۔ جہاں جہاں قمیض جلد سے چپک گئی تھی وہاں جلد صاف نظر آ رہی تھی۔ خمدار اور نازک کمر تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر کی پشت پر رکھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ نیل پالش لگے لمبے اور ترشے ہوئے ناخن خوبصورت مخروطی انگلیاں۔ ایک انگلی میں سرخ اور سفید رنگوں والے نگوں کی نازک سی انگوٹھی۔ وہ ایک انوکھی تصویر تھی۔ سب سے انوکھی بات پیٹھ پر بنا بچھو کا نشان تھا جسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو اپنا آپ بھول گیا تھا۔ پتھرا گیا تھا۔ یہ ایک ایسی تصویر تھی جو اس کی پینٹنگ کے لئے آئیڈیل تھی۔ یہ انہیں تصویروں میں سے ایک تھی جنہیں دیکھ کر وہ بنانے کے لئے بے چین ہو جاتا تھا۔

اس تصویر کو دیکھ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے ضرور پینٹ کرے گا۔ فی الحال تو اسے چیتے کی تصویر بنانی تھی جس کے لئے اس نے بازغر سے وعدہ کر لیا تھا۔ چیتے کی تصویر میں بظاہر کوئی انوکھا پن نہ تھا لیکن وہ چیتا بذات خود انوکھا تھا۔ اس کا نام بھی کیا خوب تھا...... تہکال......

دوسرے دن سے اس نے چیتے کی پینٹنگ پر کام شروع کر دیا۔ بچھو اور دلہن والی تصویر اس نے اپنے اسٹوڈیو سے نکال لی اور اسے فریم کروا کے اپنے بیڈروم میں لگا لی۔ ایسی جگہ کہ اگر وہ بیڈ پر لیٹا ہو تو تصویر عین اس کی نظروں کے سامنے ہو۔ جب وہ صبح سو کر اٹھے' پلکوں کی چلمن اٹھے تو اس کی دید ہو۔ اس پینٹنگ میں اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے عشق ہوتا جا رہا تھا' اس تصویر سے' اس تصویر والی سے جو اس کے خوابوں میں دکھائی دیتی تھی۔

اس تصویر کو اس نے سینکڑوں تصویروں میں سے نکالا تھا۔ جو شکل وصورت اسے خواب میں دیکھ کر اس کے ذہن میں رہ جاتی تھی۔ اس یادداشت کے سہارے اس نے سیکڑوں تصویریں دیکھ کر اس کا انتخاب کیا تھا۔ کہیں سے آنکھیں لی تھیں' کہیں سے ناک لی تھی' کہیں سے ہونٹ چرائے تھے کہیں سے چہرے کی گولائی لی تھی۔ پیشانی' بھنویں' پلکیں' زلفیں' کان' گردن...... کون سی ایسی چیز تھی جس پر اس نے غور نہیں کیا تھا۔ بظاہر یہ ایک خیالی تصویر تھی لیکن اصل لڑکی بھی تو خیالی تھی۔ محض ایک تصویر......

ساحل عمر نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے؟ وہ اسے خوابوں میں نظر آتی تھی۔ یہ خواب بڑے واضح اور صاف ہوتے تھے۔ وہ لڑکی اسے مختلف انداز میں نظر آتی تھی۔ کبھی وہ اسے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا دیکھتا ہے۔ پتھر پر اس کا سفید ریشمیں لباس پھیلا ہوا تھا اور ساتھ ہی جھاگ اڑاتا تیز رفتار چشمہ بہہ رہا تھا۔ کبھی وہ پہاڑوں کے درمیان چھوٹے سے راستے پر دکھائی دیتی۔ سیفد ریشمیں لبادہ۔ جاتے جاتے وہ اچانک مڑ کر دیکھتی۔ اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں ایک دم روشنی سی ہو جاتی۔ ہیرے سے جگمگا اٹھتے' ہونٹوں پر جان لیوا مسکراہٹ پھیل جاتی۔ پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑوں میں گم ہو جاتی۔ کبھی وہ اس لڑکی کو جھیل کنارے بیٹھا دیکھتا۔ وہ جھکی ہوئی جھیل کے پانی میں کچھ دیکھ رہی ہوتی۔ جیسے پانی میں اپنا عکس دیکھ رہی ہو۔ آئینہ دیکھ رہی ہو' اپنے حسن پر ناز کر رہی ہو۔

وہ لڑکی ہفتے دو ہفتے میں اس کے خوابوں میں ضرور آ جاتی تھی لیکن جب اس نے یہ تصویر مکمل کی تھی تب سے وہ ایک بار بھی اسے نظر نہ آئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔

پھر ایک رات وہ اسے اچانک نظر آئی۔ وہ بڑی اذیت میں تھی۔

اسی رات ساحل عمر تصویر کو دیکھتے دیکھتے سو گیا تھا۔ تب اس نے اسے خواب میں دیکھا تھا۔ وہ پتھر پر کھڑی تھی۔ چشمے کا پانی اس کے پیروں کو چھوتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو۔ اب تک وہ لڑکی جتنی بار بھی نظر آئی تھی۔ وہ کبھی ساحل عمر سے مخاطب نہ ہوئی تھی بلکہ ساحل عمر نے خود کو اس کے ساتھ کھڑے ہوئے آج تک نہ دیکھا تھا۔ وہ اسے تنہا نظر آتی تھی لیکن آج کے خواب میں وہ اکیلی نہ تھی۔ ساحل عمر بھی کہیں سے گھومتا گھامتا اس چشمے پر نکل آیا تھا اور اسے پتھر پر کھڑا دیکھ کر اس کے نزدیک چلا گیا تھا اور اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر اس سے پوچھا تھا۔

''کیا ہوا تمہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم کیا ہوا ہے۔ میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جو کچھ ہوا وہ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

''آخر کیا کیا ہے میں نے؟'' ساحل عمر فکر مند ہو کر بولا۔ ''مجھے کچھ تو بتاؤ۔''

''میرے جسم میں آگ سی لگی ہے۔ اسی لئے میں یہاں پتھر پر کھڑی ہوں۔ ٹھنڈا پانی میرے پیروں کو لگ رہا ہے۔ اس پانی کی وجہ سے مجھے سکون مل رہا ہے لیکن یہ سکون عارضی ہے۔ چشمے سے باہر آؤں گی تو پھر وہ نیلی آگ مجھے اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ یہ تم نے کیا کر دیا ہے۔

مجھے اس اذیت سے نجات دلاؤ۔'' اس نے بڑے کرب بھرے لہجے میں کہا۔
''لیکن کیسے؟ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ میں تمہیں تکلیف میں دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں۔''
''مجھے نہیں معلوم یہ سب کیوں ہوا ہے لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ یہ آگ تم نے لگائی ہے۔''

''میں نے لگائی ہے تو میں اسے بجھا دوں گا۔ تم بتاؤ تو سہی یہ آگ کیسے بجھے گی۔''
''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ اذیت سے بولی۔ ''جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ نیلی آگ میرے وجود کو پگھلا کر رکھ دے۔''
''نہیں میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔'' یہ کہہ کر ساحل عمر نے اس پتھر کی طرف چھلانگ لگائی جہاں وہ لڑکی کھڑی تھی لیکن وہ اس پتھر تک نہ پہنچ سکا۔ وہ چشمے میں گر گیا اور تیز رفتار چشمہ اسے بہا کر لے چلا۔ اس نے چشمے سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلائے تو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔

آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اپنے کمرے میں پایا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ اس پر ایک گھبراہٹ سی طاری تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ کمرے میں ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ چھت کا پنکھا بھی چل رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کا بدن بھیگا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر پنکھا تیز کیا اور بیڈ پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

پھر ساحل عمر نے اس تصویر پر نظر ڈالی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں وہ کچھ زیادہ ہی پر اسرار محسوس ہو رہی تھی۔ تصویر جوں کی توں تھی، اس میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔ خواب والی لڑکی کو آج اس نے بہت قریب سے دیکھا۔ اس تصویر اور لڑکی کی صورت میں کوئی فرق نہ تھا۔ فرق اگر تھا تو صرف اتنا کہ تصویر میں وہ دلہن کے روپ میں تھی اور خواب میں ایک سفید ریشمیں لبادے میں نظر آتی تھی۔ نین نقش یہی تھے البتہ چہرے کے رنگ روپ میں تھوڑا فرق تھا۔

وہ خواب میں اس لڑکی کو پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے ایسی کیا غلطی سرزد ہوئی ہے کہ وہ اذیت میں مبتلا ہو گئی۔ یہ بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اس کا اس لڑکی سے کیا ربط تھا۔ اب تک ساحل عمر نے اسے تنہا دیکھا تھا۔ مختلف انداز میں مختلف جگہوں پر۔ اس طرح خواب میں کسی اجنبی لڑکی کا دکھائی دینا کوئی ایسا پریشان کن مسئلہ نہ تھا۔ بہت سے لوگوں کو ایک ہی خواب ایک ہی انداز میں برسوں دکھائی دیتا رہتا ہے لیکن خواب میں پہلی بار خود کو اس لڑکی کے ساتھ دیکھنا اور اس طرح بات کرنا جیسے وہ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ پھر اس کا اذیت میں مبتلا ہونا اور یہ بتانا کہ یہ اذیت اس کی وجہ سے اسے ملی ہے۔ کوئی نیلی آگ اسے جلا رہی ہے۔ آگ تو سرخی مائل پیلی ہوتی ہے۔ یہ نیلی آگ کہاں سے آ گئی۔ اس سے آخر ایسی کیا غلطی سرزد ہوئی۔ اگر کوئی غلطی ہوئی بھی تو وہ اس سے کس طرح متاثر ہو گئی۔ یہ بات سمجھ میں نہ آنے والی تھی۔

ساحل عمر کمرے کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں پہنچا۔ اسے پیاس لگ رہی تھی۔ فریج سے ٹھنڈی بوتل نکال کر دو گلاس ٹھنڈا پانی پیا۔ ایک نظر اماں کے کمرے کی طرف ڈالی۔ ان کے کمرے کی لائٹ جلی ہوئی تھی۔ اس وقت دو بجے کا عمل تھا۔ وہ شاید تہجد کی نماز کے لیے اٹھی ہوں۔ وہ جلدی سے پانی پی کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اگر انہوں نے اسے اتنی رات گئے اپنے کمرے سے باہر دیکھ لیا تو سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور اس وقت وہ کسی بھی طرح کے سوال جواب کے موڈ میں نہ تھا۔

کمرے میں آ کر اس نے ٹیبل لیمپ بجھا کر ٹیوب لائٹ جلائی اور یونہی بے خیالی میں ٹہلنے لگا۔ اس کا دماغ اس معمے کو حل کرنے میں لگا ہوا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ محض خواب ہو' حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو...... لیکن اس بات پر اس کا یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لڑکی کا کربناک چہرہ' نیلی آگ کا ذکر' اس تکلیف کا اسے مورد الزام ٹھہرانا' سب سچ معلوم ہو رہا تھا لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس بات کا کس طرح پتہ چلائے جس کی وجہ سے لڑکی کرب میں مبتلا ہوئی ہے۔

یہ سوچتے سوچتے وہ اس تصویر کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی نظر اس کی پیشانی پر بنے بچھو پر تھی۔ تب اسے اچانک بازغر یاد آیا۔ وہ اس بچھو کو دیکھ کر کیسا طیش میں آ گیا تھا۔ وہ بے اختیار اس بچھو پر جھپٹا تھا۔ اس نے ایک دو اجنبی نام بھی لیے تھے۔ اس نے دیکھا تھا کہ یہ بچھو دوڑ کر تصویر کے پیچھے چلا گیا تھا اور باوجود کوشش کے مل نہیں سکا تھا۔

اوہ' اب سمجھ میں آیا۔ اس سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اس نے اس لڑکی کی پیشانی پر ٹیکہ بنانے کے بجائے بچھو بٹھا دیا۔ تصویر انوکھی ضرور ہو گئی لیکن وہ بچھو لڑکی کی اذیت کا باعث بن گیا۔ اس خیال نے آہستہ آہستہ یقین کی صورت اختیار کر لی۔ اس کا دل مطمئن ہوتا چلا گیا۔

صبح اٹھتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ فریم سے تصویر کو نکال کر اپنے اسٹوڈیو میں جا کر بورڈ پر لگایا اور ٹیوبوں سے مختلف رنگ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور برش اٹھا کر مختلف رنگوں کی آمیزش کرنے لگا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اگرچہ اس نے یہ بچھو بڑی محنت سے بنایا تھا اور وہ اس کی توقع سے کہیں اچھا بن گیا تھا۔ بڑا زبردست' بہت جاندار لیکن اس بچھو کو صفحۂ ہستی سے مٹائے بغیر چارہ نہ تھا۔ اس بچھو کو کسی کی پیشانی کا ٹیکہ بنا کر اس نے بہت زیادتی کی تھی۔ وہ نازک سی لڑکی اگر اس بچھو کو اپنی پیشانی پر محسوس کر کے کسی کرب میں مبتلا تھی تو وہ حق پر تھی۔ ہماری ناک پر اگر مکھی بھی بیٹھ جائے تو ہم کیسے بے چین ہو جاتے ہیں۔

برش پر رنگ لگا کر وہ بچھو کو مٹانے لگا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس بچھو کو مٹا کر اس کی جگہ ایک خوبصورت ٹیکہ بنائے گا۔ تب اس دلہن کی کچھ اور ہی شان نکل آئے گی۔

ابھی اس نے اسٹروک لگانے کے لئے برش بچھو کے نزدیک کیا ہی تھا کہ اسے فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کر لینا پڑا۔

اس بچھو نے ایک دم سر اٹھایا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑی تیزی سے پلٹ کر تصویر کے

پیچھے چلا گیا تھا۔

ساحل برش میز پر پھینک کر فوراً بورڈ کے پیچھے گیا کہ دیکھ سکے کہ وہ بچھو کدھر جا رہا ہے لیکن اتنی دیر میں وہ بچھو جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ساحل عمر اسے ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔ اس کمرے کا ہر گوشہ ہر کونہ تلاش کر لیا لیکن اس بچھو نے نہ ملنا تھا نہ ملا۔

اماں ناشتہ بنا کر ساحل عمر کو اٹھانے کے لیے اس کے کمرے کی طرف جانے لگیں تو انہوں نے اس کے اسٹوڈیو کا دروازہ کھلا پایا۔ انہوں نے اندر جھانک کر دیکھا تو ساحل عمر ادھر ادھر کچھ تلاش کرنے میں مصروف تھا۔

''بیٹا خیریت تو ہے یہ تم صبح ہی صبح کمرے میں کیا تلاش کر رہے ہو؟'' اماں نے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا۔

''اماں، بس خیریت نہیں ہے۔ ذرا تم اندر آ کر دیکھو۔'' اس نے اپنی پریشانی بیان کی۔

''ہائے کیا ہوا؟'' اماں نے فوراً اپنا دل تھام لیا اور بہت سنبھل سنبھل کر آگے بڑھیں جب ساحل عمر کے نزدیک پہنچیں تو انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''ہاں کیا ہوا؟''

''اماں یہ دیکھو۔'' اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے بھیا وہ بچھو کہاں گیا؟'' وہ حیران ہو کر بولیں۔

''اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' اماں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں اماں کہ اس دلہن کی پیشانی پر میں نے جو بچھو بنایا تھا وہ میری آنکھوں کے سامنے چل کر اس بورڈ کے پیچھے کہیں غائب ہو گیا۔'' ساحل عمر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

اماں کا تو یہ سن کر حال برا ہو گیا۔ وہ بھاگ کر فوراً کمرے سے نکلیں اور دھپ سے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئیں اور وہیں سے چلائیں۔ ''ساحل بیٹا فوراً باہر آ جاؤ۔''

'اماں آ رہا ہوں۔ ذرا ایک نظر اور ڈال لوں۔''

پھر وہ جب کمرے سے باہر آیا تو اماں دل پکڑے وحشت بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگیں اور بولیں۔ ''ساحل وہ بچھو کیا واقعی غائب ہو گیا۔ تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں اماں، وہ بچھو واقعی غائب ہو گیا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

''بھیا تمہیں اس بات سے ڈر نہیں لگ رہا۔''

''ہاں، اماں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ دیکھو میں کانپ رہا ہوں۔'' ساحل عمر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بیٹا تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ ہائے پتہ نہیں وہ کیا چیز تھی میں تو اسے پہلی دفعہ دیکھ کر ہی ڈر گئی تھی۔ ساحل اب کیا ہو گا؟''

"اماں کچھ نہیں ہوتا...... آؤ ناشتہ کر لو۔" ساحل عمر نے بڑے اطمینان سے کہا اور پھر وہ خوشی سے ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

چائے پیتے ہوئے اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے اماں سے پوچھا۔ "اماں مرجینا کہاں ہے؟"

"وہ تمہارے بیڈروم کی صفائی کر رہی ہے۔" اماں نے بتایا۔

ملازمہ کا اصل نام تو شاہدہ تھا لیکن ساحل عمر نے اس کا نام مرجینا رکھا ہوا تھا۔ وہ سانولے رنگ کی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ پہلے اس گھر میں اس کی ماں کام کرتی تھی لیکن جب سے وہ بیمار رہنے لگی تھی تو شاہدہ نے کام شروع کر دیا تھا۔ اماں کو اس کا کام اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے پھر اسے مستقل کر لیا۔ ساحل عمر نے اس کا نام مرجینا کیوں رکھا تھا۔ یہ بات خود اسے بھی معلوم نہ تھی۔ بس پہلے دن جیسے ہی اس نے اسے دیکھا مرجینا کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اماں نے بھی یہ نام قبول کر لیا۔ وہ بھی اسے مرجینا کہہ کر بلانے لگیں اور شاہدہ اس نئے نام پر خوش خوش دوڑی آتی۔

"اماں ذرا اسے بلا کر میرے اسٹوڈیو کی صفائی کرواؤ۔" ساحل عمر نے کہا۔

"اچھا بلاتی ہوں۔" اماں یہ کہہ کر اٹھنے لگیں۔

"پر ایک بات سنو اماں...... اسے کوئی کہانی سنانے نہ بیٹھ جانا ورنہ وہ کمرے میں گھسے گی بھی نہیں۔"

"اتنا میں سمجھتی ہوں۔" اماں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں اتنا ضرور کہہ دینا کہ کوئی کیڑا مکوڑا نظر آئے تو مجھے فوراً بلا لے۔" ساحل عمر نے ہدایت کی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ جاتے ہوئے بولیں۔

مرجینا نے ساحل عمر کے اسٹوڈیو کی ایک ایک چیز صاف کر دی لیکن اسے لال بیگ کے سوا وہاں کوئی کیڑا نہ دکھائی دیا۔

ساحل عمر نے بچھو کی جگہ پر کر کے اس کی پیشانی پر ٹیکہ بنا دیا۔ ٹیکہ بن جانے کے بعد اس لڑکی کی پیشانی جگمگا اٹھی۔ دو تین گھنٹے کی محنت کے بعد وہ تصویر فریم ہو کر پھر اپنی جگہ پہنچ گئی۔ اب وہ مکمل دلہن لگ رہی تھی۔ اسے اس روپ میں دیکھ کر ساحل عمر کے دل کو خاصا سکون محسوس ہوا۔ اماں نے اسے دیکھا تو وہ اسے دیکھتے ہی نہال ہو گئیں بولیں۔ "ہائے کتنی پیاری دلہن ہے۔ کاش، میرے ساحل کو ایسی دلہن مل جائے۔"

"اماں، آپ کے ساحل کو ایسی دلہن مل سکتی ہے۔" ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

"کہاں؟ جلدی بتاؤ میں آج ہی اس کے پاس جاتی ہوں۔"

"اماں، رات کا انتظار کر لو۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"رات کو کیا ہو گا؟" اماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''رات کو یہ ہوگا اماں کہ وہ آپ کے خواب میں آ جائے گی۔ پھر اس سے پتہ پوچھ لینا۔''
''تم کبھی سنجیدہ نہیں ہو گے ساحل۔'' وہ تنک کر اٹھیں اور اس کے کمرے سے نکل گئیں۔
وہ بھی ان کے ساتھ ہی باہر نکلا لیکن اس نے انہیں نہیں روکا۔ وہ کچن کی طرف چلی گئیں۔
ساحل عمر کو بیٹھے بیٹھے ایک خیال آیا تھا۔ وہ اس خیال کی تصدیق کر لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اسٹوڈیو میں داخل ہوا۔ اس نے انگریزی کا وہ رسالہ اٹھا لیا جس میں بچھو والے ریفرنس کی کٹنگ رکھی تھی۔ اس کے صفحات الٹ کر وہ ریفرنس نکال لیا۔
جب اس نے ریفرنس پر نظر ڈالی تو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ریفرنس میں ہر چیز موجود تھی۔ زنانہ ہاتھ بھی موجود تھا اور ہاتھ کے پس منظر میں جو کچھ تھا وہ بھی موجود تھا۔ اگر کوئی چیز نہیں تھی تو بچھو تھا۔
اس عورت کا ہاتھ جوں کا توں پھیلا ہوا تھا لیکن ہاتھ سے بچھو غائب تھا۔
یہ کیا ہوا؟ وہ پریشان ہو کر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں ریفرنس پر تھیں۔ اس عورت کے ہاتھ پر کسی قسم کا نشان نہ تھا۔ پینٹنگ پر بچھو کا نشان رہ گیا تھا۔ اس ریفرنس پر کسی قسم کی خراش تک موجود نہ تھی۔ یہ ناقابل یقین بات تھی لیکن جو کچھ ہوا تھا اس کی نظروں کے سامنے ہوا تھا۔ اس میں کسی قسم کے شبہ یا وہم کی گنجائش نہ تھی۔ وہ بچھو اس کی پینٹنگ سے غائب ہوا تھا۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے تصویر کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ اصل تصویر سے بھی غائب تھا۔
آخر وہ کیا چیز تھا؟
اس کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ اس کا جواب کسی کے بھی پاس نہ تھا۔
رات کو دس بجے کے قریب وہ ٹہلنے کے لیے نکلا۔ چورنگی تک گیا۔ وہاں پان والے سے پان خریدے اور پھر واپس گھر کی طرف چل دیا۔ جب وہ اس درخت کے نزدیک پہنچا جس کی اوٹ سے نکل کر اچانک بازغ اس کے سامنے آ گیا تھا تو اس نے درخت کی طرف بغور دیکھا۔ وہاں کچھ نہ تھا۔
بازغ جاتے ہوئے ایک ٹیلی فون نمبر دے گیا تھا اور ہدایت کر گیا تھا کہ تصویر تیار ہو جانے کے بعد وہ اس نمبر پر اسے فون کر دے۔ وہ بھی بڑا عجیب اور پراسرار شخص تھا۔ اس نے اس سے پہلے کبھی اس شخص کو نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بغیر پریشانی کے اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔ چیتے کی تصویر پر اگرچہ اس نے کام شروع کر دیا تھا لیکن اس کے دل میں وسوسوں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ ویسے اس تصویر پر کام کرتے ہوئے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔
گھر پہنچ کر کپڑے تبدیل کئے اور ڈیک پر ایک کیسٹ لگا کر اطمینان سے بیڈ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز سن کر اس نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ یہ یقیناً ورشا کا فون ہے۔ جب اس نے اپنی تصویر بھیجی تھی اس کے بعد اس کا کوئی فون نہیں آیا تھا جبکہ ساحل عمر اسی رات اس کے فون کی توقع کر رہا تھا۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے اس نے ڈیک کی آواز خاصی دھیمی کر دی۔ پھر ریسیور اٹھا کر بڑی چاہت سے بولا۔ ''جی!''

آواز سنائی دی۔ ورشا کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کہو رانجھن کیسے ہو؟'' ادھر سے ورشا کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''اتنے دن کے بعد کیوں فون کیا؟'' ساحل عمر نے شکوہ کیا۔

''اوہ تو تمہیں اب میرے فون کا انتظار رہنے لگا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں ہنسی۔

''رانجھن خیریت تو ہے۔''

''جی اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں۔''

جواب میں وہ زور سے ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں اس کی آواز میں ایک عجیب قسم کی کشش تھی۔ ایسی کشش جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''کہو میں کیسی لگی؟'' وہ بڑے مترنم انداز میں گویا ہوئی۔

''وہ تم کہاں تھیں وہ تو تمہاری تصویر تھی۔'' ساحل عمر نے وضاحت کی۔

''چلو تصویر کے بارے میں ہی بتا دو۔''

''بہت زبردست...... جس فوٹوگرافر نے بھی بنائی خوب بنائی۔''

''میں چاہتی ہوں کہ اب تم اسے بناؤ۔'' فرمائش ہوئی۔

''بنا دوں گا۔'' ساحل عمر نے فوراً وعدہ کر لیا۔ ''میں آج کل ایک پینٹنگ پر کام کر رہا ہوں وہ مکمل ہو جائے تو پھر اسے بنا دوں گا۔''

''کس کی پینٹنگ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جب مکمل ہو جائے گی تو تمہیں بتا دوں گا' آ کر دیکھ جانا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''ہائے رانجھن...... مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی بھی تو کس انداز میں؟''

''ملنا نہیں چاہتیں؟'' اس نے پوچھا۔

''کس کافر کو انکار ہے۔'' اس نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''میرا بس چلے تو ابھی تم تک پہنچ جاؤں۔''

''اب ایسی بھی کیا بے قراری۔'' ساحل عمر ہنسا۔

''تمہیں چین ہے؟'' اس نے ایک عجیب سوال کیا۔

''نہیں۔'' ساحل عمر نے کہا' پھر بولا۔ ''ورشا ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں پوچھو...... میر بارے میں ایک بات نہیں ہزار باتیں پوچھو۔ اتنا پوچھو کہ میں میں نہ رہوں۔ میں تو جانے کب سے ایسے شخص کو تلاش کر رہی ہوں جو مجھے پوچھے جو مجھے بوجھے۔'' وہ عجیب انداز میں گویا ہوئی۔

''تمہاری پیٹھ پر وہ نشان کیسا ہے۔ بالکل بچھو لگتا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''لگتا کیا ہے وہ ہے ہی بچھو۔ یہ نشان میری پیٹھ پر پیدائشی ہے۔'' ورشا نے بتایا۔

''کیا بچھوؤں کے خاندان سے ہو؟''

''یہی سمجھ لو...... ذرا میرے ڈنک سے بچے رہنا۔'' وہ ہنسی۔

"میں تمہیں کب دیکھوں گا؟" اس نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے سوال کیا۔
"کل ہی۔" اس نے فوراً ہی فیصلہ سنا دیا۔
"کہاں اور کیسے؟" ساحل عمر نے خوش ہو کر پوچھا۔
"کل طاہرہ زیدی کی تصویروں کی نمائش کا افتتاح ہو رہا ہے۔ میں وہاں آؤں گی۔تم بھی آ جانا۔" اس نے پروگرام بتایا۔
"میں عام طور پر اس طرح کی نمائشوں میں نہیں جاتا لیکن تمہارے لیے آؤں گا۔ وقت اور آرٹ گیلری کا بتاؤ۔"
ورشا نے آرٹ گیلری کا نام اور وقت بتا دیا۔
"لیکن میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟" ساحل عمر نے کہا۔"میں نے صرف تمہاری تصویر دیکھی ہے اور وہ بھی پشت سے۔"
"میں تمہیں پہچانوں گی۔تم پریشان نہ ہو۔ ویسے تم بھی مجھے پہچان لو گے۔" میں کالی ساڑھی میں ہوں گی۔ٹھیک ہے پھر کل ملاقات ہو گی۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔
یہ اس کی بڑی عجیب بات تھی۔ وہ اچانک ہی ٹیلی فون بند کر دیتی تھی۔ دوسری طرف سے ہونے والے سوال جواب کی پروا نہیں کرتی تھی بہر حال ساحل عمر ملاقات طے ہو جانے پر بہت خوش تھا۔ اس نے بڑی سرشاری سے ریسیور سیٹ پر رکھا اور ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ڈیک کی آواز ایک دم اونچی کر دی۔ پھر اسے خیال آیا کہ کہیں اماں نماز یا اور اد و وظائف میں مصروف نہ ہوں۔ اس نے آواز دھیمی کر دی اور اطمینان سے بیڈ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ ورشا کیسی ہو گی۔
ورشا کو اس نے نہیں دیکھا تھا۔ محض اس کی آواز سنی تھی اور صرف آواز سن کر کسی کی شکل و صورت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ اگرچہ بعد میں اس نے اپنی ایک تصویر ارسال کی تھی۔ اس تصویر سے بھی اس کی صورت کا اندازہ ناممکن تھا کیونکہ اس تصویر میں سر اور پیٹھ نمایاں تھے۔ اس نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ ورشا شکل وصورت کی معمولی ہو یا بدصورت ہو۔ تبھی اس نے سامنے کی تصویر نہیں بھیجی۔ ویسے وہ تصویر اپنے انداز کی وجہ سے منفرد تھی اور اس میں وہ جتنی نظر آ رہی تھی دلفریب تھی۔ وہ خود کیسی تھی، اس راز کے کھلنے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی کل معلوم ہو جانا تھا۔
میوزک سنتے سنتے اسے نیند آنے لگی تو اس نے ریموٹ کے ذریعہ ڈیک آف کر دیا اور سو گیا۔
نیند گہری ہوئی تو خوابوں کی دنیا روشن ہو گئی۔ وہ ایک انتہائی پر فضا مقام تھا۔ نیلا صاف آسمان، برف پوش پہاڑ، اونچے اونچے درخت، سرسبز شاداب علاقہ، بہتا ہوا شفاف دریا، وہ ایک پتھر پر بیٹھی دریا کے پانی سے کھیل رہی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اور اتنی خوش تھی کہ وہ دریا کا پانی کسی پر اچھال رہی تھی۔
تب اس نے دیکھا کہ وہ جس پر خوشی میں پانی اچھال رہی ہے وہ کوئی اور نہیں خود ساحل عمر ہے اور وہ پانی کے چھینٹوں سے بچنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے۔"

"مت پھینکو پانی' میرے کپڑے بھیگ رہے ہیں۔" ساحل عمر نے احتجاج کیا۔

"تو بھیگنے دو۔" وہ ایک ادائے بے نیازی سے بولی اور ایک مرتبہ پھر پانی اس کے اوپر اچھال دیا۔

"آج تم بہت خوش ہو' خیر تو ہے۔" ساحل عمر نے پوچھا۔

"ہاں آج میں بہت خوش ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ایسی کیا خوشی مل گئی آخر؟" ساحل عمر نے پوچھا۔

"خوشی تو تمہی نے دی ہے' کیا تم نہیں جانتے۔" اس نے بتایا۔

"عجیب بات ہے میں نے تمہیں خوشی دی ہے؟ اس سے پہلے میں نے تمہیں رنج دیا ہے۔ نہ تو مجھے رنج دینے کی وجہ معلوم ہو سکی اور نہ اب خوشی کی وجہ معلوم ہے۔ کچھ بتانا پسند کرو گی؟" ساحل عمر نے پوچھا۔

"تم نے میرے ماتھے پر ٹیکہ سجا دیا۔ ایک عذاب سے مجھے نجات دلا دی۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور میرے لیے کیا ہو سکتی ہے اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ صحیح تھا' اس بچھو نے تمہیں پریشان کیا ہوا تھا؟"

"ہاں اور کیا؟"

"لیکن میں اسے مٹا نہ سکا۔ وہ فرار ہو گیا۔" ساحل عمر کے لہجے میں پچھتاوا تھا۔

"کاش! تم اسے مار دیتے۔" وہ بولی۔

"وہ میرے ہاتھ لگتا جب نا۔ میں نے تو اسے فنا کرنے کے لیے برش اٹھا لیا تھا۔"

"وہ بہت خطرناک ہے۔" اس کے لہجے میں خوف تھا۔

"وہ گیا کدھر؟" ساحل عمر نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ اب وہ تمہیں کہیں نظر آئے تو اس سے دور ہو جانا۔"

"اسے مار کیوں نہ دوں۔" اس نے پوچھا۔

"تم اسے نہیں مار سکتے۔ کاش تم اسے مار سکتے۔" اس نے عجیب بات کہی۔

"وہ ہے کیا بلا؟" ساحل عمر نے سوال کیا۔

"وہ اعور ہے۔" اس نے بتایا۔

"یہ اس کا نام ہے۔" ساحل عمر نے پوچھا۔

"ہاں یہ اس خبیث کا نام ہے۔ وہ ایک شیطان کا بیٹا ہے۔"

"تم کیا ہو؟" ساحل عمر نے براہ راست سوال کیا۔

"میں رشاملوک ہوں۔" اس نے اپنا نام بتایا۔

"رشاملوک۔" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "یہ نام میرا سنا ہوا ہے: اوہ ہاں یاد آیا۔ تمہارا اور بچھو کا نام بازغر نے لیا تھا۔ کیا تم بازغر کو جانتی ہو۔"

''اوہ تو جھکال تم تک پہنچ گیا۔'' اس کے لہجے میں کسی قدر خوشی تھی۔
''وہ چیتے کی تصویر؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔
''ہاں اسے جتنا جلد ممکن ہو سکے بنا دو۔ وہ بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ وہ میرا محافظ ہے۔ وہ تمہاری بھی حفاظت کرے گا۔ اس کی تصویر جلد از جلد مکمل کر لو۔ وقت قریب آ رہا ہے۔''
''کیسا وقت؟''
''ایک خوشگوار وقت' ایک روشن لمحہ۔'' یہ کہہ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پتھر پر کھڑی ہو گئی پھر بولی۔ ''وہ مجھے لینے آیا ہے۔ میں جا رہی ہوں' میری ایک بات دھیان سے سن لو۔ اپنا خیال رکھنا' کسی کے فریب میں مت آ جانا۔''

تب اچانک ایک بادل کا ٹکڑا کہیں سے نمودار ہوا۔ وہ اس گہرے بادل میں چھپ گئی۔ ایک لمحے بعد وہاں کچھ بھی نہ رہا۔ خالی پتھر رہ گیا۔ بادل اسے اڑا کر لے جا چکا تھا۔

پھر ایک دم منظر بدل گیا۔ ساحل عمر نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا بچھو ایک پتھر سے اتر کر اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس بچھو کا سائز ایک بڑے کچھوے کے برابر تھا۔ وہ اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ وہ پلٹ کر بھاگا تو ایک پتھر سے اس کا پیر پھسل گیا۔ تبھی اس کی آنکھ کھل گئی' اس نے خود کو اپنے بیڈ پر پایا۔ کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس پر نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ ڈیک بند کرتے ہی کروٹ بدل کر سو گیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باتھ روم گیا۔ پھر اس نے ٹھنڈا پانی پیا اور لائٹ بجھا کر دوبارہ لیٹ گیا۔ اس خواب کو دیکھ کر جہاں وہ خوف میں مبتلا ہوا تھا وہاں اسے اطمینان بھی تھا کہ رشا ملوک اس کی وجہ سے جس اذیت میں مبتلا تھی اب وہ پریشانی دور ہو گئی تھی۔ اسے یہ بھی خوشی تھی کہ اس نے اس کی پریشانی کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ اسی سرشاری میں اسے دوبارہ بہت جلد نیند آ گئی۔

شام کو وہ وقت مقرر پر ورشا کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچ گیا۔ تصاویر کا افتتاح ہو چکا تھا۔ آرٹ گیلری میں خاصا رش تھا۔ مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد تھی۔ وہ بھی اسی رش میں شامل ہو گیا اور ایک ایک کر کے تصویروں کو دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ تصویر کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دائیں بائیں بھی ایک نظر ڈال لیتا تھا۔ شاید کوئی کالی ساڑھی والی نظر آ جائے۔

ایک تصویر کو دیکھتے ہوئے اس کے کانوں میں ورشا کا نام پڑا۔ اس نے بڑی بے نیازی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دو لڑکے محو گفتگو تھے۔ اگرچہ دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے لیکن وہ ساحل عمر کے اتنے نزدیک تھے کہ ساری بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔
''تم نے دیکھا یہاں ورشا آئی ہوئی ہے۔'' لہجے میں بڑی دلچسپی تھی۔
''کہاں ہے وہ قیامت؟'' دوسرا بے قرار ہو کر بولا۔
''میں نے ابھی اسے طاہرہ زیدی کے ساتھ دیکھا تھا۔'' پہلے والے لڑکے نے بتایا۔
''کیا غضب کی لڑکی ہے یار' میرا جی چاہتا ہے اس کا مجسمہ بناؤں۔'' دوسرا لڑکا بولا۔
''ہاں' بنا سکتے ہو مگر خواب میں۔''

بڑھ گئے۔ ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

اس بات پر دونوں ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔
ان لڑکوں کے آگے بڑھ جانے کے بعد اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر ہال میں طائرانہ نظر ڈالی۔ وہ جہاں تک دیکھ سکتا تھا اس نے دیکھا مگر اسے کالی ساڑھی میں کوئی لڑکی نظر نہیں آئی۔ وہ پھر تصویریں دیکھنے میں لگ گیا۔

اب آخری دو چار تصویریں رہ گئی تھیں۔ ورشا ابھی تک اس کے سامنے نہیں آئی تھی جبکہ وہ اس کی موجودگی کے بارے میں ان لڑکوں کی زبانی سن چکا تھا۔ آخر وہ اس کے سامنے کیوں نہیں آئی تھی۔ اس نے تو کہا تھا کہ وہ اسے اچھی طرح پہچانتی ہے۔ اسی اثناء میں ایک دو خواتین کالی ساڑھی میں نظر آئی تھیں لیکن وہ اجنبیوں کی طرح اس کے پاس سے گزر گئی تھیں۔

جب وہ آخری تصویر دیکھ رہا تھا تو اس کے دل پر اداسی سی چھا گئی تھی۔ اسے آرٹ گیلری میں گھومتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اس اثناء میں اسے اپنے کئی شناسا ملے تھے لیکن اس نے ان سے واجبی سی گفتگو کر کے جلد اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا تاکہ ورشا کو اس کے نزدیک آنے میں کوئی جھجک محسوس نہ ہو۔ اب وہ آخری تصویر جو باہر نکلنے والے دروازے کے نزدیک تھی آ پہنچا تھا اور وہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔

ورشا سے اسے اس طرح کے رویے کی امید نہ تھی۔ آخری تصویر دیکھ کر وہ مایوسانہ قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

اچانک کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''رانجھن، بغیر ملے ہی چلے جاؤ گے۔''

ساحل عمر نے خوشی سے مڑ کر دیکھا۔

اسی وقت گولی چلنے کی آواز آئی۔

☆......☆......☆

یوں تو ورشا کا ملنا بھی کسی دھماکے سے کم نہ تھا لیکن اس وقت حقیقتاً ایک دھماکا ہوا تھا اور لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔

یہ دونوں دروازے کے نزدیک ہی تھے۔ اس لیے ورشا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر نکال لائی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''ساحل جلدی سے یہاں سے نکلو'' اور وہ بڑی تیزی سے اس کے ساتھ باہر نکل آیا تھا۔

دوسرے دن گولی چلنے کی وجہ معلوم ہوئی۔ اصل میں طاہرہ زیدی کا ایک نوجوان سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ بات اتنی آگے بڑھی کہ اس نوجوان نے غصے میں آ کر ریوالور نکال لیا اور گولی چلا دی۔ وہ نوجوان ایک بڑے سیاست داں، ایک بڑے زمیندار کا بگڑا ہوا بیٹا تھا۔ اسے طاہرہ زیدی کی ایک تصویر پسند آ گئی۔ اس نے طاہرہ زیدی سے اس تصویر کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔

اتفاق سے کچھ دیر پہلے ہی وہ تصویر بک چکی تھی۔ طاہرہ زیدی نے اس نوجوان سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''سوری سر، وہ تصویر تو فروخت ہو چکی۔''

''کتنے میں بکی ہے؟'' اس نوجوان نے بے نیازی سے پوچھا۔

''جی ساٹھ ہزار میں۔'' طاہرہ زیدی نے سادگی سے کہا۔

''میں اس کے ستر ہزار دینے کو تیار ہوں اور وہ بھی کیش ہاتھ کے ہاتھ۔'' اس نوجوان کے لہجے میں بڑا تکبر تھا۔ ''آپ مجھے جانتی ہو گی۔ بات یہ ہے کہ مجھے جب کوئی چیز پسند آ جاتی ہے تو میں اسے چھوڑتا نہیں۔''

''آپ کسی منڈی میں نہیں آرٹ گیلری میں کھڑے ہیں ذرا خود کو سنبھال کر بات کیجئے۔'' طاہرہ زیدی نے بہت ملائمت سے کہا۔ ''رہ گئی یہ بات کہ آپ کون ہیں؟ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں آپ کو بالکل نہیں جانتی۔ تصویر کے بارے میں، میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ وہ میں فروخت کر چکی ہوں اب آپ مجھے اس کے ایک لاکھ روپے بھی دیں گے تو میں یہ تصویر آپ کے حوالے نہیں کروں گی۔''

''پھر محترمہ آپ میری بات پوری توجہ سے سن لیں، اگر یہ تصویر مجھے نہ ملی تو پھر کسی کو بھی نہیں ملے گی۔'' یہ کہہ کر وہ تصویر کی طرف بڑھا۔

طاہرہ زیدی یا وہاں موجود کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ کوئی

اس انتہائی احمقانہ قدم کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے تصویر کے سامنے جا کر آناً فاناً کندھے پر لٹکا ہوا ریوالور اتارا اور اس کے خول سے ریوالور نکال کر تصویر کے چہرے کا نشانہ لیا۔ ریوالور تانتے دیکھ کر لوگ فوراً ادھر ادھر ہٹ گئے۔ اس نے گولی چلانے میں دیر نہ کی۔ تصویر کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا۔ طاہرہ زیدی اپنی تخلیق کے ساتھ ایسا سفاکانہ سلوک دیکھ کر اپنے ہوش گنوا بیٹھی۔

وہ نوجوان اپنے حواریوں کے ساتھ پورے اطمینان کے ساتھ آرٹ گیلری سے باہر نکلا اور اپنی پجیرو میں بیٹھ کر اپنی راہ ہو لیا۔ اس کی راہ روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔

خیر گولی کی آواز سن کر جب ورشا اسے باہر نکال لائی تو اس نے پوچھا۔ ''راجھن' تمہاری گاڑی کہاں کھڑی ہے؟''

''وہ سامنے۔'' ساحل عمر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ورشا کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ اس کا جسم قیامت خیز تھا اور اس کا لباس ہیجان خیز۔ وہ کالی ساڑھی میں چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

''اندر پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ میں آج کی شام برباد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آؤ ساحل پر چلیں۔'' اس کا نرم ملائم ہاتھ ابھی ساحل عمر کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اس ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا اور تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ وہ جلد از جلد اس افراتفری کی فضا سے نکل جانا چاہتا تھا۔

''تم کہاں جاؤ گی' ساحل تو تمہارے پاس ہے۔'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''سمندر پر چلو۔'' اس نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''میں کسی سمندر سے کم ہوں کیا؟'' ساحل عمر نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''چند دنوں میں پتہ چل جائے گا کہ کتنے گہرے ہو؟'' وہ ہنس کر بولی۔ اس کی ہنسی میں بڑی کشش تھی۔ جب وہ ہنسی تو اس کے گالوں میں ننھے گڑھے پڑ گئے۔ وہ ان گڑھوں پر مرمٹا۔

''اتنا آسان نہیں ہے مجھے پالینا۔'' ساحل عمر نے بڑے یقین سے کہا۔

''کلفٹن چلو۔'' ورشا نے اس کے جملے کا کوئی اثر نہ لیا۔

''ٹھیک ہے۔'' ساحل عمر نے کہا۔ ''ورشا ایک بات کہوں۔''

''ہوں۔'' اس نے پیار بھری ہوں کی۔

''تمہارا نام ورشا مناف کے بجائے ورشا ڈمپل ہونا چاہیے۔''

اس کی یہ بات سن کر وہ زور سے ہنس دی۔ اس کے رخساروں کے گڑھے اور نمایاں ہو گئے۔ پھر ایک دم ہی اس نے ایک عجیب سوال کر دیا۔ ''راجھن میں تمہیں کیسی لگی؟''

''بالکل ہیر جیسی' کھیر جیسی' شیر جیسی۔'' ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔ وہ مذاق کے موڈ میں تھا۔

''میں ورشا ہوں یا عید ہوں۔''

''تم کسی جھیل پر برستی چاندنی ہو۔'' ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

''شاعر ہو؟''

''تھا نہیں ہو گیا ہوں ابھی ابھی کسی کو دیکھ کر......''

''رانجھن' جھوٹ مت بولو۔''

''رانجھا بھی کہتی ہو اور جھوٹا بھی کہتی ہو۔''

ورشا مسکرا کر رہ گئی۔ کچھ بولی نہیں۔

کلفٹن کے ساحل پر پہنچ کر انہوں نے ایک سنسان سی جگہ تلاش کی اور وہ دونوں دیوار پر بیٹھ گئے۔ پاؤں انہوں نے پتھروں پر رکھ لیے۔ سورج ڈوبنے کی تیاری کر رہا تھا۔ سمندر کی لہریں کافی آگے تک آ کر پلٹ رہی تھیں۔ سامنے ایک فیملی لہروں سے کھیل رہی تھی۔ ان کے نزدیک ایک ہی اونٹ والا اپنا اونٹ لیے کھڑا تھا۔ ایک دو گھوڑے والے بھی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

لہریں لیتا سمندر' تھال نما سورج' سرخی مائل آسمان عجیب منظر تھا۔

''ورشا' تمہیں سمندر کیسا لگتا ہے؟''

''تم جیسا۔'' اس نے بلاتکلف جواب دیا۔

''اور میں کیسا ہوں۔''

''سمندر جیسا۔''

''گویا میں اور سمندر اصل میں ایک ہیں؟'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ہاں' ساحل اور سمندر جیسے چولی اور دامن' چاند اور چکور جیسے بادل اور برسات جیسے ساز اور آواز جیسے گھنگھرو اور پاؤں جیسے......''

''جیسے انسان اور شیطان۔'' ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

وہ بھی ہنس دی۔ سرخ ہوتی دھوپ میں اس کا سفید چہرہ ایک دم گلنار ہو رہا تھا۔ تیز ہوا اس کی ریشمیں زلفوں کو اس کے چہرے پر بکھیر رہی تھی۔ ساحل عمر اس کا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔

''ساحل تمہیں ایک بات بتاؤں' مجھے شیطان بہت اٹریکٹ کرتا ہے۔'' اس نے ایک عجیب بات کہی۔

''واقعی کیا تم سنجیدہ ہو۔'' وہ تھوڑا سا پریشان ہوا۔

''ہاں' ساحل یہ ہماری عورتیں بچھو اور سانپ سے بہت ڈرتی ہیں۔ بچھو اور سانپ تو بہت بڑی بات ہے چھپکلی دیکھ کر ان کی جان نکلتی ہے لیکن میں سانپ' بچھو سے بالکل نہیں ڈرتی' چھپکلی تو خیر کوئی چیز ہی نہیں میرے لیے......'' یہ بات کہتے ہوئے اچانک اس کے چہرے میں تبدیلی آ گئی۔ کوئی ایسی تبدیلی کہ ساحل عمر کو اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا پڑیں۔ خوف کی ایک لہر اسے اپنے جسم میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

تب وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''ڈر گئے۔''

ساحل عمر ایک لمحے کو واقعی ڈر گیا تھا لیکن یہ ایسی بات تھی جو ظاہر نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''ہاں بھئی ایسی لڑکی سے جو سانپ' بچھو سے نہ ڈرتی ہو اور جسے شیطان پسند ہو' ایسی لڑکی

"سورج اپنے جلتے ہوئے بدن کے ساتھ وقت کے سمندر میں غروب ہو رہا ہے۔" وہ بولی۔

"بہت خوب...... تمہیں تو شاعرہ ہونا چاہیے۔" وہ خوشدلی سے بولا۔
"میں ہوں نا شاعرہ۔" اس نے تصدیق کی۔
"واقعی مشاعروں میں جاتی ہو؟" اس نے پوچھا۔
"میں مشاعرے نہیں پڑھتی' البتہ میری شاعری چھپتی ہے۔ جب تم میرے گھر آؤ گے تو تمہیں اپنی شاعری دکھاؤں گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔
"تمہاری پیٹھ پر ایک نشان ہے وہ کیسا ہے؟" اس نے اب وہ سوال کیا جو بہت دیر سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔
"میری پیٹھ پر بچھو کا نشان ہے اور یہ پیدائشی ہے۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا۔
"تم تصویروں کی نمائش میں اتنی دیر بعد کیوں آئیں؟" اس نے ایک اور سوال کیا جو اسے پریشان کر رہا تھا۔
"میں دیکھنا چاہتی تھی کہ تم مجھے خود سے پہچانتے ہو یا نہیں۔" ورشا مناف نے کہا۔
"لیکن تم مجھے کہیں نظر نہیں آئیں' البتہ تمہارا ذکر ضرور سنا۔"
"میرا ذکر۔" ورشا نے حیران ہو کر کہا۔ "میرا ذکر کرنے والا وہاں کون آ گیا۔"
"دو لڑکے تھے۔ ایک نے تمہاری آمد کا ذکر کیا۔ دوسرے نے اپنی آرزو بیان کی۔"
"آرزو وہ کیا؟" ورشا نے دلچسپی سے پوچھا۔
"شاید وہ مجسمہ ساز تھا' تمہارا مجسمہ بنانے کا خواہش مند تھا۔" ساحل عمر نے بتایا۔
"کون تھا وہ بدمعاش۔" ورشا نے تیکھے لہجے میں کہا۔
"جو بھی تھا...... ویسے خواہش اس کی سچی تھی۔ تم ہو ہی ایسی' جو دیکھے تمہیں پانے کی خواہش کرے چاہے مجسمے کی صورت میں' پینٹنگ کی صورت میں یا شعر کی صورت میں۔"
"لیکن میں مجسمہ بننا چاہتی ہوں نا پینٹنگ بننا چاہتی ہوں اور نہ شعر بننا چاہتی ہوں۔"
"پھر کیا بننا چاہتی ہو؟" سوال ہوا۔
"تمہاری۔" مختصر اور محبت بھرا جواب ملا۔
"اتنی جلدی فیصلہ نہ کرو آج ہماری پہلی ملاقات ہے۔" ساحل عمر نے کہا۔
"تمہاری ہو گی' میں تمہیں کافی عرصے سے جانتی ہوں' تمہاری پرانی عاشق ہوں۔"
"تم نے مجھے کہاں دیکھا؟"
"میں نے تمہیں پہلی بار تمہاری نمائش میں دیکھا۔ تمہیں یاد ہو گا تم نے اپنی ایک تصویر کی

نمائش کی تھی۔ وہ ایک انوکھی نمائش تھی۔ آرٹسٹ نمائش کے لیے بہت ساری تصویریں اکٹھا کرتے ہیں۔ کچھ نمائشیں ایسی ہوتی ہیں جن میں کئی آرٹسٹ مل کر اپنے کام کی نمائش کرتے ہیں لیکن تم نے بڑی انوکھی نماش کی۔ محض ایک تصویر۔ مگر وہ تصویر سو تصویروں پر بھاری تھی' پورا شہر اس تصویر کو دیکھنے کے لیے اُمڈ آیا تھا۔ وہ تصویر۔ ورشا مناف نے اسے معنی خیز انداز میں دیکھا۔

''ہاں بہت اچھی طرح یاد ہے' ایک بہت بڑے ریچھ کے ہاتھوں پر لیٹی لڑکی۔'' ساحل عمر نے بتایا۔

''اور وہ بھی مسکراتی ہوئی۔'' ورشا مناف یہ کہہ کر ہنسی۔ پھر چند لمحے توقف کر کے بولی۔ ''میں تو اس تصویر کو دیکھ کر دیوانی ہو گئی تھی اور پھر جب میں نے اس تصویر کے خالق کو دیکھا تو عقل کے ساتھ دل بھی گنوا بیٹھی۔ اس دن فیصلہ کر لیا کہ تمہیں تم سے چھین لوں گی۔'' یہ کہہ کر ورشا نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''اوہ...... یہ عزائم ہیں تمہارے۔'' ساحل عمر تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

''میرے عزائم کی چھوڑو' اپنے دل کی کہو۔''

''تم مجھے اچھی لگی ہو؟'' اس نے پوری سچائی سے کہا۔

''ایسا کیا ہے مجھ میں؟'' اس نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ شاید وہ اپنی تعریف سننا چاہتی تھی۔

''تم عام نہیں خاص ہو' کمیاب ہو' ذہین ہو' اچھی باتیں کرتی ہو' پرکشش لہجے کی مالک ہو' تمہاری مسکراہٹ' تمہاری ہنسی کا کوئی جواب نہیں' شاداب ہو' سمندر کی اونچی لہر ہو' سورج کی پہلی کرن ہو' کوئی حسین رقص ہو' پتھروں کا گیت ہو۔'' وہ ایک لمحے کو رکا۔ ورشا بڑی محویت سے اس کی بات سن رہی تھی۔ اس پر سرشاری چھائی تھی۔ توقف کر کے وہ پھر بولا۔ ''کچھ اور کہوں؟''

''ہاں کہتے رہو تم کہتے رہو' میں سنتی رہوں اور وقت پتھر بن جائے۔'' ورشا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''وقت تو ویسے ہی پتھر ہونے لگا ہے۔ کچھ ہی دیر میں تاریکی پھیل جائے گی۔ کچھ دکھائی نہ دے گا جب کچھ دکھائی نہ دے تو وقت گزرنے کا احساس بھی نہ رہے گا۔ یوں لگے گا جیسے ہر چیز ساکت ہو گئی ہو۔''

''آؤ چلو پھر یہاں سے چلتے ہیں۔ کہیں بیٹھ کر آئس کریم کھاتے ہیں۔ پھر تم مجھے چھوڑ دینا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''تم کہاں جاؤ گی؟'' اس نے پوچھا۔

''وہیں' جہاں ہم ملے تھے؟'' اس نے بتایا۔

''آرٹ گیلری...... لیکن کیوں؟''

''وہاں میری گاڑی کھڑی ہے۔'' ورشا مناف نے بتایا۔

''تم کون ہو؟''

"میں ورشا مناف ہوں۔"
"نہیں تم کوئی پر تجسس کہانی ہو لفظ لفظ حیرت' ہر لمحہ نیا انکشاف۔"
"کاش! تم افسانہ نگار ہوتے تو میں تم سے فرمائش کرتی مجھے لکھو۔"
"میں تمہیں پینٹ کروں گا اور ایسا پینٹ کروں گا کہ دنیا حیران رہ جائے گی۔" اس نے پر شوق لہجے میں کہا۔

"سچ......" وہ شاداں ہو کر بولی۔
"بالکل سچ' سو فی صد سچ۔" ساحل عمر نے بڑے یقین سے کہا۔ "چلو اب مجھے آئس کریم کھلاؤ۔"

آئس کریم کھا کر جب ساحل عمر نے ورشا مناف کو اس کی گاڑی میں بٹھایا اور وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے رخصت ہونے لگی تو اپنے اپنا خوبصورت ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔
"اب جلدی جلدی ملنا' دیکھو اب میں تمہارے بغیر رہ نہ پاؤں گی۔"
پھر وہ چلی گئی اور ساحل دور تک اور دیر تک اس کی گاڑی کو جاتے دیکھتا رہا۔ اس کی گاڑی تو کب کی دوسری گاڑیوں میں گم ہو چکی تھی مگر وہ ابھی وہیں سڑک پر کھڑا تھا...... گم صم......
اس کے جانے کے بعد اسے اپنی کوئی متاع عزیز گم ہونے کا احساس ہوا۔ اسے اپنا جسم خالی خالی سا لگا۔ اسے لگا جیسے کچھ ہو گیا ہے' کیا ہو گیا ہے' یہ اسے معلوم نہ تھا۔ کہیں اسے اس سے محبت تو نہیں ہو گئی؟

ویسے وہ اس قابل تھی کہ اس سے محبت کی جائے۔ وہ حسین بھی تھی اور ذہین بھی تھی۔ اسے گفتگو کرنے کا فن آتا تھا۔ اس کا انداز دلربا تھے۔ اس کی آنکھیں بولتی تھیں اور لب گنگناتے تھے۔ وہ ایک سحر تھی۔ جادو تھی' فسوں تھی...... اور کیوں نہ ہوتی وہ آخر بیٹی کس کی تھی؟
وہ ایک ہندو ماں کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں کا نام برکھا دیوی تھا۔ بنگالن تھی اس کا تعلق کلکتہ سے تھا۔ ایک ایسی سرزمین سے جو اپنے جادو کے لیے مشہور ہے۔ سحر بنگال سے کون واقف نہیں۔
ورشا مناف کا نانا یعنی برکھا دیوی کا باپ کالی داس' نام کا داس نہ تھا' وہ واقعی کالی دیوی کا غلام تھا' اس کا پجاری تھا۔ جادو' ٹونے ٹوٹکے کا ماہر...... اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ کسی محبوب کو قدموں میں گرانا ہو' کسی شوہر کو مٹھی میں لینا ہو' میاں بیوی کے درمیان جھگڑا کرانا ہو' کسی سے انتقام لینا ہو' خاندانوں میں نفاق کا بیج بونا ہو' کوئی بھی منفی کام کرایا جا سکتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ الٹے سیدھے جاپ کرتا تھا بلکہ جو لوگ اس کے پاس اپنی تشنہ آرزوئیں لے کر آتے تھے ان سے بھی وہ ایسے عمل کرواتا تھا کہ وہ انسان نہ رہتے تھے شیطان بن جاتے تھے۔
کالی داس کی ہتھیلی کی پشت پر ایک بچھو گدا ہوا تھا۔ ایسا ہی بچھو برکھا دیوی کے بازو پر بنا ہوا تھا۔ کالی داس نے اس کی عجیب انداز میں پرورش کی تھی۔ اس نے اسے انتہائی زہریلا بچھو بنا دیا تھا۔ جس کے بھی ڈنک مار دے وہ پانی مانگے بغیر ہی چل بسے۔ اس نے زندگی بھر نمک سے احتراز کیا تھا۔ وہ آج بھی نمک نہیں کھاتی تھی۔ ایک خاص عمل کر کے اور نمک سے پرہیز کر کے اس کے جسم میں کچھ

اس طرح کے اثرات پیدا ہو گئے تھے کہ اگر کوئی سانپ بچھو اسے کاٹ لے تو برکھا کا کچھ نہ بگڑتا تھا۔

برکھا جب چودہ پندرہ سال کی ہوئی تو اس محلے میں جہاں وہ رہتی تھی قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے حسن میں بارود بھرا تھا۔ وہ کسی آتش فشاں سے کم نہیں تھی۔ جو بھی اسے دیکھتا' اس کی طلب میں لگ جاتا۔ وہ میٹرک پاس لڑکی تھی۔ کالی داس نے اسے یونہی نہیں پڑھایا لکھایا تھا۔ ایسے ہی اپنا سارا کالا علم اسے نہیں سکھایا تھا۔ وہ اس سے بہت بڑے بڑے کام لینا چاہتا تھا۔

تب کالی داس نے کلکتہ چھوڑ دیا۔ اس نے بمبئی کا رخ کیا۔ وہاں ایک بہتر علاقے میں اس نے چھوٹا سا فلیٹ خریدا۔ اسے آراستہ کیا۔ پھر کالی داس ایک انگلش اخبار کے دفتر پہنچا۔ ساتھ میں اس کی دختر تھی۔ کچھ برکھا کا حسن اور کچھ کالی داس کا عمل۔ دونوں نے مل کر ایڈیٹر کو رام کیا۔ دوسرے دن برکھا کی ایک تصویر اس اخبار کے فرنٹ پیج پر چھپ گئی۔ اس تصویر کے نیچے کیپشن لگایا گیا تھا۔ مستقبل کی ہیروئن اپنے فلساز کی تلاش میں۔ وہ ایک زبردست تصویر تھی۔ برکھا حسین تو تھی ہی' اس تصویر میں وہ نیم عریاں بھی تھی۔ اس نیم عریاں حسن نے قیامت ڈھا دی۔

اس سے پہلے کہ کوئی پروڈیوسر اس کی طرف متوجہ ہوتا' اس اخبار کا مالک سروپ رائے اس تصویر کو دیکھ کر دیوانہ ہو گیا۔ سروپ رائے نے اخبار کے ایڈیٹر سے کچھ نہ کہا تاکہ اس کا بھرم برقرار رہے۔ اس نے اپنے اخبار کے ایک سب ایڈیٹر کو طلب کر لیا۔ اس سب ایڈیٹر شانتی لال سے جو اس کے اعتماد کا آدمی تھی' بالا ہی بالا برکھا کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں اور وہ اسی شام شانتی لال کو اپنے ساتھ لے کر کالی داس کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ کالیداس کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا' اسے توقع نہ تھی کہ تصویر چھپتے ہی کوئی شخص اپنی عقل میز کی دراز میں رکھ کر اس کے گھر پر دوڑا چلا آئے گا اور وہ بھی ایک اخبار کا مالک۔ سروپ رائے محض ایک اخبار کا مالک نہ تھا' اس کے کئی بزنس تھے۔ اس نے ایک دو فلموں میں بھی سرمایہ کاری کی ہوئی تھی۔ وہ پچاس سال کا انتہائی بدصورت شخص تھا۔ اس کی آواز تک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بولتا تو یوں لگتا جیسے کوئی گدھا رینگ رہا ہو۔ بڑی مشکل سے اس کی بات سمجھ میں آتی۔

لیکن سروپ رائے کو بات کرنے اور اپنی بات سمجھانے کا بڑا سلیقہ تھا۔ اس شام بھی جب برکھا کالی ساڑھی باندھے' بغیر آستین کے چھوٹے سے بلاؤز میں اس کے سامنے آئی تو سروپ رائے نے کوئی بات نہ کی۔ اس نے اپنا بیگ کھول کر پہلے سے ٹائپ شدہ کنٹریکٹ نکال کر برکھا کے باپ کے سامنے رکھ دیا۔ پہلی بال پر ہی چھکا لگ گیا تھا۔ یہ ایک شاندار معاہدہ تھا جس کے تحت بنگلہ گاڑی مع ڈرائیور' دس ہزار روپے ماہانہ اور ایک فلم میں ہیروئن کا چانس دیا جا رہا تھا۔

کالی داس نے اس معاہدے پر آنکھ بند کر کے دستخط کر دیئے اور تیسرے دن سروپ رائے نے اپنے معاہدے پر عمل کرتے ہوئے ساحل سمندر کے ایک پوش علاقے کے بنگلے میں انہیں منتقل کر دیا۔

سروپ رائے اپنے کو بڑا کائیاں سمجھتا تھا۔ سمجھتا کیا تھا وہ تھا بھی بڑا چلتا پرزہ۔ وہ ایک قلی کا بیٹا تھا لیکن آج اس کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ وہ آج اس شہر کی سرکلر ریلوے کو خرید سکتا تھا اور یہ

پیسہ اس نے اپنی چالبازیوں سے کمایا تھا۔ جس اخبار کا وہ مالک تھا' اس اخبار کا کام محض بلیک میلنگ تھا۔ لوگوں کے راز جان کر انہیں اپنا مطیع بنانا' یہ تھا اس اخبار کا مشن۔

سروپ رائے ایک عیاش آدمی تھا۔ خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ اس طرح کے معاہدے کرنا اس کا معمول تھا۔ معاہدہ دو تین سال کا کرتا تھا لیکن تین ماہ سے زیادہ وہ کسی لڑکی کو اپنے دل کے بنگلے میں نہ رکھتا تھا۔ جس طرح وہ اچانک لڑکیوں پر نوٹوں کی بارش کرتا تھا' بالکل ویسے ہی ایک دن اچانک ان کے سر سے چھت کھینچ لیتا تھا' وہ بیچاری فٹ پاتھ پر بیٹھی نظر آتی تھیں اور اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھیں۔

سروپ رائے برکھا کو پا کر بہت خوش تھا۔ پہلی بار اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس معاہدے کو تین ماہ کے بجائے چھ ماہ چلنا چاہیے لیکن کالی داس کچھ اور سوچ رہا تھا' وہ اسے تین ماہ سے زیادہ کی مہلت دینا چاہتا تھا۔ سروپ رائے اس کا پہلا بڑا شکار تھا۔

سروپ رائے روز ہی بنگلے پر آتا تھا اور برکھا کو اپنے ساتھ مختلف پارٹیوں میں لے جاتا تھا۔ بڑے سرکاری عہدیداروں' بڑے بزنس مینوں اور بڑے سیاستدانوں سے ملاقات کے دوران وہ برکھا کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ اسے اپنی پرائیویٹ سیکرٹری ظاہر کرتا تھا۔ ہفتے میں ایک رات وہ بنگلے پر گزارتا تھا اور یہی رات برکھا کے لیے قیام کی ہوتی تھی۔ سروپ رائے کے ساتھ تنہائی میں وقت گزارنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ پیسہ بڑی چیز ہے اور پیسہ بری چیز بھی ہے جو آدمی سے اس کی مرضی کے خلاف بہت کچھ کرا لیتا ہے وہ بھی مجبور تھی۔ اس کے باپ نے کہا تھا کہ وہ بس تین ماہ صبر کرے' وہ تین ماہ میں اس کے نیچے سے زمین کھینچ لے گا۔

اس بنگلے میں آنے کے پندرہ دن بعد ایک بے چاندرات میں کالی داس نے سروپ رائے کی تصویر پر عمل شروع کیا۔ یہ تصویر برکھا نے بڑا اصرار کر کے سروپ رائے سے منگوائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ جب تم بنگلے پر نہیں ہوتے تو میں اس تصویر سے ہی باتیں کر لیا کروں گی اور وہ شاطر کھلاڑی اس بات کو سچ سمجھ بیٹھا تھا۔ اس نے دوسرے ہی دن اپنی ایک بڑی تصویر فریم کروا کر اس کے حوالے کر دی تھی۔

اب وہی تصویر فریم سے نکال لی گئی تھی۔ رات کے دو بجے تھے۔ کالی داس آلتی پالتی مارے اپنے ہاتھ میں اس کی تصویر لیے کسی جاپ میں مصروف تھا۔ جاپ سے فارغ ہو کر اس نے زمین پر ایک دائرہ کھینچا اور تصویر اس کے درمیان میں رکھ دی۔ برکھا نزدیک ہی بیٹھی تھی۔ باپ کے اشارہ کرنے پر وہ اٹھی اور ایک خالی سرنج جو میز پر رکھی تھی کالی داس کے حوالے کر دی۔ کالی داس نے سرنج اپنے ہاتھ میں لے کر برکھا سے اپنا بازو نزدیک لانے کے لیے اشارہ کیا۔ برکھا نے اپنا بازو جس پر بچھو بنا ہوا تھا کالی داس کی طرف بڑھا دیا اور اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کالی داس نے سرنج ٹھیک بچھو کے منہ پر رکھی اور گوشت میں داخل کر دی۔ پھر اس نے آدھی سرنج کے قریب برکھا کا خون نکال لیا۔

پھر اس نے خون کو روئی کے ذریعے سروپ رائے کی پوری تصویر پر مل دیا اور برکھا کو

کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ برکھا کے کمرے سے چلے جانے کے بعد آدھے گھنٹے تک وہ تصویر پر کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکتا رہا۔

کچھ ہی دیر میں کمرے کے مختلف کونوں سے بچھو نکل نکل کر آنے لگے۔ بچھوؤں کو دیکھ کر کالی داس اس دائرے سے کافی پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا جس میں سروپ رائے کی تصویر رکھی تھی۔ بچھو ایک ایک کر کے اس تصویر پر جمع ہونے لگے۔ جب اتنے بچھو اس تصویر پر جمع ہو گئے کہ وہ ساری بچھوؤں سے ڈھک گئی تو کالی داس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ بڑی آہستگی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا اور اس نے کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا۔

پھر اس نے برکھا کے کمرے میں جھانکا۔ وہ ابھی جاگ رہی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو کمرے میں جھانکتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا باپو؟''

''اعوروں نے اس اس کی تصویر کو گھیر لیا ہے۔ صبح تک کچھ نہ بچے گا۔'' کالی داس نے خوشی سے کہا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

صبح تڑکے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ ابھی سورج نہ نکلا تھا۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی اس نے بند کمرہ کھولنا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا بند کمرے کی طرف چلا۔

تالا کھول کر وہ تیزی سے تصویر کی طرف بڑھا۔ اب تصویر پر ایک بچھو بھی نہ تھا۔ وہ تصویر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا بچھو اپنا کام کر کے جا چکے تھے۔

اب وہاں سرپ رائے کی تصویر نہ تھی بس ایک سفید کاغذ تھا۔ تصویر کو بچھوؤں نے کھا لیا تھا۔

اس سفید کاغذ کو اس نے چار برابر کے ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور ماچس نکال کر ان کاغذ کے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے جلانے لگا۔ پھر اس نے کاغذ کے ان ٹکڑوں کی راکھ ایک شیشی میں احتیاط سے جمع کر لی اور خوشی سے نعرہ لگایا۔ ''جے کالی۔''

پھر یہ راکھ بھری شیشی کالی داس نے برکھا کے حوالے کر دی اور اسے بتا دیا کہ کیا کرنا ہے۔ اسی شام جب سروپ رائے اسے کسی تقریب میں لے جانے کے لیے آیا تو برکھا نے بڑے پریم سے اس کے لیے کافی بنائی' کافی میں اپنے باپو کی حسب ہدایت' اس کی تصویر کی دو چاول بھر راکھ ملائی اور اپنے ہاتھوں سے پلا دی۔ یہ تو خیر راکھ ملی کافی تھی اگر وہ اسے زہریلی کافی بھی پلا دیتی تو وہ پینے سے انکار نہ کرتا۔ وہ چیز ہی ایسی تھی۔

پندرہ بیس دن کے اندر وہ راکھ سروپ رائے کے پیٹ میں جا کر خون میں سرایت کر گئی اور وہ جو خود کو بڑا شاطر کھلاڑی سمجھتا تھا' مات کھا گیا اور مات بھی ایسی کہ اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ اس کے ساتھ ہو کیا گیا ہے۔

تین ماہ کے اندر برکھا نے اس سے جو چاہا حاصل کر لیا اور وہ کسی معمول کی طرح کاغذات پر دستخط کرتا رہا۔ بنگلہ' گاڑی اور ایک لمبی رقم اپنے نام کرا لی۔

پھر وہ قاتل شام آئی۔ ابھی تک تو یوں ہوتا رہا تھا کہ سروپ رائے جب کسی لڑکی سے اکتا

مسلح غنڈے بھیج کر اس لڑکی سے اپنا بنگلہ خالی کرا لیتا۔ وہ لڑکی اور اس کے لواحقین کو جاتا تو وہ اپنے بنگلے کو تالا لگاتے اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو سڑک پر بٹھا کر لڑکی کے سر سے اچانک چھت کھینچ لی جاتی۔ ابھی وہ لڑکی اور اس کے گھر والے سمجھ جاتے۔ اس طرح ہوتے کہ یہ ان کے ساتھ ہو کیا رہا ہے کہ اتنے میں وہاں پولیس کی جیپ آ جاتی اور اتنے ہی رہے بیٹھ کے بنگلے پر دھرنا مار کر بیٹھنے والوں کو مشکوک جان کر پولیس اسٹیشن جانے کی دھمکی دیتی تو وہ بڑے لوگ اس نئی معیت سے بچنے کے لیے وہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت جانتے اور یوں تین ماہ کے عیش کسی بھیانک خواب کی صورت میں ظاہر ہوتے۔

لیکن آج اس کے الٹ ہوا' وہ ہوا جس کا سروپ رائے تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس قاتل شام جب وہ برکھا کے بنگلے پر پہنچا تو دو گورکھا محافظوں نے جو بندوقوں سے لیس تھے اس کی گاڑی کو اندر جانے سے روک لیا۔

"تم اندر نہیں جا سکتا۔" ایک گورکھا محافظ نے اپنی خونخوار مونچھوں کو مروڑ کر کہا۔

"کیا بکتا ہے تو جانتا نہیں کہ میں کون ہوں۔" سروپ رائے اپنی بیٹھی آواز میں بولا۔

"تم کوئی بھی ہووے اندر نہیں جا سکتا' رانی جی نے منع کیا ہے۔"

"رانی جی...... ! کون رانی جانی؟"

"برکھا رانی جی۔"

"اندر جا کر برکھا کو بولو کہ سروپ سیٹھ آئے ہیں۔"

"تم ادر گاڑی میں بیٹھو' ہم رانی جی سے بات کر کے آتا ہے۔" دوسرے گورکھا محافظ نے کہا۔

"ٹھیک ہے جاؤ...... پوچھو۔" سروپ رائے غصے سے بولا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ گورکھا محافظ واپس آیا تو اس نے بڑی سختی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"صاب' تم ادھر سے جاؤ' وہ تم کو نہیں جانتی۔"

"مجھ کو نہیں جانتی۔ یہ بنگلہ' گاڑی یہ سب ٹھاٹھ باٹ میں نے اس کو دیا ہے۔"

"یہ کوئی پاگل آدمی معلوم ہوتا ہے آؤ اندر آ جاؤ' گیٹ بند کر لیتے ہیں۔ یہ کچھ دیر خود ہی بھونک کر یہاں سے چلا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے محافظ کو اندر لے گیا اور انہوں نے اندر جا کر واقعی گیٹ بند کر لیا۔ سروپ رائے سناٹے میں آ گیا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے اپنا دل تھام لیا۔

پھر اس نے زور زور سے بیل بجائی' زور زور سے گیٹ پیٹا اور اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں گلوگیر ہو کر کہا۔ "برکھا دروازہ کھولو' دیکھو ایسا مت کرو' مجھ سے اور جو چاہے لے لو مگر مجھے خود سے محروم نہ کرو' میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔ تم نے جانے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے۔"

جواب میں اندر سے خونخوار کتے کے بھونکنے کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دی۔

اس نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ وہ روتا رہا اور کہتا رہا۔ ''بھگوان کے واسطے برکھا مجھے ایک بار اپنی شکل دکھا دو' مجھ سے میرا سب کچھ لے لو۔''

روتے روتے اس پر دل کا دورہ پڑا۔ اس کا ڈرائیور اسے اسپتال لے کر پہنچا مگر وہ اتنا شدید تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ جس طرح سروپ رائے دوسری لڑکیوں کے سر سے چھت کھینچ کر انہیں بے آسرا کر دیتا تھا ویسے ہی کالی داس نے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی اور اب وہ شمشان گھاٹ میں چندن کی لکڑیوں پر لیٹا جل رہا تھا۔

جو لوگ دوسروں کو جلاتے ہیں بالآخر خود انہیں بھی جلنا پڑتا ہے۔ یہی قانون قدرت ہے۔

اگرچہ بنگلہ' گاڑی اور بینک بیلنس خود اپنی مرضی سے سروپ رائے نے برکھا کو بخشا تھا' اس سلسلے میں کوئی پریشانی والی بات نہ تھی پھر بھی کالی داس نے اس بنگلے میں رہنا پسند نہ کیا۔ بنگلہ گاڑی بیچ کر اس نے ایک اچھے علاقے میں فلیٹ خرید لیا۔ گاڑی بھی دوسری لے لی۔

تین ماہ قبل جب سروپ رائے نے برکھا کو بنگلہ اور گاڑی دی تو گاڑی کے ساتھ ایک ڈرائیور بھی دیا تھا۔ اس ڈرائیور کا نام مناف تھا۔ یہ ڈھاکہ کا رہنے والا تھا اور ایک غریب مسلمان گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ بمبئی ہیرو بننے آیا تھا۔ وہ ایک پرکشش نوجوان تھا۔ ہیرو بننے کے قابل تھا لیکن قسمت میں اس کے فلم لائن نہ تھی۔ وہ ہیرو بننے کے بجائے ڈرائیور بن گیا۔ تھوڑا پڑھا لکھا تھا۔ مہذب اور شائستہ تھا۔ سروپ رائے اسے ذاتی طور پر بہت پسند کرتا تھا' اس لیے وہ اسے اپنی گاڑی پر ہی رکھتا تھا۔ اعتماد کا آدمی تھا۔ جب سروپ رائے کوئی نیا پنچھی پنجرے میں بند کرتا تو اپنی گاڑی کے ساتھ مناف کو ہی بھیجتا تھا اور جب پنچھی کو آزاد کرنا ہوتا تو یہ کام وہ مناف کے ذریعے کروایا کرتا تھا۔

مناف سروپ رائے کا کل وقتی ملازم تھا۔ جب اس نے گاڑی برکھا کے حوالے کی تو مناف بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے بنگلے کے سرونٹ کوارٹر میں رہائش اختیار کر لی۔ ڈرائیور کے ساتھ وہ ایک طرح کا نگراں بھی تھا۔ وہ بنگلے اور بنگلے کے مکینوں پر نظر رکھتا تھا۔ لڑکی کہاں جا رہی ہے' کس سے مل رہی ہے' کون لوگ اور کس طرح کے لوگ بنگلے پر آتے ہیں۔ یہ سب رپورٹ مناف سروپ رائے کو پہنچایا کرتا تھا لیکن برکھا کے کیس میں مناف کی کھوپڑی بھی گھوم گئی۔ وہ سروپ رائے کو برکھا کے بارے میں رپورٹ دینے کے بجائے برکھا کو سروپ رائے کے بارے میں بتانے لگا۔

جس دن یہ لوگ بنگلے میں منتقل ہوئے اس کے دوسرے دن کی بات ہے۔ صبح ہی صبح سروپ رائے کا فون آیا۔ اسے مناف کی ضرورت تھی۔ اس نے برکھا سے کہا کہ وہ ذرا اسے جا کر پیغام دے دے۔ برکھا نے اس کے کوارٹر پر جا کر دروازے پر دستک دی تو اس نے فوراً ہی دروازہ نہ کھولا۔ شاید وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ بار بار دستک دینے پر کچھ دیر کے بعد جب وہ دروازے پر آیا تو راز کھلا کہ اس نے اتنی دیر سے دروازہ کیوں کھولا۔

اور یہ جو کچھ بھی ہوا بس اچانک ہی ہوا۔

مناف کو توقع نہ تھی کہ دوسرے دن ہی اتنی صبح وہ اس کے دروازے پر آ جائے گی اور نہ

برکھا کو یہ معلوم تھا کہ دوسرے دن ہی وہ اپنے ڈرائیور کو ایسی حالت میں دیکھ لے گی کہ اپنے ہوش گنوا بیٹھے گی۔

☆......☆......☆

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے لیکن یہ ہمیشہ نہیں ہوتا اور ہر ایک کے ساتھ نہیں ہوتا' زندگی میں ایک لمحہ ایسا بھی آ جاتا ہے جب اچانک ہی دل کے فریم میں کوئی عورت یا مرد فٹ ہو جاتا ہے۔ ایسا فٹ کہ دل دھڑکنا بھول جاتا ہے۔

اس لمحے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ برکھا پر وہ لمحہ کسی بوند کی طرح برسا اور اسے شرابور کر گیا۔

مناف اس وقت نہا کر نکلا تھا۔ دستک کی آواز سن کر وہ تولیہ سر پر رگڑتا' تہبند باندھے دروازے پر آ پہنچا تھا۔ اس نے ایک دم دروازہ کھولا تو سامنے برکھا کو کھڑے پایا۔

سروپ رائے کا ٹیلی فون سن کر وہ ایسے ہی کمرے سے نکل آئی تھی۔ راستے میں اس نے اپنے لمبے ریشمیں بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا تھا اور ساڑھی کا پلو یونہی کمر کے گرد کس لیا تھا۔ اسکی سادگی غضب ڈھا رہی تھی۔

مناف نے اسے ایک نظر دیکھا تو نظریں نیچی کرنا بھول گیا۔

مناف ایک خوبصورت نوجوان تو تھا ہی...... لیکن اس کا جسم بھی کسی سنگی مجسمے کی طرح ترشا ہوا تھا۔ پانی کی بوندیں اس کے جسم پر جگہ جگہ پڑی ہوئی تھیں۔ سینہ کالے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ چار خانے کا کالا اور سرخ تہبند باندھے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ اسکا سر پر تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے دروازہ کھولا تھا۔

برکھا کی اس پر نظر پڑی تو اس کا دل ایک لمحے کو ساکت ہو گیا۔ اسی وقت پریم دیوتا حرکت میں آیا۔ اسنے تیر چلایا جو برکھا کے دل میں ترازو ہو گیا۔ برکھا کے دل کی سلیٹ ابھی بالکل صاف تھی کہ مناف کا نقش اس پر منقل ہو گیا۔

برکھا سروپ رائے کا پیغام دے کر فوراً وہاں سے چلی آئی۔ اس نے ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کے دل پر کیا بیت گئی ہے لیکن یہ ایسی بات تھی جو چھپائے نہ چھپ سکتی تھی۔ اگرچہ مناف کے دل میں بھی آگ بھڑک اٹھی تھی لیکن وہ اپنی اوقات جانتا تھا لہٰذا اس نے اپنی اس آگ کو زیادہ ہوا نہ لگنے دی...... لیکن یہ وہ آگ تھی جو بجھائے نہ بجھ سکتی تھی۔

محبت کی آگ پر محبوب کی دید اور قربت پیٹرول کا کام کرتی ہے۔ تین ماہ کسی محبت کے پھلنے پھولنے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ پھر اگر اسی دوران کوئی رات ایسی بھی آ جائے جو سیلاب بلا بن کر ان پر ٹوٹے اور جذبات کے کمزور بند خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔

اس دن رات کو برکھا ایک تقریب میں سروپ رائے کے ساتھ رہی۔ یہ ایک بڑے لوگوں کی پارٹی تھی۔ اس پارٹی میں برکھا کو ساقی گری بھی کرنا پڑی۔ اب یہ کوئی اس کے لیے مشکل کام نہ تھا لیکن اس پارٹی میں ایک مشکل یہ ہوئی کہ پینے والے نے ضد کر کے اسے بھی تھوڑی سی پلا دی۔

برکھا کے لیے یہ تھوڑی بھی بہت تھی۔

سروپ رائے نے اس کے ڈگمگاتے قدموں کو دیکھا تو اسے لے کر وہاں سے نکل آیا۔ پھر وہ راستے میں اپنے گھر پر اتر گیا اور مناف برکھا کو لے کر بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

بنگلے پر پہنچ کر اس نے بمشکل برکھا کو گاڑی سے اتارا اور اس کے بیڈروم تک پہنچایا۔ اتنے میں بادل گرجنے لگے اور بارش شروع ہو گئی۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ برکھا کا باپ کالی داس اپنے کمرے میں میٹھی نیند سو رہا تھا۔ وہ جلدی سونے کا عادی تھی۔ مناف جب برکھا کو بیڈ پر سیدھا لٹا کر اس کے کمرے سے باہر نکلنے لگا تو اسی وقت زور سے بجلی کڑکی برکھا خوفزدہ ہو کر چیخی اور بیڈ سے اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی طرف چلی' مناف اگر دوڑ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ نہ لیتا تو وہ زمین پر گر جاتی۔

پھر اس کے بعد بارش کچھ اس طرح ٹوٹ کر برسی کہ زمین آسمان ایک ہو گئے۔

اس رات کی بات نہ سروپ رائے جان سکا نہ برکھا کا باپ کالی داس۔ بنگلہ اور گاڑی بیچ کر جب کالی داس اس علاقے سے نکلا تو مناف اس کے ساتھ ہی تھا۔ کالی داس اسے پسند کرنے لگا تھا۔ اگرچہ مناف مسلمان تھا اس کے باوجود اسے چھوڑنے کے لیے راضی نہ تھا۔ اصل میں بمبئی شہر کالی داس کے لیے اجنبی تھا جبکہ مناف اس کے چپے چپے سے واقف تھا اور اس نے بنگلہ برکھا کے نام کرانے سے اسے فروخت کرنے تک بھرپور مدد کی تھی۔ کالی داس' مناف کے بغیر ادھورا تھا اور یہی حال اس کی بیٹی کا تھا وہ بھی اس کے بغیر ادھوری تھی۔

پھر اس رات ایک عجب تماشا ہوا۔

اس رات برکھا اپنے باپو کے پاؤں دبا رہی تھی اور اس کا باپو کالی داس بڑی آسودگی سے آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ تب برکھا نے وہ بات کہی جو اس کی روح میں شگاف ڈال گئی۔

''باپو ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانو گے۔''

''نہیں کہو چندا تمہاری بات نہیں سنوں گا تو پھر کس کی سنوں گا۔''

''باپو میں مناف کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں اس سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔'' برکھا نے انتہائی خطرناک بات بڑے اطمینان سے کہہ دی۔

یہ بات سن کر کالی داس کے جسم میں ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے بہت سے بچھو اس کے جسم پر چڑھ آئے ہوں۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنے پیر پیچھے کھینچ لیے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیا کہا تو نے؟ اس نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''ایسے گندے شبد نکالنے سے پہلے تو ستی کیوں نہ ہو گئی۔''

''باپو' کیا کہتے ہو۔ ابھی میرا بیاہ ہوا ہے نہ میرے پتی کا دیہانت ہوا' نہ میں بیوہ ہوئی پھر میں ستی کس پر ہوں۔ باپو تم تو جانتے ہو کہ ہندو ناری بیوہ ہونے کے بعد پتی کی چتا کے ساتھ جلتی ہے۔ ستی ہوتی ہے۔''

''میں تجھے بیاہ سے پہلے ہی بیوہ کر دیتا ہوں تو مجھے جانتی نہیں ہے۔'' وہ سانپ کی طرح

دھتکارا۔ وہ اصل میں دونوں ہی ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ باپ ایسا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو کالی ماں کے چرنوں میں بھینٹ تو چڑھا سکتا تھا لیکن ایک مسلمان مرد کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ نہیں دے سکتا تھا اور وہ ایسی بیٹی تھی جو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے باپ کو تو چھوڑ سکتی تھی لیکن اپنے محبوب کو چھوڑنا اس کے بس میں نہ تھا۔ دونوں نے مل کر بڑی خاموشی سے منصوبہ بندی کی اور بینک سے پانچ لاکھ روپے نکلوا کر وہ راتوں رات بمبئی کی حدود سے نکل آئے۔

صبح جب کالی داس سو کر اٹھا تو اس کے دل کی دنیا لٹ چکی تھی۔ ایک پرچہ اس کے تکیے کے پاس رکھا ہوا تھا۔ برکھا نے لکھا تھا۔ ''باپو! مجھے چھما کر دینا' میں مناف کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میں اب اس کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ آپ کی بیٹی برکھا۔''

کالی داس نے خط پڑھ کر غصے میں اسے چاک کر دینا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ اس نے وہ پرچہ تہہ کر کے ڈال دیا اور آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ ''برکھا! تو کالی داس کو نہیں جانتی۔ تو نے میرا سکھ لوٹا ہے میں تیرا چین لوٹوں گا۔ تو اگر پاتال میں بھی چلی جائے گی تو وہاں سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ اب تو میرا انتظار کر۔''

کالی داس کو اس طرح برکھا کے ہاتھ سے نکل جانے کا انتہائی دکھ تھا۔ وہ اس کی پوری زندگی کی جمع پونجی تھی۔ اس نے اس پر بہت محنت کی تھی۔ وہ اس کی سرمایہ حیات تھی۔ تجوری تھی بینک بیلنس تھی۔ جسے اس گھر کا ڈرائیور لوٹ کر لے گیا تھا۔ اس نے سوچا۔ اصل قصوروار تو مناف ہے۔ وہ اسے ہرگز زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ اسے ایسا مزہ چکھائے گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔

برکھا اور مناف دہلی پہنچ کر زندگی کے مزے لوٹ رہے تھے۔ دہلی میں مناف کے کچھ دور کے رشتے دار تھے اس لیے اس نے دہلی کا رخ کیا تھا۔ وہ جان بوجھ کر ڈھاکا نہیں گیا تھا اسے معلوم تھا کہ کالی داس اپنی بیٹی کے یوں ہاتھ سے نکل جانے پر ہرگز چین سے نہیں بیٹھے گا اور ڈھاکا کا پتہ معلوم کر لینا اس کے لیے کچھ مشکل نہ ہوگا۔ اس لیے اس نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔ وہ سیدھا دہلی پہنچا۔ دہلی میں اس کے رشتے کے چچا تھے۔ ان کے یہاں قیام کیا۔ انہیں ساری صورت حال بتائی۔ انہیں صاف صاف بتا دیا کہ وہ بمبئی سے ایک ہندو لڑکی لے آیا ہے۔ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکی مسلمان ہونے کے لیے راضی ہے۔

برکھا مسلمان ہو گئی۔ دونوں کا نکاح ہو گیا۔ انہوں نے دریا گنج میں ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ ان کے پاس پانچ لاکھ روپے تھے جس زمانے کی یہ بات ہے اس وقت پانچ لاکھ روپے ایک بھاری رقم تھی۔ ایک ماہ انہوں نے خوب سیر کی۔ برکھا اس کے ساتھ بہت خوش تھی۔ مناف کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اسے دینے والے نے چھپر پھاڑ کر دیا تھا۔ ایک حسین لڑکی اور بھاری رقم۔

سیر و تفریح کے بعد مناف نے ایک بڑا جنرل اسٹور کھول لیا۔ دو لڑکے ملازم رکھ لیے۔ وہ محنتی تھا' خوش اخلاق تھا۔ لوگوں سے گفتگو کا سلیقہ جانتا تھا۔ لہٰذا بہت جلد اس کا جنرل اسٹور چل پڑا۔

ایک سال کے بعد ان کی پرسکون زندگی میں شور و غوغا اٹھا۔ ایک پیاری سی بچی نے جنم

لیا۔ اس کا نام برکھا نے کرن رکھا۔ کرن کے بعد تو جیسے لڑکیوں نے ان کا گھر دیکھ لیا۔
لڑکیوں کا گھر دیکھ لینا تو خیر سے کوئی عذاب ناک مسئلہ نہ تھا۔ عذاب ناک مسئلہ تو اس وقت بنا جب کالی داس ایک دن اچانک ان کے گھر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔
دوپہر کا وقت تھا کہ کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ مناف اس وقت گھر پر ہی تھی۔ وہ دوپہر کا کھانا گھر پر ہی کھاتا تھا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جنرل اسٹور کا رخ کرتا تھا۔ مناف نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے ایک قیامت کو کھڑے پایا۔
کالی داس کی آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''حرام خور تو کیا سمجھتا تھا کہ میں تجھے ڈھونڈ نہ پاؤں گا۔ تو بڑا کمینہ نکلا۔ جس ہانڈی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔ بول کہاں ہے میری بیٹی۔ بلا اس کو باہر اس جنم جلی کی ذرا میں شکل دیکھ لوں اور اسے اپنی صورت دکھا دوں۔ فیصلے کی گھڑی اب زیادہ دور نہیں' چل جلدی کر۔''
مناف کا ذہن ایک دم ماؤف ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا۔ یہ منحوس کالی داس اچانک کہاں سے آ ٹپکا۔ اب وہ کیا کرے' کیا وہ اندر جا کر دروازہ بند کر لے اور پھر ساری صورت حال برکھا کو بتائے یا یہیں سے آواز دے کر برکھا کو دروازے پر بلائے۔ تب اس کے دماغ میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا کہ اسے اندر جا کر دروازہ بند کر لینا چاہیے تا کہ یہ منحوس گھر میں داخل نہ ہو سکے۔ ایسا سوچ کر وہ گھر میں داخل ہوا اور پھر اس نے بہت تیزی سے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔
''جا جو کہتا ہوں وہ کر اسے جنم جلی کو لا باہر بلا کر۔'' کالی داس نے سخت لہجے میں کہا۔
تب مناف نے گھبرا کر وہیں سے آواز لگائی۔ ''اے برکھا باہر آؤ۔''
اس کی آواز سن کر برکھا فوراً باہر آئی۔ اس نے برآمدے سے باہر دو دروازے کی طرف دیکھا تو پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ وہ آگے آ سکی نہ پیچھے جا سکی۔
اس وقت کالی داس نے اپنے کرتے کی جیب سے کچھ نکالا اور جس طرح کسی کو پتھر مارتے ہیں ویسے ہی اس نے کوئی چیز پھینک کر ماری لیکن کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ البتہ برکھا اس عمل کے بعد فوراً وہیں کھڑی کھڑی گر پڑی۔ یہ دیکھ کر اس نے بھیانک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''اس وقت میں جاتا ہوں۔ رات کو ٹھیک بارہ بجے آؤں گا اور برکھا کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ پہلے اس سے اپنا حساب چکالوں پھر تجھ سے نمٹوں گا۔''
پھر وہ مڑا اور تیز تیز قدموں سے گلی عبور کر گیا۔ اس کے جانے کے عد مناف نے فوراً دروازہ بند کیا۔ اس مرتبہ دروازہ بند کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ برکھا برآمدے کے فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ مناف اس کے نزدیک پہنچا تو وہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی اٹھ گئی۔
''باپو چلے گئے۔'' وہ بمشکل بولی۔
''ہاں۔'' مناف کا دم ابھی اندر ہی تھا۔ اس نے اپنا سانس باہر نکالا۔
''یہ بہت برا ہوا۔'' برکھا اسے بے نور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر

زردی کھنڈ گئی تھی۔ اس کا شاداب چہرہ برسوں کا بیمار دکھائی دے رہا تھا۔ ''میرے دل کو دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں باپو نہ آ پہنچے۔ بالآخر ایسا ہی ہوا' وہ آ پہنچا۔''

''باپو نے یہ گھر کیسے ڈھونڈ لیا مجھے حیرت ہے۔'' مناف واقعی حیرت زدہ تھا۔

''باپو سب کچھ کر سکتا ہے اس کے لیے یہ کام مشکل نہیں۔ اس کے لیے اس نے کوئی جاپ کیا ہو گا۔''

''اب کیا ہو گا۔ وہ رات کا کہہ کر گیا ہے۔ چلو برکھا جلدی کرو۔ ابھی رات بہت دور ہے۔ ہم یہاں سے نکل جاتے ہیں۔''

''اب کچھ نہیں ہو سکتا مناف...... بہت دیر ہو چکی۔ میں اب اس کی گرفت میں ہوں۔ اس گھر کی چار دیواری سے قدم باہر نکالوں گی تو میرا کلیجہ کٹ جائے گا۔ مجھے خون کی ایک الٹی آئے گی اور میں چل بسوں گی۔ وہ رات کو آئے گا۔ میرا ہاتھ پکڑے گا اور لے جائے گا۔ مجھے لے جانے سے پہلے وہ تمہارا احساب کتاب کرے گا۔ وہ تمہیں کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا۔ ایسا کرو تم کرن کو لے کر نکل جاؤ۔ میں زندہ رہی تو تم سے آ ملوں گی ورنہ پھر اس کو آخری ملاقات سمجھنا۔'' برکھا کے لہجے میں ایسا دکھ تھا کہ مناف کا دل بھر آیا۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''نہیں برکھا...... میں کہیں نہیں جاؤں گا ہم ساتھ جئے ہیں تو ساتھ ہی مریں گے۔''

''ہماری بیٹی کرن کا کیا ہو گا؟'' وہ فکر مند ہو کر بولی۔

''اسے میں چچا کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔'' مناف نے تجویز پیش کی۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ کرن کے ساتھ اس گھر میں جتنی نقدی اور زیورات وغیرہ ہیں وہ بھی میں باندھ کر دے دیتی ہوں۔ چچا کے حوالے کر آنا۔ ویسے اگر تم واپس نہ آؤ تو اچھا ہے۔ میں......''

برکھا جملہ پورا نہ کر سکی۔ مناف نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ ''بس جلدی سے کرن کو تیار کر دو اور جو دینا ہے دے دو۔ میں چچا کے حوالے کر کے فوراً واپس آتا ہوں۔ اتنی دیر میں تم اپنے باپو کے عمل کا توڑ سوچو۔ آخر تمہیں بھی تو بہت کچھ آتا ہے۔''

برکھا خاموشی سے اٹھی۔ اس نے جلدی جلدی گھر میں رکھی نقدی اور زیورات کو سمیٹا۔ کرن کے کپڑے اکٹھا کیے۔ اس کی ضرورت کا سامان جمع کیا اور یہ سب ایک بیگ میں رکھ کر مناف کے حوالے کیا۔ پھر اس نے اپنی سوتی ہوئی بیٹی کو چوما اور مناف کی گود میں دے کر بولی۔ ''جاؤ جلدی کرو۔''

کرن کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے باپ سے چمٹ گئی۔ برکھا ان دونوں کو چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئی۔ کرن اپنے باپ کے کاندھے سے لگی برکھا کو دیکھ رہی تھی۔ برکھا اسے اپنی نظروں میں بھر لینا چاہتی تھی۔

ابھی مناف دو چار قدم آگے ہی بڑھا تھا کہ اسے احساس ہوا جیسے وہ جلتی آگ پر چل رہا ہو۔ پھر ایک دم ہی اس کی قمیض کے پچھلے دامن میں آگ بھڑک اٹھی۔ برکھا نے آگ لگتی دیکھی تو وہ

فوراً چیخی۔ ''مناف آگے مت جانا۔''
مناف کو خود آگ کا احساس ہوا تھا برکھا چیخی تو وہ فوراً ہی پلٹ کر گھر میں واپس آ گیا۔ برکھا نے آگے بڑھ کر اس کے دامن کو دونوں ہاتھوں میں لے کر مسل دیا۔ تھوڑا دامن جل گیا لیکن آگ بجھ گئی۔

''باپو پکا کام کر کے گیا ہے۔ ہم میں سے اب کوئی بھی باہر نہیں جا سکتا۔'' برکھا نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آگ بجھانے کی وجہ سے اس کے ہاتھ ایک دم سرخ ہو گئے تھے۔ پھر وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔ ''اچھا باپو تو اگر میرا باپ ہے تو اتنا یاد رکھ میں بھی تیری بیٹی ہوں اب تو نہیں یا میں نہیں۔''

مناف نے برکھا کا چہرہ دیکھا تو وہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ وہ خوفزدہ سا ہو گیا۔ اس نے برکھا کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''برکھا' میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔''

برکھا نے ایک نظر مناف کو دیکھا اور بولی۔ ''تم پریشان مت ہو' کرن کو لے کر کمرے میں چلے جاؤ اور اندر سے دروازہ بند کر لو۔ اس وقت تک باہر مت آنا جب تک میں تمہیں باہر آنے کا نہ کہوں۔''

''اور اگر ان کو دودھ وغیرہ کی ضرورت ہوئی تو؟''

''میں سب تمہیں دے دوں گی لیکن تم نے کمرے سے باہر قدم نہیں نکالنا ہے۔''

مناف کرن کو لے کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ اس نے برکھا کی ہدایت کے مطابق کمرہ اندر سے بند کر لیا اور کرن کو بیڈ پر لے کر لیٹ گیا۔ کرن اپنے ہاتھ پاؤں چلا کر کھیلنے لگی۔

برکھا نے صحن کے کونے میں کھڑی جھاڑو کو اٹھایا اور بیچ صحن میں کھڑے ہو کر جھاڑو کی ایک سینک نکالتی' آسمان کی طرف منہ کر کے کچھ پڑھتی اور اس سینک کو زمین پر پھینک دیتی۔ اس طرح آہستہ آہستہ پوری جھاڑو کی سینکیں صحن میں بکھر گئیں۔ جب جھاڑو ختم ہو گئی تو اس نے پھر ایک ایک کر کے ان سینکوں کو اکٹھا کیا اور دوبارہ جھاڑو کو رسی سے باندھ کر باتھ روم کی کنڈی سے لٹکا دیا اور وہ زمین پر آسن جما کر بیٹھ گئی۔ اب اس کی نظریں سامنے ٹنگی جھاڑو پر تھیں اور وہ منہ سے کچھ عجیب سے لفظ نکال رہی تھی۔

بڑی دیر تک وہ اس کام میں لگی رہی۔ یہاں تک کہ سورج ڈھل گیا۔ جب اندھیرا ہو گیا تو اسنے صحن میں لگی لائٹ جلائی او رمناف کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا' مناف نے دروازہ کھولا تو برکھا بولی۔ ''مناف تم ایسا کرو کہ کرن کے لئے دودھ تیار کر لو اور اپنے اور میرے لیے کھانے کے لیے کچھ پکا لو۔ میں کچن میں داخل نہیں ہو سکتی۔ تم یہ کام جلد از جلد کر کے کمرے میں واپس چلے جاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' مناف نے کہا اور اس کی حسب منشا سارا کام نمٹا لیا۔ پھر دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ مناف نے کرن کو دودھ پلایا۔ کرن دودھ پی کر سو گئی تو مناف نے دروازے سے باہر جھانکا۔

برکھا صحن میں زمین پر بالکل چت لیٹی تھی۔ مناف کو احساس ہوا جیسے وہ بے ہوش پڑی

ہے۔ بھاگ کر اس کے پاس پہنچا تو برکھا نے اپنی بند آنکھیں فوراً کھول دیں اور اسے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی واپس پلٹ آیا اور اس نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

مناف کے دروازہ بند کر لینے کی آواز سن کر اس نے لیٹے لیٹے بایاں پاؤں اوپر اٹھایا اور اس طرح سیدھا کر لیا جیسے کسی چیز کو سہارا دے رکھا ہو۔ پھر وہ عجیب عجیب لفظ بولنے لگی۔

دس پندرہ منٹ کے بعد وہ اچانک اٹھی اور دوسرے خالی کمرے میں چلی گئی۔ اندر جا کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور دیوار کی طرف رخ کر کے رقص کرنے لگی۔ یہ کوئی باقاعدہ رقص نہ تھا بلکہ وہ ایک خاص لفظ منہ سے نکال کر جسم کو حرکت دیتی تھی اور پھر ساکت ہو جاتی تھی۔

''تک دھم دھم...... دھم دھم تک...... جے کالی...... جے کالی واہ۔''

ایک گھنٹے تک وہ اس طرح کے لفظ بول کر رقص کرتی رہی۔ پھر ایک دم ہی اس کی حالت بدلنے لگی۔ اب اس کے رقص میں خاصی تیزی آ گئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں سیاہ ہونا شروع ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سیاہی پورے جسم پر پھیل گئی۔ گوری چٹی برکھا ایک دم کالی بھجنگ ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں آگ بھر گئی تھی۔ صورت انتہائی مکروہ...... ایک فٹ لمبی زبان باہر نکلی ہوئی تھی پھر کمرے کے ہر کونے سے بچھوؤں نے برآمد ہونا شروع کیا اور چند لمحوں میں کمرے میں اتنے بچھو بھر گئے کہ کمرے کے فرش پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ برکھا اب بھی محو رقص تھی۔ بچھو اس کے پیروں میں آ رہے تھے لیکن دب کوئی نہیں رہا تھا مر کوئی نہیں رہا تھا۔

پھر اچانک کمرے میں ایک مکروہ آواز گونجی۔ ''بس رک جا۔''

اس حکم کو سنتے ہی برکھا ایک دم پتھر کی ہو گئی۔ کچھ دیر وہ اسی طرح ساکت کھڑی رہی اتنی دیر میں سارے بچھو کہیں غائب ہو گئے۔ ایک بلیڈ لے کر وہ فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بازو پر اس جگہ بلیڈ سے شگاف ڈالا جہاں ایک بچھو بنا ہوا تھا اور اس وقت یہ بچھو سفید نظر آ رہا تھا۔ بلیڈ لگتے ہی خون بھل بھل کر کے تیزی سے بہنے لگا۔ اس نے اس خون کو ایک پیالے میں جمع کرنا شروع کیا۔ کچھ دیر میں پورا پیالہ خون سے بھر گیا۔ تب برکھا نے کچھ پڑھ کر زخم پر ہاتھ رکھا تو خون نکلنا بند ہو گیا اور اس کے جسم کی رنگت سفید ہونا شروع ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی اصل حالت میں آ گئی۔

وہ بیٹھے بیٹھے ایک دم چونک گئی۔ جیسے کسی خواب سے چونکی ہو۔ اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا اور پھر جب اس کی نظر خون سے بھرے پیالے پر پڑی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ خون سے بھرے پیالے کو اس نے ایک چھوٹی میز پر رکھ دیا اور اسے پلیٹ سے ڈھک دیا۔

پھر وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ مناف حسب الحکم اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مناف جیسے اس کی دستک کا منتظر ہی تھا اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بناء دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی مناف کو بدبو کا ایک شدید بھبکا محسوس ہوا یہ بدبو برکھا میں سے آ رہی

تھی۔ نہ صرف بدبو آ رہی تھی بلکہ اس کی خباثت بھی ٹپک رہی تھی۔ مناف کو خوف سا محسوس ہوا لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''ٹائم کیا ہوا ہے؟'' برکھا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پوچھا۔

''ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔'' مناف نے کمرے میں لگی دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کرن سو رہی ہے؟'' برکھا نے دروازے میں کھڑے ہو کر اندر نظر ڈالی لیکن اندر نہ گئی۔

''ہاں۔'' مناف نے بیڈ پر نظر ڈالتے ہوئے بتایا۔

''مناف آؤ میرے ساتھ...... دروازہ باہر سے بند کر دو۔'' یہ کہہ کر برکھا پلٹی۔

مناف نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا اور خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اس کمرے میں پہنچ کر جہاں خون سے بھرا پیالہ رکھا تھا وہ دھیرے سے بولی۔ ''مناف اب جو میں تمہیں دکھانے لگی ہوں اسے دیکھ کر اور سن کر ڈرنا مت...... تمہیں ذرا جرات سے کام لینا ہوگا ورنہ اب ہم سب کی زندگیوں کی خیر نہیں۔''

پھر اس نے آگے بڑھ کر میز پر رکھے ہوئے پیالے سے پلیٹ ہٹائی تو اتنا سارا خون دیکھ کر مناف کو چکر سا آ گیا۔ اس نے فوراً ہی خود کو سنبھالا اور ہمت کر کے بولا۔ ''یہ کس کا خون ہے؟''

''یہ تمہاری بیوی کا خون ہے۔ بہت قیمتی خون ہے یہ۔ اس قدر قیمتی کہ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں اب اس خون کے لیے ساری زندگی ترسوں گی۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو برکھا؟'' مناف حیرت زدہ ہو کر بولا۔

''چلو اس بات کو چھوڑو پھر بتا دوں گی تفصیل سے۔ اب وقت کم ہے۔ وہ آنے والا ہی ہو گا۔ تم میری بات غور سے سن لو۔ اگر تم میری بات پر عمل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ہم باپوں سے نجات پا لیں گے ورنہ دوسری صورت میں وہ ہمارا نجات دہندہ ثابت ہو گا۔''

پھر برکھا نے اسے پوری تفصیل سے ساری بات بتا دی کہ کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔

وہ دونوں دھڑکتے دل سے اس بری گھڑی کا انتظار کر رہے تھے جو کالی داس کی صورت میں ان پر نازل ہونے والی تھی۔ اب وہ ان کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہ خوشی میں جھومتا چلا آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ برکھا اور مناف اس گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکیں گے۔ وہ بڑا مضبوط انتظام کر کے گیا تھا۔ اس جادو کا کوئی توڑ نہ تھا۔ اسے خوشی اس بات کی تھی کہ وہ برکھا کو کالی دیوی کے نام پر قربان کر دے گا۔ اس بھینٹ کے بدلے میں اسے ایک زبردست طاقت عطا ہو گی۔ یہ طاقت حاصل کرنے کے بعد وہ مناف کو ٹھکانے لگائے گا۔ اس کی کھوپڑی سے وہ نت نئے کام لے گا۔ جادو کی دنیا میں وہ تہلکہ مچا دے گا۔ لوگ اس کو پوجنے لگیں گے۔ بڑے بڑے لوگ اس کے چرن چھوئیں گے۔ وہ دھرماتما بن جائے گا۔ دھرماتما بن کر وہ لوگوں کا دھرم نشٹ کرے گا۔ اس طرح کالی دنیا میں اس کے مزید درجات بلند ہوں گے۔

وہ سوچتا ہوا اور جھومتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے گھر پر نظر ڈالی۔ گھر کے اندر مکمل تاریکی تھی۔ اندھیرا دیکھ کر ایک لمحے کو اس کا دل زور زور سے دھڑکا۔ اسے شبہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ نکل تو نہیں گئے۔ ذرا آگے بڑھ کر اس نے دروازے کو غور سے دیکھا۔ دروازے پر کوئی تالا نہ تھا۔

شاید انہوں نے اس کی آمد کو غیر اہم جانا ہے۔ وہ اس کی دھمکی کو نظر انداز کر کے سو گئے ہیں۔ مورکھ نہیں جانتے کہ موت ان کے در پر آ پہنچی ہے۔

تب اس نے ٹھیک وقت پر کنڈی کھٹکھٹائی۔

اندر سے برکھا کی آواز آئی۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں تیرا پتا جس نے تجھے پال پوس کر بڑا کیا اور تو نے اسے دھوکا دیا۔" وہ دروازے کے قریب ہو کر سانپ کی طرح پھنکارا۔ "دروازہ کھول یا تیرے گھر کو آگ لگاؤں۔"

"نہ باپو ایسا نہ کرنا میں دروازہ کھول رہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے صحن میں لگا بلب روشن کر دیا۔ پھر اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے اور دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگی۔

"باپو کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے۔" وہ اپنے باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی لجاجت سے بولی۔

وہ ایک خاص انداز میں مسلسل پیچھے ہٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کالی داس کی پیشانی پر جمی تھیں۔ کالیداس اب دروازے میں داخل ہو چکا تھا۔ جس طرح وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ رہی تھی ویسے ہی دھیرے دھیرے چوکنا انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔

"اب معافی کا وقت گزر گیا۔ تو نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ ایک تو میری زندگی بھر کی کمائی تو نے اس ڈرائیور کے ساتھ جا کر تباہ کر دی۔ دوسرا ظلم تو نے یہ کیا کہ اپنا دھرم بدل لیا۔ اب تو سزا کے لیے تیار ہو جا۔ تجھے میں کالی دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھاؤں گا۔ آ اپنا ہاتھ لا اور چل میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر کالی داس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ اب خاصا دروازے کے اندر آ گیا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ دروازے کے ایک پٹ کی آڑ میں مناف بالکل تیار کھڑا ہے۔ اسے اس بات کی توقع نہ تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے برکھا کی طرف بڑھ رہا تھا اور اسے موت کی دھمکی دے رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ مناف کی صورت میں خود اس کی موت کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہے۔

جیسے ہی کالی داس اس کے آگے آیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کے سر پر خون سے بھرا پیالہ الٹ دیا اور خود اسی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔

وہ خون میں نہا گیا۔ سر پر، چہرے پر، دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر طرف خون ہی خون تھا۔ اس خون نے کسی خطرناک تیزاب کی طرح کام دکھایا۔ خون پڑتے ہی اس کی دونوں آنکھیں ضائع ہو

گئیں۔ جہاں جہاں خون پڑا تھا وہاں کی کھال اترنا شروع ہو گئی۔ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا اور صرف اتنا کہہ پایا۔ ''یہ تو نے کیا کیا!''

اس کے بعد وہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہا۔ مناف جلدی سے دروازہ بند کر کے برکھا کے قریب آ گیا۔ برکھا نے فوراً اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ ''تم نے مجھے بچا لیا۔''

''میں نے تمہیں نہیں اپنے آپ کو بچایا ہے اپنی بیٹی کرن کو بچایا ہے۔'' وہ جذباتی ہو کر بولا۔

''ہم سب بچ گئے مناف۔'' اس نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

''اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' مناف نے کالی داس کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں جا رہا تھا۔

''بس ایک کام اور کر دو۔'' برکھا نے کہا۔

''وہ کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہاں صحن میں ایک گڑھا کھود دو' اس کے بعد تم کمرے میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔ مجھے پھر جو کرنا ہو گا خود کر لوں گی۔'' برکھا نے بڑے پراسرار لہجے میں کہا۔

مناف نے اسٹور میں پڑے پھاوڑے سے جلدی جلدی اتنا بڑا گڑھا کھود دیا کہ کالی داس کو اس میں دھکیل کر مٹی سے پر کر دیا جائے۔ پتہ نہیں برکھا کیا کرنا چاہتی تھی۔ بہر حال اس نے جو ہدایت کی تھی اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے وہ کمرے میں آ گیا۔

مناف کے کمرے میں جاتے ہی اس نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی تاکہ مناف باہر نہ آ سکے۔ وہ جو کچھ کرنے جا رہی تھی اگر مناف دیکھ لیتا تو شاید اپنے ہوش گنوا بیٹھتا۔

برکھا نے دروازہ بند کر کے صحن کی لائٹ آف کر دی۔ صحن میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔ برکھا نے اپنے بال کھول کر ساڑھی کا پلو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا اور اپنے باپ کی لاش کے گرد رقص کرنا شروع کیا۔ یہ کوئی باقاعدہ رقص نہ تھا۔ ایک کیفیت تھی' ایک جنون تھا جو اس رقص ما حرکت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ اپنے منہ سے کچھ بولتی بھی جا رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شکل تبدیلی ہونے لگی۔ وہ سیاہ رات جیسی ہو گئی۔ اندھیرے میں اس کی لال لال آنکھیں چمکنے لگیں۔ ایک فٹ لمبی زبان باہر آ گئی۔ وہ اب تیز تیز کالی داس کی لاش کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ صحن کے کونوں کھدروں سے سیکڑوں بچھو نمودار ہو چکے تھے۔ وہ کالی داس کی لاش پر اس طرح جمع ہو گئے تھے جیسے شہد کی مکھیاں چھتے پر۔

یہ بچھو جن کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بڑی تیزی سے کالی داس کی لاش کو چٹ کر رہے تھے۔ جن بچھوؤں کا پیٹ بھر جاتا وہ پیچھے ہٹ جاتے ان کی جگہ نئے بچھو لے لیتے۔ بچھو کچھ اس طرح

کالی داس کا صفایا کر رہے تھے کہ اس کا سر لاش سے جدا ہو چکا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان بچھوؤں نے کالید اس کے سر کو چھوا بھی نہ تھا۔ برکھا نے کالی داس کا سر اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا اور تیز تیز رقص کرنے لگی۔

مناف اپنے کمرے میں بند تھا' اسے نہیں معلوم تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اگر وہ باہر آ کر اس کالی بھجنگ لال لال آنکھوں والی لمبی زبان کی اس عورت کو دیکھ لیتا جس کے ہاتھوں میں کالی داس کا سر تھا تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ برکھا اپنی دھن میں مگن منہ سے عجیب سے لفظ بولتی بے ہنگم رقص کرتی جا رہی تھی کہ اچانک باہر سے ایک آواز آئی۔

برکھا اس آواز کو سن کر فوراً رک گئی۔ اس آواز کو سنتے ہی بچھو فوراً ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

برکھا دونوں ہاتھوں میں سر اٹھائے دھیرے دھیرے دروازے کی طرف بڑھی۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے کنڈی کھول دی اور دروازے کے دونوں پٹ وا کر کے ایک قدم دہلیز سے باہر نکالا۔ گلی میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن دو چمکتی آنکھیں اسے نزدیک ہی نظر آ رہی تھیں۔

برکھا نے کالی داس کا سر دروازے کے باہر رکھ دیا اور الٹے قدموں پیچھے ہو کر تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ وہی آواز پھر بلند ہوئی۔ یہ آواز کسی کتے کے رونے کی آواز سے مشابہ تھی لیکن اس آواز کو سن کر دل پر ایک خوف سا طاری ہوتا تھا۔

دروازہ بند ہوتے ہی وہ آگے بڑھا۔ وہ ایک کالے رنگ کا گدھے کے برابر کتا تھا۔ چمکتی ہوئی خوفناک آنکھیں۔ دروازے کے نزدیک پہنچ کر اس نے اپنا بڑا سا منہ کھولا اور کالی داس کے سر کو اس میں دبوچ لیا۔ اس کے بعد اس نے سر کو منہ میں دبائے دبائے ایک لمبی جست بھری اور اندھیرے میں اندھیرے جیسا ہو گیا۔

برکھا کو جب یہ احساس ہو گیا کہ دروازے پر رکھی اس بھینٹ کو قبول کر لیا گیا ہے تو وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ باہر سناٹا طاری ہو گیا تھا اگر اس کی بھینٹ قبول نہ ہوئی ہوتی تو کتے کے رونے کی آواز مسلسل آنی شروع ہو جاتی۔ پھر بھی اپنا اطمینان کرنے کے لیے اس نے دروازہ کھول کر دیکھ لیا۔ وہاں کالید اس کا سر موجود نہ تھا۔

برکھا نے دروازہ بند کر کے کالی داس کے باقی ماندہ جسم کو کھینچ کر گڑھے میں ڈالا اور اس گڑھے کو مٹی سے پر کر دیا۔ مٹی میں کالی داس کا بدن غائب ہوتے ہی اس کی حالت تبدیلی ہونے لگی اور چند منٹوں میں ہی وہ گوری چٹی برکھا بن گئی۔

پھر اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے کھول دیا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر کمرے میں تاریکی تھی۔ اس نے آواز دی۔ ''مناف! کیا تم سو گئے؟''

''نہیں' برکھا میں جاگ رہا ہوں۔''

''پھر ذرا باہر آؤ...... اس گڑھے کو برابر کر دو۔''

مناف اس کے کہنے پر باہر آ گیا۔ اتنی دیر میں برکھا صحن کی لائٹ جلا چکی تھی۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ کالی داس کی لاش غائب ہے اور وہ گڑھا مٹی سے پر ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ کالی داس کی لاش کہاں گئی۔ اس نے جلدی جلدی مٹی کو برابر کر کے اس پر اینٹیں جما دیں۔ صحن کا فرش برابر ہو گیا تھا۔ بس اب اس پر سیمنٹ کرنا باقی رہ گیا تھا۔

اس رات وہ دونوں بڑے سکون سے سوئے۔ کالی داس ان کے سروں پر کسی تلوار کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ آج وہ تلوار ٹوٹ گئی تھی۔ ان کے دلوں پر جو ایک انجانا خوف سا چھایا رہتا تھا وہ دور ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک اطمینان بھری زندگی گزار سکتے تھے۔

لیکن وہ زندگی ہی کیا جو سکون سے گزرے۔

ان کی زندگی میں ایک ایسا بھونچال آیا کہ نہ صرف انہیں اپنا گھر چھوڑنا پڑا بلکہ شہر بدر بھی ہونا پڑا۔

یہ انقلاب محض ان کی زندگی میں ہی نہیں آیا بلکہ ہزاروں لاکھوں خاندان اس سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنی خوشی سے اپنا گھر اور اپنا شہر چھوڑا۔ اب اپنا ملک اپنا وطن جو معرض وجود میں آ گیا تھا پھر غیروں کے دیس میں رہنے کا کیا جواز تھا۔

مناف نے پہلے ڈھاکہ کا رخ کیا۔ والدین کے انتقال کے بعد وہ کراچی میں آ گیا۔ برکھا اب چار لڑکیوں کی ماں ہو چکی تھی۔ بعد میں تین لڑکیوں نے اور جنم لیا اس طرح کل سات لڑکیاں ہو گئیں۔ لڑکیوں نے جیسے ان کا گھر دیکھ لیا تھا۔ ہزار خواہشوں' ہزار دعاؤں' ہزار منتوں کے باوجود کسی لڑکے نے مناف کے گھر پیدا ہونا پسند نہ کیا۔

پہلی لڑکی کا نام کرن تھا اور آخری یعنی ساتویں لڑکی کا نام ورشا تھا' ورشا مناف......

جب ورشا پیدا ہوئی تو اس کی پیٹھ پر بچھو کا نشان دیکھ کر برکھا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ اس نے اس نشان کی کسی کو ہوا نہ لگنے دی۔ ایک دن مناف نے اس نشان کو دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا تو برکھا نے اسے برص کا دھبہ قرار دے کر ٹال دیا اور یونہی دو چار بار کوئی مرہم لگا کر برص کے علاج کا تاثر دے کر اس کی تسلی کر دی۔ اس نشان کو وہ جب بھی اکیلے میں دیکھتی تو بہت خوش ہوتی۔ اس لڑکی کا تو اسے انتظار تھا۔ یہ وہ لڑکی تھی جو اس کی سالوں پرانی پیاس بجھانے آئی تھی۔ وہ پیاس جو اس کا باپ کالی داس بھڑکا کر چلا گیا تھا۔ اب اس کی بیٹی اس پیاس کو بجھانے آ گئی تھی اور یہ سب اگور کے باپ کی مہربانی سے ہوا تھا۔

مناف نے کراچی میں آ کر مختلف کاروبار کیے۔ بالآخر وہ ایک آئس فیکٹری چلانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایک منافع بخش کاروبار تھا۔ پیسے جمع ہوتے ہی اس نے گارڈن ایسٹ میں ایک بنگلہ خرید لیا۔ یہ کسی ہندو کا بنگلہ تھا۔ اس بنگلے کی دیواروں پر ہندوانے نقش بنے ہوئے تھے۔ اس بنگلے کا ایک کمرہ جو سب سے تاریک تھا جہاں دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا وہ کمراہ برکھا کو بہت پسند تھا۔ وہ اکثر اس کمرے میں پائی جاتی تھی۔

کالی داس کے مرنے کے بعد برکھا کے طور طریقوں میں ایک پراسراری تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ بمبئی والی برکھا نہ رہی تھی جس کے ساتھ مناف نے دہلی میں ایک خوبصورت وقت گزارا تھا۔ وقت تو خیر کراچی میں بھی ٹھیک ہی گزر رہا تھا لیکن یہاں آ کر اب یہ احساس زیادہ گہرا ہو گیا تھا کہ برکھا کچھ پراسرار سرگرمیوں میں ملوث ہو گئی ہے۔

مناف کو تو خیر محض شبہ ہی تھا لیکن اس کی بیٹیوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ان کی ماں دن بھر کیا کرتی رہتی ہے اور اس سے کس قسم کے مرد اور عورتیں ملنے آتی ہیں اور وہ تاریک کمرے میں بیٹھ کر جانے کیا کرتی رہتی ہے۔ بیٹیوں کی شادیاں ہوتی رہیں اور وہ کسی پنجرے سے آزاد ہونے والے پنچھیوں کی طرح اڑتی رہیں۔ سسرال جا کر انہوں نے کبھی پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ میکہ کس طرف ہے۔ برکھا کو اپنی بیٹیوں کی مطلق فکر نہ تھی۔ آتی ہیں تو آئیں نہیں آتی تو بھاڑ میں جائیں۔ البتہ مناف کو اپنی بیٹیوں کی طرف سے پریشانی رہتی تھی کہ وہ آخر گھر آتی کیوں نہیں۔

ورشا تیرہ سال کی ہوئی تو اس کا باپ مناف اس دنیا میں نہ رہا۔ ورشا کی آنکھوں کے سامنے اگر وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو وہ اپنی ماں کی سنائی ہوئی کہانی پر یقین کر لیتی جو اس نے اس کی بہنوں اور دنیا والوں کو سنائی تھی کہ مناف نے دوسری شادی کر لی اور وہ خفیہ طور پر کینیڈا چلا گیا۔

ایک رات ورشا پڑھ رہی تھی کہ اسے اپنے والدین کے کمرے سے شور شرابے کی آواز سنائی دی۔ ان کا بیڈروم ورشا کے کمرے سے ملحق تھا۔ وہ اپنے کمرے کی لائٹ بجھا کر اسٹول پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی اور درمیان کے دروازے میں لگے شیشے سے ادھر جھانکنے لگی۔

اس کی ماں ابھی ابھی باہر سے آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پنجرہ تھا جس میں ایک چمگادڑ بند تھی۔ اتنی رات گئے آنے پر مناف نے اس سے باز پرس کی تو برکھا کے تیور ایک دم بدل گئے۔ وہ غصے میں بولی۔ ”تمہیں کیا پریشانی ہے۔ میں جب چاہے آؤں۔“

یہ جواب مناف کے دل پر چھری کی طرح لگا۔ وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ پہلے تو اس نے وہ پنجرہ چھین کر دروازے سے باہر پھینکا اور پھر اس کے بال پکڑ کر زور کا دھکا دیا۔ برکھا کا سر دیوار سے ٹکرایا اور ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ مناف نے اس کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔

”تجھے میں نے بہت آزادی دے دی ہے۔ آج کے بعد سے تو میری اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں نکالے گی۔“ مناف نے اس کے بال پکڑ کر بیڈ پر زور سے دھکا دیا۔

وہ بیڈ پر گری اور گرتے ہی تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ ورشا کا خیال تھا کہ اب ماں اس کے باپ پر حملہ کرے گی لیکن اس نے اسے کچھ نہ کہا۔ بس ایک نظر گھور کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ تو گھر میں رہے گا تو تجھ سے اجازت لوں گی ناں۔ اس کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

ورشا نے سوچا شاید وہ اس کے کمرے میں آئے گی اس لئے وہ سٹول سے کود کر فوراً بیڈ پر پہنچ گئی اور برکھا کے دروازہ کھٹکھٹانے کا انتظار کرنے لگی لیکن وہ نہ آئی۔ کچھ دیر بعد برابر کے کمرے سے ایک چیخ کی آواز آئی۔ یہ اس کے باپ کی آواز تھی۔

ورشا نے جلدی سے اسٹول پر چڑھ کر ادھر جھانکا تو باپ کو خون میں نہایا ہوا پایا۔ وہ اپنے باپ کو اس حالت میں دیکھ کر چکرا کر گر پڑی۔ اس کے ہوش گم ہو گئے۔

برکھا پر مناف نے آج تک ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ مار کھا کر خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ کمرے سے باہر نکلی۔ کچھ پڑھتی ہوئی کچن میں گئی۔ وہاں ایک تیز دھار والی چھری سے اپنے بازو پر جہاں بچھو

بنا ہوا تھا ایک کٹ مارا۔ زخم لگتے ہی خون بھل بھل کر کے بہنے لگا۔ اس نے اس خون کو چینی کے بڑے پیالے میں جمع کر لیا اور اس پیالے کو اپنے پیچھے چھپا کر کمرے میں داخل ہوئی۔ مناف کو اس پر ہاتھ اٹھانے کا افسوس ہو رہا تھا۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا کہ اچانک اس کے جسم میں آگ سی لگ گئی۔ وہ اپنی آنکھیں بھی نہ کھول سکا۔ چیخ مار کر اٹھا اور پھر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

خون کی بو پھیلتے ہی کونے کھدروں سے بچھو نکلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے مناف کی لاش پر چھا گئے۔ برکھا نے کمرے کی لائٹ آف کر دی اور پھر لاش کے گرد بھینٹ ناچ شروع کر دیا۔ جلد ہی اس کی شکل تبدیل ہو گئی۔ اس کی زبان ایک فٹ باہر آ چکی تھی۔

کچھ دیر کے بعد باہر سے کتے کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے مناف کا سر اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور دروازے پر رکھ آئی۔ دروازے پر منتظر اس گدھے برابر کالے کتے نے اس سر کو اپنے بڑے سے منہ میں لیا اور اندھیرے میں جست لگا کر خود بھی اندھیرا ہو گیا۔

برکھا نے مناف کے باقی ماندہ جسم کو ٹین کے ایک بکس میں ڈال دیا اور پھر اس پر نشہ سا چھانے لگا۔ وہ پرسکون ہو کر سو گئی۔

ورشا کو جب ہوش آیا تو وہ اسٹول کے پاس ہی فرش پر پڑی تھی۔ کمرے میں خاصا اجالا پھیل چکا تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ رات کا واقعہ پوری ہولناکی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں منجمد تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر گئی تو برکھا بڑے مزے سے خراٹے بھر رہی تھی۔ بیڈ کے نزدیک ایک ہی ٹین کا بکس پڑا تھا اور اس میں بڑا سا تالا لگا تھا۔ مناف کا کہیں دور تک پتہ نہ تھا۔ ورشا کو خیال آیا کہ کہیں اس نے کوئی بھیانک خواب تو نہیں دیکھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اگر وہ خواب ہوتا تو وہ اسٹول کے نزدیک فرش پر کیوں پڑی ہوتی۔

اس نے اپنی سوتی ہوئی ماں کو جھنجھوڑ دیا۔ ''ممی، ممی......''

برکھا کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی اور کسی قدر غصے سے بولی۔ ''کیا ہے؟''

''ممی تم نے میرے باپ کو مار دیا تم قاتل ہو۔''

''بے وقوف میں نے تو اپنے باپ کو بھی مار دیا تھا۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ ''تیرا باپ تو کوئی چیز ہی نہ تھا۔''

''ممی، تم کس قدر......'' ورشا اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ ممی تم کس قدر ذلیل کمینی ہو مگر وہ کچھ نہ کہہ پائی۔ برکھا نے اسے اچانک کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ ورشا کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ اس نے اپنی ماں کی آنکھوں میں آگ بھڑکتی ہوئی دیکھی۔ چند سیکنڈوں میں اس کا چہرہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ ورشا نے گھبرا کر اپنا منہ پھیر لیا۔

''جاؤ کچن میں جا کر ناشتہ تیار کرو مجھے بہت بھوک لگی ہے۔'' برکھا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"جی اچھا ممی۔" ورشا نے انتہائی فرماں برداری سے کہا اور سر جھکا کر کچن کی طرف چلی گئی۔

وہ پہلا اور آخری دن تھا۔ اس کے بعد سے ورشا نے اپنی ماں کے سامنے کبھی زبان نہ چلائی۔ وہ کچھ اس طرح خوفزدہ ہوئی کہ ماں کے منہ سے نکلا ہو ہر لفظ اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔

اس دن خوب ڈٹ کر ناشتہ کرنے کے بعد برکھا نے کپڑے تبدیل کیے۔ گاڑی گھر میں موجود ہونے کے باوجود وہ باہر سے ایک ٹیکسی لے کر آئی۔ ٹیکسی والے کے ساتھ مل کر گھر کے صحن سے بکس اٹھوایا۔ ٹیکسی کی چھت پر رکھا اور ورشا سے کہا۔ "تم گھر کا دروازہ بند کر لو میں ڈیڑھ دو گھنٹے میں واپس آتی ہوں۔"

پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔

وہ اسٹیشن پہنچی۔ گاڑی لاہور جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اس نے لیڈیز کمپارٹمنٹ میں پہنچ کر وہ بکس قلی سے ایک برتھ کے نیچے رکھوایا اور قلی کو پیسے ادا کر کے بڑے اطمینان سے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ایک دو منٹ ڈبے کا جائزہ لیا۔ پھر اپنے برابر بیٹھی عورت سے مخاطب ہو کر بولی۔ "بہن ذرا میرے بکس کا خیال رکھنا' اس میں کچھ قیمتی سامان ہے۔ میں ابھی ذرا اپنے شوہر کو دیکھ کر آتی ہوں۔"

پھر برکھا نے اس عورت کا جواب بھی نہ سنا اور تیزی سے کمپارٹمنٹ سے اتر گئی۔ سگنل ڈاؤن ہو گیا تھا۔ گارڈ سیٹی بجا کر ہری جھنڈی دکھا رہا تھا اور برکھا تیز قدموں سے اسٹیشن کے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ادھر وہ گیٹ سے باہر نکلی ادھر گاڑی نے اسٹیشن چھوڑ دیا۔ برکھا نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور ٹیکسی پکڑ کر اپنے گھر آ گئی۔

وہ عورت جس سے برکھا نے بکس کی رکھوالی کے لیے کہا تھا ملتان کی تھی۔ جب ملتان تک برکھا ڈبے میں نہ آئی تو اس عورت کی نیت بدل گئی۔ ملتان آنے پر اس نے اپنے سامان کے ساتھ وہ بکس بھی اتار لیا اور اپنے بیٹے کے ساتھ تانگے میں برکھا کا بکس اور اپنا سامان رکھوا کر اپنے گھر چلی گئی۔

وہ عورت بہت خوش تھی۔ ایک قیمتی سامان والا بکس اس کے مفت ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے اپنے بیٹے سے اس بکس کا تالا توڑنے کے لیے کہا۔ بیٹے نے سل کا بٹہ اٹھا کر جو دو چار کراری چوٹیں تالے پر ماریں تو تالا ان چوٹوں کو برداشت نہ کر سکا' کھل گیا۔

بیٹے نے تالا ایک طرف پھینک کر جلدی سے بکس کا ڈھکن اٹھایا۔ ڈھکن اٹھتے ہی اس عورت نے بکس میں جو کچھ دیکھا اسے دیکھتے ہی وہ چکرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ بیٹا جوان تھا وہ بے ہوش تو نہ ہوا لیکن اس کی حالت خراب ہو گئی۔

بکس میں انسانی گوشت' خون اور ہڈیوں کا ملغوبہ پڑا تھا۔ اس نے فوراً بکس کا ڈھکن بند کر دیا اور بے ہوش ماں کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ کچھ دیر کے بعد اس کو ہوش آ گیا۔ بیٹے کی

طبیعت بھی سنبھل گئی۔

بیٹا ماں اور ماں بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بکس میں کیا چیز ہے۔ اگر یہ انسان ہے تو اس کا سر کہاں ہے اور یہ جسم، گوشت، ہڈیوں او رخون کا ملغوبہ کیوں ہے۔ ان دونوں نے آج تک ایسی لاش نہ دیکھی تھی۔

اب سردست مسئلہ یہ تھا کہ اس کا کیا کیا جائے؟ ان کے گھر کا صحن کچا تھا اور اس میں امرود کا درخت لگا تھا۔ طے یہ پایا کہ بکس میں موجود اس ملغوبے کو امرود کی جڑ کی زمین کھود کر بکس سمیت دفن کر دیا جائے۔ تبھی اس سے نجات ممکن تھی...... اس طرح ڈھاکا کا مناف زندگی کا سفر کرتا کہاں سے کہاں پہنچا۔ کہاں کی مٹی کہاں دفن ہو گئی۔ مناف اپنی زندگی میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ مر کر ملتان کے ایک نیم پختہ گھر کے کچے صحن میں بغیر سر کے اور بغیر کفن کے دفن ہو گا۔ لوگ اپنی زندگی میں اپنے لیے قبر کی جگہ مختص کروا لیتے ہیں وہ نہیں جانتے تھے کہ موت کہاں آئے گی اور مخصوص قبر تو دور کی بات ہے انہیں دفن کے لیے زمین بھی نصیب ہو گی یا نہیں۔

مناف کو ٹھکانے لگانے کے بعد برکھا بالکل بے خوف ہو گئی۔ ڈر تو خیر اس کا اسی وقت نکل گیا تھا جب وہ اپنے باپ کالی داس کو بھینٹ چڑھانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ رہی سہی کسر مناف کے قتل نے پوری کر دی۔ اب وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذموم مقاصد کے لیے کوشاں تھی۔ ورشا کو اس نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ ایک طرح سے وہ اس کی قید میں تھی اور بڑی فرمان برداری سے اس کا ہر حکم بجا لاتی تھی۔

برکھا اب ''مانا'' کے چکر میں پڑ گئی تھی۔ ''مانا'' طاغوتی قوتوں میں ایک بڑی قوت تھی۔ اسے حاصل کرنے کے بعد اپنی مرضی کے مطابق زندہ رہا جا سکتا تھا۔ ''مانا'' حاصل کرنے کے بعد ''ربطول'' کی طرف پیش قدمی کی جا سکتی تھی۔ ''ربطول'' کتاب سحر تھی۔ یہ کتاب فرعون کے عہد کے سو بڑے جادوگروں نے مرتب کی تھی۔ اس کتاب کا صرف ایک نسخہ تیار کیا گیا تھا اور اس نسخے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پہلے حصے میں منتر تھے اور دوسرے حصے میں ان منتروں کو کس طرح پڑھنا ہے، یہ تحریر کیا گیا تھا۔ یہ دونوں حصے ایک دوسرے کے بغیر بے اثر تھے۔ بادشاہ وقت کے پاس ''ربطول'' کے دونوں حصے ہوتے تھے جسے وہ الگ الگ رکھتا تھا تاکہ کتاب سحر چوری ہو جانے کی صورت میں چور کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ یہ کتاب فراعنہ مصر کے پاس نسل در نسل چلی آ رہی تھی کہ ایک وقت ایسا آیا کہ اس کا ایک حصہ غائب ہو گیا اور یوں سحر کی سب سے بڑی اور قدیم کتاب بے اثر ہو گئی۔ پراسرار قوت ''مانا'' کو حاصل کرنے کے بعد اس سے اس سلسلے میں رہنمائی حاصل کی جا سکتی تھی۔ ''مانا'' کے علاوہ ''ربطول'' کے بارے میں کوئی اور کچھ نہیں جانتا تھا۔

برکھا چاہتی تھی کہ کسی طرح زبردست قوت ''مانا'' ہاتھ لگ جائے لیکن ''مانا'' کو حاصل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ یہ ایک بڑی کٹھن ڈگر تھی جس پر چلنا گویا تلوار کی دھار پر چلنا تھا۔ ذرا سا غلط قدم پڑنے پر بندہ گھر کا رہتا تھا نہ گھاٹ کا۔ دو بھینٹ چڑھانے کے بعد اگرچہ برکھا کی پیاس مزید بھڑک اٹھی تھی لیکن اب اسے کہیں دور ایک امید کی کرن نظر آنے لگی تھی۔ دو بھینٹوں کے بعد راستہ کچھ

آسان ہوا تھا اور سب سے بڑی بات ورشا سے مل گئی تھی۔ اس کی پیٹھ پر بچھو کا نشان تھا اور پیدائشی تھا۔ جو قوت اس کے نانا کالی داس نے بڑی محنت اور جتن سے حاصل کی تھی وہ قوت ورشا کو بغیر کسی محنت کے حاصل ہو گئی تھی۔ ورشا اپنے آپ سے ناواقف تھی۔ اسی لیے وہ اپنی ماں کی غلام بن گئی تھی جبکہ وہ غلامی کرنے کے لیے نہیں پیدا ہوئی تھی۔ وہ پیدائشی آقا تھی۔

برکھا ہی نے اسے ساحل عمر کے پیچھے لگایا تھا۔ برکھا نے ساحل عمر کو ایک طویل عرصے کے بعد کھوجا تھا۔ ساحل عمر میں ایک ایسی خاص بات تھی جو برکھا کو "مانا" حاصل کرنے میں کامیاب کر سکتی تھی۔ برکھا نے ورشا کو جال بنا کر ساحل عمر پر پھینکا تھا۔ ساحل عمر اس کے جال میں آ گیا تھا۔

وہ ابھی تک سڑک پر گم صم کھڑا تھا۔ ورشا جا چکی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اسے اپنی کوئی متاع عزیز گم ہونے کا احساس ہوا' اسے اپنا جسم خالی خالی سا لگا۔ اسے لگا جیسے کچھ ہو گیا ہے۔ کیا ہو گیا ہے یہ اسے معلوم نہ تھا...... وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ورشا کے سحر میں آ گیا' اس کے فریب میں مبتلا ہو گیا ہے۔

ایک گاڑی قریب سے ہارن دیتی گزری تو اچانک اسے ہوش آیا۔ اسے پتہ چلا کہ وہ سڑک پر کھڑا ہے۔ ورشا اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جا چکی ہے اور وہ تماشا بنا کھڑا تھا۔ اپنی حالت پر وہ دل ہی دل میں مسکرایا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر کے رستے پر ہو لیا۔

☆☆☆☆☆

گھر کے گیٹ پر پہنچ کر جب اس نے گاڑی کا ہارن بجایا تو فوراً ہی گیٹ کھل گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے برکھا گیٹ کے پیچھے کھڑی اس کی منتظر تھی۔ برکھا کو دیکھ کر ورشا نے گاڑی کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر خوشی سے نعرہ لگایا۔ "ہائے ممی......!"

برکھا نے بھی جواباً اسے خوش آمدید کہا۔ "ہائے جان......!"

ورشا گیٹ کھلتے ہی گاڑی اندر لیتی چلی گئی۔ جب وہ گاڑی لاک کر کے بنگلے کی طرف بڑھی تو اتنے میں برکھا بھی اس کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اس نے ورشا کو آگے بڑھ کر گلے لگایا اور بڑے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کہو کیسی رہی پہلی ملاقات۔"

"بہت اچھی۔" ورشا اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے بنگلے میں داخل ہوئی۔

"اسے کیسا لگا تم سے ملنا؟" برکھا نے پوچھا۔ "کیا تم اسے پسند آ گئیں۔"

"ممی! وہ بہت خوش تھا' اتنا خوش کہ میں بتا نہیں سکتی۔" ورشا نے بتایا۔ "رہ گئی یہ بات کہ میں اسے پسند آئی یا نہیں تو ممی میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کوئی ایسا ہے جو آپ کی بیٹی سے ملے اور اسے پسند نہ کرے۔"

"نہیں کوئی نہیں۔" برکھا نے ورشا کو بڑے فخر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کسی کی کیا مجال جو ورشا کو ریجیکٹ کر دے۔ میں اس کا خون نہ پی جاؤں گی۔"

"ممی ایک بات پوچھوں' بتاؤ گی؟" ورشا بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں پوچھو' ضرور بتاؤں گی۔" وہ خوشدلی سے بولی۔

ساحل میں ایسا کیا ہے کہ تم نے اس سے ملاقات کے لیے اتنا لمبا چکر چلایا۔"

"کیا وہ تمہیں اچھا نہیں لگا۔" برکھا نے پوچھا۔

"وہ اتنا اچھا، اتنا دلکش اور من موہنا ہے کہ کوئی بھی لڑکی اس کی پوجا کرسکتی ہے۔"

"تو پھر؟" برکھا نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ممی! میں یہاں اپنی بات نہیں کر رہی، آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ آپ نے اس میں کیا دیکھا؟"

"وہ ایک کمیاب بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نایاب چیز ہے۔" برکھا خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔ "میں نے اسے بڑی مشکلوں سے تلاش کیا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اس کے پیچھے ہوں۔ اب وہ وقت قریب آ رہا ہے جس کی میں منتظر تھی۔ ورشا اگر میں اپنے مشن میں کامیاب ہوگئی تو تیری ممی تیرے قدموں میں دنیا جہان کی آسائشیں ڈال دے گی۔ تجھے وہ کچھ مل جائے گا جس کا تو تصور بھی نہیں کرسکتی۔"

"او ممی تمہیں کیا ملے گا؟" ورشا نے پوچھا۔

"مجھے مانا مل جائے گی۔ ایک ایسی شکتی، ایک ایسی پر اسرار طاقت جس کا بلیک ورلڈ میں ڈنکا بجتا ہے۔ میں اس قوت کو حاصل کر کے اپنی زندگی کی مالک ہو جاؤں گی۔ جب چاہوں گی او رجب تک چاہوں گی اس دنیا میں عیش کروں گی۔ یہ دنیا اور دنیا والے تیری ممی کے اشارے پر ناچیں گے۔" برکھا نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سچ ممی......!"

"ہاں بیٹی۔" برکھا نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تم کھانا کھا لو اس کے بعد اپنے وقت پر اسے فون کر لینا۔ اس پر اپنی گرفت مضبوط کرو۔ اتنی مضبوط کہ وہ سانس لینے کے لیے بھی تم سے اجازت مانگے۔"

"ممی...... تم بے فکر ہو جاؤ۔" ورشا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

گھر کے دروازے پر پہنچ کر ساحل عمر نے اپنے مخصوص انداز میں تین بار ہارن دیا اور گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے اندازہ تھا کہ اماں کتنی دیر میں گیٹ تک پہنچیں گی لیکن آج گیٹ توقع سے پہلے ہی کھلنے کے آثار پیدا ہو گئے۔ شاید اماں گھر کے باہر لان میں اس کے انتظار میں ٹہل رہی تھیں۔ جیسے ہی ساحل عمر نے ہارن بجایا چند لمحوں بعد ہی اماں کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

ساحل عمر نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔ "اماں، میں ہوں!"

اس کی آواز سنتے ہی انہوں نے فوراً گیٹ کھول دیا اور ایک طرف کو ہٹ گئیں۔ ساحل عمر گاڑی اندر لے آنے کے بعد اماں کا انتظار کرنے لگا۔ وہ گیٹ کو تالا لگا کر خراماں خراماں چلی آئی تھیں۔

"اماں کوئی فون تو نہیں آیا۔" جب اماں قریب آ گئیں تو ساحل عمران سے مخاطب ہوا۔

''ناصر مرزا کا آیا تھا۔'' انہوں نے بتایا۔
''کیا کہہ رہے تھے؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔
''انہوں نے کہا کہ آئیں تو مجھے فون کر لیں۔'' اماں نے بتایا۔
''ٹھیک ہے۔'' ساحل عمر نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اماں بڑی بھوک لگی ہے جلدی کھانا نکالو۔''
''اچھا نکالتی ہوں۔ تم کپڑے تبدیل کر کے آؤ۔'' پھر اماں نے ترچھی نظروں سے ساحل عمر کو دیکھا۔ ''ساحل ایک بات پوچھوں سچ سچ بتاؤ گے۔''
''ہاں، اماں بالکل سچ بتاؤں گا ویسے بھی میں جھوٹ نہیں بولتا۔''
''آج تم مجھے بہت دن کے بعد خوش نظر آ رہے ہو۔ اس خوشی کا نام بتانا پسند کرو گے۔''
''صبر کرو اماں!'' ساحل عمر نے اماں کے سر پر بزرگوں کی طرح ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔''
''اب صبر نہیں ہوتا مجھ سے...... کیا تم جانتے نہیں کہ میرا پیمانہ عمر اب چھلکنے کو ہے۔'' اماں نے افسردگی سے کہا۔
''اماں کھانا، بہت بھوک لگی ہے۔'' یہ کہہ کر ساحل عمر واش روم میں داخل ہو گیا۔ اس نے بات آگے نہ بڑھنے دی۔
کھانے سے فارغ ہو کر وہ کچھ دیر گھر کے لان پر ٹہلا۔ اتنی دیر میں اماں نے باہر آ کر اطلاع دی۔ ''فون ہے۔''
''اوہ......'' ساحل عمر نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ یہ فون ضرور ناصر مرزا کا ہو گا۔ اسے گھر آتے ہی انہیں فون کر لینا چاہیے تھا۔ اب وہ اسے ٹھیک ٹھاک سنائیں گے۔
گھر میں آ کر اس نے اماں سے پوچھا۔ ''فون ناصر مرزا کا ہے؟''
''نہیں کوئی لڑکی ہے۔'' اماں نے بتایا۔
لڑکی کا سن کر ساحل عمر نے فوراً اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ گھڑی میں گیارہ بج کر چھ منٹ ہوئے تھے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں پہنچا اور ریسیور اٹھایا۔ ''جی!''
''ہائے رانجھن، پہنچ گئے گھر خیریت سے!'' ایک کھنک دار آواز سنائی دی۔
''اوہ تو یہ آپ ہیں؟'' ساحل عمر نے اپنائیت سے کہا۔
''کیوں میرے فون کی توقع نہ تھی، جانتے نہیں ہو کہ یہ وقت میرا ہے۔'' ورشا نے ہنس کر کہا۔
''ہاں کم از کم آج توقع نہ تھی۔'' ساحل عمر نے صاف گوئی سے کہا۔
''وہ کیوں؟'' اس کی آواز میں حیرت تھی۔
''ہم آج ہی تو ملے تھے۔'' ساحل عمر نے جواب دیا۔
''میں جب تک تم سے ملی نہ تھی تب تک مجھے اپنے آپ پر اختیار تھا پر اب تو میں بے

اختیار ہو گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے تم سے بات کرتی ہی رہوں۔" اس کے لہجے میں پیار بھرا تھا۔
"ورشا، میرا بھی یہی جی چاہتا ہے؟"
"سچ، رانجھن۔" ورشا بے اختیار خوش ہو کر بولی۔
"ہاں ورشا! مجھے اپنا فون نمبر دے دو میں اگر بات کرنا چاہوں تو کر تو سکوں۔ میں تم سے تمہارا فون نمبر لینا ہی بھول گیا۔"
"لکھ لو۔" ورشا نے کہا۔
"ایک منٹ!" ساحل عمر نے بال پوائنٹ نکالنے کے لیے دراز کھولی۔ پھر اس نے ورشا کا بتایا ہوا فون نمبر اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔
"میں اگر تمہیں فون کروں تو تمہیں کوئی الجھن تو نہ ہو گی...... میر مطلب ہے کہ......"
"میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔" ورشا نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "جہاں میں رہتی ہوں وہاں میری ممی کے سوا کوئی نہیں رہتا اور انہیں تمہارا فون ریسیو کر کے خوشی ہو گی اور جب تم ان سے ملو گے تو تمہیں ان سے مل کر مزید خوشی ہو گی۔ میری ممی کا کوئی جواب نہیں۔" ورشا نے اپنی ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ برکھا اس کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔
"تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے، کیا تمہارا کوئی جواب ہے؟"
"میرا جواب......!" ورشا نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ہاں میرا جواب تو ہے۔"
"کہاں ہے وہ؟" ساحل عمر نے حیرت سے پوچھا۔
"وہ سامنے جس سے میں باتیں کر رہی ہوں، کیوں غلط کہا میں نے۔" ورشا ہنسی۔
"میں تمہارا جواب کیسے ہو سکتا ہوں۔" ساحل عمر نے انکساری دکھائی۔
"مان جاؤ رانجھن، ہم دونوں ایک دوسرے کے سوال جواب ہیں، ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ ہم لازم و ملزوم ہیں۔ اب ہمیں ایک دوسرے سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔" ورشا نے یک طرفہ بیان دے کر اپنے مشن کو آگے بڑھایا۔
ابھی وہ کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے تصویر پر پڑی۔ رشا ملوک کی تصویر پر نظر پڑتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ غصے میں اسے دیکھ رہی ہو۔ وہ گڑبڑا گیا۔ جو جواب اس کے ذہن میں آیا تھا وہ اس کے ذہن سے نکل گیا۔ اس نے فوراً اپنی نظریں تصویر سے ہٹا لیں۔

"کیا ہوا رانجھن، کہاں کھو گئے۔" ورشا نے اس کی خاموشی کو فوراً محسوس کر لیا۔
"نہیں کچھ نہیں ورشا۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا کھنچاؤ آ گیا۔
"کچھ تو ضرور ہے کیا تمہارے کمرے میں کوئی آ گیا ہے؟" ورشا نے شک ظاہر کیا۔
اس سوال پر ساحل عمر کی نظریں پھر رشا ملوک کی تصویر کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ دھیرے سے بولا۔ "نہیں ایسا کچھ نہیں...... تم بات کرو۔"

''رانجھن اب ہم کب ملیں گے؟'' ورشا نے پوچھا۔

''جب تم چاہو۔'' ساحل عمر نے جواب دیا۔

''اچھا! پھر میں فون کر کے بتاؤں گی۔ او کے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

وہ کچھ دیر ریسیور تھامے تصویر دیکھتا رہا۔ پھر ریسیور رکھ کر سوچنے لگا۔

رشا ملوک......!

ورشا مناف......!

یہ دونوں لڑکیاں بیک وقت اس کی زندگی میں آئی تھیں۔ رشا ملوک تو خیر ابھی ایک خواب تھی لیکن ورشا حقیقت بن کر سامنے آ گئی تھی۔ ساحل عمر خواب اور حقیقت کے درمیان گھرا تھا۔ اس کے لیے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ خواب اچھا ہے یا حقیقت...... حقیقت پھر حقیقت ہوتی ہے۔ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا جبکہ خواب پر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے۔

جو حسن رشا میں تھا وہ ورشا میں نہ تھا اور جو جاذبیت ورشا میں تھی وہ رشا میں نہ تھی۔ رشا کا حسن ملکوتی تھا۔ اسے دیکھ کر خالق کی یاد آتی تھی جبکہ ورشا کی دلکشی میں ایک ہلچل تھی۔ اسے دیکھ کر آدمی بے قرار ہو جاتا تھا اسے پانے کی خواہش اس کے دل میں مچلنے لگتی تھی۔

ساحل عمر کی اگرچہ آج ورشا سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اس کے باوجود اس کا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ وہ ایک سحر بن کر اس پر چھاتی چلی جا رہی تھی۔

رات کو خواب میں ساحل عمر نے رشا ملوک کو دیکھا۔ وہ بے چینی سے ایک چشمے کے کنارے ٹہل رہی تھی۔ ساحل عمر گھوڑے پر سوار تھا اس نے دور سے جب رشا ملوک کو ٹہلتے دیکھا تو اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ رشا ملوک نے اسے اپنے نزدیک آتا دیکھ کر اپنا رخ موڑ لیا۔ وہ منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

ساحل عمر تھوڑا سا گھوم کر اس کے سامنے پہنچا تو اس نے اپنا رخ مخالف سمت میں کر لیا۔ اب ساحل عمر اس کے سامنے نہ آیا' اسے احساس ہوا جیسے وہ ناراض ہے۔ اس نے پیچھے کھڑے ہو کر آہستہ سے کہا۔ ''ناراض ہو؟''

''ہاں! بہت۔'' اس نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیوں آخر؟'' ساحل عمر پھر گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔

اس مرتبہ رشا ملوک نے اپنا منہ نہیں پھیرا۔ اس کے چہرے پر بے حد اداسی تھی۔ اس نے شکوہ بھری نظروں سے ساحل عمر کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا آخر......؟ کچھ بولو تو......'' ساحل عمر نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

''کیا بولوں......؟ تم سے میں نے کہا تھا دیکھو کسی کے فریب میں نہ آ جانا لیکن تم خود کو سنبھال نہیں پائے۔'' رشا ملوک نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے شکوہ کیا۔

''تم کس کا ذکر کر رہی ہو؟''

''میں کسی کا ذکر نہیں کر رہی۔'' وہ غصے سے بولی۔

''جب تک مجھے صاف صاف بتاؤ گی نہیں' میں سمجھوں گا کیسے؟'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''میری ایک بات غور سے سن لو جتنی جلد ممکن ہو سکے جہکال کی تصویر مکمل کر لو اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔'' رشا ملوک نے تنبیہہ کی۔

''میری بھلائی......؟ وہ کیسے۔'' ساحل عمر کی کچھ سمجھ نہ آیا۔

''تم سوال بہت کرتے ہو؟'' رشا ملوک نے کسی قدر ناراضگی سے کہا۔

''اچھا! ناراض نہ ہو تم نے جیسا کہا ہے ویسا ہی کروں گا۔ اب تو خوش ہو۔''

''وعدہ کرو کہ سارے کام چھوڑ کر جہکال کی تصویر مکمل کرو گے۔''

''وعدہ۔'' ساحل عمر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اسی وقت گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ اس نے چونک کر گھوڑے کی طرف دیکھا۔ تب ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ بہت دیر تک جاگتا رہا۔ اس نے خواب میں رشا ملوک سے جہکال کی تصویر جلد از جلد مکمل کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ جہکال کا رشا ملوک سے کیا تعلق ہے اور خود اس کی بھلائی کیسے ممکن ہے۔ بہر حال جو بھی تھا اب اس تصویر کو جلد از جلد مکمل کرنا تھا۔ جہکال کی تصویر پر کام تو جاری تھا۔ آدھی سے زیادہ تصویر مکمل بھی تھی۔ بس بیچ میں دو تین روز کا گیپ آ گیا تھا۔ وہ ورشا کے چکر میں آ گیا تھا۔ اب اس نے طے کیا دن رات لگ کر اس کام کو مکمل کرے گا۔

صبح اٹھتے ہی اس نے رنگ اور برش سنبھال لیے اور کام پر لگ گیا۔

دس دن کے اندر اس نے تصویر مکمل کر لی۔ اس درمیان ورشا سے ایک ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات ایک چائنیز ریستوران میں ہوئی۔ دونوں نے رات کا کھانا کھایا۔ کافی پی۔ خوب گپیں ماریں۔ دو تین گھنٹے دونوں نے زبردست انجوائے کیا۔

جب وہ اٹھنے لگے تو ورشا اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی۔ ''پلیز ایک منٹ۔''

ساحل عمر دوبارہ بیٹھ گیا اور اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے بیگ میں کوئی چیز تلاش کر رہی تھی۔

''کیا ہوا ورشا خیریت تو ہے؟''

''ایک چھوٹا سا تحفہ ہے تمہارے لیے۔ ممی نے بھیجا ہے۔'' ورشا بیگ میں ڈھونڈتے ہوئے بولی۔ ''کہاں گئی؟ ہاں یہ رہی۔'' اس نے بیگ سے ہاتھ نکالا تو اس میں ایک انگوٹھی تھی۔

یہ ایک چاندی کی انگوٹھی تھی۔ اس میں بڑا سا کالے رنگ کا بیضوی پتھر لگا ہوا تھا۔

''یہ لو......!'' اس نے انگوٹھی اس کی طرف بڑھائی۔ ''یہ ممی کا خاص شوق ہے۔ ممی کو پتھروں کی بڑی پہچان ہے۔ وہ لوگوں کو پتھر دیتی رہتی ہیں۔ ان کے پاس بہت سے پتھر ہیں۔ تمہارے لیے انہوں نے پتھر بطور خاص منتخب کیا ہے۔ مجھ سے انہوں نے تمہارا پورا نام اور جنم دن دریافت کیا تھا۔ پھر وہ بڑی دیر تک سلیٹ پر آڑے ترچھے نقشے بناتی رہیں۔ پھر انہوں نے یہ کالا پتھر

نکالا اور اسے خود ہی چاندی کی انگوٹھی میں جڑوایا۔ اتنی مہربان ہیں' وہ تم پر......"

"تمہاری ممی کا بہت شکریہ کہ انہوں نے بطور خاص مجھ پر توجہ کی لیکن اس انگوٹھی کا فائدہ کیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں انگوٹھی پہننے کا عادی نہیں ہوں۔"

"جانتی ہوں پر ممی کا کہنا ہے کہ یہ انگوٹھی ساحل عمر کو نحوست سے بچائے گی۔ اس کا فن چکے گا۔ وہ نام پیدا کرے گا۔ دولت اس کے قدموں میں نچھاور ہو گی۔"

"اچھا اتنی خوبیاں ہیں اس انگوٹھی میں تو لاؤ میں پہنے لیتا ہوں۔" اس نے ورشا سے انگوٹھی لینا چاہی جو ابھی اس کے ہاتھ میں تھی۔

"ایسے نہیں۔" وہ ادائے بے نیازی سے مسکرائی۔

"پھر کیسے؟" وہ حیران ہوا۔

"میں خود پہناؤں گی۔" اس نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے لو پہناؤ۔" ساحل عمر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

ورشا نے انگوٹھی پہنانے سے پہلے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور پھر مسکرا کر اس کی انگلی میں ڈال دی۔

انگوٹھی پہنتے ہی اس کے جسم میں سنسناہٹ سی ہوئی اور جب اس نے انگوٹھی کے کالے پتھر کو قریب کر کے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اس کی سٹی گم ہو گئی۔

☆......☆......☆

ساحل عمر کو چمکتے سیاہ پتھر میں ایک شبیہہ سی لہراتی نظر آئی تھی اور یہ صورت اس لال آنکھوں اور لمبی زبان والی خبیث عورت کی تھی جو اسے بچپن میں نظر آتی تھی۔ یہ شکل بس ایک لمحے کو نظر آئی تھی۔ اب نہ اس کے جسم میں سنسناہٹ تھی اور انگوٹھی میں وہ خبیث صورت۔

"کیسی ہے؟" ورشا نے اسے پرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت اچھی۔ بہت پیاری۔" ساحل عمر نے رسماً تعریف کی۔

"اسے اب اتارنا مت ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ ممی نے کہا ہے کہ اس انگوٹھی کو ایک بار پہننے کے بعد اتارا نہیں کرتے۔ ایک تو پتھر کا اثر زائل ہو جائے گا۔ دوسرے فائدے کے بجائے نقصان شروع ہو جائے گا۔" ورشا نے اسے خوفزدہ کیا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ نہیں اتاروں گا ...... ایسی اچھی انگوٹھی کو اتارنے کی کیا ضرورت ہے۔" ساحل عمر نے کہا۔ "آؤ! اب چلیں۔"

ان دس دنوں میں بس یہی ایک ملاقات تھی۔ ورشا نے چاہا بھی تھا کہ وہ اگلی ملاقات کا وقت اور جگہ طے کر لے لیکن ساحل عمر نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ ایک پینٹنگ پر کام کر رہا ہے۔ اب اسے ختم کیے بنا نہیں ملے گا۔ ورشا کو یہ بات بری لگی تھی۔ وہ اس کی بجائے پینٹنگ کو اہمیت دے رہا تھا۔ لیکن ورشا نے اس بات کا اظہار نہ کیا۔ وہ جس مشن پر تھی وہاں صبر و تحمل کی ضرورت تھی۔

جس رات جہکال کی تصویر مکمل ہوئی۔ اس کے دوسرے دن ورشا کا فون آیا۔

"ہاں، رانجھن!"

"جی ہیرے نی۔"

"واہ آ گئے لائن پر......" ورشا زور سے ہنسی۔

"کیا کروں تم رانجھن کہنا نہیں چھوڑتیں۔ اب میں تمہیں ہیر نہ کہوں تو کیا کہوں۔"

"مجھے رانجھن کہنا اچھا لگتا ہے لیکن تمہارے منہ سے ہیرے نی کہنا اچھا نہیں لگا۔ جب تم ورشا کہتے ہو تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے چاروں طرف بارش ہونے لگی ہو۔ پیار کی بارش۔" ورشا بولی۔

"اچھا جی نہیں کہوں گا آپ کو ہیر میرا قصور معاف کر دیں۔" وہ درخواست گزار ہوا۔

"قصور اتنی آسانی سے معاف نہیں ہوسکتا۔" اس نے ادا دکھائی۔

"پھر کس طرح ہوگا۔" اس نے پوچھا۔

"آج ہم سے ملو۔" جواب ملا۔

"بولو کہاں۔ میں راضی ہوں۔" اس نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے۔

"تمہارے گھر آ جاؤں؟" ورشا نے بڑے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"زہے نصیب......" وہ خوش ہوا۔

"پتہ سمجھاؤ۔" وہ بولی۔

ساحل عمر نے اسے اچھی طرح سے پتہ سمجھا دیا۔ وہ شام کو وقت مقررہ پر اس کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ ساحل کو تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ ورشا کم از کم ایک گھنٹہ لیٹ پہنچے گی۔ ایک تو نئی جگہ پہنچنا تھا پھر ادائے بے نیازی بھی دکھانا تھی۔

ساحل عمر نے گیٹ کھولا تو ورشا اپنی گاڑی دیوار کے سائے میں پارک کر چکی تھی اور اب عین گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ سرخ ساڑھی اور کالا بلاؤز۔ گورا بدن ...... وہ قیامت تو تھی ہی لیکن آج یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ قیامت اس پر ٹوٹ پڑی ہو۔ اسے دیکھ کر ساحل کا سانس ایک لمحے کو رک گیا۔

وہ مسکرائی۔ سرخ دبیز ہونٹوں کے درمیان آب دار موتی چمکے۔ اس نے اپنی ساڑھی کے پلو کو مزید ٹھیک کیا۔ نتیجے میں وہ اس کے شانے سے ڈھلک گیا۔ اس کا مرمریں بازو عریاں ہوگیا۔ اس نے بغیر آستین کا اور گہرے گلے کا چھوٹا سا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ پلو ٹھیک کر کے اس نے اپنی کالی چمکتی آنکھوں سے ساحل کو دیکھا اور اپنا حسین ہاتھ پیشانی تک لے جا کر آداب کیا۔ وہ اس کی اس ادا پر مر مٹا۔

"آیئے تشریف لایئے۔" ساحل عمر نے گیٹ کے ایک طرف ہوتے ہوئے کہا۔

"میں لیٹ تو نہیں ہوئی ہوں نا۔" وہ اپنی نازک کمر لچکاتی گیٹ میں داخل ہوئی۔

"میرا خیال ہے کہ تم اس دنیا کی پہلی لڑکی ہو جو اپنے دوست سے ملنے ٹھیک وقت پر پہنچ گئی۔" ساحل عمر نے ہنس کر کہا اور پلٹ کر گیٹ بند کر دیا۔

"شکر ہے تم نے دوست تو کہا۔" ورشا نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا اور ساتھ ساتھ چلتی

ہوئی بولی۔ ''آج دوست ہوں تو کل وہ بن جاؤں گی۔''
''وہ !...... وہ کیا؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔
''ابھی کیا بتاؤں۔ جب بن جاؤں گی تو بتاؤں گی۔''
''کتنا وقت لگے گا'' وہ ''بننے میں۔'' ساحل عمر نے ہنس کر پوچھا۔
''کبھی تو ایک لمحہ لگتا ہے اور کبھی صدیاں لگ جاتی ہیں۔''

بات کچھ آگے بڑھتی لیکن گھر کے دروازے پر اماں کھڑی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر چپ ہوگئے۔ ورشا نے انہیں بہت احترام سے سلام کیا۔ ساحل عمر اپنی اماں کے بارے میں اسے تفصیل بتا چکا تھا۔

اماں نے بڑی تنقیدی نظر سے ورشا کو سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر ایک دم آگے بڑھیں۔ سلام کے جواب میں اسے دعائیں دیں اور ''ماشاء اللہ'' کہہ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے اندر لیکر چلیں۔ اماں کا چہرہ اس وقت دیکھنے والا تھا۔ خوشی ان کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ عمر کی دلہن لے کر گھر میں داخل ہو رہی ہوں۔

اماں کا یہ سلوک دیکھ کر ورشا کچھ سمٹی اور لجائی سی ان کے ساتھ چلنے گی۔

ساحل عمر مسکرا کر کبھی اماں کو اور کبھی ورشا کو دیکھ رہا تھا۔

ساحل عمر کے گھر میں کوئی اجنبی مہمان آتا ہی نہ تھا۔ اگر کوئی تکلف والا بندہ آ بھی جاتا تو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا جاتا۔ کوئی جاننے والا آتا تو ساحل اسے لاؤنج میں لے آتا۔ مسعود اور ناصر پر کوئی پابندی نہ تھی ان کے لئے گھر کا ہر گوشہ نشست گاہ تھا۔ جہاں چاہے بیٹھتے۔

اماں ورشا کو سیدھی لاؤنج میں لے آئی تھیں۔ ساحل عمر ابھی ورشا کو بیٹھنے کا اشارہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ اماں فوراً بول اٹھیں۔ ''ارے یہاں کہاں بیٹھو گی۔ ساحل کا کمرہ وہ سامنے ہے وہاں چلو۔''

اور پھر اماں ورشا کا ہاتھ تھامے بڑے اطمینان سے ساحل عمر کے بیڈ روم میں داخل ہوگئیں اور پھر جلدی سے باہر نکلتے ہوئے بولیں۔ ''تم یہاں بیٹھو میں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

اماں کے جانے کے بعد بے اختیار دونوں کی نظریں ملیں اور وہ دونوں ہی کچھ سوچ کر بے اختیار مسکرا اٹھے۔

''یہیں بیٹھیں گی یا باہر چلیں گی؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔
''یہ کون ہے؟'' یکا یک ورشا کی آواز تبدیل ہوگئی۔

''کون۔'' ساحل عمر کو فوراً ہی معلوم ہوگیا کہ وہ کیا پوچھ رہی ہے۔ وہ رشا ملوک کی تصویر پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ اس کے ابرو کمان بن چکے تھے اور آنکھوں میں تیر اتر آئے تھے۔

''پینٹنگ ہے!'' ساحل عمر نے سادگی سے جواب دیا۔
''کس کی ہے؟'' ورشا کے لہجے میں پریشانی شامل تھی۔
''یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔'' ساحل عمر نے سادگی سے کہا۔
''خیالی ہے؟'' اس نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں۔ ایک طرح سے خیالی ہی سمجھو۔ کئی تصویروں کو دیکھ کر بنائی ہے۔'' ساحل عمر نے وضاحت کی۔

''اوہ!'' ورشا نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ اس کے چہرے پر جو چند لمحوں کے لئے شک کا سانپ لہرایا تھا۔ وہ اب غائب ہو چکا تھا۔ ورشا ہنس کر بولی۔ ''کہاں بیٹھوں؟''

''پورا کمرہ تمہارے لئے نگاہ منتظر بنا ہوا ہے۔ جہاں چاہے بیٹھو۔''

تب وہ دھم سے بیڈ پر بیٹھ گئی اور مسکرا کر بولی۔ ''میرے پاس آؤ۔''

ساحل عمر نے دیوار سے لگی ایک کرسی اٹھائی اور بیڈ کے نزدیک کر کے اس پر بیٹھ گیا۔

''کل یہ پینٹنگ مکمل کی ہے تم نے؟'' ورشا کی نظریں اس تصویر پر گڑی تھیں۔

''نہیں۔ یہ پینٹنگ تو میں نے کافی پہلے بنائی تھی۔ کل والی پینٹنگ میرے اسٹوڈیو میں ہے۔ ویسے اس پینٹنگ کی بڑی عجیب کہانی ہے۔ اس کی پیشانی پر ٹیکہ دیکھ رہی ہو۔ یہاں پہلے میں نے ایک بچھو بنایا تھا۔''

''بچھو!'' ورشا ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی لیکن نظریں اس کی تصویر پر ہی تھیں۔

ساحل عمر کی اچانک ہی اس پر نظر پڑی۔ وہ بیڈ پر تھا اور بڑے مزے سے ورشا کے ہاتھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ساحل عمر بیڈ پر چلتے بچھو کو دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گیا۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ ''ورشا بچھو۔''

بچھو کا نام سن کر ورشا بڑی پھرتی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر بیڈ کی طرف دیکھا اور اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

ساحل عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس بچھو کو کس چیز سے مارے۔ بیڈ روم میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے وہ اسے مار سکتا۔ شیلف میں کچھ کتابیں ضرور تھیں۔ پہلے اس نے سوچا ایک موٹی سی کتاب نکال کر اس پر دے مارے لیکن وہ جانتا تھا کہ گدے کی وجہ سے بچھو کو چوٹ نہ لگے گی۔ پھر یکایک وہ کچن کی طرف بھاگا۔ چمٹے سے نہ صرف وہ اس بچھو کو پکڑ کر دبا سکتا تھا بلکہ وہ اس پر ضرب بھی لگا سکتا تھا۔

اس بچھو نے اپنی دم کے ساتھ دونوں ہاتھ بھی اٹھائے جیسے سلام کر رہا ہو۔ پھر وہ اپنی جگہ گھوما۔

''تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ'' ورشا نے تنبیہی لہجے میں لیکن بہت آہستہ سے کہا۔

یہ حکم سنتے ہی وہ بچھو فوراً پلٹا اور بڑی تیزی سے بیڈ کے دوسری طرف چلا گیا۔ ساحل عمر کمرے میں داخل ہوا تو وہ بچھو بیڈ کے دوسری طرف جا رہا تھا اس نے اس کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی۔ وہ چمٹا لے کر بیڈ کے دوسری طرف بھاگا۔

''نہیں۔ ساحل اسے مارنا نہیں۔'' ورشا ایک دم چیخی۔

ساحل عمر کا اٹھا ہوا ہاتھ ایک دم رک گیا۔ وہ بچھو قالین پر اس کی رینج میں تھا۔ وہ اگر زور سے اس پر چمٹا مار دیتا تو اس کی موت یقینی تھی۔

بچھو کے لئے اتنا وقت بہت تھا۔ وہ بڑی تیزی سے سائیڈ ٹیبل کے پیچھے غائب ہوگیا۔

''تم نے اس بچھو کو مارنے سے مجھے کیوں روک دیا۔'' ساحل عمر حیران تھا۔

''میں نہیں چاہتی کہ تمہارا نقصان ہو۔ اول تو وہ آئندہ تمہیں اس گھر میں نظر نہیں آئے گا اور اگر آ بھی جائے تو مارنا ہرگز نہیں ورنہ بہت تباہی پھیلے گی۔ اب اس سے زیادہ میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔'' ورشا نے خوفزدہ لہجے میں کہا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ روم سے باہر لائی۔

اتنے میں اماں ہانپتی کانپتی آئیں اور ساحل عمر کے ہاتھ سے چمٹا لے کر بولیں۔ ''کیا ہوا ساحل؟''

''کچھ نہیں اماں۔'' ساحل عمر انہیں کیا بتاتا۔

''پھر یہ چمٹا کچن سے کیوں لے کر بھاگے۔''

''اماں' یہ بیڈ روم میں روٹی پکانے کا مظاہرہ کرنا چاہ رہے تھے۔'' ورشا نے ہنس کر بات بتائی۔

''عجیب ہو تم بھی۔'' اماں واپس جاتے ہوئے بولیں۔ ''بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔''

پھر اماں جاتے جاتے پلٹیں اور گویا ہوئیں۔'' چلو ڈائننگ ٹیبل پر چلو۔ میں چائے لاتی ہوں۔

وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھے۔ ڈائننگ ٹیبل چائے کے لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔ ورشا ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''خاصا تکلف کرلیا۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب اماں کا کمال ہے۔'' ساحل عمر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میں نے بھی کچھ نہیں کیا۔ یہ سب تمہارا جمال ہے۔'' اماں کی پیچھے سے آواز آئی۔ ان کے ہاتھ میں چائے کی کیتلی تھی۔

''واہ! اماں کیا بات کہی۔ قسم سے ایک چائے کا مزہ آ گیا۔'' ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

''آپ کچھ اس تصویر کے بارے میں بتا رہے تھے۔'' ورشا نے فوراً موضوع بدلا۔

''اوہ ہاں۔'' ساحل عمر کو جیسے یاد آ گیا۔

پھر اس نے رشا ملوک کی پینٹنگ کی داستان الف سے لے کر ے تک سنا دی۔ البتہ اس نے رشا ملوک کے خواب میں آنے کا ذکر گول کردیا۔ یہ ساری روداد سن کر ورشا کے چہرے پر کچھ فکر مندی کے آثار ظاہر ہوئے لیکن وہ ان آثار کو بڑی خوبصورتی سے دبا گئی۔

چائے پینے کے بعد ورشا مناف نے اس کا اسٹوڈیو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ''کیوں اپنا اسٹوڈیو نہیں دکھاؤ گے کیا؟'' اس نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''ضرور آؤ میرے ساتھ ...... کل میں نے ایک نئی پینٹنگ مکمل کی ہے۔ وہ بھی دیکھ لینا۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لے کر چلا۔ اماں نے آگے بڑھ کر اسٹوڈیو کا لاک کھول دیا۔ ورشا اور ساحل کمرے میں داخل ہوئے۔

یہ اچھا خاصا بڑا کمرہ تھا۔ چیتے کی تصویر مکمل کرنے کے بعد اس نے بورڈ دیوار کی جانب کھسکا دیا تھا۔ دیوار بالکل خالی تھی۔ یہ ایک لائف سائز پینٹنگ تھی۔ اس میں چیتا اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ موجود تھا۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چیتا اب قدم اٹھا کر آگے آ جائے گا۔ ساحل عمر نے اس پینٹنگ پر بہت محنت کی تھی۔ اس محنت کا نتیجہ سامنے ظاہر تھا۔ ایک جیتا جاگتا چیتا۔

بازغر کی فرمائش پر یہ تصویر بنائی گئی تھی۔ وہ ساحل عمر کو ایک ٹیلی فون نمبر دے کر گیا تھا کہ وہ تصویر مکمل ہونے پر اسے اطلاع دے دے۔ وہ آ کر لے جائے گا اور منہ مانگا معاوضہ ادا کر جائے گا۔

ساحل عمر نے اسے ابھی ٹیلی فون نہیں کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ورشا کے جانے کے بعد اسے اطلاع دے دے گا کہ کل کسی وقت آ کر وہ پینٹنگ اٹھا لے جائے۔

ساحل عمر آگے تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر اپنی پینٹنگ کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ ہے وہ تصویر؟''

ورشا اس کے اسٹوڈیو پر ایک نظر ڈالتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ساحل عمر کے اشارہ کرنے پر وہ جہکال کی تصویر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

ابھی ورشا نے ایک نظر دیکھا ہی تھا کہ ایک دم اس کے چہرے پر خوف چھا گیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر چیختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ ساحل عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ ورشا کو اچانک کیا ہوا؟ وہ بھی اس کے پیچھے تیزی سے باہر نکل آیا۔ ورشا ٹی وی لاؤنج میں ایک صوفے پر بے دم سی پڑی تھی۔

''کیا ہوا ورشا؟'' ساحل عمر اس کے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔

اماں بھی پریشان ہو کر ان کے قریب آ گئیں۔ ''ائے کیا ہوا بھیا؟''

''ساحل اس کمرے کا دروازہ فوراً لاک کر دیں۔'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اچھا۔'' ساحل عمر فوراً اٹھا۔

''میں کرتی ہوں۔'' اماں نے جلدی سے کہا۔ ''تم بیٹھو''

''آخر ہوا کیا؟''

''وہ چیتا۔ تصویر سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ مجھ پر جھپٹنا چاہتا تھا۔'' اس نے حیرت میں ڈالنے والا بیان دیا۔

''یا اللہ خیر...... ایک اور نئی مصیبت۔'' ساحل عمر بڑبڑایا۔ ''ورشا تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ذرا آؤ میرے ساتھ۔''

''میں اب اس کمرے میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔'' ورشا نے سختی سے منع کر دیا۔

''اچھا! میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ساحل عمر تیزی سے اٹھ گیا۔

''اماں دروازہ بند کرنے ہی والی تھیں کہ اس نے روک دیا۔ ''اماں ایک منٹ۔''

اس نے کمرے میں جا کر جہکال کی تصویر کو دیکھا۔ تصویر اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔ اس نے پھر خود اپنے ہاتھ سے اسٹوڈیو کا دروازہ لاک کیا اور ورشا کے پاس آ گیا۔

ورشا اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''میں ٹھیک کہہ رہی تھی نا۔''

''جی بالکل نہیں۔ تصویر تو جوں کی توں موجود ہے۔ یقین نہ آئے تو چل کر دوبارہ دیکھ لو۔''
''کسی قیمت پر نہیں۔ اب میں ہرگز اس تصویر کو نہیں دیکھوں گی۔'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔
''اچھا چلو چھوڑو' مت دیکھو...... لیکن ڈرو مت...... وہ محض ایک تصویر ہے۔''
''کاش ایسا ہی ہوتا۔'' وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔
''کیا مطلب ؟'' ساحل عمر نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔
''میں نے جو دیکھا وہ کچھ اور ہی دیکھا۔ ممی کا خیال ٹھیک تھا۔''
''کیا کہا تھا ممی نے ؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔
''ممی نے کہا تھا کہ ساحل کے گھر مت جاؤ اس کے گھر میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جنہیں دیکھ کر تم پریشان ہو جاؤ گی۔ وہی ہوا۔ ممی کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ اب میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔'' یہ کہہ کر وہ فوراً کھڑی ہوگئی۔
''ارے ورشا کچھ دیر تو اور رکو۔'' اس نے التجا کی۔
''نہیں۔ ساحل اب جانا ہی ہوگا۔ میں تم سے جلد ملوں گی۔ او کے پھر......''
ساحل عمر ورشا کے رویے کو سمجھ نہ سکا۔ جب وہ آئی تھی تو بہت خوش تھی۔ لگتا تھا کہ بہت دیر بیٹھ کر جائے گی لیکن اب وہ کچھ اس طرح اکھڑی تھی کہ چند منٹ بیٹھنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ تہکال کی تصویر دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ پتہ نہیں اس نے تہکال کی تصویر میں کیا دیکھ لیا تھا۔
ساحل عمر اب سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ وہ تصویریں بنانا چھوڑ دے۔ حد ہوگئی تھی۔ جو تصویر بنا رہا تھا وہ پراسرار ثابت ہو رہی تھی۔ لیکن یہ سلسلہ ابھی انہی دو تصویروں سے شروع ہوا تھا۔ اس سے پہلے تو کبھی کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوا تھا۔
ورشا تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گیٹ پر پہنچ کر ساحل عمر نے اس سے پوچھا۔ ''ورشا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ تم گاڑی ڈرائیو کر لو گی یا میں گھر تک چھوڑ آؤں۔''
''نہیں۔ تم پریشان نہ ہو' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں معذرت چاہتی ہوں کہ میری وجہ سے ایک اچھی ملاقات بوریت میں تبدیل ہوگئی۔ مجھے معاف کر دینا۔'' ورشا نے عجیب سے انداز میں کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے نکل گئی۔
ساحل عمر گاڑی کی سرخ بتیاں دیکھتا رہ گیا۔
ورشا جب توقع کے خلاف جلد گھر پہنچ گئی تو برکھا نے گیٹ کھولتے ہی سوال کیا۔ ''کیا ہوا؟''
''ممی' اندر تو آنے دو بتاتی ہوں۔'' ورشا نے نرم لہجے میں کہا۔
''اچھا آؤ!'' برکھا گیٹ کے سامنے سے ہٹ گئی۔
گاڑی کھڑی کرنے کے بعد جب ورشا برکھا کے بیڈ روم میں پہنچی تو وہاں عجیب سی بو آرہی تھی۔
''ممی ! تمہارے کمرے میں بو کیسی آرہی ہے۔'' ورشا نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔
''ورشا اپنی بات کرو۔'' برکھا کے ایک دم تیور بدل گئے۔

''بس، ممی میں کیا بتاؤں۔ یوں سمجھو کہ مجھے کمرے سے نکلنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو میں تو گئی تھی۔'' ورشا نے یہ کہہ کر ساحل عمر کے گھر میں اس پر کیا بیتی مختصراً احوال کہہ سنایا۔

''ہوں۔'' برکھا نے ساری بات سن کر ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا اور پھر بولی۔ ''ورشا تجھے وہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ اگر تو اس منحوس کی تصویر مکمل ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جاتی تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میرا نام بھی برکھا ہے۔ میں کرتی ہوں اس کا انتظام۔''

''ممی ! تم کیا کرو گی۔'' ورشا فکر مند ہو کر بولی۔

''بتاتی ہوں کیا کروں گی۔ یہ بتا اس نے میری دی ہوئی انگوٹھی تو نہیں اتار دی۔'' برکھا نے پوچھا۔

''نہیں وہ اس کے ہاتھ میں تھی۔'' ورشا نے تصدیق کی۔

''اچھا۔'' وہ کسی قدر خوش ہو کر بولی۔ ''یہ بھی اچھا ہے۔ لا ذرا مجھے ٹیلی فون اٹھا دے۔''

ورشا نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ٹیلی فون برکھا کی طرف بڑھا دیا۔ برکھا اطمینان سے بیڈ پر بیٹھ کر کسی کو ٹیلی فون ملانے لگی۔

''ہاں واسم کیسے ہو؟'' برکھا نے ادھر سے ٹیلی فون اٹھانے پر خوش اخلاقی سے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں برکھا جی آپ حکم فرمائیں۔'' اس نے فرماں برداری سے کہا۔

''واسم میں فون ورشا کو دیتی ہوں وہ تمہیں ایک پتہ سمجھائے گی اس پتے کو اچھی طرح سمجھ لو لکھ لو ...... پھر میں بات کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر برکھا نے ریسیور ورشا کی طرف بڑھا دیا اور بولی۔

''واسم کو ساحل عمر کے گھر کا پتہ اچھی طرح سمجھا دو۔''

ورشا نے ریسیور اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولی۔

''ممی کیا کرنے لگی ہو؟''

''سوال نہیں ؟'' برکھا کی بھنویں ایک دم کمان بن گئیں۔

ورشا نے واسم کو اچھی طرح ساحل عمر کے گھر کا پتہ سمجھا دیا۔ پتہ سمجھنے کے بعد واسم نے کہا۔

''برکھا جی کو فون دیجئے۔''

''اچھا!'' ورشا نے کہا۔ پھر برکھا کی طرف ریسیور بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''لو ممی ...... بات کرو۔''

''ہاں۔ واسم پتہ سمجھ میں آ گیا ؟'' برکھا نے سوال کیا۔

''جی سمجھ گیا۔'' اس نے کہا۔

''اب تم نے کیا کرنا ہے اس بات کو غور سے سن لو۔ جیسا میں کہتی ہوں اس پر حرف بہ حرف عمل کرو۔'' یہ کہہ کر برکھا نے اسے پورا منصوبہ سمجھایا۔

واسم نے ساری بات اچھی طرح سمجھ کر کہا۔ ''ہو جائے گا اور آج رات ہی ہو جائے گا۔''

''بہت ہوشیاری کی ضرورت ہے۔'' برکھا نے تنبیہ کی۔

''فکر نہ کریں آپ اتنا بتائیں کہ کیا اسے آپ کے بنگلے پر پہنچایا جائے یا ....''

''نہیں، اپنی تحویل میں رکھنا۔'' برکھا نے اس کی بات کاٹی اور پھر حکم دیا۔ ''کام ہونے کے بعد اطلاع دو گے تو پھر بتاؤں گی کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے برکھا جی!'' واسم نے انتہائی فرماں برداری سے کہا۔

ٹیلی فون بند کر کے برکھا نے ورشا کو اشارہ کیا۔ ورشا نے فون اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور بولی۔ ''ممی میں کپڑے چینج کر لوں۔''

''ہاں، جاؤ، میری جان!'' برکھا نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آ گئی۔''

''کیا بات کرتی ہو ممی ...... تم کون سی بوڑھی ہو...... اب بھی تمہاری جوانی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔'' ورشا نے ہنس کر کہا اور کمر لچکاتی ہوئی برکھا کے کمرے سے نکل گئی۔

رات کا کھانا کھا کر ساحل عمر نے سوچا کہ کچھ دیر کے لئے باہر ٹہل آئے۔ پھر اسے ایک دم بازغر کا خیال آیا۔ اسے تصویر کے مکمل ہونے کی اطلاع دینا تھی۔ اس نے سوچا کہ پہلے اس سے ٹیلی فون پر بات کرے پھر ٹہلنے جائے۔

وہ اپنے آرٹ روم کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا، لائٹ جلا کر سب سے پہلے اس نے مہاکال کی تصویر پر نظر ڈالی۔ تصویر اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔

وہ سوچنے لگا کہ بازغر کا ٹیلی فون نمبر کہاں ہے اسے یاد آیا کہ ٹیلی فون نمبر اس نے پنسل سے کسی رسالے پر نوٹ کیا تھا اور یہ سوچ کر نوٹ کیا تھا کہ وہ بعد میں اسے اپنی ڈائری میں اتارے گا لیکن وہ ایسا کرنا بھول گیا اور اب اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ ٹیلی فون نمبر اس نے کس رسالے پر لکھا تھا۔ کمرے میں بے شمار رسالے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ان بکھرے رسالوں کو ایک ایک کر کے دیکھنے لگا لیکن تلاش کے باوجود اسے ٹیلی فون نمبر نہیں ملا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ ٹیلی فون نمبر آخر کہاں گیا۔

وہ مایوس ہو کر کمرے سے نکلنے ہی والا تھا کہ ایک دم اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے ایک رسالے پر پڑی۔ یہ وہ رسالہ تھا جس پر فون نمبر لکھا تھا۔ اس ٹیلی فون نمبر کے لئے اس نے زیادہ تر رسالوں کے سرورق دیکھ لئے تھے جبکہ وہ رسالہ اوپر ہی میز پر رکھا تھا۔ اس رسالے پر بھی اس نے نظر ماری تھی لیکن اس وقت یہ نمبر نظر نہیں آیا تھا۔ رسالہ اٹھا کر جب اس نے نمبر دیکھا تو بڑی مایوسی ہوئی۔ اس ٹیلی فون نمبر کے درمیان سے دو ہندسے مٹے ہوئے تھے۔ اتنے دھندلے ہو گئے تھے کہ ان کا سمجھنا مشکل تھا۔ یہ نمبر کیونکہ پنسل سے لکھا ہوا تھا۔ اس لئے دو ہندسوں کا مٹ جانا بعید از قیاس نہیں تھا لیکن پریشان کن ضرور تھا۔

اس نے غور سے ان مٹے ہوئے ہندسوں کو دیکھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے ربڑ مار دی ہے۔ بہر حال جو بھی تھا۔ اب بازغر کو ٹیلی فون کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ بازغر سے اب اسی صورت میں رابطہ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی تصویر کے بارے میں دریافت کرے۔

ٹیلی فون نمبر سے مایوس ہو کر وہ کمرے سے نکل آیا۔ اس نے اپنے اسٹوڈیو کو لاک کر دیا اور گھر سے باہر نکل کر لان پر ٹہلنے لگا۔

اپنی ان دو تصویروں کی وجہ سے وہ عجیب و غریب حالات کا شکار ہوگیا تھا۔ دلہن والی تصویر پر بنے بچھو نے ناقابل یقین واقعات سے دوچار کیا تھا اور اب اس چیتے کی پینٹنگ نے رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ دلہن والی تصویر پر بازغر جھپٹا تھا' اس نے بچھو کو مارنا چاہا تھا اور اس چیتے والی تصویر کو دیکھ کر ورشا ڈر گئی تھی۔ بقول اس کے اسے دیکھ کر چیتا اس پر جھپٹا تھا۔ وہ تصویر سے باہر نکل آیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تصویریں اس نے بہت محنت سے بنائی تھیں۔ وہ جاندار دکھائی دیتی تھیں۔ اب اس نے یہ بھی نہیں چاہا کہ وہ تصویریں متحرک ہو جائیں۔ ان میں جان پڑ جائے ٹہلتے ٹہلتے اسے جب کافی دیر ہوگئی تو اماں نے باہر آ کر جھانکا۔ دروازے پر کھڑے ہوکر انہوں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ جب ساحل عمران کے قریب پہنچا تو انہوں نے اس کے چہرے پر اچھی طرح پھونک ماری اور پھر بولیں۔ ''کیا آج رات بھر ٹہلنے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں اماں' بس جا رہا ہوں اپنے کمرے میں۔''

اس نے سعادت مندی سے کہا۔

''چلو پھر تم اندر جاؤ' میں باہر کی لائٹیں وغیرہ بند کر کے آتی ہوں۔'' اماں بولیں۔

''اماں میں بند کر کے آجاؤں گا۔'' ساحل عمر نے خواہش ظاہر کی۔

''نہیں بھئی میں خود کروں گی' پتہ نہیں تم ٹھیک سے بند کرو گے کہ نہیں۔ دوسرے میں کاہل نہیں بننا چاہتی ذرا چلتے پھرتے رہنا چاہتی ہوں۔'' وہ ہنس کر بولیں۔

''اچھا اماں!'' ساحل عمر نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ اپنی جان بنائیں میں اندر چلتا ہوں۔''

ساحل عمر نے اپنے بیڈ روم میں آ کر لائٹ آن کی۔ لائٹ جلاتے ہی اس کی نظر رشا ملوک کی تصویر پر پڑی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز رینگ کر فریم کے پیچھے گئی ہے۔ وہ تیزی سے دوڑ کر تصویر کے نزدیک پہنچا۔ اس نے جھانک کر فریم کے پیچھے دیکھا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ ایک وہم سمجھ کر اس نے ذہن جھٹک دیا اور کیسٹوں کی قطار میں سے کوئی کیسٹ نکالنے کے لئے ان پر نظر ڈالنے لگا۔ ایک کیسٹ منتخب کر کے اس نے ڈیک میں لگا دیا۔ آواز دھیمی تھی پھر بھی احتیاطاً کمرے کا دروازہ بند کر دیا تا کہ اماں ڈسٹرب نہ ہوں۔ پھر اس نے کمرے کی لائٹ آف کر دی اور اطمینان سے لیٹ کر گانے سننے لگا۔ گانے سنتے سنتے اسے نیند نے آلیا۔ کیسٹ ختم ہونے کے بعد ڈیک خود بخود آف ہوگیا۔

پھر وہی منظر' وہی فضا' نیلا آسمان' خوبصورت برف پوش پہاڑ' تیز رفتار چشمہ' چشمے میں پڑے بڑے بڑے پتھر اور ایک بڑے پتھر پر بیٹھی رشا ملوک ...... وہی سفید ریشمیں لبادہ ...... ذرا فاصلے پر بہتے پانی میں کھڑا چیتا۔

چیتے کو دیکھتے ہی ساحل عمر نے فوراً پہچان لیا کہ د تہکال ہے۔ اسے تہکال کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ اس سے بڑی حیرت کی بات یہ تھی کہ چیتے کے نزدیک کھڑے ہونے کے باوجود رشا ملوک بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔ اسے چیتے کا ذرا سا بھی ڈر نہ تھا۔

تب ساحل عمر نے اسے آواز دی۔ ''رشا ملوک!''

رشا ملوک نے جب مڑ کر ساحل کی طرف دیکھا تو وہ اس کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ اس

کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"ارے رشا ملوک کیا ہوا؟" وہ پریشان ہو کر بولا "تم رو رہی ہو؟"

پھر وہ تیزی سے اس پتھر کی طرف بڑھا جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ جب وہ پانی سے گزر کر پتھر کے نزدیک پہنچا تو وہاں کچھ نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بادل کا ٹکڑا کہیں سے نمودار ہوا۔ وہ گہرے بادل میں چھپ گئی اور وہ بادل اسے لے اڑا۔ اب وہاں خالی پتھر تھا اور وہ چیتا ایک بڑے پتھر پر اپنی دونوں ٹانگیں رکھے انگڑائی لے رہا تھا۔ اس نے بھی ساحل عمر کی طرف سے منہ موڑ لیا تھا۔

اچانک اسے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔ اس کی فوراً آنکھ کھل گئی۔ تب پتہ چلا کہ دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ ساتھ ہی اس کا نام بھی پکار رہا ہے۔

وہ فوراً اٹھا۔ یہ تو اماں کی آواز تھی۔ اس نے کمرے کی لائٹ جلائی اور تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر اماں پریشان کھڑی تھیں۔

"خیریت ہے اماں ...... کیا ہوا؟" ساحل عمر نے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ساحل گیٹ پر کوئی ہے؟ کئی بار بیل ہو چکی ہے؟"

اماں نے بتایا۔

اسی وقت ایک مرتبہ پھر بیل کی آواز سنائی دی۔

ساحل عمر نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بج رہے تھے۔ یہ رات کے دو بجے اس کے دروازے پر کون آ گیا۔

"لائیں اماں چابی دیں' میں دیکھتا ہوں۔"

"ساحل! گیٹ کھولنے سے پہلے اچھی طرح تصدیق کر لینا کون ہے؟" اماں نے چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

گیٹ کے نزدیک پہنچ کر اس نے آواز لگائی۔ "کون؟"

"صاحب جی دروازہ کھولیں میں برابر کے بنگلے کا چوکیدار ہوں۔" ادھر سے آواز آئی۔

"کیا ہوا؟" ساحل عمر نے پوچھا۔

"صاحب جی آپ دروازہ تو کھولیں بتاتا ہوں' جلدی کریں۔ ہمارے صاحب پر دل کا دورہ پڑا ہے۔"

دل کے دورے کا سن کر ساحل عمر نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔

گیٹ کھلتے ہی چار نقاب پوش تیزی سے اندر آئے۔ ایک نے کلاشنکوف کی نال اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"چلو' اندر چلو!"

☆......☆......☆

ایک نقاب پوش نے پلٹ کر گیٹ بند کر دیا اور پھر وہ چاروں اسے کلاشنکوف کی زد پر لئے گھر کی طرف بڑھے۔ اماں گھر کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ انہوں نے صورت حال گھمبیر دیکھی تو وہ لپک کر آگے بڑھیں اور التجا آمیز لہجے میں بولیں۔ "اے بھیا! میرے ساحل عمر کو کچھ مت کہنا۔ اگر مارنے آئے ہو تو مجھے مار دینا اور ڈاکے کی غرض سے آئے ہو تو گھر کی جو چیز لے جانا چاہتے ہو وہ لے جاؤ۔ تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔"

"بڑھیا بڑی عقلمند معلوم ہوتی ہے۔" ان ہی میں سے ایک نقاب پوش ہنسا۔

"بڑی بی ہم تمہاری جان لے کر کیا کریں گے۔ تم ویسے ہی قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی ہو۔ چلو تم بھی اندر چلو۔" دوسرے نقاب پوش نے اماں کو بھی نشانے پر لے لیا۔

گھر کے اندر آ کر انہوں نے گھر کا دروازہ بھی اندر سے بند کرلیا۔ لاؤنج میں آ کر انہوں نے ساحل عمر کو ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ساحل عمر خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہ صورت حال اس کے لئے بالکل نئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان سے کس طرح گفتگو کا آغاز کرے۔

"ایم ون۔" ایک نقاب پوش اپنے کسی ساتھی سے مخاطب ہوا۔

"سر!" وہ نقاب پوش جس کا نام ایم ون تھا جھک کر بولا۔

"گھر کا جائزہ لو۔ دیکھو ہمارا مال کہاں ہے؟"

"ٹھیک ہے سر۔" ایم ون یہ کہہ کر پہلے ڈرائنگ روم میں گیا اس کے بعد اس نے گھر کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا پھر واپس آیا۔

"ہاں کیا ہوا؟"

"گھر میں ان دونوں کے سوا کوئی اور نہیں۔ دوسرے ہمارا مال کھلے کمروں میں نہیں۔ ایک کمرہ لاک ہے۔ ممکن ہے وہ وہاں ہو۔"

"آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟" بالآخر ساحل عمر کو بولنا پڑا۔

"فی الحال بند کمرے کی چابی۔" ایک نقاب پوش بولا جو شاید ان کا چیف تھا۔

"آؤ میرے ساتھ میں کھولتی ہوں کمرہ۔" ساحل عمر کے کچھ جواب دینے سے پہلے ہی اماں بول پڑیں اور وہ ساحل عمر کے اسٹوڈیو کی طرف بڑھیں۔ انہوں نے چابی میز کی دراز سے نکال کر جلدی

سے کمرہ کھول دیا۔

''ایم ٹو اپنی کلاشنکوف کندھے پر ڈال کر کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر وہ اندر گیا اور چند سیکنڈ کے بعد ہی باہر آ گیا۔ پھر اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز لگائی۔

''سر ! وہ اندر ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ان دونوں کو بہت پیار سے ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں سے باندھ دو۔'' چیف نے حکم دیا۔

''ہمیں باندھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' ساحل عمر نے کہا۔ ''آپ لوگ جو چیز یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں وہ لے جائیں۔''

''مسٹر ساحل ہمیں آپ کے مشورے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے حق میں بہتر ہوگا کہ خاموشی اختیار کریں۔'' چیف نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ''چلو اپنا کام کرو۔''

دو نقاب پوشوں نے بیگ میں سے رسی نکال کر دونوں کو کرسیوں سے باندھ دیا۔ پھر وہ چیف اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسٹوڈیو میں داخل ہوا۔ اس نے چیتے کی تصویر پر ایک نظر ڈالی اور ایم ون سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اسے احتیاط سے اتار لو۔''

ایم ون اور ایم ٹو نے مل کر وہ تصویر بورڈ پر سے اتار لی۔

''چلو اسے گاڑی میں رکھو۔'' چیف نے حکم دیا۔

جب وہ دونوں چیتے کی تصویر اٹھائے کمرے سے باہر نکلے تو ساحل عمر یہ دیکھ کر سناٹے میں آ گیا۔ یہ کس قسم کے ڈاکو ہیں کہ بھرے ہوئے گھر میں سے محض ایک پینٹنگ اٹھا کر لئے جا رہے ہیں۔ اس تصویر میں ان کی کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ ابھی تو یہ ابتدا ہے ہو سکتا ہے یہ لوگ اس پینٹنگ کے بعد دوسری چیزوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہیں اور ابھی سے اپنی جان کا بھی خطرہ تھا۔ کیا پتہ جاتے جاتے وہ ان دونوں کو بھی اوپر پہنچاتے جائیں۔

''بھائی اس تصویر کا آپ کیا کریں گے؟'' ساحل عمر سے بولے بنا رہا نہ گیا۔

''مسٹر ساحل سوال کوئی نہیں۔ ہمیں مجبور نہ کریں۔ خواہ مخواہ آپ کے منہ میں کپڑا ٹھونسنا پڑے گا۔'' چیف نے اسے تنبیہ کی۔

''ساحل خاموش رہو۔'' اماں نے فکر مند لہجے میں کہا۔

کچھ دیر کے بعد جب چیف کو یقین ہو گیا کہ چیتے کی تصویر گاڑی میں بحفاظت رکھی جا چکی ہے تو اس نے ساحل عمر کو مخاطب کر کے کہا۔ ''مسٹر ساحل ! ہم جا رہے ہیں۔ ہم نے آپ کے گھر سے صرف ایک پینٹنگ اٹھائی ہے۔ ہم چاہتے تو یہاں سے بہت کچھ لے جا سکتے تھے۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم اب جا رہے ہیں۔ گھر کا دروازہ اور باہر کا گیٹ کھلا رہے گا۔ آپ لوگ صبح تک اس کرسی پر براجمان رہیں۔ صبح کوئی نہ کوئی گھر کے اندر آ کر آپ کو کھول دے گا۔ کھل جانے پر زیادہ پھیلنے کی کوشش مت کیجئے گا۔ ویسے بھی ایک تصویر کی چوری کی رپورٹ کوئی تھانیدار لکھنے پر راضی نہ ہوگا۔ بہتر

ہو گا کہ آپ اپنے گھر میں آرام سے رہیں۔"

ساحل عمر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کیا جواب دیتا۔

"نہیں بھیا تم جاؤ آرام سے۔ ہمیں پولیس میں رپورٹ لکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ساحل عمر چاہیں گے تو ایسی کئی تصویریں بنا کر پھینک دیں گے۔" اماں فوراً بولیں۔ وہ ڈاکوؤں کو مطمئن کر دینا چاہتی تھیں کہ ان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

"بڑھیا تم واقعی عقلمند ہو۔۔۔۔۔۔ ساحل کو قابو میں رکھنا۔ اگر انہوں نے ہڑبونگ مچانے کی کوشش کی تو یاد رکھو ہم دوبارہ بھی آ سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر چیف کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر کے بعد ساحل عمر نے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ ساحل عمر نے اماں کی طرف گردن گھما کر دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "اماں! تم بندھی ہوئی کیا غضب کی لگ رہی ہو۔"

"ساحل تمہیں مذاق سوجھا ہے۔ ادھر میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔" اماں نے پریشان لہجے میں کہا۔

"خدا کا شکر ادا کرو اماں کہ وہ ہمارے منہ میں کپڑا ٹھونس کر نہیں گئے۔ ورنہ بات کرنے سے بھی ترس جاتے۔ پھر ایک مہربانی انہوں نے اور کی کہ باہر کا گیٹ کھلا چھوڑ گئے ہیں۔ ورنہ ان کے لئے گیٹ اندر سے بند کر کے دیوار پھلانگ جانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اماں یہ کس قدر پیارے ڈاکو تھے۔ میرا خیال ہے کہ باذوق بھی تھے تبھی صرف ایک پینٹنگ لے کر چلے گئے۔ ہیں اماں؟" ساحل عمر نے اماں سے تصدیق چاہی۔

"ساحل آخر تم اس قدر کیوں بول رہے ہو۔" اماں اس صدمے سے ابھی سنبھل نہ پائی تھیں۔ وہ خاموش رہ کر اپنے حواس بحال کرنا چاہتی تھیں۔

"اماں ابھی تو صبح ہونے میں کئی گھنٹے باقی ہیں۔ اس طرح خاموشی میں کس طرح رات کٹے گی۔ اچھا اماں یوں کرو۔ کوئی اچھا سا لطیفہ سناؤ۔"

اماں نے جواب میں اسے گھور کر دیکھا۔

"کوئی بات نہیں اماں۔ تمہیں اگر کوئی لطیفہ یاد نہیں تو کیا ہوا۔ مجھے سینکڑوں لطیفے یاد ہیں۔ میں تمہیں سناتا ہوں۔" ساحل عمر نے اس کے گھورنے کی پروا نہ کی وہ اپنی دھن میں بولتا رہا۔ "ایک شیر لنچ میں پورا ہرن کھانے کے بعد جنگل میں قیلولے کے لئے کوئی اچھی سی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ وہ جھاڑی میں چھپے دو چوہوں کے سامنے سے گزرا تو ایک چوہا بولا۔ چلو یار اس کو مارتے ہیں۔ بہت اکڑتا ہے۔ دوسرا چوہا بولا۔ اوہ نہیں یار اسے کیا مارنا۔ اکیلا ہے اور ہم دو ہیں۔

لطیفہ سن کر اماں بے اختیار ہنس پڑیں اور پھر بولیں۔ "ساحل تم بہت شریر ہو۔"

صبح ہوئی تو سب سے پہلے مرجینا گھر میں داخل ہوئی۔ وہ صبح سات بجے ہی کام پر آ جاتی تھی۔ گھنٹی بجانے پر گیٹ اماں کھولتی تھیں لیکن آج تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر آئی تو اس نے گھر کا دروازہ بھی کھلا پایا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر اسے اماں کہیں نظر نہ آئیں۔ وہ یہ سوچتی کہ آج

گھر کے دروازے چوپٹ کیوں پڑے ہیں۔ گھر میں داخل ہوئی تو ڈائننگ ٹیبل کے نزدیک کرسیوں پر اماں اور ساحل عمر کو بندھا پایا۔

وہ دونوں کو ہونقوں کی طرح دیکھنے لگی۔ ''ہیں!''

''او اماں، مرجینا آ گئی۔'' ساحل عمر نے خوش ہو کر کہا۔

''مرجینا جلدی کرو۔ ہمیں کھولو۔'' اماں جلدی سے بولیں۔

''ہائے یہ کیا ہوا؟'' مرجینا فوراً ساحل عمر کی طرف لپکی۔

''پہلے اماں کو کھولو۔'' ساحل عمر نے ملائم لہجے میں کہا۔

مرجینا نے جلدی جلدی اماں کو کھولا پھر وہ ساحل عمر کی طرف بڑھی۔ جب وہ اس کی رسیاں کھول رہی تھی تو ساحل عمر بولا۔ ''مرجینا! کیا تم جانتی ہو کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔''

''صاحب جی، مجھے نہیں معلوم آج کیا تاریخ ہے۔ دن معلوم ہے آج جمعرات ہے۔'' وہ اپنی دھن میں بولی۔

''تمہیں تاریخ نہیں معلوم تو کوئی بات نہیں، مجھے تاریخ کا پتہ ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میری بات غور سے سنو۔ ایک زمانے میں مرجینا نے چالیس چوروں سے علی بابا کی جان بچائی تھی۔ کیا عجیب اتفاق ہے کہ آج کی مرجینا نے پھر ایک مرتبہ علی بابا یعنی ساحل عمر کی جان بچائی۔ یہ اور بات ہے کہ ڈاکو کب کے گھر سے جا چکے ہیں۔'' ساحل عمر نے بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے جو بندھے بندھے اکڑ گئے تھے۔

''ڈاکو، صاحب جی کیا یہاں ڈاکو آئے تھے۔'' مرجینا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

''ہاں آئے تھے اور وہ تمہارا پوچھ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ مرجینا کہاں ہے۔ ہم نے اس سے اپنے آباؤ اجداد کا بدلہ لینا ہے۔'' ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

''صاحب جی، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''مرجینا! تم جھاڑو پکڑو اور شروع ہو جاؤ۔ تم ساحل کی باتوں میں کہاں آئی ہو۔''

''اماں جی ادھر چلیں ناں۔'' مرجینا انہیں کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بتائیں ناں کہ آپ لوگوں کو کس نے باندھا ہے۔''

''ہاں چلو۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' اماں اپنا جسم سہلاتی ہوئی اس کے ساتھ ہو لیں۔

اور وہ اسی کرسی پر بیٹھا انہیں جاتا ہوا دیکھ کر مسکراتا رہا۔

ناشتہ کرنے کے بعد اس نے اپنے دونوں دوستوں کو فون کیا۔ انہیں اس انوکھی ڈکیتی کی خبر سنائی۔ مسعود آفاقی نے کہا کہ اخبار میں خبر لگواؤ۔ ناصر مرزا نے کہا کہ پولیس میں رپورٹ درج کراؤ۔

ساحل عمر ان دونوں باتوں کے حق میں نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ سانپ نکل چکا ہے۔ اب اس کی لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ...... لیکن اس کی دوستوں کے آگے ایک نہ چلی۔ وہ دونوں اس کے گھر آ گئے۔

ناصر مرزا کے پولیس میں تعلقات تھے۔ اس نے کوشش کر کے تھانے میں رپورٹ درج کرا

پڑی کیونکہ اس تصویر کی قیمت ایک لاکھ روپے جو بتائی گئی۔
دی۔ تھانے دار کو رپورٹ درج کرنا ہی پڑی کیونکہ اس تصویر کی قیمت ایک لاکھ روپے جو بتائی گئی۔
مسعود آفاقی نے اپنے ایک صحافی دوست کو فون کر دیا اور یوں یہ خبر اخبارات کی زینت بن گئی۔
ادھر یہ کارروائی ہوئی تو ادھر ڈاکوؤں کے چیف نے رات تین بجے ٹیلی فون پر واسم کو اطلاع دی۔ واسم تصویر کے قبضے میں آجانے پر بہت خوش ہوا۔ اس نے فوراً برکھا کا نمبر گھمایا۔
برکھا کچھ دیر پہلے ہی سوئی تھی۔ وہ ڈھائی بجے تک اپنے پسندیدہ کمرے میں بیٹھ کر ایک جاپ کرتی رہی تھی۔ جاپ سے فارغ ہو کر وہ نہائی اور پھر اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ پھر وہ جلد ہی سو گئی۔ اسے امید نہیں تھی کہ واسم رات ہی کو اسے فون کرے گا۔ ٹیلی فون سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔ اس کی بیل ہو رہی تھی اور برکھا گہری نیند میں ہونے کی وجہ سے اسے سن نہیں رہی تھی۔
پانچویں بیل پر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر اس پر جھنجھلاہٹ طاری ہوگئی۔ اس وقت کس منحوس کا ٹیلی فون آ گیا۔ اس نے غصے سے ریسیور اٹھا کر جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''کون؟''
''برکھا جی۔ میں ہوں واسم۔'' واسم نے اس کی جھلاہٹ کو محسوس کر لیا تھا وہ فوراً بولا۔ ''اس وقت ٹیلی فون کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔''
''اچھا تم ہو۔'' برکھا واسم کی آواز پہچان کر نرم لہجے میں بولی۔ ''ہاں' بولو کیسے فون کیا؟''
''برکھا جی۔ آپ کا کام ہو گیا ہے۔'' اس نے خوشخبری سنائی۔
''سچ!'' برکھا خوشی سے اچھل پڑی۔
''ہاں' برکھا جی بالکل سچ۔''
''کہاں ہے وہ؟'' برکھا نے بے تابی سے پوچھا۔
طارق روڈ کے ایک مکان میں؟'' واسم نے بتایا۔
''اچھا ایسا کرو اسے کل دوپہر تک اپنے گھر منتقل کر لو۔ میں کل شام کو کسی وقت تمہارے گھر آجاؤں گی۔''
''برکھا جی پھر تو ہمارے نصیب جاگ جائیں گے۔'' وہ سرشار ہو کر بولا۔
''ہاں بالکل میں تمہارا نصیب جگانے آ رہی ہوں کیا نام ہے تمہارے نصیب کا میں بھول گئی۔'' برکھا نے ہنس کر پوچھا۔
''ستارہ۔'' واسم نے بتایا۔
''بس سمجھو کہ ستارہ تمہاری ہوگئی۔ اس کی ساری اکڑ نکل جائے گی۔ وہ اب تمہارے قدموں میں لوٹے گی۔'' برکھا نے بڑے یقین سے کہا۔
''میں پھر شام کو آپ کا منتظر رہوں گا۔'' واسم سے خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔
ستارہ ایک اسکول ٹیچر تھی۔ وہ واسم کے گھر کے نزدیک ہی رہتی تھی۔ واسم اسے روز اسکول آتے جاتے دیکھتا تھا۔ وہ اس پر مرمٹا تھا لیکن ستارہ اس پر مرمٹنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی البتہ وہ اسے مٹانے کی ضرور خواہشمند تھی۔ واسم نے کئی مرتبہ برکھا سے اس کا ذکر کیا تھا لیکن برکھا ٹال گئی تھی۔ لیکن

اب کیونکہ واسم نے ایک بہت بڑا کام چٹکیوں میں کر دیا تھا تو اس کا بھی فرض تھا کہ وہ بھی اس کے لئے کچھ کرے۔

واسم صبح اٹھا تو بہت خوش تھا۔ رات سے ستارہ اس کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔ اب وہ وقت زیادہ دور نہیں تھا جب وہ بے اختیار اس کے قدموں میں آ کر گرے گی۔ برکھا کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

وہ گاڑی میں صبح دس بجے کے قریب ڈاکوؤں کے چیف رفیق کے گھر پہنچ گیا۔ جب وہ رفیق کے گھر کے سامنے پہنچا تو اس کے گھر کا نقشہ ہی کچھ اور پایا۔ اس کے گھر کے آگے بے شمار لوگ جمع تھے۔ ساتھ ہی پولیس کی ایک موبائل بھی موجود تھی اور ایک ایمبولینس ابھی ابھی دروازے پر آ کر رکی تھی۔

واسم نے اپنی گاڑی فوراً بیک کی۔ پھر وہ اپنی گاڑی رفیق کے گھر سے ذرا فاصلے پر کھڑی کر کے واپس آیا۔ گھر میں پولیس موجود تھی۔ وہ گھر کے اندر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے؟ ابھی وہ وہاں کھڑے کسی آدمی سے معلومات حاصل کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایم ون پر پڑی۔ وہ گھر کے دروازے سے ابھی باہر آیا تھا۔

واسم نے اس کے نزدیک پہنچ کر بڑی آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ایم ون نے مڑ کر دیکھا اور پھر واسم کو اپنے سامنے پا کر وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ واسم اسے اپنی گاڑی کی طرف لے آیا۔ پھر اس نے گاڑی میں بیٹھ کر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”سر جی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیا ہوا؟“ ایم ون پریشان تھا۔

”رفیق تو خیریت سے ہے؟“

”رفیق مر گیا سر جی۔“ ایم ون کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

”کس نے مارا ہے اسے؟“ واسم ایک دم سانپ کی طرح پھنکارا۔

”سر جی معلوم نہیں۔ اس کی لاش کی حالت بہت خراب تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی خونخوار جانور نے اسے بھنبھوڑا ہو۔“ اس نے ایک عجب انکشاف کیا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم...... اور وہ تصویر......؟ وہ تصویر کہاں ہے؟“

”سر جی وہ چیتے والی تصویر ہم رفیق کے گھر میں رکھ کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ رفیق نے مجھے صبح ہی بلایا تھا تا کہ آپ کا فون آنے کی صورت میں تصویر جہاں پہنچانی ہو پہنچائی جا سکے۔ میں آٹھ بجے کے قریب یہاں پہنچا تو ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ رات وہ تصویر ہم نے رفیق کے ڈرائنگ روم میں لا کر رکھی تھی۔ ہمارے جانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں ہی سو گیا۔ صبح چار بجے کے قریب رفیق کی بیوی کو رفیق کی چیخ سنائی دی۔ وہ بھاگ کر ڈرائنگ روم میں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ایک چیتا رفیق کو بری طرح بھنبھوڑ رہا ہے۔ وہ اس منظر کو دیکھ کر اپنے حواس گم کر بیٹھی۔ گھر کے ایک کمرے میں رفیق کا بھائی ساجد بھی سویا ہوا تھا۔ وہ رفیق کی چیخ اور بعد میں اپنی بھابھی کی گھٹی گھٹی سی آواز سن کر ڈرائنگ روم میں آیا تو اس نے اپنی بھابھی کو بے ہوش اور اپنے بھائی کی لاش کو ادھڑا ہوا پایا۔ اس وقت کرے

میں کوئی اور نہ تھا۔ رفیق کی بیوی کو جب ہوش آیا تو اس نے چیتے والی بات بتائی لیکن اس بات پر کسی کو یقین نہ آیا۔ اتنے میں کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس نے پہنچتے ہی رفیق کی لاش کو اسپتال پہنچانے کا انتظام کیا اور وہ تصویر اپنی تحویل میں لے لی۔ ایمبولینس آ چکی ہے۔ اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے لے جائی جانے والی ہے۔" ایم ون نے پورا واقعہ تفصیل سے بتا دیا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" واسم کا چہرہ اتر گیا۔ "میں تو وہ تصویر لینے یہاں آیا تھا۔"

"اس تصویر پر تو پولیس نے قبضہ کرلیا ہے۔ اس کی دھڑا دھڑ تصویریں بن رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شام کے اخباروں میں یہ خبر چھپ جائے گی۔ اب ہمیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک یہ تصویر واپس آرٹسٹ کے گھر نہ پہنچ جائے۔ سر جی تصویر وہاں پہنچ جانے دیجئے وہاں سے دوبارہ نکالنا میری ذمہ داری۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔" ایم ون نے واسم کا حوصلہ بڑھایا۔

یہ بات واسم کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ گہرا اور ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی چند دن انتظار کرنا ہوگا۔"

چند دن تو بہت بڑی بات تھی۔ برکھا کے لئے چند گھنٹوں کا انتظار سوہان روح تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ جھکال کی پینٹنگ اس کے ہاتھ آتے آتے ہاتھ سے نکل گئی ہے تو وہ تلملا کر رہ گئی۔ اس کے سوا وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

واسم کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں کسی بھپری ہوئی شیرنی کی طرح ٹہل رہی تھی۔ ورشا اپنی ماں کی پریشانی کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ اسے کچھ دیر بے قراری سے ٹہلتا ہوا دیکھتی رہی۔ بالآخر اس سے بولے بنا رہا نہ گیا۔

"ممی آخر آپ بھوکی شیرنی کی طرح کب تک ٹہلیں گی۔"

"ورشا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ کیا ہوگیا ہے۔"

"میں آپ کی پریشانی کو سمجھتی ہوں ممی ...... چند دن کی بات اور ہے۔ وہ پینٹنگ پھر آپ کے سامنے ہوگی۔ اس قدر پریشان نہ ہوں۔" ورشا نے تسلی دی۔

"پریشان کیسے نہ ہوں ورشا...... بنا بنایا کام بگڑ گیا۔"

"کیا کام بگڑ گیا ممی؟"

"تو نہیں جانتی کہ جھکال کا خاتمہ کس قدر ضروری ہے۔"

"ہاں ممی آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ جب یہ خبر اخبار میں آئے گی تو اس بات پر کوئی یقین نہ کرے گا کہ رفیق کو کسی تصویر کے چیتے نے بھنبوڑ ڈالا ہوگا لیکن ممی میں اس بات پر پورا یقین کرتی ہوں کیونکہ میں نے خود اسے تصویر سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہے وہ مجھے دیکھتے ہی جھپٹا تھا۔ ممی وہ بے حد خطرناک چیز ہے۔ آپ اس پر کیسے قابو پائیں گی۔ میرا تو خیال ہے ممی کہ آپ اس کا خیال دل سے نکال دیں۔" ورشا نے اپنی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں ورشا اب وہ میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکے گا۔ اس نے ہمارا ایک آدمی مار دیا ہے۔ اب میں اسے مار کر ہی دم لوں گی۔ ویسے بھی اب اسے مارے بغیر چارہ نہیں۔ ساحل عمر تک پہنچنے

کے لئے اس کا خاتمہ ضروری ہے۔ جب تک وہ نہیں مرے گا۔ میں اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکوں گی۔ میں مانا کو کس طرح پاؤں گی۔ مانا کو حاصل کرنا میری زندگی کا مشن ہے۔" برکھا کے دل میں آگ بھڑک رہی تھی۔

"مانا کیا ہے؟" ورشا نے پوچھا۔

"مانا مستقل زندگی کا پرمٹ ہے۔" برکھا نے اسے جدید لفظوں میں بتایا۔

"گویا آپ کی زندگی آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔" ورشا نے جیسے تصدیق چاہی۔

"نہ صرف زندگی ہاتھ میں ہوگی بلکہ بہت کچھ اپنے اختیار میں آجائے گا۔" برکھا خواب دیکھ رہی تھی۔

"اور یہ زندگی یہ اختیار۔ آپ کو ساحل عمر کی وجہ سے حاصل ہوگا۔" ورشا نے سوال کیا۔

"ہاں۔ ورشا...... ساحل عمر وہ سیڑھی ہے جس کے ذریعے میں مانا تک پہنچوں گی۔"

"تہکال کے بعد آپ ساحل عمر کی بھینٹ لیں گی۔"

"ہاں۔" برکھا نے کہا۔ پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا اس نے ورشا سے پوچھا۔ "تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

"مجھے! نہیں ممی، مجھے کیا پریشانی ہوگی۔" ورشا نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

برکھا آخر ورشا کی ماں تھی اس نے اپنی بیٹی کے لہجے میں کوئی خاص بات محسوس کی۔ اپنا شک رفع کرنے کے لئے اس نے براہ راست سوال کیا۔ "ورشا کہیں تو سچ مچ تو اس سے محبت نہیں کرنے لگی۔"

"ارے نہیں ممی۔" ورشا نے فوراً تردید کی۔ تردید کرنے کے بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے جھوٹ بولا ہو۔ اپنے آپ سے۔ اپنی ممی سے۔

"ہاں ورشا اس بات کا خیال رکھنا کہ ساحل عمر میرا قیدی ہے۔ اس کی زندگی اس کی روح میری ہے۔" برکھا نے بدلے ہوئے تیوروں کے ساتھ کہا۔ "میرے لئے ہے۔"

"جی ممی۔" ورشا نے گردن جھکا کر کہا۔

☆......☆......☆

ساحل عمر گردن جھکائے کسی غیر مرئی نقطے پر نظر جمائے تہکال کی تصویر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اماں آتے جاتے کئی بار اسے سوچ میں غرق بیٹھا دیکھ چکی تھیں۔ وہ اس کے دکھ کو سمجھتی ہیں لیکن اس کے لئے کرکچھ نہیں سکتی ہیں۔ اگر انہیں تصویریں بنانا آتا تو وہ کب کی تہکال کی پینٹنگ بنانے بیٹھ گئی ہوتیں۔

اماں نے ساحل عمر کے لئے چائے بنائی اور بڑے پیار سے بولیں۔ "لو بیٹا، چائے پی لو۔"

اماں کے مخاطب کرنے پر اس نے انہیں خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ پھر چائے کا کپ لے کر بولا۔ "لاؤ، اماں!"

"بیٹا تم تصویر کی وجہ سے پریشان ہو۔"

"اماں میں نے اس پر بہت محنت کی تھی۔ دکھ یہ ہے کہ میری محنت ضائع ہوگئی۔" وہ دکھ سے بولا۔

"کچھ ضائع نہیں ہوا۔ اللہ تمہیں زندگی دے ایسی تم تین سو ساٹھ تصویریں بنا کر پھینک دو گے۔"

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ساحل عمر کا اٹھنے کا موڈ نہ تھا۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا۔ اماں یہ کہتے ہوئے فوراً اٹھ گئیں۔ "اچھا! میں دیکھتی ہوں۔"

ٹیلی فون بیڈ روم میں تھا اور ساحل عمر اس وقت لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ اماں نے ٹیلی فون ریسیو کر کے وہیں سے آواز لگائی۔ "مسعود صاحب کا فون ہے؟"

مسعود کا نام سن کر وہ چائے کا کپ اٹھائے اٹھائے اندر آ گیا۔ کپ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور ریسیور تھامتے ہوئے بولا۔ "جی جناب!"

"یار ایک زبردست خبر ہے تمہاری پینٹنگ کے بارے میں......" مسعود چہکتے ہوئے بولا۔

"ہیں!" ساحل عمر نے خوش ہوکر کہا۔ "مل گئی۔"

"نہ صرف پینٹنگ برآمد ہوگئی ہے بلکہ اس تصویر کے چرانے والے کو سزا بھی دے دی ہے۔"

"بھئی وہ اپنے دوست ہیں ناں نیوز ایڈیٹر اشفاق صاحب...... ان کا فون آیا تھا۔ ان کے اخبار کو خبر موصول ہوئی ہے۔ میں تمہاری پینٹنگ کے بارے میں ان سے خبر لگوا چکا تھا انہوں نے خبر موصول ہوتے ہی مجھے فون کر دیا۔ تم تیار ہو جاؤ۔ تو تھانے چل کر پینٹنگ وصول کر لیتے ہیں۔ تمہاری پینٹنگ اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔" مسعود آفاقی نے بتایا۔

"یار پوری بات تو بتاؤ۔"

"تفصیل میں تمہارے گھر پہنچ کر بتاتا ہوں۔" مسعود آفاقی نے کہا۔ "تم یوں کرو ذرا ناصر مرزا کو فون کرلو وہ آجائے تو اچھا ہے۔ ویسے میں نے اخبار سے تھانے فون کروا دیا ہے۔ تھانیدار نے کہا ہے کہ آ کر تصویر لے جائیں۔ اتنی بڑی تصویر کا رکھنا ایک مشکل کام ہے۔ عدالت میں آ کر اس تصویر کو پیش کرنے کی ضرورت پڑی تو کر دیں گے۔"

ساحل عمر نے مسعود کا فون منقطع ہوتے ہی ناصر مرزا کو ملایا۔ اس نے کہا کہ میں گھر آنے کے بجائے تھانے پہنچتا ہوں اور ایس ایچ او کو اوپر سے فون بھی کروا دیتا ہوں۔

تصویر ملنے کی روداد بڑی حیرت میں ڈالنے والی تھی۔ پولیس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رفیق کی لاش کے ساتھ کیا ماجرا ہوا ہے۔ ایس ایچ او سے پوری روداد سننے کے بعد ساحل عمر کے اندر ایک سناٹا چھا گیا تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ یہ ساری کارروائی جھکال کی ہے۔ ورشا نے جب اس تصویر کو دیکھا تھا تو وہ یونہی خوفزدہ نہیں ہوگئی تھی۔ جھکال اسے دیکھ کر باقاعدہ جھپٹا تھا اور وہ تصویر سے باہر نکل آیا تھا۔

بہرحال تصویر مل گئی اور صحیح سلامت تھی۔ تصویر اٹھانے والا بندہ چل بسا تھا۔ یہ تصویر اس نے

کیوں اٹھائی تھی۔ اس کے پیچھے کیا مقاصد تھے۔ یہ راز مرنے والا اپنے ساتھ لے گیا۔

جب وہ لوگ جھکال کی پینٹنگ لے جانے لگے تو ناصر مرزا نے ایک تجویز پیش کی۔ "ساحل کیا یہ تصویر تم اپنے گھر لے جاؤ گے۔"

"تو اور کیا؟" اس نے غیر یقینی انداز میں ناصر مرزا کو دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اس تصویر کو اپنے گھر مت لے جاؤ۔ کہیں یہ تصویر اٹھانے وہ لوگ پھر نہ آ جائیں۔"

"ہاں۔ یار ناصر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" مسعود نے اس تجویز کی تائید کی۔ "ابھی یہ تصویر خطرے میں ہے۔"

"پھر کیا کرنا چاہئے؟" ساحل عمر نے سوال کیا۔

"اسے میں اپنے گھر لے جاتا ہوں۔" ناصر مرزا نے کہا۔ "اس تصویر کو دیکھ کر میرے دماغ میں لال بتی سی جلی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ بہر حال تصدیق بھی ہو جائے گی اور اس کی حفاظت بھی......"

"اور بھائی ساحل تجھ سے میں دست بستہ عرض کروں گا۔ اللہ کے واسطے اب یہ تصویریں بنانا چھوڑ دو۔ ورنہ تم کسی دن خود چل بسو گے۔" مسعود آفاقی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"نہیں ساحل ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اس مرتبہ ہاتھی پر طبع آزمائی کرو۔" ناصر نے مذاق کیا۔

"مرزا صاحب اگر ہاتھی باہر نکل کر آ گیا تو اسے پالے گا کون؟" مسعود بولا۔

"کسی سرکس والے کو فروخت کر دیں گے۔" ناصر مرزا نے ہنس کر کہا۔

"اچھا مرزا صاحب پہلے تو اس چیتے کو سنبھالیں۔ اس کے لئے کوئی چڑیا گھر دیکھیں۔" مسعود نے تصویر کی طرف دیکھ کر کہا۔

یہ ایک عجیب و غریب واقعہ تھا۔ شام کے اخبارات کئی دن تک چیختے رہے۔ شام کے اخباروں کے لئے یہ ایک بہترین موضوع تھا۔ طرح طرح کی کہانیاں چھاپی جاتی رہیں۔ قیاس آرائیاں کی جاتی رہیں۔ ساحل عمر کے گھر فون کالز کا تانتا بندھ گیا۔ اس کی تصویریں چھپتی رہیں بیان اور انٹرویو لئے گئے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے مزید سنسنی پھیلا دی۔ ڈاکٹروں کی رائے میں یہ کسی انسان کا کام نہ تھا اور یہ بات کوئی ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ یہ کام تصویر کے چیتے نے انجام دیا ہے۔

رفیق کو کس نے مارا یہ بات تو خیر معمہ رہی لیکن کوئی یہ بھی نہ جان سکا کہ اس پینٹنگ کو ساحل عمر کے گھر سے کن لوگوں نے اٹھایا اور اس تصویر کو چرانے کا مقصد کیا تھا۔

دو چار دن یہ معاملہ چلا پھر سب ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے۔ اخبار والے بھی اور پولیس والے بھی۔

وہ پینٹنگ اب ناصر مرزا کے گھر میں تھی اور وہاں گل کھلا رہی تھی۔

ناصر مرزا نے اس پینٹنگ کو اپنے کمرے میں پڑی بڑی میز پر رکھ لیا تھا۔ یہ پینٹنگ اسے پسند آ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر بازغر اس تصویر کو لینے نہ آیا تو وہ اسے ساحل عمر سے مانگ لے گا اور اسے فریم کروا کر اپنے بیڈ روم میں لگوائے گا۔

یہ کمرہ اسٹڈی روم تھا۔ کبھی کبھی وہ اس کمرے میں سو بھی جاتا تھا۔ اس رات بھی یہی ہوا کہ وہ پڑھتے پڑھتے وہیں قالین پر سو گیا۔ رات کو کسی وقت اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنا ہاتھ نرم بالوں پر رکھا محسوس کیا۔ یہ ایک ایسا احساس تھا جس نے ناصر مرزا کے حواس کو فوراً چوکنا کر دیا۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اس نے لائٹ آن کی اور پھر قالین پر اس جگہ نظر ڈالی جہاں وہ سو رہا تھا لیکن وہاں کوئی چیز نہ تھی۔ پھر اس نے تصویر کو دیکھا۔ تصویر میں چیتا اپنی جگہ جوں کا توں موجود تھا۔

ناصر مرزا کچھ سوچتا ہوا اس کمرے سے نکل آیا۔ اس نے دروازے کو باہر سے لاک کر دیا اور اپنے بیڈ روم میں آ کر سو گیا۔ اسٹڈی روم اور بیڈ روم کا باتھ روم ایک ہی تھا البتہ دروازے دو تھے جو دونوں کمروں میں کھلتے تھے۔

صبح کے نزدیک ناصر مرزا کی ایک مرتبہ پھر آنکھ کھلی۔ وہ اٹھ کر باتھ روم گیا۔ باتھ روم میں اس نے کچھ کھڑ بڑ کی آواز سنی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی جانور کمرے میں ٹہل رہا ہو۔ یہ احساس جسم میں سنسنی پھیلانے والا تھا۔

ناصر مرزا نے چاہا کہ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر کمرے میں جھانک لے لیکن اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے سوچا جو ہوگا صبح دیکھا جائے گا۔ اب کمرے میں جانا کسی خطرے کا موجب بھی ہو سکتا تھا۔

صبح اٹھ کر اس نے آہستہ سے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور اس میں تھوڑی درز پیدا کر کے اندر جھانک کر دیکھا۔ سامنے ہی میز تھی۔ تصویر کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ چیتا وہاں موجود تھا۔

تب ناصر مرزا نے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا اور اسٹڈی روم میں داخل ہوا۔ اسٹڈی روم کی تمام چیزیں الٹی پلٹی پڑی تھیں۔ کوئی ڈیکوریشن پیس اپنی جگہ موجود نہ تھا۔ سب اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ لگتا تھا کمرے میں کسی نے خوب اتھل پتھل مچائی ہے۔

ساحل عمر کا خیال تھا کہ جھکال کی پینٹنگ کی اخبارات کے ذریعے اس قدر شہرت ہو گئی ہے کہ بازغر کو اس سے رابطہ کر لینا چاہئے۔ اسے بازغر کے ٹیلی فون کا شدت سے انتظار تھا لیکن وہ کچھ اس طرح گیا تھا کہ اس کا کوئی پتہ نشان نہیں مل رہا تھا۔

انتظار کے باوجود بازغر کا ٹیلی فون نہ آیا البتہ ناصر مرزا کا آ گیا۔

"اوہ بھائی! مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا۔" ساحل عمر کے ریسیور اٹھاتے ہی ناصر مرزا بولا۔

"کیا ہو گیا.......... خیرت تو ہے؟" ساحل عمر فکر مند لہجے میں بولا۔

جواب میں ناصر مرزا نے ساری روداد سنائی کہ وہ آج اسٹڈی روم میں سو گیا تھا تو اس نے اپنا ہاتھ کسی بالوں بھرے جسم پر رکھا ہوا محسوس کیا۔ پھر بند کمرے میں جو دھما چوکڑی مچی اس کا حال

سنایا۔

"پھر اب کیا کرنا چاہئے۔" ساری کہانی سن کر ساحل عمر نے کہا۔

"میری خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" ناصر مرزا نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس تصویر کا گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے آج رات میں ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے؟"

"بھائی کیا کرنا چاہتے ہو۔ ذرا ہاتھ پاؤں بچا کے۔" ساحل عمر نے تنبیہ کی۔

"بے فکر رہو۔" ناصر مرزا نے پر یقین لہجے میں کہا۔ "اچھا اب میں کل صبح تم سے بات کروں گا رات جو کچھ ہوگا اس کی رپورٹ صبح دوں گا او کے ......"

"او کے ......" ساحل عمر نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

رات کو ساحل عمر دیر تک جاگتا رہا۔ سوچتا رہا وہ ان دونوں تصویروں کو بنا کر خواہ مخواہ مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اب آئندہ اس نے طے کرلیا تھا کہ وہ کوئی پینٹنگ نہیں بنائے گا۔ ایسی تصویریں بنانے کا کیا فائدہ جو جی کا جنجال بن جائیں۔

سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر جانے کیا ہوا کہ سوتے سوتے اس کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اس کے کانوں میں کوئی آواز آ رہی تھی۔ جب اس نے غور سے سنا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نزدیک ہی سسکیوں سے رو رہا ہے۔

☆......☆......☆

یہ بڑا جان لیوا احساس تھا۔

اس کے کمرے میں آخر کون رو رہا ہے۔ یہ کس کی نسوانی آواز تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پہلے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ٹیبل لیمپ جلایا۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی محدود تھی اس میں کچھ نظر نہ آیا۔ تب اس نے کمرے میں لگی ٹیوب لائٹ روشن کردی۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا کچھ نظر نہ آیا۔ وہاں کچھ ہوتا تو نظر آتا۔ سسکیوں سے رونے کی آواز بھی اب معدوم ہو چکی تھی۔

اب اسے شبہ ہوا کہ اس نے واقعی کسی کے رونے کی آواز سنی تھی۔ اگر آواز سنی تھی تو کیا یہ خواب تھا۔ تب اسے خیال آیا کہ رونے کی آواز تو اس نے آنکھ کھلنے کے بعد سنی تھی۔ وہ پوری طرح حواسوں میں تھا۔ اگر یہ حقیقت تھی تو وہ رونے والی کہاں ہوا ہوگئی۔ کدھر غائب ہوگئی۔

اچانک اس کی نظر رشا ملوک کی تصویر پر پڑی۔ وہ اس تصویر کے نزدیک چلا گیا اور اسے بغور دیکھنے لگا۔ تب اس پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ رشا ملوک کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر پھیل گئے تھے۔ تصویر پر نمی موجود تھی۔

صبح اس کا ارادہ تھا کہ دیر تک سوئے گا کیونکہ وہ رات کو خاصا ڈسٹرب رہا تھا۔ اس کی نیند پوری نہ ہوئی تھی۔ اس وقت وہ گہری نیند میں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا اس لئے جواب نہ ملنے پر اماں کمرے میں آ گئیں۔ ساحل عمر کو بے خبر سوتا دیکھ کر پہلے انہوں نے سوچا کہ ناصر مرزا کو بتا دیں کہ وہ کچھ دیر کے بعد رنگ کرے۔ پھر یہ سوچ کر کہ ناصر مرزا کو جانے کیا کام ہے کہ اس نے کہا کہ اگر سو بھی رہے ہوں تو اٹھا دیں وہ مجبور ہو گئیں اور انہوں نے دھیرے سے اس کی

آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔
چند لمحوں بعد ساحل عمر اپنی آنکھوں پر اماں کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے جاگ گیا۔ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے ہٹایا اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھا۔
"خیرت اماں۔؟" اس نے پوچھا۔
"ناصر مرزا کا فون ہے۔ کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں ورنہ میں تمہیں ہرگز نہ اٹھاتی۔"
ناصر مرزا کا نام سن کر اس نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا اور بولا۔ "ناصر ایک منٹ۔" اس کے بعد وہ اماں سے مخاطب ہوا۔ "اماں آپ ادھر سے ریسیور رکھ دیں۔"
"اچھا بیٹا۔" اماں یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئیں۔
"جی جناب۔" ادھر سے ریسیور رکھے جانے کی آواز سن کر ساحل عمر مخاطب ہوا۔ "کیا خبر ہے۔؟"
"وہ چلا گیا۔" ناصر مرزا نے خبر سنائی۔
"کون چلا گیا۔؟"
"مہاکال کی بات کر رہا ہوں۔؟" ناصر مرزا نے بات صاف کی۔
"میں ابھی تک بات سمجھا نہیں۔" اس کی سمجھ میں پھر بھی کچھ نہ آیا۔
"حیرت ہے اتنی صاف بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔" ناصر مرزا نے کہا۔ "ٹھہرو میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ میں نے کل تم سے کہا تھا نا کہ آج رات میں ایک تجربہ کروں گا۔؟"
"ہاں کہا تو تھا۔ تم نے کیا کیا تھا۔"
"بھئی رات کے گیارہ بجے کے بعد میں نے وہ پینٹنگ باہر لے جا کر لان میں ایک درخت کے نیچے رکھ دی۔ آدھے گھنٹے تک میں نے اس تصویر کے سامنے بیٹھ کر کچھ عمل کیا اور پھر بارہ بج کر پانچ منٹ پر میں نے وہ پینٹنگ درخت کے نیچے ہی چھوڑی اور میں گھر کے اندر چلا آیا۔ اندر آ کر میں نے گھر کا ہر دروازہ اور کھڑکی بند کروا دی۔ صبح ہی صبح جب میں اس درخت کے نیچے پہنچا تو وہاں میدان صاف ہو چکا تھا جبکہ باہر کا مین گیٹ جوں کا توں بند تھا۔"
"یار یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" ساحل عمر نے کسی قدر پریشانی سے کہا۔
"اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" ناصر مرزا خود الجھا ہوا تھا۔
"تم نے کیا عمل کیا تھا۔؟" ساحل عمر نے پوچھا۔
"میں نے کچھ پڑھا تھا۔ میرے پڑھنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر اس تصویر میں کوئی اسرار ہے تو ظاہر ہو جائے۔ اس تصویر کو دیکھ کر میرے دماغ میں جو لال بتی روشن ہوئی تھی۔ اس کے پیش نظر میں نے یہ عمل کیا تھا۔ بہرحال تصویر کا اسرار تو ظاہر ہو گیا۔ وہ جو بھی تھا فریم کی قید سے آزاد ہو گیا۔" ناصر مرزا نے بتایا۔
"چلو یار۔ جان چھٹی لیکن اس خالی کینوس کو ضائع مت کرنا۔ اس پر اگر ضرورت پڑی تو دوبارہ تصویر بن جائے گی۔" ساحل عمر نے کہا۔

''اس مرتبہ ایسا کرو کہ اپنی قدم آدم تصویر بنالو کیا عجب کہ تم ایک سے دو ہو جاؤ۔'' ناصر مرزا نے مذاق کیا۔

''یار آئیڈیا تو اچھا ہے۔'' ساحل عمر نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ اسی کینوس پر اپنی پینٹنگ تیار کرتا ہوں۔''

''بھائی صاحب ایسا غضب نہ کر بیٹھنا۔ اگر اس پینٹنگ کو کسی نے اغوا کرلیا تو میں اور مسعود مشکل میں پھنس جائیں گے'' ناصر مرزا نے ہنس کر کہا۔

''رات کو ادھر بھی ایک عجیب واقعہ رونما ہوا ہے۔'' ساحل عمر نے موضوع بدلا۔

''وہ کیا۔؟'' ناصر مرزا نے پوچھا۔

ساحل عمر نے رات کو آنکھ کھلنے کسی کے سسکیوں سے رونے اور رشا ملوک کی تصویر بھیگی ہونے کی روداد سنائی۔ یہ روداد سناتے سناتے اس کی نظر رشا ملوک کی تصویر پر پڑی۔ ''ایک منٹ ہولڈ کرنا۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور بیڈ پر چھوڑا اور رشا ملوک کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ جو آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک کر ایک لکیر کی صورت میں بہے تھے۔ وہ اب برف کی طرح منجمد نظر آرہے تھے۔

تب اس نے ریسیور اٹھا کر ناصر مرزا کو اطلاع دی۔ ''بھائی صاحب وہ آنسو کسی برف کی مانند جمے ہوئے نظر آرہے ہیں۔''

''ارے نہیں۔'' ناصر مرزا کو یقین نہ آیا۔

''آ کر دیکھ لیجئے۔'' ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں مجھے آنا پڑے گا۔ میں شام تک آؤں گا۔ میں اب تمہاری طرف سے فکر مند ہوگیا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں۔ یہ معاملہ کیا ہے۔ اس چیتے کا تصویر سے اس طرح غائب ہو جانا۔ تمہارے گھر میں پیش آنے والے انوکھے واقعات۔ یہ کوئی آسیبی چکر نہیں ہے۔ نہ ان واقعات میں جنات کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ میری رائے میں کوئی پراسرار قوت تمہارے پیچھے لگ گئی ہے۔'' ناصر مرزا نے رائے پیش کی۔

''بھائی ناصر میرے خیال میں ان واقعات کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ نظر آتا ہے۔'' ساحل عمر نے بڑی سادگی سے کہا۔

ساحل عمر کی بات سن کر ناصر مرزا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے۔''

''ویسے ایک بات ہے۔ میں ان پراسرار واقعات سے بالکل متاثر نہیں ہون شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بچپن ہی سے اس طرح کے واقعات سے دوچار رہا ہوں۔'' ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

''بات ڈرنے یا پریشان ہونے کی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کہیں تمہیں ان پراسرار واقعات سے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ میں اس مسئلے پر ذرا چھان پھٹک کرلینا چاہتا ہوں۔ آج شام کو میں آؤں گا تو میرے ساتھ ایک شخص اور ہوگا۔'' ناصر مرزا نے بتایا۔

''مسعود ہوگا۔'' ساحل عمر نے اندازہ لگایا۔

''او! یار مسعود شخص نہیں ہے۔ وہ دوست ہے ہمارا۔ اگر اس نے سن لیا کہ اسے کوئی شخص کہا گیا ہے تو پھر تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔'' ناصر مرزا نے ہنس کر کہا۔

''پھر کون ہوگا۔؟ کچھ بتائیں تو۔'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''ایک ڈاکٹر ہوگا۔ وہ تمہاری نبض دیکھے گا۔''

''مجھے بیمار سمجھ رہے ہیں۔؟''

''ہو نہیں...... ہو جاؤ گے ......جنوں کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ آپ شام کو آئیں میں انتظار کروں گا۔؟''

شام کو ناصر مرزا آیا تو اس کے ساتھ ایک اول جلول سا شخص تھا۔ دبلا پتلا۔ سیاہی مائل رنگت۔ سر پر چار بال جنہیں بڑی احتیاط کے ساتھ جمایا گیا تھا۔ شیروانی پہنے۔ منہ میں پان، ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ آنکھوں میں چمک۔ عمر ساٹھ سال سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔

ساحل عمر نے اس شخص کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اسے دیکھ کر اس نے ناصر مرزا کو گھورا جیسے کہہ رہا ہو یار یہ کیا تماشا اٹھالائے۔ ناصر مرزا کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے پروقار انداز میں ان کا تعارف کروایا۔ ''یہ ہیں عابد منجم۔ بڑے زبردست آدمی ہیں۔''

عابد منجم نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ساحل عمر پر نظر ڈالی اور پان چباتے ہوئے بولے۔

''اچھا تو یہ ہیں ساحل میاں۔''

''ساحل میاں!'' ساحل عمر نے حیران ہو کر کہا۔ ''جناب میرا نام ساحل میاں نہیں ہے۔ ساحل عمر ہے ساحل عمر۔''

''ہیں۔ اچھا اچھا۔ تو ساحل عمر صاحب ذرا ایک کام کیجئے۔ مجھے ایک کاغذ پر اپنی والدہ محترمہ کا نام اور اپنی تاریخ پیدائش لکھ دیجئے اگر ولادت کا وقت معلوم ہو تو وہ لکھ دیجئے۔''

ساحل عمر نے ناصر مرزا کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کیا چکر ہے۔

''ساحل، جیسا عابد منجم صاحب نے کہا ہے۔ اس پر فوراً عمل کرو۔'' ناصر مرزا نے زور دے کر کہا۔

''اچھا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ ڈرائنگ روم میں تو کاغذ قلم نہ تھا۔ وہ اندر گیا۔ ایک کاغذ پر اس نے مطلوبہ معلومات درج کیں اور ڈرائنگ روم میں واپس آ گیا۔ اور وہ کاغذ اس نے عابد منجم کی طرف بڑھا دیا۔

کاغذ لیتے ہوئے اچانک عابد منجم کی نظر انگوٹھی پر گئی۔ اس انگوٹھی کو دیکھ کر وہ ذرا چونکے اور بولے۔'' ساحل میاں۔

اوہ۔ میرا مطلب ہے ساحل صاحب ذرا آپ مجھے یہ انگوٹھی دکھانا پسند کریں گے۔''

ساحل عمر نے دوبارہ اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ''یہ لیجئے دیکھ لیجئے۔''

"زحمت نہ ہو تو ذرا مجھے اتار کر دے دیں۔" عابد منجم نے بڑے شائستہ لہجے میں کہا۔
تب اچانک ہی اسے ورشا کی بات یاد آئی۔ اس نے انگوٹھی پہناتے ہوئے کہا تھا کہ اسے اتارنا مت ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہو گیا۔
"ساحل انگوٹھی اتار کر دے دو۔" ناصر مرزا نے ہدایت کی۔
"ارے۔ یہ کوئی خاص انگوٹھی معلوم ہوتی ہے۔ کیا کسی نے دی ہے۔؟" عابد منجم نے پوچھا۔
اس سے پہلے کہ ساحل عمر کوئی جواب دیتا۔ ناصر مرزا بول پڑا۔" جی عابد صاحب یہ بڑی خاص انگوٹھی ہے۔ ان کی ایک دوست نے دی ہے۔"
"اچھا تبھی اس کو اتارنے سے ہچکچا رہے ہیں۔ خیر اس انگوٹھی کو میں ابھی دیکھتا ہوں پہلے ذرا یہ کاغذ دیکھ لوں۔" یہ کہہ کر عابد منجم نے اپنی شیروانی کی جیب سے بال پوائنٹ نکالا اور اسی کاغذ پر کچھ حساب کتاب کرنے لگے۔ جوں جوں وہ حساب کتاب کرتے جاتے تھے۔ ان کی پیشانی پر بل پڑتے جاتے تھے۔ ناصر مرزا ان کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔
کاغذ پر حساب کتاب چھوڑ کر اچانک انہوں نے نظریں اٹھائیں اور ساحل عمر سے بولے۔" یہ انگوٹھی آپ نے کب سے پہنی ہوئی ہے۔"
"میرا خیال پندرہ سولہ دن ہوئے ہوں گے۔"
"دن ۔ تاریخ اور وقت بتایئے۔"
ساحل عمر سوچ میں پڑ گیا۔ اسے فوراً ہی کچھ یاد نہ آیا۔
"ساحل صاحب اپنے ذہن پر زور ڈالئے۔ یہ بتانا بہت ضروری ہے۔" عابد منجم نے کہا۔
"ساحل تمہیں وقت کا تو کچھ اندازہ ہوگا۔"
"ہاں بس اٹھتے ہوئے اس نے یہ انگوٹھی دی تھی۔ میرا خیال ہے ساڑھے دس بجے کا وقت ہوگا۔"

"ساڑھے دس بجے رات۔" عابد منجم نے تصدیق چاہی۔
"جی۔" ساحل عمر نے کہا۔
"تاریخ کیا تھی۔؟" عابد منجم نے پوچھا۔ ساحل عمر سوچنے لگا۔
"میرے اندازے کے مطابق اسے تیرہ تاریخ ہونا چاہئے اور دن جمعرات۔" عابد منجم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔
"جی آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ وہ جمعرات کی رات تھی۔" ساحل عمر نے تصدیق کی۔
عابد منجم نے پھر بال پوائنٹ سنبھال لیا۔ اور کاغذ پر مختلف زائچے بناتے رہے۔ جب کاغذ بھر گیا تو اسے پلٹ لیا۔ سات منٹ تک وہ اس حساب کتاب میں مصروف رہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی جیب سے سفید رومال نکال کر اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا جبکہ ڈرائنگ روم میں ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ وہ اس اثناء میں پان چبانا بھی بھول گئے تھے۔ پھر انہوں نے بال پوائنٹ بند کر کے جیب میں لگایا۔ کاغذ بند کر کے مٹھی میں دبایا اور ایک نظر ناصر مرزا کی طرف دیکھا۔

"جی عابد صاحب۔" ناصر مرزا نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
"جہاں انہوں نے بیٹھ کر وہ دونوں تصویریں بنائی ہیں' وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" عابد منجم نے ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر کہا۔
"جی ضرور۔" ساحل عمر نے براہ راست جواب دیا اور فوراً کھڑا ہو گیا۔ "آیئے تشریف لایئے۔"
پھر وہ تینوں اسٹوڈیو میں داخل ہوئے پہلے ساحل عمر اس کے بعد ناصر مرزا اور سب سے آخر میں عابد منجم۔ ساحل عمر نے اندر پہنچ کر کہا۔ "یہ ہے میرا آرٹ روم۔ آپ اسے جائے واردات سمجھ لیں۔"
کمرے میں اس وقت کوئی پینٹنگ نہ تھی۔ رنگ برش' فریم' بورڈ اور انگریزی رسالے۔ بس اس طرح کی چیزیں تھیں۔ عابد منجم کمرے کے عین درمیان میں کھڑے ہو گئے اور پھر انہوں نے سیدھا ہاتھ بلند کر کے مٹھی بند کی اور شہادت کی انگلی کھول لی۔ اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے چاروں طرف گھوم گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا ہاتھ نیچے کر لیا اور ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر بولے۔ فی الحال یہ کمرہ صاف ہے۔"
"ذرا اس لڑکی کی تصویر اور دیکھ لیجئے جس کی پیشانی پر ساحل عمر نے بچھو بنا دیا تھا۔"
"ہاں۔ دکھایئے۔"
ساحل عمران دونوں کو اپنے بیڈ روم میں لے آیا۔ اس تصویر کو دیکھ کر عابد منجم کو سکتہ سا ہو گیا۔ پتہ نہیں وہ اس کے حسن سے متاثرہ ہوئے یا اس تصویر میں انہوں نے کوئی خاص بات دیکھ لی کہ پلک جھپکانا بھول گئے۔
پھر کچھ دیر کے بعد جیسے ہوش آیا تو ان کے منہ سے نکلا۔ "ماشاء اللہ۔"
"ناصر' میں نے جن آنسوؤں کا ذکر کیا تھا۔ وہ دیکھو۔" ساحل عمر نے ناصر مرزا کو مخاطب کیا۔
ناصر مرزا نے اس تصویر کے قریب آ کر ان دو سفید لکیروں کو دیکھا جو اس کی آنکھوں سے رخساروں تک بنی ہوئی تھیں۔ یہ ابھری ہوئی لکیریں تھیں۔ ناصر مرزا نے انہیں انگلی سے چھو کر دیکھا۔
"ہاں واقعی یار۔ یہ تو برف کے آنسو ہیں۔" ناصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ پھر وہ عابد منجم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جی' عابد صاحب دیکھی آپ نے یہ تصویر۔"
"تصویر ایسی ہے تو تصویر والی کس قدر حسین ہو گی۔" عابد منجم نے بے خیالی میں کہا۔
"کیا مطلب۔ آپ کے خیال میں کیا اس تصویر والی کا کوئی وجود ہے۔؟"
"بالکل ہے۔" عابد منجم نے بڑے یقین سے کہا۔
"آپ یہ بات اس بنیاد پر کہہ رہے ہیں کہ یہ لڑکی ساحل عمر کو خواب میں نظر آئی ہے۔"
"نہیں۔ یہ بات میں اس تصویر کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔"
"ذرا کچھ کھل کر بتایئے۔"

"وقت آنے پر کچھ بتاؤں گا۔ فی الحال اس سے زیادہ نہیں۔" عابد منجم نے ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ آپ دونوں حضرات کچھ دیر کے لئے مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ دیں۔"

"جی کیوں نہیں۔" ساحل عمر نے فوراً کہا اور ناصر مرزا کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ دونوں باہر آئے تو عابد منجم نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھ گئے۔

"ناصر، تم یہ کیا چیز اپنے ساتھ اٹھا لائے ہو۔" ساحل عمر نے تمسخر اڑایا۔

"شش۔" ناصر مرزا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "انہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کیا چیز ہیں۔ تم فی الحال خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔ کسی مسئلے پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"جی بہت بہتر۔" ساحل عمر نے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔

دس منٹ کے بعد عابد منجم مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ اور لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھ کر کہا۔ "ساحل صاحب ایک سادہ کاغذ دیجئے۔"

ساحل عمر نے اپنے اسٹوڈیو سے سادہ کاغذ لا کر ان کے حوالے کر دیا۔ عابد منجم نے اس کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے تہہ کر کے ساحل عمر کے حوالے کر دیا۔ اور بولے۔ "اسے بغیر دیکھے اپنی پینٹ کی جیب میں ڈال لیجئے۔"

ساحل عمر نے اس کاغذ کو بغیر دیکھے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ بولا کچھ نہیں۔

"اب آپ یہ انگوٹھی اتار کر میرے حوالے کر دیجئے۔"

"مجھے اس انگوٹھی کو اتارنے سے منع کیا گیا ہے۔" بالآخر ساحل عمر نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"وہ کیوں۔؟"

"اگر میں نے یہ انگوٹھی اتاری تو مجھے نقصان پہنچے گا۔"

"ساحل عمر صاحب آپ کو الٹی بات بتائی گئی ہے۔ اگر آپ نے اس انگوٹھی کو اتار کر نہ پھینکا تو آپ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔" عابد منجم نے بڑے یقین سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "یہ انگوٹھی کسی جونک کی طرح ہے۔ آپ کا خون چوس رہی ہے۔"

"یہ کیا بات کر رہے ہیں۔؟" ساحل عمر نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ جیسے انہوں نے کوئی فضول بات کہہ دی ہو۔

"واقعی۔" ناصر مرزا پر اس جملے کا بالکل مختلف اثر ہوا۔ وہ فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور عابد منجم کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"آپ کو میری بات پر یقین نہیں آ رہا۔ ایسا کیجئے ایک شیشے کے گلاس میں پانی بھر کر لے آیئے میں آپ کو اس انگوٹھی کی اصل حقیقت ابھی دکھائے دیتا ہوں۔"

ناصر مرزا نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"ساحل پانی لاؤ۔" ناصر مرزا نے تنبیہی لہجے میں کہا۔
ساحل عمر نے شیشے کے ایک گلاس میں پانی لا کر عابد منجم کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ گلاس لے کر عابد منجم نے شیشے کی میز پر رکھ دیا اور ساحل عمر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "چند منٹ کے لئے انگوٹھی اتار کر مجھے دے دیں۔"

چند منٹ کا سن کر ساحل عمر نے وہ انگوٹھی اتار کر عابد منجم کے حوالے کر دی۔ عابد منجم نے اس انگوٹھی کو بغور دیکھا اور پھر کچھ پڑھنا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس انگوٹھی کا پتھر جو کالے رنگ کا تھا۔ اپنا رنگ بدلنے لگا۔ پہلے وہ سرخی مائل ہوا پھر وہ بالکل سرخ ہو گیا۔

ساحل عمر اور ناصر مرزا دونوں دم بخود ہو کر اس انگوٹھی کو دیکھ رہے تھے۔
اچانک عابد منجم نے وہ انگوٹھی پانی سے بھرے گلاس میں ڈال دی۔ پانی میں جاتے ہی اس انگوٹھی کے پتھر سے ایک سرخ رنگ کی دھاری سی پھوٹی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے گلاس کا پانی سرخ ہو گیا۔
"ساحل صاحب آپ نے دیکھا۔ یہ گلاس میں کیا ہے۔؟" عابد منجم نے سوال کیا۔
ساحل عمر نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اس سے بولا نہ گیا۔ وہ دم بخود رہ گیا تھا۔
"یہ آپ کا خون ہے۔ یہ انگوٹھی آپ کا خون جونک بن کر چوس رہی تھی۔ ایک وقت ایسا آتا کہ آپ کے بدن میں ایک قطرہ خون بھی نہ رہتا۔ اس کے بعد یہ انگوٹھی آپ سے لے لی جاتی۔ اور آپ کی روح پر کسی اور کا قبضہ ہوتا۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کن خطرناک لوگوں میں پھنس گئے ہیں۔ آپ طاغوتی طاقتوں کے فریب میں آ گئے ہیں۔"
"طاغوتی طاقتیں۔؟" ساحل عمر نے سوالیہ انداز میں کہا۔ "لیکن یہ انگوٹھی تو مجھے ورشا نے دی ہے۔ اور ورشا کو اس کی ماں نے دی تھی۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔"
"ساحل عمر صاحب! کیا آپ ورشا کی ماں سے ملے ہیں۔؟" عابد منجم نے پوچھا۔
"نہیں" ابھی تک تو نہیں۔" ساحل عمر نے بتایا۔
"مل لیجئے گا وہ ٹھیک پندرہ منٹ بعد یہاں ہو گی۔ آپ نے اپنی جیب میں جو کاغذ رکھا ہے اسے نکال کر پڑھئے۔" عابد منجم نے مزید حیران کرنے والی بات کہی۔
ساحل عمر نے پینٹ کی جیب میں رکھا ہوا کاغذ نکالا اور اس کی تہہ کھول کر اس پر لکھی عبارت پر نظر ڈالی۔

"زور سے پڑھئے تاکہ ناصر مرزا بھی سن لیں۔" عابد منجم نے کہا۔
ساحل عمر نے پرچہ پڑھنے کے بجائے ناصر مرزا کی طرف بڑھا دیا۔ اس پر لکھا تھا۔
"ٹھیک سات بجے برکھا یہاں آئے گی۔ اور میری شکل دیکھتے ہی الٹے قدموں واپس لوٹ جائے گی۔"

ساحل عمر نے گھڑی پر نظر ڈالی ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔
عابد منجم نے اپنی جیب سے پان کی ڈبیہ نکالی۔ اور اس ڈبیہ سے ایک پان بڑی نفاست سے نکالا اور منہ میں رکھ لیا۔ اور آنکھیں بند کر کے پان کھانے میں مصروف ہو گئے۔

وہ کچھ دیر پان چباتے رہے۔ پھر پان چباتے چباتے اچانک آنکھیں کھولیں۔ اور ساحل عمر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "آپ کے گھر میں کوئی گلاب کا پودا ہے۔"

"جی ہاں۔ باہر لان میں کئی گلاب کے پودے ہیں۔" ساحل نے جواب دیا۔

"کیوں خیرت۔؟" ناصر مرزا نے عابد منجم سے پوچھا۔

"یہ ساحل عمر کا خون ہے، کسی اچھی جگہ ٹھکانے لگانا ہے۔" عابد منجم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور فوراً ہی آنکھیں بند کرلیں۔ اور پان کھانے میں مشغول ہو گئے۔ بظاہر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے آنکھیں بند کر کے محض پان کا مزہ لے رہے ہوں لیکن ایسا نہیں تھا۔

وہ دل ہی دل میں باقاعدہ کچھ پڑھ رہے تھے اور پھر آنکھیں انہوں نے اس وقت کھولیں جب گھر کے دروازے پر بیل ہوئی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور بولے۔ "وہ آ گئی جاؤ دروازہ کھولو۔"

ساحل عمر کا دل اچانک تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے جانے کیوں خوف سا محسوس ہوا وہ جس شخص کو یونہی الول جلول سا سمجھ رہا تھا۔ وہ تو بڑے پائے کا آدمی نکلا تھا۔ اس نے کس طرح اس انگوٹھی میں سے اس کا خون نکال دیا تھا۔ اگر وہ یہ انگوٹھی پہنے رہتا جسے وہ اپنا محافظ سمجھ رہا تھا تو اس پر جانے کیا قیامت گزر جاتی۔ پھر انہوں نے برکھا کی آمد کی اطلاع پہلے ہی تحریری طور پر اس کے حوالے کر دی تھی اور اب برکھا آ پہنچی تھی۔ ٹھیک سات بجے۔ اب نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

جب اس نے گیٹ کھولا تو اسے توقع تھی کہ کوئی اجنبی عورت دروازے پر کھڑی ہوگی۔ لیکن اس وقت دروازے پر کوئی اجنبی عورت نہ تھی۔ اس کے سامنے ورشا کھڑی تھی۔ ہنستی مسکراتی اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ۔

"حیران رہ گئے نا مجھے دیکھ کر۔" ورشا نے ہنس کر کہا۔

"ارے نہیں آؤ اندر آؤ۔" ساحل عمر اسے اپنے ساتھ اندر لے چلا۔

"میں نے سوچا۔ آج بغیر اطلاع دیئے۔ تم سے ملوں۔ تمہیں حیران کروں۔ ویسے ایسا کر کے میں نے رسک لیا ہے۔" اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"رسک کیوں؟" ساحل عمر نے پوچھا۔

"ہوسکتا تھا کہ تم گھر پر نہ ملتے۔ پھر میرا کیا حال ہوتا۔" ورشا نے جواب دیا۔

"ہاں یہ تو ہوسکتا تھا۔ لیکن سرپرائز کا بھی تو اپنا مزہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سرپرائز کبھی الٹا پڑ جاتا ہے۔" ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

"کیا کر رہے تھے۔؟ میں نے آکر کہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا۔؟"

"ارے نہیں۔ میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج تم ضرور آؤ گی۔" ساحل عمر نے اسے گہری نظر سے دیکھا۔

"بس دیکھ لو۔ تم نے سوچا اور ہم چلے آئے۔" اس نے ایک ادا سے کہا۔

جب وہ باتیں کرتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئے اور لاؤنج میں پہنچے جہاں ناصر مرزا اور عابد منجم ان کے منتظر تھے تو ورشا ایک دم آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔

ایک نظر اس نے ناصر مرزا کو دیکھا پھر عابد منجم پر نظر ڈالی تو اس کے جسم میں ایک جھٹکا سا لگا۔ پھر اس کی نظریں اس گلاس پر جم گئیں جس میں برکھا کی دی ہوئی انگوٹھی پڑی تھی اور گلاس خون رنگ ہو رہا تھا۔ اس خون رنگ گلاس کو دیکھ کر اس پر جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ تیزی سے گلاس کی طرف جھپٹی اور گلاس اٹھا کر غٹ غٹ کر کے سارا خون پی گئی۔ خون کے ساتھ انگوٹھی بھی اس کے منہ میں چلی گئی تھی۔ اس نے انگوٹھی جس کا پتھر غائب ہو چکا تھا۔ منہ سے نکال کر اپنی انگلی میں پہن لی اور بڑی غضب ناک نگاہوں سے عابد منجم کو دیکھا اور تیزی سے لاؤنج سے نکل گئی۔ ساحل عمر اس کے پیچھے لپکا۔

"ورشا اے ورشا...... سنو تو۔" وہ پکارتا رہا۔

ورشا نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ بہت تیزی سے دوڑتی ہوئی گیٹ سے نکل گئی۔ اور جب ساحل عمر گیٹ پر پہنچا تو وہ اپنی گاڑی اسٹارٹ کر چکی تھی۔ وہ اس کی گاڑی کی طرف لپکا۔ لیکن گاڑی تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنی گاڑی آگے بڑھا چکی تھی۔

ساحل عمر جب گھر میں واپس آیا تو عابد منجم سر تھامے بیٹھے تھے۔ ساحل عمر نے اشارے سے ناصر مرزا سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟" لیکن ناصر مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک ٹک عابد منجم کو دیکھا کیا۔

"عابد صاحب آپ نے فرمایا تھا کہ برکھا آئے گی لیکن یہ تو برکھا نہ تھی ورشا تھی اس کی بیٹی۔" ساحل عمر نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

تب عابد منجم نے سر سے ہاتھ ہٹائے اور اپنا سر اٹھا کر ساحل عمر کو دیکھا اور بولے۔ "یہ ورشا نہیں تھی برکھا تھی۔ میں نے جو کہا تھا وہ ٹھیک کہا تھا۔"

"لیکن......" ساحل عمر اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔

"ساحل عمر تم اس بات کو نہیں سمجھ پاؤ گے۔ میں ناصر مرزا کو سمجھا دوں گا۔" عابد منجم اس کی بات کاٹ کر بولے۔ "فی الحال میں ایک اور الجھن میں ہوں۔ مجھ سے ذرا سی چوک ہو گئی۔ میں اس خون کو اس کے آنے سے پہلے پودے میں ڈلوا دیتا تو اچھا ہوتا۔ وہ تمہارا خون پی گئی۔ اگر وہ ورشا ہوتی تو ہرگز ایسا نہ کرتی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں نے اسے دیکھ لیا۔ یہ ایک اچھی بات ہو گئی۔"

"ساحل تم ذرا دیکھو چائے کس مرحلے میں ہے۔" ناصر مرزا نے اسے آنکھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

"اچھا دیکھتا ہوں۔" ساحل عمر اس کا اشارہ سمجھ کر فوراً اٹھ گیا۔

"ہاں۔ عابد صاحب کون تھی یہ۔؟"

"یہ برکھا تھی۔ ورشا کے جسم میں۔" عابد منجم نے بتایا۔

"اوہ۔ اس قدر خطرناک عورت ہے۔" ناصر مرزا نے ان کی بات سمجھ کر تشویش کا اظہار کیا۔ "مجھے تو اپنے دوست کی فکر پڑ گئی۔"

"تشویش کی بات یقیناً ہے۔ ساحل عمر کی حفاظت کے لئے کچھ انتظام کرنا ہوگا۔"

"آپ کریں۔ اس کام میں ذرا بھی دیر نہ کریں۔ مجھے ساحل بہت عزیز ہے۔" ناصر مرزا

بولا۔

''ہاں بہت پیارا لڑکا ہے۔ میں اس کے لئے کچھ کرتا ہوں۔ فی الحال اس کو یہ ہدایت کر دو
کہ ورشا سے نہ ملے۔''

''ٹھیک ہے کہہ دوں گا۔'' ناصر مرزا نے کہا۔

''چائے تیار ہے۔'' ساحل عمر نے اندر آ کر کہا۔

''آیئے عابد صاحب۔'' ناصر مرزا' عابد نجم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چل کر چائے پیتے
ہیں۔''

پھر وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئے اور کھانے پینے میں مشغول ہو گئے۔

دوسرے دن ناصر مرزا اپنی فیکٹری کے دفتر میں بیٹھا۔ مسعود آفاقی سے بات کر رہا تھا۔ وہ
اسے کل کی روداد سنا رہا تھا کہ اس کا چپڑاسی رمضان کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ناصر مرزا کو فون پر بات
کرتے دیکھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

''ایک منٹ ہولڈ کرنا۔'' ناصر مرزا ریسیور پر کہہ کر رمضان سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں کیا ہے۔
''ہاں' کیا ہے۔؟''

''سر کوئی خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں۔'' رمضان نے بڑے مودبانہ لہجے میں کہا۔

''اچھا۔ انہیں بٹھاؤ۔ میں بات کرلوں۔ پھر بلاتا ہوں۔'' ناصر مرزا نے جواب دیا۔

''کون ہے بھئی۔'' مسعود آفاقی نے پوچھا۔

''ملازمت کے سلسلے میں خواتین آتی رہتی ہیں۔ ایسی ہی کوئی ضرورت مند خاتون ہوں گی۔
اچھا تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ ......'' ناصر مرزا بات کرتا کرتا رک گیا۔ ایک برقع پوش خاتون اس کے
کمرے میں داخل ہو چکی تھیں۔ اور رمضان اس عورت کو اندر آنے سے روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

''اچھا مسعود میں تمہیں ابھی فون کرتا ہوں۔ یہ خاتون بلا اجازت اندر آ گئی ہیں۔ ذرا ان
سے نمٹ لوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

''سر میں نے انہیں بہت منع کیا کہ سر بزی ہیں لیکن یہ مانی نہیں' زبردستی اندر آ گئیں۔''
رمضان پریشان تھا۔

'' آپ کون ہیں خاتون ...... آپ کو باہر بیٹھ کر بلائے جانے کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔''
ناصر مرزا نے ناگواری سے کہا۔

''میں انتظار نہیں کر سکتی۔'' یہ کہہ کر اس خاتون نے نقاب الٹ دیا۔

وہ ایک چالیس پینتالیس سال کی پر کشش عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی
کہ ناصر مرزا اس سے آنکھ نہ ملا پایا۔

''جی فرمایئے۔'' ناصر مرزا نے پوچھا۔

''اس سینگ سلائی سے کہہ دینا کہ ہوش میں رہے۔''

''جی میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔؟'' ناصر مرزا نے وضاحت چاہی۔

''وہ پہلے ہی اتنا دبلا پتلا ہے۔ اگر میں نے زور سے پھونک مار دی تو اس کا پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کدھر گیا۔'' اس نے پھر دھمکی دی۔

''آپ کس کی بات کر رہی ہیں اور آپ کون ہیں۔؟'' ناصر مرزا نے ذرا سخت انداز میں پوچھا۔

''میں عابد منجم کی بات کر رہی ہوں اور میں برکھا ہوں۔'' برکھا نے بڑے تیکھے لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ! اچھا اب میں سمجھا۔ آپ ہیں برکھا...... کل تو آپ کسی اور ہی روپ میں تھیں۔'' ناصر مرزا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں اسے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آئے۔

''اور شکاری تم بھی کان کھول کر سن لو۔ ساحل عمر کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔'' یہ کہہ کر وہ واپس جانے کے لئے مڑی۔

''ایک بات میری بھی سنتی جاؤ۔'' ناصر مرزا کو بھی غصہ آ گیا۔

''میں سننے کی نہیں سنانے کی عادی ہوں۔ میرا پیغام اس سینک سلائی کو دے دینا۔ وہ مجھے کوئی معمولی چیز نہ سمجھے پہلے ہی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ بس اسے ایک معمولی سے دھکے کی ضرورت ہے۔'' یہ کہہ کر برکھا رکی نہیں۔ اس نے ناصر مرزا کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

ناصر مرزا اس کی اس جرات پر ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔

اس کے جانے کے بعد اچانک دروازے پر ناصر مرزا کی نظر پڑی۔ وہاں ایک چیز پڑی تھی جو اس کے برقعے میں سے گری تھی۔

☆......☆......☆

اس کے برقعے سے جو چیز گری تھی وہ ایک ماچس کی ڈبیہ تھی۔
رمضان ابھی کمرے میں موجود تھا۔ ناصر مرزا نے اس سے کہا۔ ''دیکھو کیا ہے اس میں۔''
رمضان نے ماچس کی ڈبیہ اٹھائی اور اسے کھولنے کے بجائے کان کے نزدیک لے جاکر بجائی۔ پھر بولا۔ ''سر دو چار تیلیاں معلوم ہوتی ہیں۔''
''کھول کر دیکھو۔''
رمضان نے ڈبیہ کھولی اس کا اندازہ صحیح تھا۔ اس میں صرف دو تیلیاں تھیں۔
''سر اس میں صرف دو تیلیاں ہیں۔'' رمضان نے کھلی ہوئی ماچس ناصر مرزا کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
ناصر مرزا نے اس ماچس کو ہاتھ نہ لگایا۔ دور ہی سے نظر ڈالی اور پھر بولا۔ ''اسے بند کرکے اپنے پاس رکھ لو اور میرے لئے چائے بناؤ۔''
''جی سر!'' رمضان نے کہا اور ماچس کی ڈبیہ اپنی جیب میں رکھ کر باہر نکل گیا۔
ناصر مرزا کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ماچس اس کے برقعے میں سے کس طرح گری۔ آیا اس نے جان بوجھ کر گرائی یا اتفاقی طور پر برقعے کی جیب سے نکل گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ برکھا سگریٹ نوشی کرتی ہے۔ ورنہ ماچس اپنے پاس رکھنے کا کیا مطلب ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس ماچس میں کوئی بھید ہو کوئی اسرار ہو۔ یہ سوچ کر اس نے فوراً عابد منجم کا نمبر گھمایا۔
''سائیں وہ آپ کی دوست آئی تھی۔'' نمبر ملتے ہی ناصر مرزا نے گفتگو شروع کی۔
''میری دوست۔'' عابد منجم نے آواز پہچان کر کہا۔ ''پر میری دوست تم تک کیسے پہنچی؟''
''سائیں بڑی دھمکیاں دے کر گئی ہے۔'' ناصر مرزا نے بتایا۔
''بھائی کس کی بات کر رہے ہو؟'' عابد منجم نے پوچھا۔
''عابد صاحب برکھا کی بات کر رہا ہوں۔ وہ ابھی یہاں سے گئی ہے۔''
''کیا کہہ رہی تھی۔'' انہوں نے پوچھا۔
''جان سے مارنے کی دھمکی دے گئی ہے۔ اس کے خیال میں ساحل عمر کو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔''
''اچھا' کس روپ میں تھی؟''

"اپنے ہی روپ میں تھی۔ عابد صاحب وہ چالیس پینتالیس کی ایک پرکشش عورت ہے۔"
"اچھا! پھر تو اس سے جلد ملاقات کرنا پڑے گی۔" وہ ہنسے۔
"جاتے جاتے وہ ایک کام کر گئی ہے۔ پتہ نہیں یہ کام اس نے نادانستگی میں کیا یا دانستہ۔"
"وہ کیا؟"
"اس کے جانے کے بعد ایک ماچس دروازے پر دکھائی دی جو یقیناً اس کے برقعے سے گری۔"
"اچھا برقعے میں تھی وہ؟" عابد منجم نے حیرت ظاہر کی۔
"نہ صرف برقعے میں تھی بلکہ بڑی دلیری سے میرے کمرے میں گھس آئی۔"
"ماچس میں کیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔
"صرف دو تیلیاں۔" ناصر مرزا نے بتایا۔
"اس ماچس کو اپنے پاس احتیاط سے رکھو۔ جلانے کی کوشش نہ کرنا اور پہلی فرصت میں اسے میرے پاس بھیجو۔"
عابد منجم نے ہدایت کی۔
"کسے برکھا کو؟" ناصر مرزا نے ہنس کر کہا۔
"اے بھائی! ماچس کو......" وہ بولے۔
"وہ میں خود ہی لے کر حاضر ہوں گا۔ دفتر سے اٹھوں گا تو سیدھا آپ کے پاس آؤں گا۔"
"ٹھیک ہے۔ میں نے ساحل کے لئے ایک تعویذ تیار کیا ہے۔ وہ بھی دے دوں گا۔ ٹھیک ہے باقی باتیں ملاقات پر۔ تم برکھا کی دھمکی کا اثر نہ لینا۔ میں اسے دیکھ لوں گا۔"
انہوں نے تسلی دی۔
"نہیں ایسا ڈرنے والا نہیں ہوں میں۔ مجھے شکاری کہہ کر گئی ہے پھر وہ یہ بات اچھی طرح جانتی ہوگی کہ میرا نشانہ کیسا ہے۔ اچھا او کے۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔
ابھی ریسیور رکھ کر ناصر مرزا نے ایک گہرا سانس ہی لیا تھا کہ اس کا منیجر زاہد ملک بوکھلایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سر وہ رمضان اندھا ہوگیا۔"
"رمضان اندھا ہوگیا۔" ناصر مرزا فوراً کھڑا ہوگیا۔
"کہاں ہے وہ؟"
ناصر مرزا اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ رمضان سامنے ہی ایک کرسی پر اپنی آنکھیں پکڑے بیٹھا تھا اور دفتر کے دو چار لوگ اس کے گرد کھڑے تھے۔
ہوا یہ کہ جب رمضان چائے بنانے کے لئے کچن میں پہنچا تو اسے چولہا جلانے کے لئے ماچس کی ڈبیہ کہیں نظر نہ آئی۔ اس نے ماچس کی تلاش سے بچنے کے لئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اس ماچس کی ڈبیہ میں دو تیلیاں موجود تھیں۔ اس نے ایک تیلی نکال کر ماچس پر رگڑی۔
تیلی سے جیسے ہی شعلہ نکلا اسے دیکھتے ہی رمضان کی آنکھیں جاتی رہیں۔ ایک دم اس کی

آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ کچن میں گھبرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔
ایک بندے نے اسے کچن سے اٹھا کر باہر کرسی پر بٹھایا۔ رمضان نے بتایا کہ اسے اب آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ یوں یہ اطلاع زاہد ملک نے ناصر مرزا تک پہنچائی۔
ناصر مرزا نے سب سے پہلے وہ ماچس کی ڈبیہ جس میں اب ایک تیلی موجود تھی۔ اپنے قبضے میں کی۔ اس کے بعد اس نے زاہد ملک کو ہدایت دی۔ ''رمضان کو میری گاڑی میں بٹھا کر فوراً اسپتال لے جاؤ۔ اس سلسلے میں جو بھی خرچہ ہوگا اسے میں برداشت کروں گا۔''
زاہد ملک اسے فوراً گاڑی میں بٹھا کر اسپتال پہنچا۔
آنکھوں کے سرجن نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا اور معائنے کے بعد اس نے جو بات بتائی۔ اسے سن کر زاہد ملک کا منہ کھلا رہ گیا۔
ڈاکٹر نے کہا۔ ''اس کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔''
''ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اسے آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ اس کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔''
''یہ بات میں پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ اس کی آنکھیں پوری طرح صحیح ہیں۔ بھلا ماچس کی تیلی جلنے سے بھی کبھی کسی کی آنکھیں ضائع ہوئی ہیں اور وہ بھی دونوں۔'' ڈاکٹر نے بڑی وثوق سے کہا۔
''رمضان تم نے سن لیا۔ ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔''
''ہاں! میں نے سن لیا۔'' رمضان نے پریشان ہوکر کہا۔ ''خدا کی قسم زاہد صاحب مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گا۔''
''اچھا آؤ میرے ساتھ...... فون پر ناصر صاحب سے بات کرتے ہیں۔'' زاہد ملک نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آئی سرجن کے کمرے سے رمضان کو لے کر باہر آ گیا۔
اسپتال کے استقبالیہ سے زاہد ملک نے ناصر مرزا سے بات کی۔ اسے ساری صورت حال بتائی اور پوچھا۔ ''سر اب کیا حکم ہے۔''
ناصر مرزا نے زاہد ملک کی بات بڑے تحمل سے سنی۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔
''تم اسے دفتر واپس لے آؤ۔ میں سوچتا ہوں کہ اب اس کے لئے کیا کرنا ہے۔''
ناصر مرزا نے ٹیلی فون منقطع کر کے ایک مرتبہ پھر عابد منجم سے بات کی۔ انہیں رمضان کے اندھے ہونے کی داستان سنائی۔
پوری روداد سننے کے بعد عابد منجم بولے۔ ''میں نے منع کیا تھا نا ماچس جلانے کو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تم ایسا کرو کہ اپنے چپڑاسی کو فوراً میرے پاس لے آؤ۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیا معاملہ ہے۔ بھئی یہ عورت تو توقع سے زیادہ خطرناک معلوم ہو رہی ہے۔''
''ٹھیک ہے رمضان واپس دفتر آ جائے تو میں فوراً آپ کے پاس لے کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون منقطع کر دیا اور ریسیور پکڑے سوچنے لگا۔

ناصر مرزا نے جنات' بھوت پریت' آسیب کے بہت واقعات سنے اور پڑھے تھے۔ ایک دو دیکھے بھی تھے لیکن اس طرح کی کسی عورت سے اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ جادو کے بارے میں اس نے سنا ضرور تھا لیکن کوئی جادوگر دیکھا نہ تھا۔ اب واسطہ پڑا تو ایک عورت سے ...... ایک تو ساحرہ اوپر سے حسین ...... حسین عورت تو ویسے ہی کسی سحر سے کم نہیں ہوتی۔ اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے لیکن یہ بر کھا تو چیزے دیگر تھی۔ وہ کالے علم میں بہت آگے تھی۔ وہ روح کی منتقلی کے فن سے بھی واقف تھی۔ وہ پکی شیطان تھی۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد وہ رمضان کو لے کر عابد منجم کے دفتر پہنچ گیا۔ عابد منجم نجوم پر ایک ماہنامہ نکالتے تھے۔ رمضان کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے اپنے نزدیک کرسی پر بٹھالیا اور اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بظاہر بالکل ٹھیک تھیں۔ نہ کوئی سرخی تھی نہ کوئی زخم تھا اور نہ ہی آنکھوں میں کسی قسم کا درد تھا۔

''ہاں! رمضان کیا ہوا تھا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''سر جی میں نے جیسے ہی تیلی جلائی اور اس کے شعلے پر نظر پڑی تو ایک دم سے آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔'' رمضان نے بتایا۔

''اب تمہیں کچھ نظر آرہا ہے۔''

''جی بالکل نہیں ...... میری آنکھوں میں اب بھی گہرا اندھیرا اترا ہوا ہے جیسے کسی نے آنکھوں پر کالی پٹی باندھ دی ہو۔''

''تم نے صحیح کہا۔ رمضان تمہاری آنکھوں پر واقعی کالا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔'' عابد منجم نے کہا پھر ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''وہ ماچس کہاں ہے؟''

''یہ ہے۔'' ناصر مرزا نے ماچس نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔

عابد منجم نے ماچس کی ڈبیہ سے وہ تیلی نکال کر بڑے غور سے دیکھی اور بولے۔ ''خوب آتش بازی ہے۔''

''یہ تیلی تو عام سی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ بطور خاص بنائی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔''

''ہاں' ٹھیک کہا تم نے۔ یہ تیلی کسی عام ماچس کی ہے لیکن وہ عورت بڑی آتش باز ہے۔ کس طرح ماچس کی ڈبیہ پھینک کر نکل گئی۔'' یہ کہہ کر انہوں نے گھنٹی بجائی۔ ایک ادھیڑ عمر کا ملازم اندر آیا۔ عابد منجم اس سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''شوکت! ایک گلاس میں پانی لاؤ۔''

''جی صاحب!'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر گیا اور ایک شفاف گلاس میں پانی لے آیا۔

عابد منجم نے وہ گلاس اپنے سامنے رکھا اور دھیرے دھیرے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ ماچس کی تیلی ان کے ہاتھ میں تھی اور ان کی نظریں تیلی پر۔

دو چار منٹ کچھ پڑھ کر انہوں نے تیلی پر پھونک ماری اور اس کی مصالحہ لگی سائیڈ پانی میں ڈال کر نکال لی۔ مصالحہ گیلا ہو گیا۔ انہوں نے پھر پڑھنا شروع کیا۔

اس طرح انہوں نے تین مرتبہ کچھ پڑھ کر تیلی پر پھونک ماری اور اسے پانی میں ڈبو کر نکال

لیا۔ تیسری مرتبہ اس کا مصالحہ چھوٹ کر میز پر گر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی جیسا ہوگیا۔
تب انہوں نے گھنٹی بجا کر شوکت کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا گلاس دے کر کہا۔ ''رمضان کو باتھ روم میں لے جاؤ۔ اس پانی سے اس کی آنکھیں دھلوانی ہیں۔ تم اس کے ہاتھ پر پانی ڈالتے جانا یہ دھوتا جائے گا۔''
شوکت نے رمضان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''آؤ بھئی۔''
''یہ اس طرح نہیں جاسکتا۔ اس کا ہاتھ تھام کر لے جاؤ۔'' عابد منجم نے ہدایت کی۔
رمضان نے اندھوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ چلائے۔ تب شوکت کو احساس ہوا کہ بندہ اندھا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی اس نے فوراً رمضان کا ہاتھ پکڑ لیا اور دھیرے دھیرے کمرے سے نکال لے گیا۔
پانچ منٹ کے بعد جب رمضان کمرے میں واپس آیا تو اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔
''سر میں دیکھ سکتا ہوں۔ میری آنکھوں سے اندھیرا چھٹ گیا۔''
''شکر ہے اللہ کا ...... ورنہ میں تو تمہاری طرف سے بڑا فکر مند ہوگیا تھا۔'' ناصر مرزا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''اب تو تمہیں نظر آرہا ہے نا۔'' عابد منجم نے تصدیق چاہی۔
''جی سر! مجھے بالکل صاف نظر آرہا ہے۔ آپ نے کمال کر دیا سر۔'' رمضان بڑی ممنونیت سے عابد منجم کو دیکھتا ہوا بولا۔
''جاؤ عیش کرو، تم پر اللہ کا فضل ہوگیا ورنہ اس شیطان نے تمہیں اندھا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔'' عابد منجم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''اصل فضل تو مجھ پر ہوا کیونکہ اصل نشانہ تو میں تھا۔ یہ بے چارہ تو ایسے ہی لپیٹ میں آگیا۔'' ناصر مرزا نے وضاحت کی۔
''ہاں تم صحیح کہتے ہو۔ اب ہم دونوں کو اپنی حفاظت کے لئے بھی کچھ کرنا پڑے گا۔'' عابد منجم بولے۔
''ساحل عمر کے لئے آپ نے کیا کیا؟ ناصر مرزا نے پوچھا۔
''اس کے لئے میں نے تعویذ تیار کر لیا ہے۔ اسے یہ تعویذ مستقل گلے میں ڈال کر رکھنا ہوگا۔'' عابد منجم نے کالے کپڑے میں سلا تعویذ جیب سے نکال کر ناصر مرزا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
پھر ناصر مرزا نے رمضان کو دفتر بھیج دیا اور وہ دونوں بڑی دیر تک آئندہ کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔
آج صبح ہی سے برکھا کی حالت خراب تھی۔ وہ بستر پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی۔ بے چینی سے اپنے ہاتھ پاؤں پٹخ رہی تھی۔ اسے کسی کروٹ قرار نہ تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا اور نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ ورشا کئی مرتبہ اس سے ناشتے کا کہہ چکی تھی۔

''نہیں ورشا ناشتہ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ میرے اندر آگ لگی ہے۔'' وہ تڑپ کر بولی۔
''اگر گرمی لگ رہی ہے تو ایئر کنڈیشنر اور تیز کردوں۔'' ورشا نے تجویز پیش کی۔
''نہیں ورشا مجھے پیاس لگی ہے۔'' وہ اپنی زبان باہر نکال کر بولی۔
''پیاس لگی ہے تو جوس لے آؤں۔''
''نہیں ورشا یہ وہ پیاس نہیں ہے یہ کوئی اور پیاس ہے۔''
''کیسی پیاس ...... ؟ ممی کچھ بتاؤ تو میں تمہیں کئی مرتبہ اس طرح تڑپتے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔ شام ہوتے ہوتے تمہاری حالت مردوں سے بدتر ہو جائے گی۔ اتنی کمزور ہو جاؤ گی جیسے برسوں کی مریض ...... ممی یہ تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔ کچھ بولو تو ......'' ورشا نے برکھا کا ہاتھ پکڑ لیا جو برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ''بتاؤ ممی!''

''تو جانتی ہے کہ میں نے تیرے نانا کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو وہ مجھے بھینٹ چڑھا دیتا۔ وہ میری جان کا دشمن ہو گیا تھا اور ٹھیک ہوا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ اسے یہی کرنا چاہئے تھا۔ میں اس کی تپسیا تھی۔ اس کا سرمایہ تھی۔ اس نے مجھ پر بہت محنت کی تھی۔ اس نے مجھے ہر وہ سحر سکھا دیا تھا جو اسے آتا تھا۔ وہ میرے ذریعے اس دنیا پر دنیا والوں پر راج کرنا چاہتا تھا۔ اس کام کا آغاز اس نے بمبئی پہنچ کر کر دیا تھا لیکن میں نے اس کے ساتھ دغا کی۔ اسے دھوکا دیا۔ اس کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔ برا ہو اس محبت کا جو مجھے مناف سے ہو گئی۔ مناف کی محبت نے مجھے راستے سے بھٹکا دیا۔ اپنے باپ اپنے استاد کو چھوڑ کر مناف کے ساتھ نکل گئی۔ پھر سب سے بھیانک غلطی میں نے یہ کی کہ میں مسلمان ہو گئی اور میں نے ان کاموں سے توبہ کر لی۔ جو لوگ اپنے راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ اپنا مسلک چھوڑ دیتے ہیں ان کے ساتھ یہی ہونا چاہئے جو میرے ساتھ ہوا۔ میرا باپ مجھے سزا دینے آ پہنچا۔ یہ بات میں اچھی طرح جان گئی کہ اب وہ مجھے کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑے گا اور میں کسی قیمت پر مرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں اس کے مقابلے پر آ گئی۔ اس کا سکھایا پڑھایا اسی پر آزما ڈالا۔ اس طرح میں اسے بھینٹ چڑھانے میں کامیاب ہو گئی۔ جو فائدہ وہ اٹھانا چاہتا تھا وہ فائدہ میں نے اٹھا لیا۔ مجھے اس بھینٹ کے عوض بہت کچھ مل گیا۔ میرا قیمتی خون تو ضائع ہوا لیکن مجھے ایک طاقت مل گئی۔ کالی طاقت۔ اب میں مسلمان نہ رہی۔ کافر ہو گئی۔ اپنے مسلک پر لوٹ آئی۔ مناف کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔ جھوٹ' دھوکا' فریب میرا مذہب بن گیا۔ سیدھے راستے سے لوگوں کو بھٹکانا میرا ایمان ہو گیا۔ پھر ایک دن مناف نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میرے اندر آگ بھڑک اٹھی۔ وہ میرے غصے کی لپیٹ میں آ گیا۔ اسے بھی میں نے بھینٹ چڑھا دیا۔ اس طرح میرا قیمتی خون ایک مرتبہ پھر ضائع ہوا۔ وہ پیاس جو میرے اندر پہلے ہی بھڑک رہی تھی۔ مزید بھڑک اٹھی۔ اس پیاس کو بجھانے کے لئے مجھے بڑے جتن کرنے پڑے ہیں۔ یوں سمجھو کہ مجھے خون کا سرطان ہو گیا ہے۔ جس طرح خون کے سرطان میں بار بار نئے اور تازہ خون کی ضرورت پڑتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جب میرے اندر پیاس بھڑکتی ہے تو یہ تازہ خون حاصل کئے بغیر نہیں بجھتی۔ آج میں نے تمہیں ساری بات اچھی طرح سمجھا دی ہے۔ پوری تفصیل بتا دی ہے۔ اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ

کس قسم کی پیاس ہے۔" برکھا نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔
"پھر ممی تمہارے لئے تازہ خون کہاں سے آئے گا" ورشا فکر مند ہو کر بولی۔
"آ جائے گا ...... تم پریشان مت ہو۔ میں انتظام کرلوں گی۔" برکھا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "تم ذرا واسم کو فون ملاؤ۔"
"ٹھیک ہے ممی۔" ورشا نے واسم کا نمبر ڈائل کر کے ریسیور برکھا کے ہاتھ میں تھما دیا۔
"ادھر ابھی بیل ہو رہی تھی۔ پھر کسی نے فون اٹھا کر "ہیلو" کہا۔
"ہاں واسم میں بول رہی ہوں۔" برکھا نے اس کی آواز پہچان کر اپنی پہچان کرائی۔
"جی برکھا جی ...... کیا حکم ہے میرے لئے ......" وہ فرماں برداری سے بولا۔
"آج سوناں کو لے کر شکار پر جانا ہے۔" برکھا نے حکم دیا۔
"جی ٹھیک ہے۔"
"سوناں سے کہنا ذرا آنکھیں کھول کر کام کرے۔ تم اس کے آگے پیچھے رہنا تا کہ کسی قسم کی گڑبڑ ہونے پر معاملہ سنبھال سکو۔ اس سے کہنا کہ ذرا صحیح چیز کا انتخاب کرے۔ ٹھیک ہے۔ اچھا ذرا جلدی آنا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سمجھ گئے نا میری بات۔"
"جی سمجھ گیا۔ ہم جلدی آنے کی کوشش کریں گے۔ شکار ملتے ہی ہم نکل آئیں گے۔" اس نے تسلی دی۔
"ٹھیک ہے ...... او کے۔" برکھا نے ریسیور ورشا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"ممی آپ تھوڑا سا کچھ کھا لیں۔" ورشا نے ریسیور رکھتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں ورشا میں کچھ نہیں کھا سکتی۔ اگر کھاؤں گی تو فوراً باہر آ جائے گا۔ مجھے رات تک انتظار کرنا ہوگا۔" برکھا نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔
"جوس وغیرہ لے لیں ...... اس طرح تو نقاہت بہت بڑھ جائے گی۔" ورشا فکر مند تھی۔
"نہیں جوس نہیں ...... ایسا کرو مجھے تھوڑا سا نمک ملا پانی دے دو۔ نمکین پانی کے علاوہ کچھ نہیں پیا جا سکتا۔"
برکھا نے کہا۔
"ممی مجھے نہیں معلوم کہ راسم کو آپ نے کس شکار پر بھیجا ہے اور وہ آپ کے لئے کیا انتظام کر کے لائے گا لیکن میں سوچتی ہوں کہ اگر کسی وجہ سے وہ انتظام نہ کر پایا تو پھر آپ رات کس طرح گزاریں گی۔"
"ورشا ایسی بری باتیں منہ سے مت نکال۔ سوناں بڑی کھلاڑی عورت ہے وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی۔ اگر وہ کسی وجہ سے ناکام ہو گئی تو پھر میرے پاس ایک راستہ اور ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ورشا کو کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ وہ سہم کر رہ گئی۔
آج چھٹی کا دن تھا۔ دن بھر خوب گرمی پڑی۔ شام ہوتے ہی موسم بہتر ہو گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ کلفٹن پر اچھا خاصا رش تھا۔ پلے لینڈ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگ اپنی فیملیز کیساتھ آئے ہوئے

تھے۔ انہی لوگوں میں سوناں اور واسم بھی تھے۔ سوناں سانولے رنگ کی اچھے نین نقش کی عورت تھی۔ وہ زرد رنگ کی سرخ بارڈر والی کاٹن کی ساڑھی ہندوانے اسٹائل میں باندھے ہوئے تھی۔ اس کی پیشانی پر لال بِندیا اور مانگ میں سیندور پڑا ہوا تھا۔ اسے پلے لینڈ میں گھومتے ہوئے ایک گھنٹہ ہوگیا تھا۔ واسم اس کے نزدیک ہی تھا۔ کبھی آگے کبھی پیچھے کبھی دائیں کبھی بائیں اور کبھی دو چار قدم ساتھ بھی چل لیتا تھا۔

سوناں بہت تیزی سے ادھر ادھر نظروں کے جال پھینک رہی تھی لیکن اس کی مطلوبہ چیز ابھی تک نظروں میں نہیں آئی تھی۔ وہ ادھر سے ادھر گھومتی رہی۔ تب اچانک اس کی نظر ایک جھولے پر پڑی۔ وہ وہیں ٹھہر گئی۔ اتنے میں جھولے میں بیٹھی لڑکی اوپر چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ نیچے آئی تو اس کی نظروں نے اس کا انتخاب کیا۔ سوناں کو جھولے کے سامنے کھڑا دیکھ کر واسم بھی نزدیک رک گیا اور جھولے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اندازہ نہ کر پایا کہ سوناں نے کس لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔

جھولے کے رکنے کے بعد فیملیز نے باہر آنا شروع کیا تو وہ اپنی منتخب کردہ لڑکی کے پیچھے ہولی۔ وہ سات آٹھ افراد کی فیملی تھی۔ اس میں چار لڑکیاں، دو عورتیں، ایک جوان لڑکا اور ایک ادھیڑ عمر کا مرد تھا۔ وہ لڑکی ان میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس کی عمر بمشکل تیرہ چودہ سال ہوگی۔ وہ بڑی پیاری سی لڑکی تھی، معصوم سی......

سوناں نے لڑکی کو دیکھتے ہی منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ اب وہ موقع کی تلاش میں تھی۔ جیسے ہی رش میں لڑکی اپنی فیملی سے ذرا الگ ہوئی تو سوناں نے آگے بڑھ کر بہت نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ لڑکی نے فوراً ہاتھ پکڑنے والی کو دیکھا۔ سوناں نے پھونک مار کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور اس کا ہاتھ دبا کر اپنی طرف کھینچا۔ ”آجاؤ میرے ساتھ......“

وہ لڑکی یہ سن کر اس کے ساتھ کچھ اس طرح چل دی جیسے اپنی ماں کے ساتھ جا رہی ہو۔ وہ لڑکی بندش میں آگئی تھی اور کسی سحر زدہ معمول کی طرح اس کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔

واسم نے جب دیکھا کہ سوناں نے شکار پکڑلیا ہے تو وہ اس کے قریب آ کر بولا۔ ”سوناں جلدی کر......“

”تو گیٹ سے نکل کر گاڑی اسٹارٹ کر میں اسے لا رہی ہوں۔“ سوناں نے اسے بھگایا۔

”آؤ...... وہ دونوں گیٹ سے باہر نکل آئے اور اندھیرے میں اس کی پچھلی نشست پر سوناں نے اس لڑکی کو دھکیلا اور ہیجانی انداز میں بولی۔ ”واسم بھگا گاڑی۔“

واسم طوفانی انداز میں وہاں سے گاڑی نکال کر مین روڈ پر لے آیا۔

گاڑی میں اندھیرا تھا۔ اس لڑکی کو سوناں نے اپنے قریب کر کے اس کا سر اپنے کندھے پر لگالیا تھا۔ اس لڑکی پر نیم غشی طاری ہو چکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے ہوش کھوتی جا رہی تھی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ ایک تو شکار جلد مل گیا تھا اور برکھا کے مطلب کا تھا۔

جب گاڑی برکھا کے گھر کے گیٹ پر پہنچی تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ واسم نے مخصوص انداز میں گاڑی کا ہارن دیا۔ برکھا جو اب نڈھال ہو چکی تھی ہارن کی آواز سن کر ایک دم اس کے تن

مردہ میں جان سی پڑ گئی۔ وہ خوش ہو کر بولی۔ ''وہ آ گئی۔''

''ممی میں جا کر گیٹ کھولوں۔'' ورشا نے اجازت چاہی۔

''ہاں جاؤ۔'' برکھا نے اسے گیٹ کھولنے کی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر

''تم گاڑی میں جھانکنے کی کوشش مت کرنا۔ گیٹ کھول کر واپس اپنے کمرے میں چلی جانا۔ آج رات

سوناں میرے ساتھ ہی رہے گی۔ البتہ واسم فوراً واپس چلا جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد سوناں خو

گیٹ بند کر لے گی۔

''اچھا ممی۔'' ورشا نے سعادت مندی سے کہا۔ ''میں گیٹ کھول کر اپنے کمرے میں چلی

جاؤں گی۔''

ورشا نے گیٹ کھولا تو گاڑی کی بجھی ہوئی ہیڈ لائٹس ایک دم آن ہو گئیں۔ ورشا کی آنکھیں

چندھیا گئیں وہ فوراً ایک طرف ہو گئی۔ اس کے ایک سائیڈ پر ہوتے ہی گاڑی تیزی سے اس کے برابر

سے گزر گئی۔ ورشا باوجود کوشش کے کچھ نہ دیکھ پائی۔ گاڑی گھوم کر بنگلے کے پیچھے چلی گئی۔

ورشا نے گیٹ کھلا چھوڑ کر اپنے کمرے کا رخ کیا اور

لائٹ جلا کر ایک رسالہ پڑھنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے گاڑی واپس جانے کی آواز

سنی۔ کسی نے گیٹ بند کیا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ کچھ وقت گزرا تو ورشا نے رسالہ ایک طرف

پھینک کر کمرے میں لائٹ آف کر دی اور سوچا کہ چپکے سے نکل کر ممی کے کمرے کی طرف جائے اور

وہاں جا کر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔

ابھی وہ باہر نکلنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ باہر سے اس کے دروازے کے کنڈے کے بند

ہونے کی آواز آئی۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے کنڈا بند کر کے تالا ڈال دیا ہو۔

ورشا نے آگے بڑھ کر دروازے کو آہستہ سے ہلایا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ وہ کھلتا کیسے!

ورشا نے سوچا کہ دروازے کو باہر سے بند کر دینا ہی کافی تھا۔ کنڈے میں تالا ڈالنے کی کیا ضرورت

تھی۔ وہ بند کنڈے کو اندر سے کسی قیمت پر نہیں کھول سکتی تھی۔ اس کمرے میں دو دروازے تھے۔ ایک

دروازہ ممی کے پرانے بیڈ روم میں کھلتا تھا۔ یہ وہ بیڈ روم تھا جس سے جھانک کر اس نے اپنے باپ

مناف کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے باپ کو مارنے کے بعد برکھا نے یہ بیڈ روم چھوڑ دیا تھا۔ اس بیڈ

روم کے برابر والے کمرے کو برکھا نے اپنا بیڈ روم بنا لیا تھا۔ برابر والے بیڈ روم کے درمیان بھی ایک

دروازہ تھا۔ اگر اندر کے دونوں دروازے کھول دیئے جائیں تو تینوں کمرے ایک ہو سکتے تھے۔

تینوں بیڈ روموں کو ملانے والے دونوں دروازوں کے اوپر شیشے لگے ہوئے تھے۔ ورشا لمبے

قد کی لڑکی تھی۔ اس نے ذرا سا اچک کر دیکھا۔ برابر والے کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ تو خیر تھا کہ

وہاں تو اندھیرا ہونا ہی تھا لیکن برکھا کے کمرے میں بھی اندھیرا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ برکھا اپنے بیڈ

روم میں نہ تھی۔ اس نے دروازے میں دھکا مار کر دیکھا وہ دوسری طرف سے بند تھا۔

ورشا اب اپنے کمرے سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ وہ مایوس ہو کر بیڈ پر اوندھے منہ گری اور

سسکیوں سے رونے لگی۔

برکھا اس وقت اس کمرے میں تھی جہاں دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا۔ یہ کمرہ ایک طرح اس کا آپریشن تھیٹر تھا۔ وہ یہیں بیٹھ کر سارے عملیات کرتی تھی۔ یہی اس کی پوجا کا کمرہ تھا۔ وہ شیطان کی پجاری تھی۔ اس شیطان کی پجاری جس نے انسان کے وجود میں آتے ہی قسم کھائی تھی کہ وہ رہتی دنیا تک اسے بھٹکاتا رہے گا۔ نقصان پہنچاتا رہے گا۔ ایک زمانے میں وہ ہندو تھی ہندو اس لئے تھی کہ اس کا باپ ہندو تھا۔ پھر وہ مسلمان ہوئی۔ مسلمان اس لئے ہوئی کہ اس کا شوہر مسلمان تھا۔ اب وہ مسلمان تھی نہ ہندو۔ اس کا کوئی مذہب نہ تھا۔ وہ اس دنیا کے سب سے بڑے طاغوت کی چیلی تھی۔ اس کی پجارن تھی۔ اس کی پیروکار تھی۔ وہ بدی کے دیوتا کی داسی تھی۔ وہ ابلیس کی غلام تھی۔ وہ ابلیس جو سدا سے انسان کا دشمن ہے۔ ایسے انسان کا جو اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہو۔ ایسے انسان کو بھٹکا کر چھوڑ دینا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ انسان کے وجود میں نیکی بدی دونوں موجود ہوتی ہیں۔ جو شخص اللہ کی رسی مضبوطی سے تھام لیتا ہے اس کی روح میں نیکی کی روشنی پھیل جاتی ہے اور بدی سمٹ کر اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔ ایسے شخص کے پیچھے شیطان لگ جاتا ہے۔ وہ اس کی کمزوری تلاش کرتا ہے اور پھر اس کی روح میں بجھی ہوئی بدی کی موم بتی کو گناہ کی دیا سلائی سے روشن کر دیتا ہے۔ گناہ میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ انسان بڑی تیزی سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ گناہ میں اگر کشش نہ ہو تو گناہ کون کرے لیکن گناہ کر کے ہمیشہ دکھ پہنچتا ہے۔ آدمی غمگین ہو جاتا ہے۔ پچھتاتا ہے جبکہ نیکی میں بظاہر کوئی کشش نہیں ہوتی لیکن نیکی کر کے ہمیشہ سکھ پہنچتا ہے۔ آدمی کو سکون ملتا ہے۔ ایک سرخوشی سی اس پر چھا جاتی ہے۔ نیکی اللہ ہے اور بدی شیطان ...... شیطان کا ہاتھ پکڑنے والا ہزار آسائشوں کے باوجود دکھی رہتا ہے۔ بے چین رہتا ہے۔ ایک کرب میں مبتلا رہتا ہے جبکہ اللہ کی رسی کو تھامنے والا ہزار دکھوں کے باوجود سکھی رہتا ہے۔ پرسکون رہتا ہے۔ اس کی روح پر اطمینان کی بارش برستی رہتی ہے۔

طاقت دونوں کو مل جاتی ہے۔ اس کو بھی جو نیکی کی راہ پر چلتا ہے اور اس کو بھی جو بدی کے راستے اپنا لیتا ہے۔ ہوا کے دوش پر دونوں آدمی اڑ سکتے ہیں۔ وہ بھی جس کے پاس اللہ کی بخشی ہوئی طاقت ہوگی اور وہ بھی جس کے پاس ابلیس کی دی ہوئی قوت ہوتی ہے۔ فرق صرف نیت کا ہوتا ہے۔ روحانی آدمی سب کا دوست ہوتا ہے اور شیطانی آدمی سب کا دشمن ہوتا ہے۔ سب سے بڑا دشمن تو وہ خود اپنا ہوتا ہے۔

برکھا نے جو راستے اپنا لئے تھے وہ راستے اسے اس زندگی کی طرف لے جا رہے تھے جہاں آگ ہی آگ تھی۔ لیکن اس آگ سے وہ انجان تھی۔ اس وقت تو اسے اس آگ کی فکر تھی جو اس کے لہو میں لگی تھی۔ لہو کی اس آگ کو بجھانے کے لئے تازہ خون کی ضرورت تھی۔

اور سوناں اس کے لئے ایک دو بوتل خون نہیں پورا ''بلڈ بینک'' اٹھا لائی تھی۔ اس وقت وہ اس عملیات والے کمرے میں تھیں۔ اس کمرے میں صرف ایک موم بتی جل رہی تھی۔ وہ لڑکی اب مکمل طور پر بے ہوش ہو چکی تھی۔ وہ فرش پر لیٹی تھی۔ سوناں کے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا نیا بلیڈ تھا۔ اس نے لڑکی کی کلائی میں بلیڈ سے ایک چیرا لگایا۔ فوراً ہی سرخ سرخ خون ابل کر باہر آیا اور کلائی سے بہ کر نیچے گرنے لگا۔ سوناں نے اس کے ہاتھ کو ایک بڑے چینی کے سفید پیالے پر رکھ دیا۔ خون ٹپک کر اس

پیالے میں بھرنے لگا۔

چوتھائی پیالہ بھر جانے پر اس نے یہ پیالہ برکھا کے سامنے رکھ دیا۔ برکھا آلتی پالتی مارے آسن جمائے بیٹھی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور شیطان کا کلمہ پڑھ رہی تھی۔ سوناں نے کچھ بولے بغیر اسے آہستہ سے چھوا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اپنے سامنے پیالہ دیکھ کر اس نے اپنا انگوٹھا خون میں ڈبویا اور اپنی زبان باہر نکال کر چند قطرے خون ٹپکایا اور زبان اندر کر کے خون کا ذائقہ چکھا۔ پھر چٹخارے لیتی ہوئی سوناں کو بڑی تعریفی نگاہوں سے دیکھا۔

''واہ سوناں تیرا جواب نہیں۔''

''میں آپ کی داسی ہوں برکھا دیوی! آپ کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔'' سوناں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر عقیدت سے اس کے سامنے سر جھکایا۔

برکھا نے وہ پیالہ اٹھا کر اپنے سر پر الٹ لیا اور بیٹھے بیٹھے سرشاری سے جھومنے لگی۔ پیالہ خالی ہوتے ہی سوناں نے اٹھالیا اور اس لڑکی کے جسم کے مختلف حصوں پر کٹ مار کر اس پیالے کو بھرنے لگی۔

خون میں بھیگی برکھا موم بتی کی روشنی میں بڑی عجیب لگ رہی تھی۔ وہ مسلسل ہل رہی تھی اور ناقابل فہم الفاظ کا ورد کر رہی تھی۔ کمرے میں پہلے ہی کیا کم بو تھی لیکن اب یہ بو ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بو اس قدر اذیت ناک تھی کہ کوئی حساس انسان اس کو سونگھ لیتا تو فوراً بے ہوش ہو جاتا لیکن ان دونوں پر اس بدبو کا کوئی اثر نہ تھا۔

جھومتے جھومتے جو اچانک برکھا نے اپنا سر اٹھایا تو ایک لمحے کو سوناں بھی کانپ اٹھی۔ کمرہ ویسے ہی تقریباً تاریک تھا۔ ایک موم بتی کی روشنی بھلا کتنا اندھیرا دور کر سکتی تھی۔ اس اندھیرے میں جب ایک فٹ لمبی زبان منہ سے باہر آ جائے اور آنکھوں میں خونخوار چمک پیدا ہو جائے۔ رنگ ایک دم سیاہ ہو جائے تو سامنے بیٹھنے والا انسان آخر کانپے گا نہیں تو کیا کرے گا۔

''لا......!'' برکھا نے اپنی زبان کو لپلپاتے ہوئے بڑے وحشت ناک انداز میں کہا۔

سوناں اس پیالے کو خون سے لبالب بھر چکی تھی۔ اس نے وہ پیالہ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ برکھا نے بڑی بے قراری سے اپنے دونوں ہاتھوں پر جھک کر اپنی ایک فٹ لمبی زبان پیالے میں ڈال دی۔

اس کے بعد کمرے میں ''چپ چپ'' کی آواز گونجنے لگی۔

''ورشا روتے روتے جانے کب سوگئی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دن کے دس بج رہے تھے وہ گھڑی پر نظر ڈالتی ہوئی جلدی سے اٹھ گئی۔ اسے بڑی شدت کی بھوک لگی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ اپنی بھوک سے زیادہ اسے برکھا کے ناشتے کی فکر تھی۔ برکھا ٹھیک آٹھ بجے ناشتہ کرنے کی عادی تھی۔ ناشتے میں وہ دو چار منٹ کی دیر بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ ورشا کو ڈانٹ دیتی تھی۔ اس وقت تو دس بج رہے تھے۔ جانے برکھا کا غصے میں کیا حال ہوگا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر جب اس نے دروازہ کھولنا چاہا تو وہ نہیں کھلا۔ اس نے اطمینان

کا سانس لیا۔ اب اس دیر میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ بند دروازے سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔
پھر اسے یاد آیا کہ برکھا نے کہا تھا سوناں آج رات یہیں رہے گی۔ اسی لئے برکھا کو اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ سوناں نے ناشتہ بنا کر دے دیا ہوگا۔ اب اسے اپنی بھوک کا احساس ہوا۔ اس نے دروازے کو زور سے جھنجوڑا۔ کئی مرتبہ پیٹا ...... مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ وہ تھک کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور دروازے کو تکنے لگی۔
کوئی گیارہ بجے کے قریب دروازے پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے نزدیک پہنچی تو وہ اس وقت کھل چکا تھا۔
وہ دروازے پر کھڑی تھی اور ورشا اسے دیکھ کر ساکت ہوگئی۔

☆......☆......☆

اسے دیکھ کر ورشا کو ساکت تو ہو ہی جانا تھا۔ دروازے پر برکھا کھڑی تھی۔ وہ سرخ ساڑھی باندھے ہوئے تھی اور شعلہ جوالا بنی ہوئی تھی' یہ وہ برکھا نہ تھی جس کا چہرہ کل زرد پڑ چکا تھا اور کمزوری کے مارے اٹھنا محال تھا۔ اس وقت تو وہ بڑی چاق و چوبند تھی۔ چہرے پر بغیر میک اپ کے سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ چہرہ ایک دم فریش تھا۔ بال سلیقے سے بندھے ہوئے تھے اور اس میں چنبیلی کے پھول گندھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر تروتازہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی خوبصورت تو اس نے اپنی ماں کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اگر وہ اسے دیکھ کر ساکت رہ گئی تھی تو حق بجانب تھی۔
برکھا ورشا کو دیکھتے ہی اپنی بانہیں پھیلا کر اس کی طرف بڑھی۔ اس نے ورشا کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور بڑے پیار بھرے لہجے میں بولی۔
''میری جان!''
اس کی بانہوں میں جاتے ہی ورشا کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ کسمسا کر جلدی سے اس سے الگ ہوگئی برکھا سمجھی کہ وہ ناراضگی کے اظہار کے لیے اس سے الگ ہوئی ہے۔ ایسا نہ تھا اصل میں برکھا کے جسم سے شدید بھپکا آیا تھا۔
''میری جان ناراض''
برکھا نے نرم لہجے میں پوچھا۔
''نہیں ممی۔''
اس نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔
''ورشا' دروازے پر تالا میں نے ڈلوایا تھا اور ایسا میں نے تمہاری بھلائی کے لیے کیا تھا۔ آؤ میرے ساتھ آؤ ..... میں نے اپنی بیٹی کے لیے خود ناشتہ بنایا ہے۔''
برکھا نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا
''نہیں ممی کوئی بات نہیں ..... میں جانتی ہوں' آپ جو کرتی ہیں میری بھلائی کے لیے ہی کرتی ہیں۔''
برکھا نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا اور قدرے لہجہ بدل کر بولی۔

"مجھ پر طنز کر رہی ہو۔"

"نہیں ممی، میں بھلا ایسی جسارت کر سکتی ہوں۔"

ورشا نے نظریں جھکا کر کہا۔

"ہاں ورشا کبھی ایسی کوشش بھی نہ کرنا..... برکھا کے لہجے میں تنبیہ آ گئی تھی۔

ورشا نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اچھا آؤ، میرے ساتھ ناشتہ تو کر لو۔ پھر مجھے باہر جانا ہے۔"

یہ کہہ کر برکھا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے ڈرائنگ روم کی طرف لے چلی۔

☆......☆......☆

صادق مرزا نے چلتے چلتے پلٹ کر پوچھا۔

"ارے بھئی روزی سے پوچھو، اس نے آئس کریم یہیں کھانی ہے یا باہر چل کر کھائے گی۔"

صادق مرزا کی بیگم نے پیچھے آتی فیملی پر نظر ڈالی۔ تب اچانک ہی یہ احساس ہوا کہ روزی ان میں نہیں ہے۔ ایک دم ہی کھلبلی مچ گئی۔

"ارے روزی کہاں ہے۔؟"

"ابھی تو یہیں تھی۔"

"کسی نے کہا۔" وہ میرے پیچھے تھی۔"

کسی نے بتایا۔

"وہ اس کے آگے تھی۔"

روزی کے بارے میں سب کا بیان یہی تھا کہ وہ ابھی تو یہیں تھی لیکن روزی کا دور تک پتہ نہیں تھا۔ صادق مرزا اور اس کے نوجوان بیٹے ارباز صادق نے پلے لینڈ کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن روزی کا کوئی سراغ نہ ملا۔

روزی کا اصل نام روزینہ تھا۔ صادق مرزا کے دو ہی بچے تھے ایک ارباز صادق جو روزی سے پانچ چھ سال بڑا تھا اور ایک روزی تھی۔ صادق مرزا کی فیملی کے ساتھ روزی کی خالہ اور اس کی خالہ زاد بہنیں بھی تھیں۔ سب لوگ پریشان تھے۔

صادق مرزا نے پہلے اپنی فیملی کو گھر چھوڑا اور پھر پولیس اسٹیشن جانے لگا تو اس کے بیٹے ارباز صادق نے کہا۔

"ابو، چچا جان سے بات کر لیں۔ انہیں اطلاع دے دیں۔"

ارباز نے نمبر ملا کر موبائل ریسیور صادق مرزا کے ہاتھ میں دے دیا۔ دو گھنٹیاں بجنے کے بعد ادھر سے کسی نے فون اٹھایا اور بھاری لہجے میں کہا۔" ہیلو"

بھائی کی آواز پہچان کر صادق مرزا بہت دھیرے سے بولا۔" ناصر....."

"جی بھائی جان..... کیا حال ہیں؟"

"ناصر خیر نہیں ہے۔"

''ارے کیا ہوا؟''
''ہم لوگ پلے لینڈ گئے تھے۔ وہاں روزی گم ہو گئی''۔ صادق مرزا کی آواز گلوگیر ہو گئی۔
''پلے لینڈ سے وہ کہاں جا سکتی ہے۔ رش میں ادھر ادھر ہو گئی ہو گی۔''
''ہم وہاں سے اس وقت آئے ہیں۔ جب پورا پلے لینڈ خالی ہو چکا تھا۔ روزی کو ہم نے پلے لینڈ کے چپے چپے میں تلاش کیا۔ وہ کہیں نہیں ملی۔''
''اوہ!''
ناصر مرزا نے گہرا سانس لیا۔ اور پھر توقف کر کے بولا۔
''پولیس میں رپورٹ لکھائی''
''نہیں' میں ابھی پولیس اسٹیشن جا رہا تھا کہ میں نے سوچا کہ تم سے بات کر لوں۔''
''اچھا آپ میرا انتظار کریں۔ میں فوراً ہی گھر سے نکل رہا ہوں۔''
یہ کہہ کر ناصر مرزا نے ٹیلی فون رکھ دیا اور گاڑی نکال کر کلفٹن کی طرف چل دیا جہاں صادق مرزا ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔

ناشتے کے بعد برکھا چلی گئی۔ وہ گاڑی میں کہیں گئی تھی اور شام تک آنے کا کہہ گئی تھی۔ ورشا کو سوناں کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ شاید وہ ناشتے سے پہلے ہی چلی گئی تھی۔

ورشا گیٹ بند کر کے پلٹی تو اس کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ برکھا نے رات کو اسے قید کیوں کر دیا تھا۔ سوناں اس کے لیے کیا لیکر آئی تھی اور ان دونوں نے مل کر رات کو کیا کیا تھا۔ آخر ایسی کیا بات ہوئی کہ برکھا کے تن مردہ میں ایک ہی رات میں جان پڑ گئی بلکہ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی توانا اور حسین ہو گئی۔

پہلے وہ برکھا کے بیڈ روم میں گئی۔ بیڈ روم کا اچھی طرح سے جائزہ لیا مگر وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ وہاں سے کوئی سراغ نہیں ملا جس سے رات کے واقعے پر روشنی پڑتی۔ پھر اس نے دوسرے کمروں کا بھی جائزہ لیا مگر وہاں سے بھی کوئی مشکوک چیز برآمد نہ ہوئی۔

اب صرف ایک کمرہ رہ گیا تھا اور وہ تھا عملیات اور پوجا پاٹ والا کمرہ۔ اس کمرے میں ورشا ایک دو مرتبہ سے زیادہ نہیں گئی تھی۔ کمرہ تاریک اور بدبودار تھا۔ کمرے میں کوئی چیز نہ تھی سوائے اس تین فٹ لمبے کپڑے کے ایک پتلے کے۔ یہ پتلا بڑی ہیبت ناک صورت کا تھا۔ اس پتلے کے گلے میں برکھا روز پھولوں کا ہار جو خود وہ اپنے ہاتھ سے بناتی تھی ڈالتی تھی۔ برکھا نے اس کمرے میں داخل ہونے سے منع نہیں کیا تھا لیکن وہ کمرہ اس قدر وحشت ناک تھا کہ اس کمرے میں قدم رکھتے ہی خوف کی ایک لہر اٹھتی تھی۔ ورشا ایک دو مرتبہ کسی ضروری فون کال کے بارے میں بتانے گئی تھی۔ تب اس نے اپنی ممی کو موم بتی روشن کیے اس پتلے کے سامنے آسن جمائے بیٹھے دیکھا تھا اور وہ کمرے میں تھوڑا اندر جا کر اسے ٹیلی فون کے بارے میں بتا کر فوراً ہی باہر آ گئی تھی۔

آج اس نے سوچا کہ وہ اس کمرے کو بھی اندر سے دیکھ لے۔ جب وہ اس کمرے کے دروازے پر پہنچی تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ کمرے کا نہ صرف دروازہ بند تھا بلکہ اس پر تالا بھی پڑا تھا۔

ایسا آج تک نہ ہوا تھا۔ یہ کمرہ عام طور پر کھلا ہی رہتا تھا کیونکہ اس تاریک، بدبودار اور وحشت ناک
کمرے میں برکھا کے سوا کوئی نہ جاتا تھا۔

ورشا نے تالے کو ہلا کر دیکھا۔ تالا بند تھا۔ اس نے برکھا کے بیڈ روم میں جا کر اس کی چابی
تلاش کی لیکن وہ وہاں موجود نہ تھی۔ ویسے بھی اتنے بڑے بنگلے میں ایک تالے کی چابی تلاش کر لینا اتنا
آسان نہ تھا۔

اب ایک چانس اور تھا اور چانس کے لیے اسے گھوم کر بنگلے کی پشت پر جانا پڑا۔ اس کمرے
کی ایک کھڑکی ادھر کھلتی تھی۔ اگرچہ اس بات کی امید نہ تھی کہ وہ کھڑکی ادھر سے کھلی ہو۔

وہ جب اس کمرے کی پشت پر پہنچی تو اسے کھڑکی بند نظر آئی۔ مایوس ہو کر وہ پلٹنے والی تھی کہ
اس نے ایسے ہی اس پر ہاتھ رکھ کر اس کے پٹ کو اندر کی طرف دھکیلا۔ پٹ تھوڑا سا اندر ہو گیا لیکن
کھلا نہیں تب اسے احساس ہوا کہ کھڑکی اندر سے بولٹ نہیں ہے بلکہ اس کا پٹ سختی سے بند ہے۔ اس
نے ایک زور کا دھکا مارا تب پٹ کھل گیا۔

یہ کھڑکی فرش سے دو ڈھائی فٹ اونچی تھی۔ وہ اس کھڑکی کے ذریعے بآسانی اندر جا سکتی
تھی۔ اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ دھکا دے کر کھول دیئے اور چند لمحے انتظار کیا۔ اسے اندر سے کوئی
آہٹ نہ سنائی دی۔ البتہ بدبو کا بھپکا ضرور آیا۔ اس نے اپنی ناک پر دوپٹہ باندھ لیا اور کھڑکی میں
کھڑے ہو کر اندر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر میں جب اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو
اس نے کمرے کے عین درمیان کسی کو لیٹا ہوا پایا۔

تب اس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر پیر رکھا اور اندر کود گئی۔ ورشا نے کھڑکی سے آتی روشنی میں
دیکھا کہ وہ ایک تیرہ چودہ برس کی لڑکی ہے جو بے ہوش ہے اور اس کے جسم پر جگہ جگہ بے شمار زخموں
کے نشان ہیں۔ جیسے اس کے جسم پر کسی تیز دھار کی چیز سے کٹ لگائے گئے ہوں۔ اس لڑکی کے کپڑے
اس کے جسم پر پڑے ہوئے تھے۔ وہ پہنے ہوئے کچھ نہ تھی۔

اس لڑکی کو دیکھ کر اسے رات ہونے والے ڈرامے کے بارے میں کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ
سمجھ گئی تھی کہ خون کے ''سرطان'' میں مبتلا اس کی ممی کو نیا خون کہاں سے دستیاب ہوا تھا۔ نہ جانے یہ
معصوم لڑکی کون ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟ اسے سوناں کہاں سے اٹھا کر لائی ہے۔ یہ ممی نے کیسا وحشت
ناک کھیل رچایا ہے۔ اس کے دل میں اپنی ماں سے نفرت کا جو بیج موجود تھا وہ اب پھوٹنے لگا تھا۔

اس کے باپ پر خون چھینکنے کا وہ منظر بارہا اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ جب بھی وہ
منظر اسے یاد آتا اس کا دل کٹ کر رہ جاتا۔ ایک نفرت سی محسوس ہونے لگتی لیکن یہ نفرت لمحاتی ہوتی۔
جیسے ہی برکھا اس کے سامنے آتی تو وہ سب کچھ بھول جاتی۔ اس کے دل سے ہر نفرت نکل جاتی۔

اس لڑکی کو دیکھ کر نفرت کے سانپ نے پھر سر ابھارا تھا اور وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا
کرے۔ کسی نے گھر کی کال بیل بجائی۔ گھنٹی کی آواز سن کر وہ بے اختیار چونک گئی۔ اس نے اس لڑکی
کو ویسے ہی چھوڑا چوکھٹ پر پاؤں رکھ کر کھڑکی سے باہر کودی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ بند کیے اور تیزی
سے بنگلے کے گیٹ کی طرف بھاگی۔

جب اس نے چھوٹا گیٹ کھول کر سر باہر نکالا تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔
دروازے پر ایک فقیر مسکین صورت بنائے کھڑا تھا' اللہ کے واسطے بی بی کچھ مدد کرو۔"
ورشا نے کوئی جواب دیئے بغیر دروازہ دھاڑ سے بند کر دیا اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

☆......☆......☆

روزی کو غائب ہوئے آج تیسرا روز تھا۔
ان تین دنوں میں پولیس نے اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لی تھی۔ وہ روزی کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی۔ اخبار میں دو دن سے ایک بڑا اشتہار جس میں روزی کی تصویر بھی موجود تھی' تلاش گمشدہ کے عنوان سے شائع ہو رہا تھا لیکن ابھی تک کسی قسم کی اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی۔
پورا گھر' پورا خاندان پریشان تھا' روزی پورے گھر کی لاڈلی تھی۔ ناصر مرزا تو اس پر جان دیتا تھا' وہ اس کی پیاری بھتیجی تھی۔ گھر میں وظیفے وظائف جاری تھے۔ جس کے ذہن میں جو تدبیر آرہی تھی اس پر عمل کیا جا رہا تھا لیکن کہیں سے کوئی کامیابی کی امید نظر نہیں آرہی تھی۔
ناصر مرزا کی بھتیجی گم ہوئی تھی' ساحل عمر اور مسعود آفاقی کا پریشان ہونا فطری تھا۔ وہ تینوں سر جوڑے بیٹھے تھے۔
اپنی اپنی سوچ کے مطابق اظہار خیال کر رہے تھے مگر کسی کی سمجھ میں روزی کے غائب ہونے کی وجہ نہیں آرہی تھی۔ اگر یہ اغوا کا کیس تھا تو ابھی تک تاوان کیوں نہیں مانگا گیا تھا ایک خیال یہ بھی تھا کہ لڑکی ناراض ہو کر نہ کہیں چلی گئی ہو کیونکہ یہ عمر بڑی جذباتی ہوتی ہے لیکن ایسی بات بھی نہ تھی۔ روزی گھر بھر کی لاڈلی تھی ۔ اس کے ناراض ہو کر کہیں چلے جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ لے دے کر بس اب یہی بات رہ گئی تھی کہ کہیں وہ عورت فروشوں کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو' کوئی عورت اسے ورغلا کر نہ لے گئی ہو۔
پھر اچانک ساحل عمر کو خیال آیا۔ اس نے ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر کہا۔
"بھائی' کیا اس سلسلے میں عابد منجم صاحب سے مدد نہیں لی جاسکتی۔"
"لی جاسکتی ہے۔"
ناصر مرزا کے چہرے پر خوشی آگئی۔
"عابد منجم کا خیال ذہن میں آیا ہی نہیں۔"
"ان کے گھر چلیں!"
مسعود آفاقی نے فوراً کہا۔
"وہ اس وقت گھر پر نہیں ہوں گے' وہ رات دس بجے تک دفتر میں ہوتے ہیں۔ دیر تک بیٹھنے کے عادی ہیں۔"
ناصر مرزا نے بتایا۔
"چلو ان کے دفتر چلتے ہیں۔"

"جانے سے پہلے ٹیلی فون پر چیک کرلیں۔"
ساحل عمر نے رائے دی۔
"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"
مسعود آفاقی نے فوراً تائید کی۔
پھر جب یہ تینوں دوست عابد منجم کے دفتر پہنچے تو وہ ان کے منتظر بیٹھے تھے۔ تینوں کو ایک ساتھ دیکھ کر وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے پھر بولے۔
"یہ فنکاروں کا قافلہ کہاں گھوم رہا ہے۔"
"عابد صاحب' یہ دونوں تو واقعی فنکار ہیں۔"
ناصر مرزا نے مسعود کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
"مجھے کہاں آپ نے کانٹوں میں گھسیٹ لیا۔"
"کانٹوں میں نہیں پھولوں میں گھسیٹا ہے۔ آپ کو بھی ہمارے ساتھ فنکار بنا دیا ہے۔"
مسعود آفاقی نے ہنس کر کہا۔
"عابد صاحب' اس وقت ہم ایک گھمبیر مسئلہ لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔"
ساحل عمر اصل موضوع پر آیا۔
"تعویذ تو تم نے گلے میں ڈالا ہوا ہے۔"
عابد منجم فکر مند ہو کر بولے۔
"جی یہ دیکھیے!"
ساحل عمر نے قمیض کے اندر سے نکال کر تعویذ دکھایا۔
"اس وقت میرا مسئلہ نہیں ہے۔
"تو پھر......!"
عابد منجم نے ناصر مرزا کی طرف دیکھا۔
"عابد صاحب' میری بھتیجی کہیں گم ہو گئی ہے۔"
ناصر مرزا نے فوراً اصل بات بتائی۔
"ہیں....."
عابد منجم ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئے۔
"یہ کب ہوا؟"
ناصر مرزا نے پورا واقعہ تفصیل سے ان کے گوش گزار کر دیا اور جو معلومات وہ روزی سے متعلق چاہتے تھے وہ بھی انہیں بتا دیں۔
ساری باتیں سن کر انہوں نے میز پر رکھی' پان کی ڈبیہ اٹھائی۔ بڑی نفاست سے ایک پان نکالا۔ بٹوے سے چھالیہ اور تمباکو وغیرہ نکال کر پان منہ میں رکھ لیا اور پان چباتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں' چند منٹ آنکھیں بند رکھیں۔ پھر بال پوائنٹ اٹھا کر کاغذ پر کچھ اعداد و شمار' زائچے اور نقشے

بنانے لگے۔ زائچے بناتے ہوئے کئی مرتبہ ان کے چہرے کا رنگ بدلا' تیوریوں پر بل پڑے۔ آنکھوں سے فکر جھانکی۔

ساحل عمران کے چہرے کے تاثرات بغور دیکھ رہا تھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ معاملہ گھمبیر ہے۔

پھر عابد منجم نے بال پوائنٹ میز پر رکھ کر اپنے سیدھے ہاتھ کی دراز کھولی اور ایک خوبصورت سی تسبیح نکال کر دہ تسبیح کے دانوں پر کچھ پڑھنے لگے۔ پان انہوں نے ایک کلے میں دبا لیا تھا۔

پھر انہوں نے تسبیح کا ایک چکر مکمل کر کے تسبیح میز پر رکھی۔ ایک سفید اور سادہ کاغذ اٹھایا۔ اس کی چار تہہ کیں۔ اس کاغذ پر تین پھونکیں ماریں اور دائیں ہاتھ پر رکھی ایک کتاب کے درمیان رکھ دیا۔ کتاب پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے کچھ پڑھا اور کاغذ کتاب کے درمیان سے کھینچ لیا۔

کاغذ کھول کر دیکھا۔ کچھ اس طرح دیکھا کہ جیسے اس پر کچھ لکھا پڑھ رہے ہوں۔ پھر انہوں نے کھلا کاغذ میز پر رکھ دیا۔ ساحل عمر نے ذرا اچک کر دیکھا۔ اس پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔

عابد منجم نے جلدی جلدی پان چبایا اور پھر اسے اگلدان میں تھوک کر انتہائی سنجیدگی سے بولے۔

''ناصر میاں' آپ کی بھتیجی اس شہر میں ہے' اسے ایک عورت نے اغواء کیا ہے۔ فی الحال وہ زندہ ہے لیکن اس کی بازیابی کے امکانات .....''

اتنا کہہ کر رک گئے۔ پھر افسردہ لہجے میں کہا۔

''بس میاں' اللہ سے دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ وہی زندگی اور موت کا مالک ہے۔ وہی بچھڑوں کو ملانے والا ہے۔''

''عابد صاحب' میری بھتیجی کے بارے میں مکمل معلومات کیجئے۔ اس سلسلے میں آپ جو کہیں گے آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا۔''

ناصر مرزا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''ناصر میاں' ہر آدمی کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں نے انہی حدود میں رہتے ہوئے جو کچھ بتا سکتا تھا بتا دیا ہے۔ میں پھر کہوں گا کہ اللہ سے لو لگانے کی ضرورت ہے۔ بس دعا کریں کہ اللہ اس بچی پر اپنا رحم کرے۔'' عابد منجم نے کہا۔

''اچھا' ناصر تم کل صبح میرے گھر پر فون کرنا۔ مجھے رات کو وظیفہ پڑھنا پڑے گا۔''

عابد منجم نے پتہ نہیں ایسے ہی ان کی ڈھارس بندھانے کے لیے یہ بات کہہ دی یا واقعی وہ اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتے تھے۔

چلو اتنا تو ہوا کہ روزی کے سلسلے میں بنیادی معلومات دستیاب ہو گئی تھیں۔ یہ بات بھی تسلی بخش تھی کہ وہ جہاں تھی' زندہ تھی۔ رہ گئی بازیابی کی بات تو عابد منجم نے اس سلسلے میں کچھ کہتے کہتے خاموشی اختیار کر لی تھی اور یہ بات تینوں کو ناگوار گزری تھی۔

☆......☆......☆

چھ سات دن ہو گئے تھے۔ ورشا سے نہ فون پر بات ہوئی تھی اور نہ ملاقات ہوئی تھی۔ ورشا عابد منجم کے سامنے اس کے گھر پر آئی تھی۔ عابد منجم نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ یہ ورشا نہیں برکھا ہے۔ ایسا کیسے ممکن تھا کہ ورشا کے جسم میں برکھا گھس جائے۔ یہ سارا کیا گورکھ دھندا تھا' وہ سمجھنے سے قاصر تھا لیکن اتنی بات اس کی سمجھ میں ضرور آ گئی تھی کہ برکھا ایک خطرناک عورت تھی' وہ ماہر ساحرہ تھی۔ اس کے سحر سے بچنا ضروری تھا۔ عابد منجم نے اس کی حفاظت کے لیے جو تعویذ دیا تھا' وہ اس نے گلے میں پہن لیا تھا۔

عابد منجم نے ورشا سے ملاقات کرنے سے بھی منع کیا تھا۔ ابھی تک خود ہی ورشا نے ٹیلی فون پر یا بالمشافہ کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ لہذا اس سے ملاقات سے انکار کی نوبت نہیں آئی تھی۔

ویسے بھی وہ سوچتا تھا کہ اگر انکار کرنے کی نوبت آئی تو کیا وہ انکار کر سکے گا۔ وہ اس سے کہہ سکے گا کہ اب وہ اس سے نہیں ملے گا۔ یہ سن کر کیا وہ خاموشی سے ٹیلی فون بند کر دے گی۔ کیا وہ پلٹ کر پوچھے گی نہیں کہ میرے رانجھن ایسا مجھ سے کیا قصور ہوا کہ ترک تعلق پر اتر آئے۔ تب وہ اسے کیا جواب دے گا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دے گا' اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی' اس کے دل نے کہا' یہ ٹیلی فون ورشا کا ہے۔ اس نے ریسیور اٹھا کر "جی" کہا۔

"ہائے رانجھن۔"

ادھر واقعی ورشا تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"کیا قصور ہوا ہم سے ......"

"کچھ نہیں ....." ساحل عمر نے جواب دیا۔

"پھر اتنے دن ہو گئے' نہ فون کرتے ہو' نہ ملتے ہو۔" اس نے شکایت کی۔

"ورشا ایک بات پوچھ رہا ہوں' دیکھو سچ بتانا۔"

"چھ سات دن پہلے جب تم آئی تھیں تو پھر فوراً واپس کیوں چلی گئی تھیں۔"

"رانجھن' کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں سات دن پہلے تمہارے گھر کب آئی۔ میں تو تمہارے گھر نہیں آئی۔"

ورشا نے بڑے یقین سے کہا۔

"پھر وہ کون تھا۔ تم ہی تو تھیں ..... تم بھول رہی ہو' یاد کرو' تم نے میز پر سے اٹھا کر کیا پیا تھا۔

"رانجھن! تم یہ کیا کہہ رہے ہو میں تمہارے گھر آئی ہی نہیں تو پھر پینے یا نہ پینے کا سوال کیسا۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کیا تم ساری بات مجھے تفصیل سے بتانا پسند کرو گے۔"

"ہاں! کیوں نہیں۔"

ساحل عمر نے یہ کہہ کر اس دن کی پوری روداد اس کے گوش گزار کر دی۔

ساری روداد سن کر وہ بڑی حیرت زدہ ہوئی۔ پھر ایک دم اس پر اداسی چھا گئی۔ چند لمحے

خاموش رہی گہرا سانس لینے کی آواز آئی اور پھر ایک دم مرے ہوئے لہجے میں بولی۔
"مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کیا ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔"
"چلو چھوڑو، اس مسئلے کو بھول جاؤ اور سناؤ"
اس نے موضوع بدلا۔
"بس کیا سناؤں۔"
اس کے لہجے میں الجھن تھی۔
"دماغ ماؤف ہوتا جا رہا ہے۔"
"کیا ہوا؟ وہ چونک کر بولی۔
"بھئی وہ ہمارے ایک دوست ہیں ناصر مرزا..... تین دن سے ان کی بھتیجی غائب ہے۔"
"کتنی بڑی ہے۔ کیسے غائب ہوئی۔"
"ان کے بھائی، اپنی فیملی کے ساتھ کلفٹن کے پلے لینڈ گھومنے گئے تھے۔ بس وہیں سے وہ غائب ہو گئی۔ پولیس ڈھونڈ رہی ہے۔ اخبار میں اشتہار بھی آ رہا ہے لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ تیرہ چودہ سال کی لڑکی ہے اور اکلوتی بچی ہے۔" ساحل عمر نے بتایا۔
"اوہ، بڑا افسوس ہوا یہ سن کر۔" اس نے افسردگی سے کہا۔
"کس اخبار میں اشتہار ہے، میں دیکھوں گی۔ اس میں اس کی تصویر بھی ہو گی۔"
"انگریزی اور اردو کے تمام بڑے اخباروں میں یہ اشتہار موجود ہے۔ تصویر بھی ساتھ ہی ہے۔ بڑی پیاری بچی ہے۔ ورشا دعا کرو کہ وہ بچی مل جائے۔"
وہ بھلا کیا دعا کرتی۔ وہ دعا کرنے کے قابل کہاں رہی تھی۔ ساحل عمر کی باتوں نے اسے خاصا الجھا دیا تھا۔ اس کے گھر میں دو اخبار آتے تھے۔ ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا۔ ورشا کو اخبار پڑھنے کا زیادہ شوق نہ تھا بس وہ سرسری سے انداز میں نظر ڈالتی تھی۔ البتہ برکھا کو اخبار پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اخبارات کو بڑی دلچسپی سے پڑھتی تھی۔ آج کا ایک اخبار اٹھا کر اس نے صفحات الٹے تو وہ اشتہار اسے فوراً ہی نظر آ گیا۔ اس نے تصویر کو غور سے دیکھا تو اس کو کرنٹ سا لگا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو شاید اس وقت بھی برکھا کے کمرے میں موجود ہو۔ دو دن پہلے تو وہ یقیناً وہاں موجود تھی، اس نے خود اپنی آنکھوں سے اسے کمرے کے فرش پر بے ہوش پڑے دیکھا تھا۔
ابھی وہ اشتہار غور سے دیکھ ہی رہی تھی کہ برکھا اس کے کمرے میں دبے پاؤں آ گئی۔ اس نے جھک کر دیکھا کہ ورشا کیا پڑھ رہی ہے۔
"ممی ..... تم نے یہ اشتہار دیکھا۔" اس کی موجودگی محسوس کر کے ورشا نے گردن اٹھا کر پوچھا۔
"ہاں دیکھا ہے کوئی خاص بات ..... اس شہر میں روز ہی لڑکیاں ادھر ادھر ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو شہر میں ہلچل کس طرح پیدا ہو۔" برکھا نے بے نیازی سے کہا۔
"ممی جانتی ہو، یہ لڑکی کس کی بھتیجی ہے۔"

"نہیں۔" برکھا ذرا چوکنا ہوئی۔

"ساحل عمر کے ایک دوست ہیں ناصر مرزا' یہ ان کی بھتیجی ہے۔"

"اچھا! تو یہ اس شکاری کی بھتیجی ہے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا' ایک تیر سے دو شکار ہو گئے۔"
بے خیالی میں بولی۔

"ممی کیا مطلب؟" ورشا کچھ نہ سمجھ پائی۔

"کچھ نہیں۔" برکھا ٹال گئی۔

"ممی' کیا آپ بتا سکتی ہیں' اس لڑکی کو کس نے اغوا کیا ہے۔"

"ہاں' بتا سکتی ہوں ' یہ بتانا میرے لیے کچھ مشکل نہیں لیکن تم اس لڑکی میں اتنی دلچسپی
کیوں لے رہی ہو۔"

"بس ویسے ہی ممی۔

"اس میں یہ بتانے کی ہمت نہ تھی کہ اس نے اس لڑکی کو عملیات کے کمرے میں دیکھا
ہے۔

"یہ لڑکی کل جھاڑیوں سے برآمد ہو جائے گی۔" برکھا نے پیشگوئی کی۔

"مر گئی۔" ورشا ایک دم چونک اٹھی۔

"ظاہر ہے' جب اس کے جسم میں ایک قطرہ خون کا نہیں رہے گا تو وہ مرے گی نہیں تو زندہ
رہے گی۔" برکھا نے ورشا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی لاپروائی سے کہا۔

"ممی کس نے مارا ہے اس کو۔" ورشا نے پوچھا۔

"جس نے بھی مارا ہے ٹھیک مارا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ یہ ناصر کی بھتیجی تھی۔ اب
اسے پتہ چلے گا۔ کیا تم جانتی ہو کہ تھکال کو میرے ہاتھوں سے نکالنے والا یہی شخص ہے۔ اس نے اسے
آزاد کر دیا' مجھے مزید مشکل میں ڈال دیا۔ آہ' یہ کتنی اچھی بات ہوئی کہ یہ اس کی بھتیجی ہے' میں بہت
خوش ہوں۔ تم نے مجھے بہت اچھی خبر سنائی۔ بولو کیا مانگتی ہو۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"کچھ نہیں ممی' مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ تم ہو نا میرے پاس۔" ورشا نے خوشامدانہ لہجے میں
کہا۔

"ورشا' اب تمہیں میرے ساتھ بیٹھ کر کام سیکھنا ہو گا۔ مجھے تمہاری سخت ضرورت ہے۔ میں
اکیلی کچھ نہ کر سکوں گی۔ تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔ میں تمہیں ہر وہ عمل سکھا دوں گی جو میں جانتی
ہوں۔ پھر میں تمہیں سالانہ اجتماع میں پیش کروں گی۔ اگور کا باپ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو گا اور فوراً
تمہیں اپنی داسی بنا لے گا۔"

"ٹھیک ہے ممی' جیسی آپ کی مرضی۔" ورشا نے انتہائی فرمانبرداری سے کہا۔

ورشا کی تمام سوچیں برکھا کے سامنے آتے ہی دم توڑ دیتی تھیں۔ برکھا سے نظر ملتے ہی وہ
اپنا آپ بھول جاتی تھی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگتا کہ ممی جو کچھ کہہ رہی ہیں' ٹھیک کہہ رہی ہیں۔
برکھا کی "پیشگوئی" کے مطابق روزی کی لاش دوسرے دن ایک ویران علاقے کی جھاڑیوں

سے برآمد ہوگئی۔ برکھا تو خیر سب جانتی تھی۔ یہ سب کیا دھرا ہی اس کا تھا۔ البتہ عابد منجم نے جو کہا تھا، وہ سچ ثابت ہوا۔ اگرچہ عابد منجم نے جو کہا تھا، وہ بہت مبہم تھا لیکن اس ابہام میں بھی بہت کچھ واضح تھا۔

برکھا نے روزی کی لاش واسم کے ذریعے جھاڑیوں میں پھنکوائی تھی اور پھر اسی نے ٹیلی فون کر کے متعلقہ تھانے میں روزی کی لاش کی اطلاع دی۔ ممکن تھا کہ روزی کی لاش کو بازیاب ہونے میں پانچ سات دن لگ جاتے لیکن برکھا چاہتی تھی کہ لاش جلد از جلد برآمد ہو جائے تا کہ لواحقین لاش پا کر رو دھو کر سکون سے بیٹھ جائیں۔ لاش نہ ملنے کی صورت میں برکھا کو خطرہ تھا کہ روزی کے متعلقین عاملوں کے ذریعے اس تک نہ پہنچ جائیں۔ سب سے زیادہ خطرہ تو اسے عابد منجم سے تھا۔ وہ اس دن اس کی ایک جھلک دیکھ کر ہی اندازہ لگا چکی تھی کہ بندہ واقف کار ہے۔ کام کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔

لاش برآمد ہوئی تو اس گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی جس گھر کی وہ بیٹی تھی اس کی موت کا ماں باپ کو جتنا دکھ ہوتا کم تھا لیکن وہ تو خاندان بھر کی لاڈلی تھی۔ سب سے زیادہ چہیتی تو وہ ناصر مرزا کی تھی۔ اس کی لاش دیکھ کر وہ چند لمحوں کو ساکت رہ گیا۔ دل سے درد کی ایک لہر اٹھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اسے کسی تیز دھار آلے سے بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ زخموں کے نشان تھے۔ جسم سے بے پناہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی۔

ناصر مرزا کا بس چلتا اور اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ کس درندے نے اس کی بھتیجی کی یہ حالت بنائی ہے تو وہ اس سے کہیں زیادہ اذیت دے کر اسے مار ڈالتا۔ اپنی معصوم بھتیجی کی لاش دیکھ کر اس کا خون کھول کر رہ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں طے کیا کہ وہ قاتل کا ہر ممکن طریقے سے پتہ لگانے کی کوشش کرے گا۔

پولیس سے تو کسی قسم کی امید رکھنا فضول ہی تھا۔ اگر کوئی شخص روزی کی لاش سے متعلق فون نہ کرتا تو پولیس تو اس کی لاش بھی برآمد نہ کر سکتی تھی۔ قاتل کا پتہ لگانا تو بہت دور کی بات ہے۔ ناصر مرزا کا ذہن بار بار عابد منجم کی طرف جاتا تھا ممکن ہے وہ اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکے۔ ویسے اس سے زیادہ امید وابستہ نہیں کی جاسکتی تھی کیونکہ وہ روزی کی گمشدگی کے بارے میں بھی زیادہ واضح جواب نہ دے سکا تھا۔ پھر بھی اس نے سوچا تھا کہ وہ ایک مرتبہ اس سلسلے میں عابد منجم سے بات ضرور کرے گا۔

روزی کی لاش ابھی گھر پر موجود تھی۔ مگر ناصر مرزا کے غصے اور بے قراری کا یہ عالم تھا کہ وہ روزی کی تجہیز و تکفین کا بھی انتظار نہ کر سکا۔ اس نے اسی وقت عابد منجم کو فون کیا۔

اس کا فون کرنا بہتر ہی ثابت ہوا، کیونکہ عابد منجم نے ساری بات سن کر جس چیز کی فرمائش کی اگر روزی کی تدفین ہو جاتی تو اس چیز کا مہیا کرنا ناممکن ہو جاتا۔

اس وقت روزی کو غسل دیا جا رہا تھا۔ ناصر مرزا نے اپنی بھابی کو بلا کر روزی کا ایک بال لانے کی ہدایت کی۔ بھابی نے اپنی بیٹی کا ایک بال ناصر مرزا کے حوالے کر دیا۔ ناصر مرزا نے اس بال کو ایک کاغذ میں لپیٹ کر بہت احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اب یہی بال عابد منجم کے سامنے رکھا

ہوا تھا۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ گھر کے تمام لوگ سو چکے تھے مگر وہ اپنے کمرے میں بیٹھے وظیفے میں معروف تھے۔ اڑھائی بجے تک وہ وظیفے میں معروف رہے۔

وظیفے سے فارغ ہو کر انہوں نے روزی کے بال کو اپنے بائیں ہاتھ کی چٹکی میں اٹھایا اور دائیں ہاتھ سے لائٹر جلا کر بال کو آگ دکھا دی۔

بال نے فوراً آگ پکڑ لی۔ وہ آناً فاناً جل گیا۔ بال جلتے ہی عابد منجم کی سماعت میں ایک نام گونجا اس نام کو تین بار بہت صاف لہجے میں دہرایا گیا۔ برکھا...... برکھا...... برکھا......"

اس نام کو سن کر عابد منجم حیرت زدہ رہ گئے' "روزی کی قاتل اور برکھا۔" انہوں نے حیران ہو کر خود کلامی کی۔ اپنے وظیفے کی کامیابی پر وہ بہت خوش تھے اگرچہ انہیں امید نہ تھی کہ وہ قاتل کا نام پتہ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اوپر والے کی مہربانی سے وہ کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اس بات کی اطلاع فوری طور پر ناصر مرزا کو دے دی جائے۔

اگرچہ یہ فون کرنے کا وقت نہ تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ ادھر سے ناصر مرزا ضرور فون اٹھالے گا' لیکن وہ اپنی کامیابی پر خوش اس قدر تھے کہ اس راز کو فوراً اصل بندے تک منتقل کر دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ فون پر ٹرائی کر کے دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔

ابھی فون کی دوسری گھنٹی بھی پورے طور پر بج نہ پائی تھی کہ ناصر مرزا نے فون اٹھالیا۔ وہ اس وقت جاگ رہا تھا اور اپنے اسٹڈی روم میں تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں وظائف کی ایک بہت پرانی کتاب تھی۔ یہ اس کے دادا کے زمانے کی تھی۔ وہ اس کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اگر عابد منجم اس سلسلے میں کچھ نہ کر پایا تو وہ خود کوشش کر کے دیکھے گا۔

"ہیلو......!" ناصر مرزا گھمبیر آواز میں بولا۔

"ناصر میاں' میاں عابد بول رہا ہوں' عابد منجم"

"جی' عابد صاحب' آپ نے اس وقت فون کیا ہے تو یقیناً آپ کو اس سلسلے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔" ناصر مرزا نے بے قراری سے کہا۔

"ہاں' میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ تم قاتل کا نام سنو گے تو اچھل پڑو گے۔"

"ہیں ..... کیا میں اسے جانتا ہوں۔"

"نہ صرف جانتے ہو بلکہ اسے دیکھ بھی چکے ہو۔"

"فوراً آپ اس کا نام بتایئے ..... میں اس کا خون پی جاؤں گا۔"

"ویسے وہ ہے بھی اس قابل کہ اس کا خون پی لیا جائے۔" عابد منجم جذباتی ہو کر بولے۔" روزی کو قتل کرنے والی کا نام ہے برکھا......"

"برکھا......!" اس نام کو سن کر وہ واقعی حیرت سے اچھل پڑا۔

"یہ عورت آخر چاہتی کیا ہے۔ یہ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

"ناصر میاں! وہ عورت بہت خطرناک ہے۔ کوئی جذباتی قدم نہ اٹھالینا۔ اس کا حساب

کتاب بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہو گا۔ کل تم میرے دفتر آجاؤ' وہاں اطمینان سے بیٹھ کر اس بارے میں کوئی لائحہ عمل طے کریں گے ٹھیک ہے۔''

''جی ٹھیک ہے' میں کل آپ کے دفتر آجاؤں گا۔''

برکھا نے آج واسم کو صبح ہی طلب کرلیا تھا۔ وہ کافی دیر سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا اور برکھا اپنے کمرہ خاص میں براجمان تھی۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب وہ اپنے کمرۂ خاص سے برآمد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک موتیے کا تروتازہ ہار اور مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ وہ ان دونوں چیزوں کولیکر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو واسم برکھا کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو واسم۔'' برکھا نے اپنی تیز چمکیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''جی برکھا دیوی'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

برکھا نے دونوں چیزیں اس کے حوالے کر کے اچھی طرح سمجھا دیا کہ کیا کرنا اور کیسے کرنا ہے۔

واسم نے وہ ہار بہت احتیاط سے کاغذ میں لپیٹ لیا۔ پھر دونوں چیزیں لیکر برکھا کے بنگلے سے نکل آیا۔ اس نے اپنی گاڑی کا رخ ''جائے واردات'' کی طرف موڑ دیا۔

مطلوبہ جگہ پہنچ کر اس نے گاڑی بلڈنگ کے نیچے پارک کی اور وہ دونوں چیزیں اٹھا کر اس بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اس بلڈنگ کے دوسرے فلور پر عابد منجم کا دفتر تھا۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بجے تھے اور وہ ابھی ابھی دفتر آئے تھے۔ دفتر کا ملازم شوکت کرسی ڈالے کمرے کے باہر بیٹھا تھا۔

واسم نے ایک نظر شوکت پر ڈالی اور کمرہ کھلا دیکھ کر وہ سیدھا کمرے میں داخل ہو گیا۔

عابد منجم نے ایک عجیب سے شخص کو اپنے دفتر میں بلا تکلف داخل ہوتے دیکھ کر ذرا ناگواری سے پوچھا۔ ''جی فرمایئے!''

واسم نے کوئی جواب دیئے بغیر مٹھائی کا ڈبہ میز پر رکھا اور کاغذ میں لپٹا ہوا ہار کھولنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ زہریلی ہوتی جارہی تھی۔

☆......☆......☆

"یہ کیا ہے؟" عابد منجم نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"سر آپ کی پیشگوئی سچ ثابت ہو گئی۔ سر آپ کو یاد نہیں ہو گا میں نے چھ ماہ پہلے آپ سے اپنی شادی کے بارے میں پوچھا تھا۔ آپ نے اس کا جواب اپنے رسالے میں دیا تھا۔ میری شادی کے بارے میں آپ نے جو پیشگوئی کی وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہو گئی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری شادی زبیدہ سے ہو جائے گی دشمن چچا کی بیٹی سے .... لیکن آپ کا کہنا سچ ثابت ہوا۔ اسی خوشی میں میں یہ تھوڑی سی مٹھائی اور پھولوں کا ہار لایا ہوں۔ سر' اگر آپ اجازت دیں تو میں خود آپ کو یہ ہار پہنا دوں۔ سر یقین کریں' میری خوشی اس طرح دوبالا ہو جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ میز کی بائیں جانب سے عابد منجم کی طرف بڑھا اور ابھی وہ جواب بھی نہ دے پائے تھے کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر ان کے گلے میں ہار ڈال دیا۔

"مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے کس پرچے میں آپ کے سوال کا جواب دیا تھا۔ چلیں آپ کی شادی ہو گئی۔ آپ کو مبارک ہو۔ آپ نے بلاوجہ تکلف کیا۔"

عابد منجم نے اپنے گلے میں پڑے ہوئے ہار کی طرف ہاتھ بڑھایا اتارنے کے لیے۔

"سر! ابھی مت اتاریئے گا۔ ذرا یہ تھوڑی سی مٹھائی اور چکھ لیں۔"

یہ کہہ کر واسم گفٹ پیپر میں پیک ہوا ڈبہ کھولنے لگا۔ ڈبہ کھولتے ہوئے وہ بار بار ہار کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ ہار موتیے کی کلیوں کا تھا۔ ان کلیوں کے منہ سے اچانک خون کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔ پورا ہار آناً فاناً سرخ ہو گیا تھا۔ واسم نے جب دیکھا کہ ہار پورا خون سے سرخ ہو چکا ہے تو ڈبہ عابد منجم کے بالکل قریب کر کے اسے کھول دیا اور کہا۔

"لیجیے سر' کھائیے مٹھائی۔"

عابد منجم نے کھلے ڈبے پر نظر کی۔ جو چیز برق رفتاری سے اس ڈبے سے برآمد ہو رہی تھی' اسے دیکھ کر عابد منجم کے ہوش اڑ گئے۔ اب انہیں اندازہ ہوا کہ برکھا نے ان کے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے' لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔

ڈبہ کھلتے ہی دس بارہ بچھو تیزی سے نکل کر عابد منجم پر چڑھ گئے اور ان بارہ بچھوؤں نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنا زہر عابد منجم کے جسم میں اتار دیا۔ یہ انتہائی زہریلے بچھو تھے۔

زہر اس قدر تیزی سے چڑھا کہ وہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔
واسم کو جب یقین ہو گیا کہ عابد منجم کا کام تمام ہو گیا ہے تو وہ بڑے اطمینان سے کمرے سے باہر نکل آیا اور باہر بیٹھے شوکت سے بولا۔
"اے سنو، دیکھو آدھے گھنٹے تک کوئی اندر نہ جائے، صاحب نے منع کیا ہے۔ وہ کوئی ضروری کام کر رہے ہیں۔"
"جی اچھا صاحب!"
شوکت نے فرمانبرداری سے گردن ہلائی اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔
واسم تیزی سے زینے کی طرف بڑھا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگا۔ اسی وقت ناصر مرزا اوپر آرہا تھا۔ دونوں کا ٹکراؤ سیڑھیوں پر ہوا، دونوں نے ایک دوسرے کو گہری نظروں سے دیکھا اور پھر دونوں اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے۔
جب ناصر مرزا، عابد منجم کے دفتر کے نزدیک پہنچا تو اس نے شوکت کو حسب معمول کرسی پر بیٹھا پایا۔ وہ ایک سیدھا سادہ ملازم تھا، اپنے کام سے کام رکھنے والا، ناصر مرزا سے وہ اچھی طرح واقف تھا، اسے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔
"کیوں بھئی شوکت کیسے ہو؟"
ناصر مرزا نے پوچھا۔
"صاحب جی! میں ٹھیک ہوں ..... صاحب اندر ہیں، کچھ کام کر رہے ہیں۔"
شوکت نے بتایا مگر اسے یہ کہنے کی جرات نہ ہوئی کہ آپ اندر مت جائیے۔
"اچھا میں دیکھتا ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ دفتر میں داخل ہو گیا۔
ابھی ناصر مرزا نے سلام کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ عابد منجم کی حالت دیکھ کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ سفید شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ گلے میں ہار تھا جو سرخی مائل تھا۔ شیروانی پر جگہ جگہ خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں اور میز پر ایک ڈبہ رکھا تھا جو بالکل خالی تھا۔
"شوکت"
ناصر مرزا نے گھبرا کر آواز دی۔
شوکت دوڑا ہوا اندر آیا۔ ناصر مرزا نے ہاتھ کے اشارے سے عابد منجم کی طرف اشارہ کیا۔
"یہ!"
"ارے، میرے صاحب کو کیا ہوا؟"
وہ جلدی سے عابد منجم کی طرف بڑھا۔
ناصر مرزا نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور پوچھا۔
"یہ کیسے ہوا؟"

"صاحب! خدا کی قسم مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک صاحب آئے تھے اور وہ سیدھے اندر آگئے تھے۔ کچھ دیر اندر رہے اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ صاحب اندر کام میں معروف ہیں اندر کوئی نہ جائے۔"

"لیکن تم نے تو مجھے اندر آنے سے نہیں روکا۔"

"صاحب! میں آپ کو اندر آنے سے کیسے روک سکتا تھا' کیا میں آپ سے واقف نہیں ہوں۔"

"جو صاحب اندر آئے تھے' وہ کیسے تھے۔"

ناصر مرزا نے پوچھا۔

"صاحب وہ کچھ عجیب سے تھے' مجھے تو ان کی صورت دیکھ کر ہی ڈر لگا۔ ابھی وہ کمرے سے نکل کر گئے ہیں۔ آپ کو وہ ضرور زینے میں ملے ہوں گے۔"

تب ناصر مرزا کو وہ تیزی سے اترتا ہوا شخص یاد آیا۔ وہ واقعی خبیث صورت شخص تھا لیکن وہ تھا کون؟ اور وہ یہ سب کیا کر گیا تھا۔

عابد منجم کی پراسرار موت نے شہر میں ہلچل مچا دی۔ وہ اس شہر کی جانی مانی شخصیت تھے۔ ان کے بڑے لوگوں سے تعلقات تھے۔ لوگ ان کے پاس اپنے مسائل لیکر آتے رہتے تھے۔ وہ اپنے فن کو لوگوں کو لوٹنے کھسوٹنے کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ ایک مثبت آدمی تھے۔ دولت کا لالچ ذرہ بھر بھی نہ تھا۔

پولیس نے اس کیس میں خاصی سرگرمی دکھائی لیکن تفتیش آگے نہ بڑھ سکی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ ظاہر ہوا کہ عابد منجم کی موت ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے ہوئی جبکہ ناصر مرزا نے ایف آئی آر میں واضح طور پر یہ درج کروایا کہ عابد منجم کو قتل کیا گیا ہے۔

پولیس نے اس بات کو محض ایک مفروضہ قرار دیا۔ جس صورت حال میں عابد منجم کی موت واقع ہوئی' وہ صورت حال یقیناً پراسرار تھی۔ گلے کا ہار اور شیروانی پر پڑے خون کے دھبے کسی انوکھی بات کے مظہر ضرور تھے لیکن وہ آلہء قتل نہ تھے۔ آلہء قتل تو اس صورت میں تلاش کیا جاتا جب ان کی موت کا سبب حرکت قلب بند ہو جانا نہ ہوتا۔

ناصر مرزا کو عابد منجم کی موت کا بے حد صدمہ ہوا۔ اسے اس بات کا پکا یقین تھا کہ اس واردات میں برکھا کا ہاتھ ہے لیکن یہ ایسی بات تھی جسے سرعام نہیں کہا جاسکتا تھا۔ عابد منجم جاتے جاتے اس کی بھتیجی کی قاتلہ کی نشاندہی کر گئے تھے۔ وہ ان سے مل کر روزی کی موت کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ منصوبہ بندی کرنے آیا تھا لیکن برکھا نے عابد کو اپنے بارے میں انکشاف کرنے کی فوری طور پر سزا دے دی تھی۔

ناصر مرزا اب اس میدان میں تنہا رہ گیا تھا' لیکن وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہ تھا۔ اپنا شکار ڈھونڈ کر مارنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔

دن کا وقت تھا اس وقت گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ ساحل عمر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا

چائے پی رہا تھا اور ایک میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ یہ ایک خاص وقت تھا۔ اگرچہ اب یہ وقت خاص نہ رہا تھا۔ ورشا اب کسی وقت بھی بات کر لیا کرتی تھی۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ ورشا کا فون نہ ہو۔ اماں کچن میں مصروف تھیں۔ مرجینا گھر کی جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا' وہ خود ہی ٹیلی فون اٹینڈ کر لے۔

اپنے بیڈ روم میں جا کر اس نے ریسیور اٹھایا اور اپنے مخصوص انداز میں "جی" کہا۔

"ہائے رانجھن!"

ورشا کی کھنک دار ہنسی سنائی دی۔ یہ وہ ہنسی تھی جو اس کی سماعت میں رس گھول دیتی تھی۔

"ہاں ورشا کیسی ہو؟"

ساحل عمر نے پوچھا۔

"میں مروں یا جیوں' تمہیں کیا؟"

اس نے شکوہ کیا۔

"کیا ہوا؟"

"مجھے دوست کہتے ہو لیکن سمجھتے نہیں' اسی لیے دوستوں کا سا سلوک نہیں کرتے۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"خیر ایسا تو نہیں۔"

"ایسا ہی ہے' میرے رانجھن ایسا ہی ہے۔ تم ایک بے مروت شخص ہو یا شاید اب تم مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔"

ورشا نے صاف گوئی سے کام لیا۔

یہ بات ٹھیک تھی کہ ساحل عمر اب واقعی اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ جب سے عابد منجم کی موت ہوئی تھی اور اس موت میں برکھا کا ہاتھ نظر آ رہا تھا' تب سے وہ اور محتاط ہو جانا چاہتا تھا لیکن عملاً وہ ایسا کر نہیں سکا تھا جب ورشا کا فون آ جاتا تو وہ اس کی آواز سن کر یہ بھول جاتا کہ یہ وہ لڑکی ہے جس سے آئندہ نہیں ملنا۔ ملنے سے انکار تو دور کی بات ہے وہ نہ ملنے کا کوئی بہانہ بھی نہیں بنا پاتا تھا۔ اس کا فون آنے پر وہ کسی سدھے ہوئے شیر کی طرح اس کے قدموں میں جا بیٹھتا۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ باوجود انکار کی خواہش رکھنے کے وہ یہ نہ کہہ سکا کہ ہاں' اب میں تم سے ملنا نہیں چاہتا بلکہ اس نے کہا۔

"بھلا' ایسا ہو سکتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں' تم کبھی مجھ سے ملنے سے انکار نہیں کر سکتے۔"

وہ بڑے اعتماد سے بولی' اس کے لہجے سے خوشی جھلک رہی تھی۔

"ایسا کیوں؟"

ساحل عمر نے سادگی سے پوچھا۔

"ایسا' اس لیے میرے رانجھن کہ میں تمہارے اندر گھسی ہوں' تمہارے دل میں ...... میں

تمہارے خون میں گردش کرتی ہوں۔"

وہ شرارت آمیز انداز میں ہنسی۔

"یہ بات تو شیطان کے بارے میں سنی ہے کہ وہ انسان کے خون میں گردش کرتا ہے۔"

ساحل عمر نے کہا۔

"چلو شیطان سمجھ لو مجھے ...... تم جانتے ہو کہ میں شیطان کو کس قدر پسند کرتی ہوں۔"

"کہیں میرے اندر بھی تو تمہیں کوئی شیطان نظر نہیں آتا۔"

"تم تو بڑے شیطان ہو۔"

اس نے یہ بات بڑے پیار بھرے لہجے میں کی اور زور سے ہنس پڑی۔ پھر چند لمحے توقف کر کے بولی۔

"اچھا' ہاں کہیں باتوں باتوں میں میں اصل بات نہ بھول جاؤں۔"

"اصل بات .... وہ کیا؟"

"تمہیں آج ممی نے بلایا ہے۔"

"چائے پر۔"

اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں یونہی سمجھو۔"

ورشا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آؤ گے ناں۔"

"تمہاری ممی سے میں آج تک نہیں ملا' پتہ نہیں ان سے ملتے ہوئے دل کیوں ڈر رہا ہے۔"

"میری ممی بہت پیاری ہیں۔ آج تم ان سے ملو گے تو سارا ڈر دور ہو جائے گا۔ پھر انہی کا کلمہ پڑھنے لگو گے۔" وہ ہنس کر بولی۔

"اچھا!" ساحل عمر نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ممی آج ساڑھے چار بجے تمہارا انتظار کریں گی۔ آؤ گے ناں۔"

"میں نے تمہارا گھر نہیں دیکھا۔"

ساحل عمر نے بتایا۔

"میں تمہیں خود لینے آؤں گی۔"

اس نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔"

وہ راضی ہو گیا۔

پھر وہ پروگرام کے مطابق وقت مقررہ پر اسے لینے آ گئی۔ ساحل عمر نے خود جا کر گھر کے گیٹ پر اس کا استقبال کیا۔ آج وہ جینز اور شرٹ میں تھی۔ جینز اور شرٹ میں ساحل عمر نے اسے پہلی

وہ بے حد اسمارٹ لگ رہی تھی۔ وہ جس طرح کا چاہے کپڑا پہن لیتی۔ اس پر لباس مکمل بار دیکھا تھا۔

اس کو دیکھتے ہی ورشا نے بے تکلفی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ الگتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ورشا نے بے تکلفی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"ہائے راجھن!"

"ہائے ورشا!"

ساحل عمر نے اس کا نرم ملائم ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"آؤ!"

گھر میں آکر اس نے اماں سے سلام دعا کی اور پھر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی جبکہ ساحل عمر کا خیال تھا کہ وہ بیڈ روم میں جاکر بیٹھے گی۔ ساحل عمر کا خیال ٹھیک تھا' وہ واقعی بیڈ روم میں جاکر دم لیتی لیکن وہاں رشا ملوک کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس تصویر سے وہ الرجک تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر اس کے دل میں آگ سلگ اٹھتی تھی۔

ٹی وی لاؤنج کے ایک صوفے میں دھنس کر اس نے ساحل عمر کی طرف ایک خاص انداز سے دیکھا پھر تھوڑا سا مسکرائی جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے ساحل عمر نے اپنی بھنویں اچکا کر پوچھا۔

"جی فرمایئے! کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔"

"کوئی تصویروں کی البم نہیں ہے' تمہارے پاس۔"

"بے شمار البم ہیں ...... لیکن تم کیا دیکھنا چاہ رہی ہو۔"

"سچ بتا دوں۔"

ورشا نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں' ضرور سچ بولنے میں کیا حرج کیا۔"

وہ مسکرا کر بولا۔

"مجھے تمہاری ایک تصویر چاہیے۔"

وہ ذرا جھجکتی ہوئی بولی۔

"میری تصویر لیکر کیا کرو گی' میری تصویر مجھ سے اچھی تو نہیں۔" وہ ہنسا۔

"ٹھیک کہا تم نے ..... تمہاری تصویر واقعی تم سے اچھی نہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم ہر وقت تو میرے پاس نہیں ہوتے۔ پھر میں کیا کروں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ہر وقت میرے پاس رہو۔ تم تصویر کی صورت میں ہی میرے پاس ہو سکتے ہو۔ تمہاری تصویر میرے پاس ہو گی تو جب دل چاہے گا۔ اسے میز کی دراز سے نکال کر دیکھ لوں گی۔ تم سے وہ باتیں کرلوں گی جو میں تم سے کہہ نہیں پاتی۔"

اس نے خلاف معمول نظریں جھکا کر کہا۔

"پھر تو میں تمہیں اپنی تصویر نہیں دوں گا۔"

ساحل عمر نے انکار کیا۔

"کیوں آخر؟"
وہ چونک کر بولی۔
"پھر میں وہ باتیں کیسے سنوں گا جو تم میری تصویر سے کرو گی، تمہارے پاس میری تصویر نہ ہوگی تو مجبور ہو کر ایک نہ ایک دن تم وہ باتیں مجھ سے کرنے لگو گی۔
"ہرگز نہیں۔"
ورشا نے بڑے یقین سے کہا۔
"تم چاہے، مجھے اپنی تصویر دو یا نہ دو۔ وہ باتیں میں تم سے ہرگز نہیں کرسکتی۔ وہ خاص پرائیویٹ باتیں میں تم سے ہرگز نہیں کرسکتی۔ وہ خاص پرائیویٹ باتیں ہیں جو تمہاری تصویر سے کی جاسکتی ہیں، تم سے نہیں۔"
ورشا نے یہ کہہ کر کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ ساحل عمر کو اپنی آنکھیں جھکاتے ہی بنی۔
"اچھا، پھر میں تمہیں البم دکھانے کے بجائے اپنی لے ٹیسٹ اتری ہوئی تصویریں دکھائے دیتا ہوں ان میں سے کوئی پسند کرلینا۔"
ساحل عمر اٹھتے ہوئے بولا۔
"بالکل ٹھیک! ورشا ایک دم خوش ہوکر بولی۔
"یوں تو میرا جی چاہ رہا تھا کہ تمہاری ساری البمیں دیکھوں لیکن اس وقت جلدی ہے۔ ممی گھر پر انتظار کر رہی ہوں گی۔ پھر کسی دن آکر ساری تصویریں دیکھوں گی۔"
ساحل عمر نے چار پانچ نئی اتری ہوئی تصویروں کا لفافہ لاکر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ تصویریں دو ماہ پہلے مسعود آفاقی نے بنائی تھیں۔
یہ ساری تصویریں دس بارہ سائز میں تھیں۔ ورشا نے جو تصویر پسند کی وہ فرنٹ سائیڈ کلوز اپ تھا۔ وہ اس تصویر کو بہت غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"یہ تصویر لے لوں۔"
"لے لو۔"
ساحل عمر نے باقی تصویریں لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔
"اچھا بس، پھر چلو، ممی انتظار کر رہی ہوں گی۔"
وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ تصویر اس نے اپنے بیگ میں حفاظت سے رکھ لی تھی۔
"کچھ چائے وائے نہیں پیو گی؟"
ساحل عمر نے پوچھا۔
"چائے تو وہاں پییں گے۔"
ورشا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔
"آج میری ممی نے تمہیں چائے پر بلایا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں ہنس دی۔
"چلو پھر!"
ساحل عمر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔
وہ ٹھیک ساڑھے چار بجے بنگلے پر پہنچ گئے۔ گیٹ پر پہنچ کر ورشا نے ایک مخصوص انداز میں ہارن دیا۔ تھوڑی دیر بعد جس عورت نے گیٹ کھولا' وہ برکھا نہ تھی۔ وہ سوناں تھی۔
سوناں نے ان دونوں کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ ساحل عمر نے سوالیہ نگاہوں سے ورشا کی طرف دیکھا۔
"یہ سوناں ہے۔ میری ممی کی خادمہ خاص ہے۔"
ورشا نے اس کی نگاہوں کا سوال سمجھ کر جواب دیا۔
"واقعی خاص ہے۔"
ساحل عمر نے تعریف کی۔
"تم نے اسے کس نظر سے دیکھا۔"
ورشا نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔
"اپنی نظر سے۔"
اس نے ایک معنی خیز جواب دیا۔
"ہو سکے تو آئندہ اپنی نظروں کو نیچی رکھنا' میں کسی کی تعریف برداشت نہیں کر سکوں گی۔"
ورشا نے گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔
"آدمی کو اس قدر جیلس نہیں ہونا چاہئے۔"
ساحل عمر گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔
"تم جانتی ہو کہ میں آرٹسٹ آدمی ہوں۔ کسی بھی اچھی چیز کو دیکھ کر اس کے لیے اچھے الفاظ خود بخود زبان پر آجاتے ہیں۔"
"میرے رانجھن' زبان پر قابو پانا سیکھئے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ میرے لیے ہو۔"
وہ ایک ادائے خاص سے بولی۔
"اگر ایسا نہ ہوا تو سزا دوں گی"
"پھر تو شاید ساری زندگی سزا کاٹنے میں ہی گزر جائے گی۔
وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔
"اتنے میں سوناں ان کے نزدیک آگئی تو باتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ورشا نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔
"سوناں ممی کہاں ہیں؟"
"وہ اپنے کمرے میں ہیں۔"

سوناں نے بڑے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔
"آپ صاحب کو لیکر ڈرائنگ روم میں چلئے میں انہیں اطلاع دیتی ہوں۔"
"اچھا' ٹھیک ہے۔"
ورشا نے سوناں کو جواب دیا' پھر وہ ساحل عمر سے مخاطب ہو کر بولی۔
"آؤ' میرے رانجھن۔"
"ورشا' تم کہاں رہتی ہو؟"
ساحل عمر کا سوال سن کر وہ سمجھ نہ پائی کہ اس کے جملے کا مطلب کیا ہے۔ اس نے الجھی نظروں سے اسے دیکھا اور دھیرے سے بولی۔
"کیا مطلب؟"

اصل میں ساحل عمر جیسے ہی اس بنگلے کے احاطے میں داخل ہوا اور اس نے بنگلے کی عمارت پر ایک نظر ڈالی تو اسے اس بنگلے کے درو دیوار سے وحشت ٹپکتی محسوس ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ بھوتوں کے مسکن میں چلا آیا ہو۔ ایک تو یہ بنگلہ پرانے انداز کا بنا ہوا تھا۔ اوپر سے خستہ حال تھا۔ اس کی ظاہری ٹپ ٹاپ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ ظاہری حالت کے ساتھ اس کی اندرونی کیفیت بھی وحشت ناک تھی۔ اسی لیے ساحل عمر نے ورشا سے پوچھا تھا کہ تم کہاں رہتی ہو؟

اس کا خیال تھا کہ ورشا جیسی لڑکی کو کسی ماڈرن بنگلے میں ہونا چاہئے تھا۔ اس کی رہائش گاہ دیکھ کر ساحل عمر کو بڑی مایوسی ہوئی تھی۔

"یہ علاقہ' یہ بنگلہ اور تم جیسی لڑکی ...... ان تینوں چیزوں میں کوئی مناسبت نہیں۔"
اس کی رہائش گاہ دیکھ کر ساحل عمر نے اپنی بات واضح کی۔
"اس میں میرا کوئی قصور نہیں' میری ممی کو یہ گھر بہت پسند ہے' وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتیں ۔ میرا تو بہت جی چاہتا ہے کہ میں کلفٹن چلی جاؤں۔"
ورشا نے اپنے دل کی بات ظاہر کی۔
"تمہاری ممی میں کوئی پرانی روح گھسی ہوئی معلوم ہوتی ہے؟"
وہ ایک صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔
"مجھے حیرت ہے آپ دونوں اتنے بڑے اور ویران سے بنگلے میں کس طرح رہتی ہیں۔"
اس سے پہلے کہ ورشا کوئی جواب دیتی سوناں اچانک ڈرائینگ روم کے دروازے پر نمودار ہوئی اور با آواز بلند بولی۔
"برکھا دیوی آرہی ہیں۔"

برکھا کے آنے کا سوناں نے کچھ اس طرح اعلان کیا جیسے کسی ملک کی ملکہ معظمہ تشریف لا رہی ہوں۔ ورشا کو بھی یہ بات عجیب محسوس ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے ' وہ کسی وقت کوئی بھی قدم اٹھا سکتی ہے۔ وہ ڈرامہ باز عورت تھی۔ اسے ڈرامہ کر کے بڑا مزہ آتا تھا۔

ساحل عمر تھوڑا سا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ڈرائنگ روم کے دروازے پر ایک

شعلہ سا لپکا۔ ساحل عمر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ سرخ ساڑھی میں ایک سفید بدن کی پرکشش عورت دروازے میں داخل ہو رہی ہے۔ اس نے اچھا خاصا میک اپ کر رکھا تھا۔ بغیر آستین کا چھوٹا بلاؤز پہنے ار فلمی اداکاراؤں کی طرح نیچی ساڑھی باندھے' وہ کسی فلم کی ہیروئن بننے کی کوشش میں تھی۔ برکھا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی بجی ہوئی تھی اور آنکھیں کسی ناگن کی طرح چمک رہی تھیں۔

ورشا کو ماں کا اس طرح فل میک اپ اوز نیم عریاں انداز میں آنا اچھا نہ لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی ممی اس کے ور کے بجائے اپنے ور سے ملنے آئی ہو۔ یہ اس کی ماں کو دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے۔

"بیٹھو۔"

برکھا نے ہاتھ کے اشارے سے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ انداز میں بڑی تمکنت تھی۔

"جی' شکریہ۔"

"کیسے ہو ساحل۔"

برکھا نے پروقار لہجہ بنانے کی کوشش کی۔

"جیسا ہوں' آپ کے سامنے ہوں۔"

ساحل عمر نے سیدھے لہجے میں جواب دیا۔

"تم ویسے نہیں ہو' جیسا میں دیکھنا چاہتی ہوں' تم ویسے بن جاؤ' جیسا میں چاہتی ہوں۔"

"پتہ نہیں جی' آپ کیا فرما رہی ہیں؟"

ساحل عمر نے برکھا کے بجائے ورشا کی طرف دیکھا۔

"تم نے مجھے پہچانا؟"

برکھا نے عجب لہجے میں سوال کیا۔

"ظاہر ہے آپ ورشا کی ممی ہیں۔"

ساحل نے مسکرا کر کہا۔

"وہ تو خیر میں ہوں۔"

برکھا نے بے نیازی سے کہا۔

"لیکن میں تمہیں عمر عابد صاحب کے بیٹے کی حیثیت سے پہچانتی ہوں۔"

اپنے والد کا نام سن کر ساحل عمر بے اختیار چونک گیا۔ اس کے والد کا نام تو شاید ورشا کو بھی معلوم نہ تھا۔

"حیرت ہے' آپ میرے والد کو کیسے جانتی ہیں۔"

"تمہارے والد اس بنگلے پر آ چکے ہیں۔"

برکھا نے ایک اور انکشاف کیا۔

"ان کا کوئی مسئلہ تھا۔ جو میں نے حل کر دیا تھا۔ پھر ایک دن ان سے میری ملاقات الفنسٹن اسٹریٹ پر ہوئی تھی۔ تم ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے میرا تم سے تعارف کرایا تھا۔ تمہیں کہاں

یاد ہو گا۔ کافی پرانی بات ہے۔ تم خاصے چھوٹے تھے۔"

اس نے کہا۔

"جی مجھے یاد نہیں۔"

ساحل عمر نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"لیکن مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا۔"

برکھا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ورشا تمہاری بہت تعریف کرتی ہے۔ ہر وقت تمہارے گن گاتی ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی' نہ تم خود اپنے بارے میں جانتے ہو کہ تم کیا ہو' صرف میں جانتی ہوں کہ تم کیا ہو؟ تم میرے لیے کتنے اہم ہو۔"

"میں آپ کے لیے کیوں اہم ہوں؟"

ساحل عمر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میری وجہ سے۔"

ورشا بے اختیار بولی۔

"شاید"

برکھا نے ایک لفظ بول کر ورشا کو بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ ورشا کے چہرے پر ایک اداسی سی چھا گئی۔ برکھا نے ورشا کو گہری نظر سے دیکھا اور پھر ساحل عمر سے مخاطب ہو کر بولی۔

"میں تمہیں کیسی لگی؟"

عجیب سوال تھا' ساحل عمر پریشان ہو کر رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ یہاں ورشا کے لیے نہ آیا ہو برکھا کے لیے آیا ہو۔ جیسے برکھا' ورشا کی بیٹی ہو۔ ورشا اپنی ماں کی حرکتوں پر مسلسل شرمندہ ہو رہی تھی لیکن برکھا کو کسی کی پروا نہ تھی۔

آپ بہت اچھی ہیں۔"

بالآخر ساحل عمر کو کہنا پڑا' اگر وہ یہ نہ کہتا تو پھر کیا کہتا۔

"شکریہ' ساحل' اب میں چلتی ہوں۔ آپ ورشا کے ساتھ بیٹھ کر چائے پئیں۔ مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے' ورنہ میں تم لوگوں کے ساتھ کچھ دیر اور بیٹھتی۔ امید ہے کہ تم مائنڈ نہیں کرو گے۔"

"کوئی بات نہیں۔"

ساحل عمر نے سرسری انداز میں کہا جیسے اس کے چلے جانے سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو۔

"ورشا" برکھا اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئی۔

"جی ممی!" وہ جلدی سے بولی۔

"دیکھو' ساحل کو بغیر چائے پلائے نہ جانے دینا۔ یہ ہمارے گھر آئے ہیں۔ ہمارے لیے

ملک کے بہت بڑے آرٹسٹ ہیں۔"
یہ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ یہ ملک کے بہت بڑے آرٹسٹ ہیں۔"
یہ کہہ کر برکھا ڈرائنگ روم سے جانے لگی' پھر جاتے جاتے ورشا سے بولی۔
"ورشا ایک منٹ ذرا میری بات سننا۔"
"جی ممی آئی۔"
ورشا کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔
"ساحل ایک منٹ۔"
گویا اس نے اس سے اجازت لی۔
"ہاں ٹھیک ہے ورشا' آپ ممی کی بات سن لیں۔"
ساحل عمر نے خوش اخلاقی سے کہا۔
برکھا دروازے پر جا کر رک گئی۔ جب ورشا قریب آ گئی تو اس نے بہت آہستہ سے پوچھا۔
"کام ہوا؟"
"جی ممی' ہو گیا۔"
ورشا نے دور بیٹھے ساحل عمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"شاباش' میری جان!"
برکھا نے ورشا کے دونوں گال تھپتھپائے۔ وہ ایک دم خوش ہو گئی تھی۔
"ممی' آپ کہاں جا رہی ہیں؟"
ورشا نے ہمت کر کے پوچھا۔
"آپ نے ساحل کو بلایا تھا۔"
"ایک ارجنٹ کال پر مجھے جانا پڑ رہا ہے۔ میرے جائے بغیر مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ تم اس کے پاس بیٹھو' اسے چائے وائے پلاؤ۔ سوناں گھر میں ہے۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔ ٹھیک میری جان۔"
"اچھا ممی بائی۔"
ورشا نے بلند آواز میں کہا اور ساحل عمر کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔
اسے پیاری نظروں سے دیکھا ہلکا سا مسکرائی اور پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
"دیکھا میری ممی کو؟"
"بھئی' تمہاری ممی خوب ہیں۔ اس عمر میں بھی ینگ لگتی ہیں۔"
"کیا مجھ سے بھی زیادہ ینگ۔"
یہ کہہ کر اس نے شرارت آمیز لہجے میں ساحل کو دیکھا اور پھر زور سے ہنس پڑی۔
"تم سمندر کی لہر ہو۔"
وہ بولا۔
"اور ممی۔"

اس نے پوچھا

''وہ بھی سمندر کی لہر ہیں۔''

''واہ یہ کیا بات ہوئی۔''

وہ خفگی سے بولی۔

''وہ بھی لہر میں بھی لہر۔''

''ہاں، مگر دونوں میں فرق ہے۔''

''اچھا وہ کیا؟''

''تم سمندر کی اٹھتی ہوئی لہر ہو اور تمہاری ممی جاتی ہوئی لہر۔''

ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔ اس کی وضاحت سن کر وہ بھی ہنسنے لگی۔

☆......☆......☆

ساحل عمر کی تصویر دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ ورشا نے یہ لاجواب کام کیا تھا۔ اس نے بہت صاف اور واضح تصویر حاصل کی تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر برکھا کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے اس تصویر پر بے اختیار اپنے ہونٹ رکھ دیئے تھے اور پیار بھرے لہجے میں بولی تھی۔

''میرا ماٹا!''

اس وقت برکھا اپنے

''آپریشن تھیٹر'' میں موجود تھی۔ ورشا بھی اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے ورشا کو بہت سے عمل سکھا دیئے تھے۔ شروع شروع میں تو ورشا نے ان عملیات میں کوئی دلچسپی نہ لی لیکن جب اس نے اس سفلی علم کے اثرات دیکھے تو وہ خود بخود لائن پر آگئی۔ اس وقت وہ برکھا کی دائیں جانب کی معمول کی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔

برکھا کے ہاتھ میں ساحل عمر کی تصویر موجود تھی، وہ دھیرے دھیرے کچھ پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے زمین پر ایک دائرہ بنایا اور اس تصویر کو اس نے دائرے میں رکھ دیا۔

پھر اس نے دائیں جانب مڑ کر ورشا کو دیکھا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ کر اٹھی اور کارنس پر رکھے شیشے کے پیالے کو اٹھا لائی۔ اس پیالے میں ایک سرنج رکھی تھی۔ پیالہ دے کر ورشا پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔ برکھا نے اس کے بلاؤز کے دو بٹن کھول دیئے۔ اس کی پیٹھ پر بنا بچھو صاف دکھائی دینے لگا۔ برکھا نے سوئی بچھو کے منہ پر رکھی اور ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ سوئی کھال میں گئی تو ورشا نے سسکاری بھری۔

برکھا نے آدھی سرنج کے قریب ورشا کا خون نکال لیا اور پھر روئی کے ذریعے اس نے اس خون کو ساحل عمر کی پوری تصویر پر اچھی طرح مل دیا اور اس کے بعد اس نے ورشا سے باہر جانے کو کہا۔ ورشا کسی معمول کی طرح خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا اور جاتے جاتے کمرے کا دروازہ بھیڑ گئی۔

ورشا کے باہر جانے کے بعد وہ ساحل عمر کی تصویر پر کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہی۔ یہ عمل آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔ جب یہ عمل ختم ہوا تو اس کمرے کے چاروں کونوں سے بچھو نکل کر آنے لگے۔ برکھا نے فوراً اس تصویر کو دائرے میں رکھ دیا اور خود دائرے سے دور ہو کر بیٹھ گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بچھوؤں نے تصویر کو اچھی طرح ڈھک لیا۔ جب پوری تصویر پر بچھو اچھی طرح چھا گئے تو برکھا کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ آہستگی سے اٹھ گئی۔ کمرے سے باہر نکل کر اس نے باہر سے دروازہ بند کر دیا اور پھر اس میں ایک بڑا سا تالا ڈال دیا۔

پھر اس نے ورشا کے کمرے میں جھانکا۔ وہ آرام سے لیٹی ایک رسالہ دیکھ رہی تھی۔ ماں کو کمرے میں جھانکتا پا کر اس نے پوچھا۔

"کیا رہا ممی۔"

"اھوروں نے اس کی تصویر کو گھیر لیا ہے۔ صبح تک کچھ نہ بچے گا۔"

برکھا نے خوش ہو کر کہا' پھر وہ پورے اطمینان سے اپنے کمرے میں جا کر پاؤں پھیلا کر سو گئی۔

برکھا کے جانے کے بعد اس نے رسالہ ایک طرف رکھ کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے بارہ بجے کا عمل تھا۔ اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر بڑھا ہوا ہاتھ کھینچ لیا۔ سوچنے لگی کہ اسے فون کرے یا نہ کرے۔ ساڑھے بارہ بجے تھے۔ ممکن ہے ساحل سو چکا ہو۔ نہ بھی سویا ہو تو یہ کسی کے گھر فون کرنے کا مناسب وقت تو نہ تھا۔

پر اس کا دل نہ مانا۔ اس نے سمجھایا کہ فون کر کے دیکھ لینے میں کیا حرج کیا۔ اگر وہ جاگ رہا ہو گا اور بات کرنے کے موڈ میں ہو گا تو بات کرے گی ورنہ "ہیلو ہائے" کر کے فون بند کر دے گی۔ یہ سوچ کر اس نے دوبارہ ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا ٹیلی فون کو اپنی گود میں رکھ کر ساحل عمر کا نمبر ڈائل کیا۔

جلد ہی اسے ساحل عمر کی مخصوص انداز میں "جی" سنائی دی۔

"ہائے رانجھن۔" اس نے بڑے میٹھے لہجے میں اسے پکارا۔

"اوہ' یہ تم ہو؟"

ساحل عمر نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہا۔

"کیا کر رہے تھے؟"

"سچ بتاؤں۔"

اس نے پوچھا

"ہاں' پلیز۔"

"جانے کیوں ابھی ابھی تمہارا خیال آیا تھا۔ تم بے اختیار یاد آئی تھیں۔"

"شکر ہے..... میں تمھیں یاد تو آنے لگی۔"

"پتہ نہیں' اس وقت میری عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ فوراً تم سے ملوں' تم سے بات کروں۔ اتنے میں تمہارا فون آ گیا۔"

"اس کیفیت کو جانتے ہو' کیا کہتے ہیں۔"

ورشا نے پوچھا۔

''نہیں، میں نہیں جانتا۔''
ساحل عمر نے صاف گوئی سے کام لیا۔
''اس کیفیت کو محبت کہتے ہیں ..... تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔''
وہ ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔
''ورشا، میں الجھ گیا ہوں۔''
ساحل عمر کچھ پریشان سا تھا۔
''ہاں، میری زلفوں میں الجھ گئے ہو، میری زلفوں کے اسیر ہو گئے ہو۔''
اپنی دھن میں مگن تھی۔
''کچھ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے۔ میرے دل میں عجب وسوسے سے اٹھ رہے ہیں، میرے دل پر بادل سے چھائے ہیں۔ گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔ اچھا ورشا میں تم سے پھر بات کروں گا۔''
ساحل عمر نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا، اس نے ورشا کا جواب سننے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ ورشا ریسیور تھامے کچھ دیر یونہی سکتے کے سے عالم میں بیٹھی رہی، پھر اس نے ایک گہرا سانس لیکر ریسیور رکھ دیا۔ پھر لائٹ بجھا کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔
برکھا کو آج صبح تڑکے ہی اٹھنا تھا۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی کمرے میں جانا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی ہوئی جاپ والے کمرے کی طرف چل دی۔
اس نے کمرے کا بڑا سا تالا کھولا اور بے تابی سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اب وہاں ایک بھی بچھو نہ تھا۔ برکھا نے جھک کر ساحل عمر کی تصویر اٹھالی اور جب اس نے خوش ہو کر اس کی تصویر پر نظر ڈالی تو خوشی ایک دم اداسی میں بدل گئی۔
برکھا کو زبردست حیرت کا جھٹکا لگا۔

☆......☆......☆

حیرت کا جھٹکا آخر کیوں نہ لگتا؟ کام ہی کچھ ایسا ہوا تھا۔
اس نے یہ سوچ کر تصویر اٹھائی تھی کہ ساحل عمر کی تصویر غائب ہو چکی ہوگی، وہاں صرف سادہ کاغذ رہ گیا ہوگا۔ پھر وہ اس کاغذ کے چار ٹکڑے کر کے انہیں جلائے گی اور اس کی راکھ ورشا کے حوالے کر دے گی تاکہ وہ اس راکھ کو ساحل عمر کو کھلا دے اور جونہی ساری راکھ اس کے خون میں شامل ہوگی، وہ ورشا کا مطیع ہو جائے گا۔ پھر ورشا کے ذریعے وہ ساحل عمر پر حکومت کرے گی۔ اسے دھیرے دھیرے وہاں لے جائے گی جہاں لے جانا چاہتی ہے۔
تصویر دیکھ کر اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ ساحل عمر کی تصویر کاغذ پر موجود تھی۔ البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ تصویر کہیں کہیں سے اڑ گئی تھی۔ جیسے تصویر بہت پرانی ہو جائے تو اس پر چھوٹے چھوٹے سفید دھبے پڑ جاتے ہیں۔ بس ایسی ہی ہو گئی تھی اس کی تصویر...... لیکن ایسا کیوں ہوا تھا آخر؟
یہ تو اس کا آزمودہ عمل تھا۔ کئی بار اس نے مختلف لوگوں کے لیے کیا تھا۔ یہ وہ عمل تھا جو

سب سے پہلے اس کے باپ نے کیا تھا۔ اسی سے اس نے سیکھا تھا۔ اس عمل کے ناکام ہونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ کبھی انہونی بھی ہو جاتی ہے' وہ ہو گئی تھی۔

جب ساحل عمر نے ورشا سے بات کرتے کرتے اچانک ریسیور رکھ دیا تو ورشا کو عجیب سا لگا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا نہ کیا تھا۔ یہ اس کی تو عادت تھی کہ وہ بات کرتے کرتے اچانک ریسیور رکھ دیتی تھی۔ شاید اسی کا سایہ اس پر پڑ گیا تھا۔ ساحل عمر کو اپنی اس حرکت پر بعد میں شرمندگی ہوئی تھی لیکن وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ اصل میں بات کرتے کرتے اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے تھے۔ اسے ایک زوردار چکر آیا تھا کہ اس کا ہاتھ خود بخود کریڈل پر پہنچ گیا تھا اور غیر ارادی طور پر ریسیور فون سیٹ پر رکھا گیا تھا۔

اس کے دل پر شدید گھبراہٹ سی طاری تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا ہوا تھا اور سر گھوم رہا تھا۔ وہ اپنا سر جھکائے اور اسے دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھا تھا۔

تبھی اس نے دیکھا کہ کوئی چیز بڑی تیزی سے اس کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ وہ جھکال تھا جو اس کے گرد گھوم رہا تھا۔ وہ بے وزن تھا' بے آواز تھا اور کبھی اسے دکھائی دے رہا اور کبھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

پھر اچانک ہی اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا اور چند لمحوں پہلے اس نے جو کچھ محسوس کیا تھا یا کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا' وہ اب محض ایک خواب لگ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کیا ہوا ہے۔ جھکال اچانک کہاں سے آ گیا۔ اس نے اس کے گرد چکر کیوں لگائے۔

بہرحال جو بھی ہوا تھا لیکن کمرے میں کسی قسم کے آثار نہیں تھے۔ یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اتنا بڑا جانور اس کمرے میں گھوم کر گیا ہے۔ اس وقت رات کا پون بجا تھا۔ اماں شاید جاگ رہی ہوں' اس نے سوچا۔ ان سے تذکرہ کر کے دیکھے' انہیں اپنا حال سنائے' اپنی کیفیت بیان کرے۔ پھر اس نے سوچا جب کمرے میں کسی چیز سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا کہ یہاں کوئی چیتا چھلانگیں مار کر گیا ہے تو وہ اماں کو کیسے یقین دلائے گا۔ اسے یہ تو معلوم تھا۔ اس بات کا پکا یقین تھا کہ وہ اماں کو بتائے گا' اس پر وہ من وعن یقین کر لیں گی مگر وہ یہ سب بتا کر انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بیچاری اس کی طرف سے ویسے ہی خاصی پریشان رہتی تھیں۔

سوچتے سوچتے اچانک اس کی نگاہ رشا ملوک کی تصویر پر پڑی۔ وہ اس تصویر کو دیکھ کر چونک پڑا اور جس چیز نے اسے چونکایا اس کی تصدیق کے لیے تصویر کے نزدیک جانا ضروری تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ رشا ملوک کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو جو جم کر برف بن گئے تھے' وہ برف کے آنسو اب پگھلنے لگے تھے۔

وہ فوراً اٹھ کر تصویر کے نزدیک پہنچا۔ اس نے ان آنسوؤں کو غور سے دیکھا۔ وہ آنسو واقعی پگھل رہے تھے' پانی بن رہے تھے لیکن پانی بن کر بہہ نہیں رہے تھے۔ وہ پانی ہوا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر میں وہ آنسو تصویر سے غائب ہو گئے۔ اب تصویر خشک اور صاف تھی۔

ساحل عمر کے دل پر سرشاری سی چھا گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے خود اپنے ہاتھوں رشا ملوک کے آنسو پونچھ دیئے ہوں۔

☆......☆......☆

ناصر مرزا کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی تھی۔ اس کی گاڑی نے ملیر ہالٹ کے سٹاپ سے ماڈل کالونی کی طرف رخ اختیار کر لیا تھا۔ شام کے چار بجے تھے۔ وہ حافظ موسیٰ خان سے ملنے جا رہا تھا۔ حافظ موسیٰ کا پتہ اس کے منیجر زاہد ملک نے بتایا تھا۔

پتہ ڈھونڈنے میں ناصر مرزا کو کوئی دقت پیش نہ آئی۔ مارکیٹ میں پہنچ کر جب اس نے ایک جنرل اسٹور والے سے حافظ موسیٰ کا پتہ معلوم کیا تو حافظ موسیٰ کا نام سن کر اس نے بڑی عقیدت سے ناصر مرزا کو دیکھا۔ اگرچہ ان کا گھر نزدیک ہی تھا' پھر بھی اس جنرل سٹور والے نے اپنی دکان کے لڑکے کو ناصر مرزا کے ساتھ کر دیا۔

گھر کے سامنے پہنچ کر اس لڑکے نے چاہا کہ وہ گیٹ پر لگی بیل بجا کر اندر سے کسی کو بلا دے مگر ناصر مرزا نے منع کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''بس بیٹا' آپ جائیں۔ میں خود دروازہ کھٹکھٹا لوں گا۔''

''اچھا جی۔'' لڑکا یہ کہہ کر واپس اپنی دکان پر چلا گیا۔

ناصر مرزا نے گیٹ کی دیوار کے ساتھ اپنی گاڑی کھڑی کی۔ پھر گیٹ پر آ کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ چار سو گز پر بنے اس مکان کی چار دیواری اتنی اونچی تھی کہ اندر کا گھر نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکے نے گیٹ کھولا اور اپنے سامنے ایک بھاری بھر کم شخصیت کو پا کر تھوڑا سا جھک گیا۔ اس کے چہرے پر نرمی سی آ گئی تھی اور اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''جی فرمائیے' کس سے ملنا ہے؟''

''بیٹے مجھے حافظ جی سے ملنا ہے۔'' ناصر مرزا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''اچھا آپ ٹھہریئے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں۔ اس وقت وہ پچھلے حصے میں ہیں۔ آپ اپنا نام بتایئے۔ میں دروازے کے باہر کھڑے ہو کر آپ کا نام لوں گا۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو ملاقات ہو جائے گی ورنہ آپ کو دوبارہ زحمت کرنا پڑے گی۔'' اس لڑکے نے خلاف توقع بڑی تفصیل سے ساری صورتحال سمجھائی۔

''ٹھیک ہے بیٹے...... میرا نام ناصر مرزا ہے۔ میں حسن اسکوائر سے آیا ہوں۔''

وہ لڑکا اس کا نام سن کر اندر چلا گیا۔ ناصر مرزا گیٹ کے سامنے سے ہٹ کر اپنی گاڑی کے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ اس کے منیجر نے بتایا تھا کہ وہ بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں۔ ان سے ملنے کے لیے لوگ چکر پر چکر لگاتے رہتے ہیں۔ وہ شخص بڑا خوش قسمت ہوتا ہے جسے پہلی ہی دفعہ میں شرف باریابی حاصل ہو جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد گیٹ پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی تو ناصر مرزا فوراً گیٹ کے سامنے آ گیا۔ وہ لڑکا چھوٹے گیٹ سے برآمد ہوا اور مسکرا کر بولا۔ ''آپ کو اندر بلایا ہے۔''

''شکریہ بیٹے!'' ناصر مرزا نے ممنونیت سے کہا۔ لڑکا کچھ نہ بولا۔ جب وہ گیٹ کے اندر

داخل ہو گیا تو لڑکے نے گیٹ اندر سے بند کر دیا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ”آئیے۔“
ناصر مرزا کا خیال تھا کہ وہ اسے گھر میں لے جائے گا لیکن اس نے گھر میں جانے کی بجائے گھر کے پچھواڑے کا رخ کیا۔ یہ گھر درختوں، پودوں اور کیاریوں سے گھرا ہوا تھا۔ جب وہ گھر کے پچھلے حصے میں پہنچے تو ناصر مرزا کو ایک دیوار نظر آئی۔ اس دیوار میں ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ لڑکا دروازے کے سامنے رک گیا اور زور سے بولا۔ ”بابا! دروازہ کھولیے۔“ یہ کہہ کر وہ لڑکا واپس مڑا اور ناصر مرزا سے مخاطب ہوا۔ ”ابھی دروازہ کھلے گا، آپ اندر چلے جائیے گا اور دروازہ اندر سے بند کر لیجیے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ناصر مرزا نے کہا۔
وہ لڑکا جس راستے سے آیا تھا، اسی راستے سے واپس چلا گیا۔
لڑکے کے جانے کے بعد دروازہ کھلا لیکن دروازے میں کوئی نظر نہ آیا۔ البتہ کچھ فاصلے پر نیم کے درخت کے نیچے ایک چارپائی پر بیٹھا شخص ضرور نظر آیا۔ اس شخص کا چہرہ دروازے کی طرف تھا۔ وہ بولا۔ ”آؤ بھائی، اندر آجاؤ۔“
یہ سن کر ناصر مرزا فوراً دروازے میں داخل ہو گیا اور اس نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ بہت آہستہ آہستہ بڑے مودبانہ انداز میں چارپائی پر بیٹھے شخص کی طرف بڑھا۔
ناصر مرزا نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھا لیکن اسے وہاں حافظ موسیٰ کے سوا کوئی نظر نہ آیا۔ تو پھر دروازہ کس نے کھولا تھا؟ حافظ موسیٰ اگر دروازہ کھولتے تو وہ اسے دروازے پر نظر آتے۔ دروازہ کھلتے ہی حافظ موسیٰ دور چارپائی پر بیٹھے نظر آئے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں ایک موٹی سی لاٹھی تھی۔ وہ چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور لاٹھی دونوں ٹانگوں کے درمیان تھی جو انہوں نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھی تھی اور ذرا آگے کو جھکے بیٹھے تھے۔
وہ ایک بھرے بھرے چہرے والے سرخ سفید آدمی تھے۔ اگرچہ بیٹھے تھے لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ اونچے قدو کاٹھ کے مالک ہیں۔ انتہائی نورانی چہرہ۔ ایسا کہ ایک بار دیکھے تو پھر نظریں ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ اندھے تھے۔ ان کی دونوں آنکھوں میں پتلیاں نہ تھیں، محض سفیدی تھی اور آنکھیں قدرے سکڑی ہوئی تھیں۔ آنکھیں نہ ہونے کے باوجود ان کے چہرے میں بے پناہ کشش تھی۔
ناصر مرزا جب ان کے نزدیک پہنچا تو حافظ موسیٰ نے کڑک دار لہجے میں کہا۔ ”اچھا بچو! اب تم جاؤ۔ کل اچھی طرح سبق یاد کر کے آنا۔“
ناصر مرزا نے بڑی حیرت سے انہیں، پھر ان کے سامنے، اس کے بعد چاروں طرف حتیٰ کہ نیم کے درخت پر بھی نظر ڈالی مگر اسے وہاں کوئی بچہ نظر نہ آیا۔ دروازہ بھی جوں کا توں بند تھا۔
چند لمحے حافظ موسیٰ نے جیسے ان بچوں کے جانے کا انتظار کیا۔ پھر ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر دھیمے لہجے میں بولے۔ ”ہاں بھائی آؤ بیٹھو۔ بتاؤ کیوں آئے ہو؟“
ناصر مرزا ان کے قدموں میں نیچے گھاس پر بیٹھ گیا۔ حافظ موسیٰ کو فوراً احساس ہو گیا کہ وہ نیچے بیٹھ گیا ہے۔ انہوں نے کہا۔ ”بھائی مجھ گنہگار کو مزید کیوں گنہگار کرتے ہو، آؤ چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔“

انہوں نے اپنے سرہانے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
ناصر مرزا اب اتنا بدتہذیب بھی نہ تھا کہ ان کے سرہانے چڑھ کر بیٹھ جاتا۔ وہ ان کی پائتی کی طرف مودبانہ انداز میں بیٹھ گیا۔ یہ ایک کھری چارپائی تھی۔ اس پر چادر بھی نہ بچھی تھی۔
''ہاں اب کہو۔ کیسے آئے ہو؟'' وہ گویا ہوئے۔
''حافظ جی! آپ کے شہر میں ایک جادوگرنی نے ظلم کی انتہا کر رکھی ہے۔'' ناصر مرزا نے شکوہ کیا۔
''بھائی میرا شہر کہاں؟ شہر تو شہر والے کا ہے' وہی جانے اپنی حکمت۔'' حافظ موسیٰ نے گریز کا راستہ اختیار کیا۔
''حافظ جی! آپ کو کچھ کرنا ہوگا۔ وہ قتل پر قتل کر رہی ہے۔ ایک اس نے میری بھتیجی کو مارا دوسرے اس نے ایک ایسے شخص کو مار دیا جس نے اس کے قاتلہ ہونے کا سراغ لگایا۔ نہ جانے وہ اب تک کتنے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہوگی۔ آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ اللہ نے آپ کو طاقت دی ہے۔ اگر آپ کچھ نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا؟'' ناصر مرزا نے بڑے امید بھرے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔
''بھائی مجھے ان بکھیڑو میں نہ الجھاؤ۔ ایک گوشے میں بیٹھا ہوں' بیٹھا رہنے دو۔''
''آپ موسیٰ ہیں' فرعون کی سرکوبی آپ کا فرض ہے۔'' ناصر مرزا بضد تھا۔
''بھائی میں نام کا موسیٰ ہوں اور اس شہر میں ایک نہیں' ہزاروں فرعون ہیں۔ بتاؤ میں پھر کیا کروں؟''
''اس جادوگرنی کے لیے تو آپ کو ضرور کچھ کرنا ہوگا۔'' ناصر مرزا نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔
''تم تو خود ایک سمجھدار آدمی ہو۔''
''میں سمجھدار ضرور ہوں لیکن میرے پاس لاٹھی نہیں ہے۔''
''بھائی لاٹھی میری لے جاؤ۔'' انہوں نے مسکرا کر اس کی طرف لاٹھی بڑھائی۔
''میں لاٹھی کا کیا کروں گا' لاٹھی بھی اسی کے ہاتھ میں جچتی ہے جو اسے چلانا جانتا ہو۔''
''بہت ضدی ہو' مانو گے نہیں۔''
''ضدی نہیں ہوں' مظلوم ہوں۔ آپ کے پاس فریاد لے کر آیا ہوں۔''
''تمہارے پاس تو ایک بڑی اہم دستاویز ہے۔ ایک زبردست خزانہ۔ اسے کیوں نہیں استعمال کرتے۔'' حافظ موسیٰ نے اس کتاب کی طرف اشارہ کیا جس میں بہت سے وظائف درج تھے۔ یہ ہاتھ کا لکھا ہوا مخطوطہ فارسی زبان میں تھا اور یہ کتاب اس کے دادا کے پاس سے ملی تھی۔ پتہ نہیں ان کتاب کے بارے میں انہیں کیسے پتہ چل گیا۔
''میں ایک گاڑی کا مالک ضرور ہوں لیکن مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔''
''میں ڈرائیونگ سکھا دوں گا۔'' وہ بولے۔

"تو پھر میں گاڑی چلا لوں گا۔" اس نے بھی اسی انداز میں کہا۔
"کتاب ساتھ لائے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔
"جی لایا ہوں۔" جواب دیا گیا۔
"کتاب چارپائی پر چھوڑ جاؤ۔ پانچ دن کے بعد آنا لیکن اس وقت نہیں، صبح میں آنا۔ اس وقت میرے پاس کچھ بچے قرآن شریف پڑھنے آتے ہیں۔" اس نے بتایا۔
"جی بہت بہتر!" ناصر مرزا نے ہاتھ کا لکھا ہوا مخطوطہ جو اس نے کتاب کی شکل میں مجلد کروایا ہوا تھا، اپنے بریف کیس سے نکال کر چارپائی کے سرہانے رکھ دیا اور پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ "اچھا حافظ جی، میں چلوں۔"
"نہیں، بیٹھ جاؤ اور مجھے ہر وہ بات بتاؤ جو تم مجھے بتانا چاہتے ہو۔"
ناصر مرزا ان کا حکم سن کر پھر چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس نے ان واقعات کو وہاں سے شروع کیا جہاں سے وہ شروع ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ کس طرح اس کے دوست ساحل عمر نے ایک انوکھی تصویر بنائی اور اس نے کیا رنگ اختیار کیا۔ اس داستان میں ورشا کا بھی ذکر ہوا، برکھا پر بھی فرد جرم عاید کی گئی۔ چیتے والی تصویر کا بھی ذکر ہوا۔ عابد منجم کے ساتھ کیا بیتی، یہ بھی ان کے گوش گزار کیا گیا۔ بھتیجی کا اغوا اور پھر اس کا قتل۔ عابد منجم کے ساتھ ہولناک واردات۔ غرض جب ہر وہ بات بتا دی گئی جو وہ بتانا چاہتا تھا تو ساری بات سن کر حافظ موسیٰ گویا ہوئے۔
"پانچ دن کے بعد آنا اور ساتھ اس لڑکے کو بھی لانا، کیا نام ہے اس کا؟"
"جی، ساحل عمر۔" "اصل قصہ تو اس کا ہے۔ وہ سفلی والی شیطان کی چیلی اس کے پیچھے لگی ہے۔ لو دیکھو!" حافظ موسیٰ نے اپنی لاٹھی اس کی طرف کی۔
"کہاں دیکھوں؟"
"اس آنکھ میں دیکھو۔" حافظ موسیٰ نے موٹی لاٹھی میں بنی ایک آنکھ نما گڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ حافظ موسیٰ جب تک وہ واقعات سناتا رہا تھا، اس لاٹھی میں بنی آنکھ سے اپنی اندھی آنکھ لگائے بیٹھے تھے۔
جب اس نے اس لاٹھی کی آنکھ پر اپنی آنکھ رکھی تو برکھا اسے واضح طور پر نظر آئی۔
"یہی ہے نا وہ؟" حافظ موسیٰ نے پوچھا۔
"جی یہی ہے۔" ناصر مرزا نے تصدیق کی۔
"اس سفلی والی کو پچھاڑنے کے لیے بہت محنت کرنا ہو گی۔ میں تمہاری مدد کروں گا لیکن اصل محنت تمہیں خود کرنا ہو گی۔" اس نے آئندہ کا لائحہ عمل بتایا۔
"حافظ جی! آپ جو کہیں گے، کروں گا۔ بس میں اسے ٹھکانے لگانا چاہتا ہوں۔" ناصر مرزا نے اپنی دلی خواہش ظاہر کی۔
"بڑی عیار لومڑی ہے بھائی۔" حافظ موسیٰ نے پرفکر انداز میں کہا۔ "خیر اللہ مالک ہے۔"
"آپ کا ہاتھ میرے کندھے پر رہا تو میں اسے مار گراؤں گا۔"

حافظ موسیٰ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ یکا یک خاموش ہو گئے۔ ناصر مرزا نے محسوس کیا کہ وہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے لاٹھی پکڑ کر سر جھکا لیا تھا۔ پھر انہوں نے کچھ دیر کے بعد سر اٹھایا اور بولے۔ ''اس کتاب کا صفحہ سات کھولو۔''

ناصر مرزا نے ان کے سرہانے سے وہ کتاب اٹھا کر اس کا صفحہ سات کھول لیا۔ ''جی!''

''فارسی پڑھ لیتے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی پڑھ تو لوں گا لیکن اچھی طرح سمجھتا نہیں ہوں۔'' ناصر مرزا نے بتایا۔

''اچھا پڑھو' میں سمجھاتا ہوں۔''

ناصر مرزا نے صفحہ سات پر جو درج تھا' وہ پڑھ کر سنا دیا۔

''یہ ایک زبردست وظیفہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس طرح میدان جنگ میں اترنے سے پہلے سپاہی اچھی طرح ڈھال اور تلوار کا استعمال سیکھتا ہے' بالکل اسی طرح تمہیں اس سفلی والی کو پچھاڑنے کے لیے پہلے اپنی حفاظت کا طریقہ سیکھنا پڑے گا۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ وظیفہ ایک طرح سے لائف پروف جیکٹ ہے۔'' حافظ موسیٰ نے مسکرا کر کہا۔ پھر انہوں نے اسے اچھی طرح سمجھایا کہ یہ وظیفہ کس طرح پڑھنا ہے۔ کہاں پڑھنا ہے۔ کس وقت پڑھنا ہے اور پڑھنے کے دوران کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ ساری بات اچھی طرح سمجھا کر بولے۔ ''بھائی سمجھ گئے نا؟''

''جی بالکل' میں نے ساری بات بہت اچھی طرح سمجھ لی ہے۔'' ناصر مرزا نے پریقین اور پرمسرت لہجے میں کہا۔

''بس ٹھیک ہے۔ تم اب جاؤ' پانچ دن بعد اس وظیفے کے عامل بن کر میرے پاس آنا۔ ساتھ میں اس لڑکے کو بھی لانا' میں چاہتا ہوں ذرا اسے ایک نظر دیکھ لوں۔''

''جی بہتر۔'' یہ کہہ کر ناصر مرزا کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ باہر کوئی نہ تھا۔ اس نے چند لمحے انتظار کیا۔ جب کوئی نظر نہ آیا تو وہ گردن جھکائے مکان کی طرف دیکھے بغیر گیٹ سے باہر نکل آیا۔ گیٹ سے باہر نکل کر اس نے کال بیل بجائی۔ کچھ دیر کے بعد وہی لڑکا باہر نکل کر آیا۔

''بیٹے گیٹ بند کر لیں۔'' ناصر مرزا نے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر جب ناصر مرزا اپنے گھر کی طرف چلا تو وہ بہت خوش تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو۔ حافظ موسیٰ سے ملاقات ہی کار دارد تھی۔ اس کے منیجر زاہد ملک نے اسے اچھا خاصا ڈرا دیا تھا کہ وہ ملاقات نہیں کرتے۔ ملاقات کرتے ہیں تو بات نہیں کرتے لیکن یہاں تو پہلی دفعہ میں ہی چھکا لگ گیا تھا۔ نہ صرف ملاقات ہو گئی تھی بلکہ انہوں نے ''لائف پروف وظیفہ'' بھی بتا دیا تھا۔ پھر انہوں نے ساحل عمر کو بھی بلا بھیجا تھا۔ ایک بات انہوں نے البتہ عجب کہی تھی کہ وہ ایک نظر ساحل عمر کو دیکھنا چاہتے ہیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس نے ان کے بارے میں سنا تھا کہ وہ نابینا ہیں اور یہ بات انہیں دیکھ کر صحیح ثابت ہو گئی تھی' وہ واقعی اندھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر یہ دیکھنے والی بات؟

تب اسے خیال آیا کہ انہوں نے کتاب کو کھولے بغیر یہ کیسے کہہ دیا تھا کہ اس کا صفحہ سات

کھول کر پڑھو۔ انہوں نے آخر اس کتاب کو کس آنکھ سے پڑھا؟

وہ اندھے ہوتے ہوئے بھی اندھے نہ تھے۔ اصل میں ہمارے جسم کو کچھ دیکھنے کے لیے آنکھوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کچھ چھونے کے لیے ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے لیکن وہ جسم تھے ہی کب؟ ان کا جسم روح ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اندر سمٹ گئے تھے۔ جب چاہتے' من کی آنکھ کھول لیتے اور جو چاہتے دیکھ لیتے تھے۔ انہیں اب ان ظاہری آنکھوں کی ضرورت تھی اور نہ ہاتھ پاؤں کی۔ وہ بیٹھے بیٹھے جہاں چاہے پرواز کر سکتے تھے۔

تب ناصر مرزا کو زاہد ملک کا وہ واقعہ یاد آیا تھا جو اس کے خالہ زاد بھائی ارشد کے گھر میں پیش آیا تھا۔ ارشد کے گھر میں جنات نے بسیرا کر لیا تھا اور یہ جن شریر قسم کے تھے۔ انہوں نے گھر والوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ کبھی وہ کسی گھر کے فرد کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ جاتے' کبھی چیزوں کو توڑ پھوڑ دیتے' کھانے پینے کی اشیاء غائب ہو جاتیں۔ گھر میں کبھی چاروں طرف گندگی پھیلا دیتے۔ چھوٹے بچوں کے سامنے خوفناک شکلوں میں آ کر انہیں چیخ مارنے پر مجبور کر دیتے۔ کبھی گھر کی لائٹیں خود بخود جل جاتیں' کبھی خود بخود بجھ جاتیں۔

کئی عاملوں کو جھاڑ پھونک کرنے والوں کو بلا کر دکھایا مگر مسئلہ وہیں کا وہیں رہا بلکہ جیسے ہی کوئی عامل گھر سے نکل کر جاتا' یہ شرارتی جن مزید تخریب کاری مچا دیتے۔

بالآخر گھر کے مکینوں نے سوچا کہ اس گھر کو بیچ دینا چاہیے۔ بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہ مکان فروخت ہو جائے مگر ایسا ہو نہ سکا۔ اچھا خاصا سودا ہو جاتا' پھر کوئی ایسی وجہ ہو جاتی کہ بنا بنایا سودا بگڑ جاتا۔

جب گھر میں رہنا محال ہو گیا تو یہی سوچا کہ گھر کو تالہ لگا کر کرائے پر مکان لے لیا جائے۔ تب مایوسی کے اندھیرے میں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ کسی نے حافظ موسیٰ کا پتہ بتایا۔ اول تو وہ مل کر ہی نہ دیئے۔ جب سات چکر لگ گئے اور زاہد ملک کے بھائی ارشد مایوس ہو کر واپس جانے لگے تو گیٹ کے اندر سے آواز آئی۔ ''آ جاؤ بھائی' واپس کیوں جاتے ہو۔'' اس کے ساتھ ہی گیٹ کھلا۔ گیٹ ایک لڑکے نے کھولا اور اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

حافظ موسیٰ ایک بیری کے درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھے تھے۔ ان کی لاٹھی ان کے نزدیک رکھی تھی اور وہ دروازے کی طرف پیٹھ موڑے بیٹھے تھے۔

ارشد اپنی بیوی کے ساتھ آیا تھا۔ دونوں میاں بیوی ان کے سامنے جاتے ہی سسک سسک کر رو پڑے اور رو رو کر اپنی بپتا بیان کی۔ ساری روداد سن کر انہوں نے صرف اتنا کہا۔ ''کل چار بجے آنا۔ آ کر مجھے لے جانا۔ بھائی میں اندھا آدمی ہوں۔''

دوسرے دن ارشد گاڑی لے کر مقررہ وقت پر پہنچ گیا اور انہیں گاڑی میں اپنے ساتھ لے آیا۔ حافظ موسیٰ اپنی موٹی لاٹھی ہاتھ میں تھامے کچھ پڑھتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ پھر وہ لاٹھی کے سہارے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھ کر کچھ دیر پڑھتے رہے۔ پھر وہاں سے اٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں آ گئے۔ وہاں بیٹھ کر کچھ دیر پڑھا۔ پھر ایک گلاس پانی مانگا۔ اس پر پھونک ماری اور

بولے۔ ''گھر کا ہر فرد تھوڑا تھوڑا اس پانی کو پی لے۔''
گھر کے تمام افراد کو یہ پانی پلا دیا گیا۔ پھر وہ ارشد سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''بھائی تمہارے گھر میں جنوں کا ایک خاندان آباد ہے۔ ان کے چند بچے ہیں جو بہت خبیث ہیں۔ ایک بچہ اس وقت ٹی وی پر چڑھا بیٹھا ہے۔ اس کے آدھے سر پر بال ہیں' آدھا سر گنجا ہے۔ ایک بچہ ادھر فریج کے اوپر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہے۔ ایک ادھر دروازے میں کھڑا قلابازیاں لگا رہا ہے۔ جن کی بیوی اور اس کا ایک بھائی میرے قدموں میں پڑے ہیں۔ معافی کے خواستگار ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اگر انہیں سزا نہ دی گئی تو یہ خود اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائیں گے لیکن میں نے ایسے بہت سے خبیث دیکھے ہیں۔ یہ اتنی شرافت سے جانے والے نہیں ہیں۔ میرے نکلتے ہی یہ پھیل کر بیٹھ جائیں گے۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ جب میں یہاں تک آ گیا ہوں تو ان کا پکا بندوبست کر کے جاؤں گا۔ میں یہاں بیٹھا ہوں۔ جب تک یہ میرے سامنے سمندر پار نہیں کر جاتے میں یہاں سے نہیں ہلوں گا۔''
پھر وہ وہاں بیٹھے پڑھتے رہے۔ پڑھتے پڑھتے کبھی کبھی وہ اس جنات گھرانے سے مخاطب بھی ہو جاتے۔ دو تین گھنٹے کی محنت کے بعد وہ اس گھر کو جنات کے خاندان سے خالی کرانے میں کامیاب ہو گئے۔
تب انہوں نے گھر والوں کو بتایا۔ ''میں نے اس خاندان کو سمندر پار کرا دیا۔ اب یہ کبھی اس طرف کا رخ نہیں کریں گے۔ آپ لوگ مطمئن ہو جائیں۔''
اس کے بعد انہوں نے پانی پڑھ کر دیا اور کہا۔ ''اس پانی کے چھینٹے گھر کی دیواروں پر مار دیں۔''
ارشد نے پڑھے ہوئے پانی کے چھینٹے گھر کی ہر دیوار پر مار دیئے۔ بس پھر وہ دن اور آج کا دن۔ دو سال ہو گئے' پھر کبھی اس گھر میں کوئی خلاف عقل واقعہ نہیں ہوا' سکون ہو گیا۔
گھر کے لوگوں کو اس بات پر حیرت نہ تھی کہ حافظ موسیٰ خان نے اس گھر کے جن نکال دیئے تھے۔ حیرت اس بات پر تھی کہ انہوں نے یہ کیسے بتا دیا کہ ٹی وی کدھر رکھا ہے اور فریج کدھر کھڑا ہے۔ وہ تو اس طرح بتا رہے تھے جیسے واقعی آنکھیں رکھتے ہوں۔
وہ واقعی آنکھیں رکھتے تھے۔ اندھے ہونے کے باوجود جب وہ چاہتے ہر اس چیز کو دیکھ لیتے تھے جس کو وہ دیکھنا چاہتے تھے اور اس کا مشاہدہ ناصر مرزا نے خود اپنی آنکھوں سے کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

اندھیری رات تھی۔ آس پاس کے بنگلوں کی لائٹیں بھی بجھ چکی تھیں۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ جھینگروں کا شور تھا۔ برکھا نے اپنے بنگلے کے پچھلے حصے میں پیپل کے درخت کے نیچے ایک پختہ حوض بنوا رکھا تھا۔ یہ ایک چوکور حوض تھا۔ اس کی چوڑائی لمبائی چار فٹ تھی۔ اتنا ہی گہرا تھا۔ اس میں پانی بھرا رہتا تھا۔
اس حوض کے چاروں طرف دیئے روشن تھے اور برکھا رات کے گیارہ بجے سے پانی میں کھڑی کسی عمل میں مصروف تھی۔ اس کا آدھا جسم پانی کے اندر تھا اور آدھا جسم پانی سے باہر تھا۔ اس

وقت اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے، سر جھکائے کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔
حوض کے چاروں طرف اکیس دیئے روشن کیے گئے تھے جو آہستہ آہستہ بجھتے جا رہے تھے۔ اب اس کے سامنے صرف تین دیئے روشن تھے۔ عمل کا وقت پورا ہو رہا تھا۔ ان تینوں دیوں کو ایک ساتھ بجھنا تھا۔ ان دیوں کے بجھتے ہی اگھور کی سواری کو آنا تھا۔
اندھیری رات بھیانک سے بھیانک ہوتی جا رہی تھی۔ جھینگروں کا شور، اڑتی ہوئی چمگادڑوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور پھر علاقے کے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں۔ یہ سب چیزیں بتا رہی تھیں کہ اگھور کی سواری کہیں نزدیک ہی ہے۔ بس آیا ہی چاہتی ہے۔
پھر وہ منحوس گھڑی آ پہنچی جو برکھا کے لیے شبھ گھڑی تھی۔ تینوں دیئے بیک وقت بجھ گئے۔ چند لمحوں کے لیے مہیب سناٹا چھا گیا۔ پیپل کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تک رک گئی۔ ہوا بھی جیسے ساکت ہو گئی۔
یہ سناٹا محض چند لمحوں کے لیے تھا۔ اس کی سواری آ پہنچی تھی۔ برکھا نے حوض کے کنارے رکھی ماچس سے جلدی جلدی سارے دیئے روشن کر دیئے اور جب اس نے سامنے نگاہ کی تو وہ اپنی سواری پر موجود تھا۔
اس کے سامنے ایک تین فٹ لمبی چھپکلی موجود تھی جس کی زبان باہر نکل رہی تھی اور اس چھپکلی کی گردن میں ایک سانپ رسی کی طرح بندھا تھا۔ اس سانپ کی دم اگھور کے دونوں ہاتھوں میں تھی۔ یہ کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا بچھو تھا۔ اس بچھو کی دم اٹھی ہوئی تھی اور اس دم کا آخری حصہ چمک رہا تھا۔ بالکل کسی جگنو کی طرح۔
''سواگتم مہاراج۔ سواگتم مہاراج۔'' برکھا آدھی جھک کر بولی۔
''ہاں' کیوں بلایا ہے ہمیں؟ کیا تو جانتی نہیں کہ ہمارا وقت کتنا قیمتی ہے؟''
''جانتی ہوں مہاراج۔ میں نہیں جانوں گی تو اور کون جانے گا۔ پر کیا کروں مہاراج اکیلی ہوں۔ آپ کو نہیں پکاروں گی تو پھر کس کو پکاروں گی؟ مہاراج میری مدد کریں۔'' وہ گھگھیائی۔
''کیا ہوا؟'' مہاراج اگھور نے کڑک کر پوچھا۔
''ایک انکاری آڑے آ گیا ہے۔'' برکھا نے فریاد کی۔
''جو انکاری ہے' اسے اقراری بنا۔ تو اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ دنیا انکاریوں سے بھری پڑی ہے۔ ہمارا کام انکاریوں کو اقراری بنانا ہے اور اقراری بناتے رہنا ہے۔ تو جتنے اقراری بنائے گی' اتنے ہی تیرے درجات بلند ہوں گے۔ میرا باپ تجھے طاقت بخشتا چلا جائے گا تو اقراریوں پر راج کرے گی۔'' اگھور بولا۔
''مہاراج آپ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ کچھ انکاری بڑے اڑیل ہوتے ہیں۔''
''ہاں' جانتا ہوں۔'' اگھور نے پر رعب آواز میں کہا۔ ''پر ایسے انکاری کو مار مار کر سیدھا کیا جاتا ہے۔''

گیا۔ میں نے اسے سدھو کی مار مارنی چاہی تھی لیکن وہ صاف بچ نکلا۔"

"ہیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سدھو کا وار تو ہمارا وار ہے۔ ہمارا وار کیسے خالی ہو گیا۔ ہمارے چیلے کیسے ناکام ہو گئے۔" اعور نے غصے میں بار بار اپنی دم چھپکلی کی پیٹھ پر ماری۔

"مہاراج یہی تو نہیں معلوم ہو رہا ہے' اسی لیے تو آپ کو زحمت دی ہے۔ آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا ہے۔"

"اس کی چال بتا۔"

"وہ شنی ہے۔ وقت کا دھنی ہے۔ چاند اور سورج اس کے راستے میں ہیں۔ اس پر زحل کا سایہ ہے۔ مشتری اس کا غلام ہے۔ عطارد اس کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا رہتا ہے۔ اس کی پیدائش سات ستاروں کے گٹھ جوڑ سے عمل میں آئی ہے۔" برکھا نے جیسے سبق سنایا۔

"ایسا انکاری تو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔" اعور نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں مہاراج۔ وہ صدیوں میں پیدا ہوا ہے۔ اسی لیے تو میں اس کے پیچھے ہوں۔ آپ جانتے ہیں مہاراج برکھا جس کے پیچھے لگے' وہ کوئی معمولی انکاری نہیں ہوتا۔"

"ہاں' جانتا ہوں۔ اسی لیے میرا باپ تجھ سے بہت خوش ہے۔" اعور نے کہا۔ "اس انکاری کا نام بتا۔"

"ساحل عمر۔" برکھا نے اپنی چمکتی آنکھوں سے اعور کو دیکھا۔

"اوہ' اچھا وہ ہمارا دشمن۔"

"ہیں مہاراج۔ آپ اس سے واقف ہیں؟"

"بہت اچھی طرح۔"

"وہ کس طرح مہاراج؟"

"یہ راز ابھی ہمارے من میں ہے۔"

"کوئی بات نہیں مہاراج' آپ نہ بتائیں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اس کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ مہاراج وہ کئی سالوں سے میری نظروں میں ہے۔ میں اس پر کام کر رہی ہوں۔ اس کے لیے جال بن رہی ہوں۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اس پر سدھو کا جال پھینکا تو وہ بڑے آرام سے نکل گیا۔"

"ہوں۔" اعور نے گہرا سانس لیا۔ "فکر کیوں کرتی ہے۔ وہ اب ہم دونوں کا مشترکہ دشمن ہے۔ اس انکاری کی کمر توڑنا اب ہمارا فرض ہے۔"

"ہاں مہاراج۔ بہت ضروری ہے۔" برکھا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "وہ بہت قیمتی ہے۔"

"تیرے لیے قیمتی ہے تو میرے لیے وہ بہت اہم ہے۔ وہ میرے راستے کا پتھر ہے۔ اسے اب ٹھوکر لگانا ہی ہو گی۔"

"مہاراج میرا سدھو کیوں ناکام ہوا؟" اسے اپنے عمل کی ناکامی کا غم تھا۔ وہ جلد سے جلد

اس راز کو جان لینا چاہتی تھی۔

''تیرے سدھو کو جھکال نے بھرشٹ کیا ہے۔''

''اوہ' اب سمجھی۔'' برکھا کی سمجھ میں فوراً ہی ساری بات آ گئی۔ وہ بے قراری سے بولی۔

''مہاراج جھکال کا کچھ کریں۔''

''ہاسکل کو اس کے پیچھے لگانا ہوگا۔''

''ہاں مہاراج۔ وہی اس کو سبق سکھا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے تو دیئے بجھا۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ تو میرے پیغام کا انتظار کرنا۔''

''اچھا مہاراج۔ آپ کی بڑی مہربانی' آپ آئے۔'' یہ کہہ کر اس نے دیئے کی لو پر ہاتھ رکھ رکھ کر تمام دیوں کو بجھا دیا اور جب اس نے سامنے نظر کی جہاں اعور کی سواری موجود تھی' وہاں اب کچھ نہ تھا۔ اندھیرا اور مہیب سناٹا تھا۔

☆......☆......☆

ساحل عمر رشا ملوک کی تصویر کے سامنے کھڑا اس کی پینٹنگ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جمے ہوئے آنسو کئی دن ہوئے پگھل چکے تھے۔ اب اس کا چہرہ بالکل صاف ہو گیا تھا۔ اس لڑکی کے حسن میں کوئی ایسی بات تھی کہ جو کوئی اسے دیکھتا تھا تو بڑا لطیف احساس ذہن کے اندر جاگتا تھا۔ ایسا حسن جو دل میں ٹھنڈک کی طرح اترتا جاتا تھا۔ جب دیکھے' جتنی بار دیکھے' نظر ٹھہر جائے اور دل نظریں ہٹانے کو نہ چاہے۔

عابد منجم نے جب اس تصویر کو دیکھا تو وہ نظریں ہٹانا بھول گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کا وجود ہے۔ پھر ان کی زندگی نے وفا ہی نہ کی کہ وہ ان سے مزید معلومات حاصل کرتا۔ کافی دن سے رشا ملوک اسے خواب میں بھی نظر نہ آئی تھی۔ اس کے دل میں کبھی کبھی یہ خواہش جاگتی تھی کہ اگر یہ لڑکی اس دنیا میں موجود ہے تو اس سے ملاقات کرے۔ اس نے سوچا کہ اب اگر رشا ملوک اسے خواب میں نظر آئی تو وہ اس سے ملاقات کی شدید خواہش کرے گا اور اس سے اس کا پتہ دریافت کرے گا بشرطیکہ اسے خواب میں یہ بات یاد رہی۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی چیخی۔ اس کی محویت ٹوٹ گئی۔ اس نے بیڈ پر بیٹھ کر ریسیور اٹھایا اور دھیمے لہجے میں کہا۔

''جی۔''

''میرے رانجھن کیسے ہو؟'' وہی مترنم ہنسی' وہی کھنک دار لہجہ۔

''میں بہت اچھا ہوں۔'' ساحل عمر نے خوشدلی سے کہا۔

''کیا کر رہے تھے؟'' پوچھا گیا۔

''تمہیں یاد کر رہا تھا۔'' بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا۔ اپنی اس بات پر اسے حیرت بھی ہوئی کہ یہ اس نے کیا کہہ دیا اور کیوں کہہ دیا۔

''بڑی خوش قسمت ہوں میں کہ تم جیسے عظیم آرٹسٹ کی یادوں میں بستی ہوں۔'' اس نے

بڑے ناز سے کہا۔
''اور سناؤ؟'' ساحل نے رستہ تبدیل کیا۔
''آج شام تیار رہنا' میں آؤں گی تمہیں لینے۔''اس نے ایک دم اپنا پروگرام بتایا۔
''کیا ارادے ہیں؟''اس نے پوچھا۔ وہ اس کا پروگرام سمجھ نہ سکا۔
''بہت دن ہو گئے سمندر پر گئے ہوئے۔ سمندر پر چلنا ہے اور رات وہیں رہنا ہے۔'' اس نے کھل کر بتایا۔
''چاند کی کیا تاریخ ہے؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔
''چاند کی آخری تاریخ ہے۔'' ورشا بولی۔
''پھر رات کو تو وہاں اندھیرا ہوگا۔ سمندر کیا خاک نظر آئے گا۔'' ساحل عمر نے اسے سمجھایا۔
''کبھی تم نے اندھیری رات میں سمندر دیکھا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں' آج تک نہیں۔ البتہ فل مون میں سمندر کو دیکھا ہے۔ کیا قیامت خیز منظر ہوتا ہے۔''
''آج اندھیری رات کا سمندر دیکھنا......اس کا اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔''
''حسن نہ کہو' احساس کہو کیونکہ حسن کا تعلق دید سے ہے اور دید بغیر روشنی کے ممکن نہیں۔''
''ہاں رانجھن۔ تم نے اچھی بات کہی' اسے احساس ہی کہنا چاہیے۔'' ورشا نے ہنس کر کہا۔
''پھر چلو گے نا' ہم وہاں پہنچ کر پہلے ڈوبتے سورج کا نظارہ کریں گے۔ پھر اندھیری رات میں سمندر کو محسوس کریں گے اور جب صبح ہوگی تو طلوع ہوتے سورج کو دیکھیں گے۔ آہ کتنا مزہ آئے گا۔'' وہ خوش ہو رہی تھی۔
''اور ہٹ کا کیا ہوگا؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔
''ہٹ کی فکر مت کرو۔ وہاں ایک علیحدہ جگہ پر زبردست ہٹ ہے۔ وہاں عام لوگوں کا گزر نہیں ہے۔ ممی کے ایک جاننے والے ہیں' ان کی ہٹ ہے۔ فرنشڈ' پانی' بجلی' ڈش' ٹیلی ویژن وی سی آر...... کیا ہے وہاں جو نہیں ہے۔ رات' سمندر' میں اور تم......اور کیا چاہتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسی۔ اس کی یہ ہنسی اس کا دل لوٹ لیتی تھی۔ وہ پھر لٹ گیا۔
''چلو پھر چلتے ہیں......'' ساحل عمر نے فوراً کہا۔ یہ بات بھی بے اختیار اس کی زبان سے نکل گئی تھی جبکہ وہ اندر سے سمندر پر جانے کے لیے راضی نہ تھا۔
''اوہ' زندہ باد......میرے رانجھن زندہ باد۔ میں پھر شام کو آتی ہوں!'' یہ کہہ کر اس نے فوراً ٹیلی فون منقطع کر دیا۔
اسی وقت اس کی نظر سامنے دیوار پر پڑی۔ تب بے اختیار اس کے منہ سے نکلا
''ارے......!''

☆......☆......☆

سامنے دیوار پر رشا ملوک کی تصویر موجود نہ تھی۔
وہ ریسیور رکھ کر تیزی سے بیڈ سے اٹھا۔ وہ تصویر قالین پر پڑی تھی۔ وہ ورشا سے باتوں میں اس قدر مشغول تھا کہ فریم کے گرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اس نے فوراً تصویر اٹھا کر دیکھی۔ تصویر کے پیچھے بندھی ڈوری کھل گئی تھی۔ دیوار پر کیل موجود تھی۔ اس نے ڈوری کو دوبارہ مضبوطی سے باندھا اور تصویر دوبارہ کیل پر لٹکا دی۔ اس نے تصویر کو اچھی طرح دیکھا۔ اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔
اماں کمرے میں داخل ہوئیں تو انہوں نے ساحل کو رشا ملوک کی تصویر کا بغور معائنہ کرتے پایا۔ انہوں نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر پوچھا۔ ''ساحل! کیا ہوا؟''
''کچھ نہیں اماں! تصویر کی ڈوری کھل جانے کی وجہ سے تصویر نیچے گر گئی تھی، میں نے دوبارہ لگائی ہے۔'' اس نے بتایا۔
''حیرت ہے۔'' اماں نے کہا۔ ''آج تک تو کوئی تصویر نہیں گری۔''
''بس اماں گر گئی۔'' ساحل عمر نے بحث میں پڑنے کے بجائے بحث ختم کی اور پھر بولا۔ ''ہاں، اماں شام کو میں گھر سے باہر جاؤں گا۔ رات کو باہر ہی رہوں گا۔ کل دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔''
''کس کے ساتھ جا رہے ہو؟'' اماں نے پوچھا۔
''اماں ورشا ساتھ جا رہی ہے۔'' ساحل عمر نے صاف گوئی سے کام لیا۔
''جا کہاں رہے ہو؟'' انہوں نے پھر سوال کیا۔
''سمندر پر۔'' وہ بولا۔
''ٹھیک ہے جاؤ۔'' اماں نے خوشدلی سے جواب دیا۔
''لیکن اماں مسئلہ یہ ہے کہ آپ گھر پر اکیلی کیسے رہیں گی؟'' اس کا لہجہ تشویش بھرا تھا۔
''میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' انہوں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔
''پھر بھی اماں! میں آپ کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی آپ کے ساتھ رہے۔''
''ارے نہیں بیٹا! میں کوئی بچہ تھوڑی ہوں۔''

''اماں ایسا کریں۔ آج کی رات مرجینا کو اپنے پاس روک لیں۔ وہ ابھی گئی تو نہیں۔''
''نہیں ابھی کہاں جائے گی۔ ٹھیک ہے میں اس سے کہے دیتی ہوں۔ وہ تو بڑی خوشی سے رک جائے گی۔''
''چلو اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ خدانخواستہ کوئی مسئلہ ہو تو ناصر یا مسعود کسی کو بھی فون کر لینا۔'' ساحل عمر نے ہدایت کی۔

پھر چائے پی کر وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اٹھا تو شام ہونے والی تھی۔ وہ جلدی سے نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ قمیض اتارتے ہوئے آئینے میں نظر پڑی۔ اس نے دیکھا گلے میں تعویز موجود ہے۔ وہ نہاتے ہوئے تعویز اتار دیا کرتا تھا۔ وہ فوراً باہر آیا۔ اس نے تعویز کو رشا ملوک کی تصویر کے فریم کے ایک کونے پر لٹکایا۔ وہ تعویز اسی طرح لٹکا دیا کرتا تھا۔ باتھ روم سے نکلتا تو گلے میں ڈال لیتا۔ اگر فوراً گلے میں ڈالنا بھول جاتا تو کسی نہ کسی طرح اس کی نظر تعویز پر پڑ جاتی۔

آج وہ باتھ روم سے نہا کر نکلا تو ورشا اسے لینے آ چکی تھی۔ وہ لاؤنج میں اس کی منتظر بیٹھی تھی۔ وہ جلدی سے کپڑے تبدیل کر کے اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ بیگ اٹھانا نہ بھولا تھا۔

گیٹ کے باہر نکلا تو سامنے گاڑی موجود تھی۔ گاڑی میں ڈرائیور کی سیٹ پر ایک طباق سے چہرے والا شخص بیٹھا تھا۔ وہ ایک مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔
''یہ کون ہے؟'' ساحل عمر اسے دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹھکا۔
''یہ اس شخص کا ڈرائیور ہے جس کی ہٹ ہے۔ یہ ہمیں ہٹ تک پہنچا کر واپس آ جائے گا۔''
''اور گاڑی؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔
''گاڑی ہمارے پاس رہے گی۔''

وہ دونوں گاڑی کے نزدیک آ گئے تو وہ شخص بڑی پھرتی سے گاڑی سے باہر آیا۔ اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ بڑے مودبانہ انداز میں کھولا۔ جب وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تو اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور بڑی مستعدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اماں گیٹ پر کھڑی تھیں۔ انہوں نے جاتی ہوئی گاڑی پر پھونک ماری۔ ساحل عمر نے انکی ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہا۔ ورشا نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ہلکے سے دباتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ ''میرے رانجھن!''

ساحل عمر نے اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار مسکرا دیا۔

واسم نے آئینہ ٹھیک کرنے کے بہانے ایک لمحے کو ورشا کی طرف دیکھا اور پھر گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی۔

جب وہ سمندر کے کنارے پہنچے تو سورج اپنی تمازت کھو چکا تھا۔ وہ ہٹ واقعی شاندار تھی۔ دو منزلہ اس ہٹ میں ہر سہولت موجود تھی۔ واسم نے ہٹ کھولنے کے بعد گاڑی کی ڈگی میں بھرا ہوا سامان ہٹ میں منتقل کر دیا اور پھر گاڑی کی چابی ورشا کو دیتا ہوا بولا۔ ''بی بی جی میں جاتا ہوں۔ کل صبح

دس بجے تک پہنچ جاؤں گا۔"
"ٹھیک ہے۔" ورشا نے اس سے چابی لیتے ہوئے کہا۔ "دیکھو وقت پر پہنچ جانا۔"
"آپ فکر نہ کریں۔ میں ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ ہٹ سے نکل گیا۔
واسم ہٹ سے ضرور نکلا لیکن وہ ہٹ سے دور نہ گیا۔ وہ بڑی احتیاط سے ہٹ کی پشت پر گیا اور دروازہ کھول کر زینہ چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچا تو وہاں برکھا پہلے سے موجود تھی۔ اس نے اشارے سے پوچھا۔ "سب ٹھیک ہے؟"
"جی برکھا جی...... سب ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر واسم نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔
اوپر آنے کا راستہ ہٹ کے اندر سے بھی تھا لیکن اس دروازے کو لاک کر دیا گیا تھا۔ اوپر جانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ نیچے کا پورشن خاصا کشادہ اور شاندار تھا۔ پھر ہٹ بھی خاصی بلندی پر بنی ہوئی تھی۔ پھر بھی اگر ساحل اوپر جانے کی بات کرتا تو ورشا اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کرتی اور پھر بند پا کر غصے سے کہتی۔ "بے وقوف اوپر کا پورشن کھولے بغیر ہی چلا گیا۔" ظاہر ہے اس کے جواب میں ساحل عمر کو بھی کہنا پڑتا۔ "ارے کوئی بات نہیں۔"
واسم کے ہٹ سے جانے کے بعد ورشا نے مترنم لہجے میں کہا۔ "اچھا جناب، پہلے میں بناتی ہوں چائے۔ چائے پی کر پھر باہر نکلتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"
"ہیں تم چائے بنا لیتی ہو؟" ساحل عمر نے حیرت ظاہر کی۔
"جناب میں کھانا بھی زبردست پکاتی ہوں۔ آج رات کا کھانا جب پکا کر کھلاؤں گی تو انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔" اس نے ایک ادا سے کہا اور پھر کچن کی طرف بڑھ گئی۔
پھر وہ فوراً ہی مسکراتی ہوئی واپس آئی۔ ٹیلی ویژن پر رکھا ہوا ریموٹ کنٹرول اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دیا اور شوخی سے بولی۔ "جب تک تمہارے ہاتھ میں سویٹ ڈش آئے، اس وقت تک ورلڈ ڈش سے شوق فرماؤ۔"
"کھانے میں سویٹ ڈش بھی ہو گی؟" ساحل عمر نے ریموٹ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔
"کیوں نہیں ہو گی۔" اس نے چمکیلی نگاہوں سے ساحل کو دیکھا۔
"پھر تو تمہیں پوری رات کھانا پکاتے ہی گزر جائے گی۔" ساحل عمر نے خدشہ ظاہر کیا۔
"ارے نہیں، کیا سمجھا ہے مجھے۔" وہ اترا کر بولی۔ "اچھا پکاتی ہوں اور جلدی پکاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کچن میں چلی گئی۔
کیتلی چولہے پر رکھ کر وہ ساتھ لایا ہوا سامان کھولنے لگی۔
ساحل عمر نے ٹی وی آن کر کے چینل بدلنے شروع کیے۔ چند لمحے وہ ایک چینل کا جائزہ لیتا پھر آگے بڑھ جاتا۔ بالآخر وہ ایک میوزک چینل پر ٹھہر گیا۔ اس وقت سکرین پر میڈونا چھائی ہوئی تھی۔
میڈونا کے گانے کی آواز سن کر ورشا نے کچن سے جھانکا۔ "تھوڑی سی آواز بڑھا دو۔"
"اچھا!" ساحل عمر نے یہ کہہ کر تھوڑی سی آواز تیز کر دی۔ "کیا تمہیں میڈونا پسند ہے؟"

''ہاں بہت۔'' ساحل عمر نے زور سے کہا۔'' اور مائیکل جیکسن؟''
''اس کی تو دیوانی ہوں۔''
''تمہاری پسند آخر اس قدر تیزی سے تبدیل کیوں ہو جاتی ہے؟''
''کیا مطلب؟'' وہ کچن سے باہر نکل آئی۔
''دو دن پہلے تو تم نے کہا تھا کہ میں تمہاری دیوانی ہوں۔'' ساحل عمر نے بڑی معصومیت سے کہا۔
''وہ میں نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہوگا۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور شریر نگاہوں سے دیکھتی ہوئی پھر کچن میں چلی گئی۔
دو کپ چائے تیار کر کے اس نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا۔ پھر ایک چمچے میں دو چار بوند پانی لے کر اس پر ایک بار پھونک ماری اور اس چمچے کو ایک کپ میں ڈبو کر نکال لیا۔ ٹرے میں دونوں کپ سجائے۔ لاؤنج میں میز پر ٹرے رکھی۔ ساحل عمر کا کپ اس کے ہاتھ میں دیا اور اپنا کپ قالین پر رکھ کر ساحل عمر کے قدموں میں بیٹھ گئی۔
''ارے کہاں بیٹھ گئیں......اوپر آ جاؤ۔'' ساحل عمر نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔
''نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔ تمہارے چرنوں میں۔'' یہ کہہ کر اس نے اس کا پیر پکڑ لیا اور اسے چومنے کے لیے جھکی۔
''اوہ نو۔'' ساحل عمر نے فوراً اپنا پاؤں کھینچ لیا۔''خدا کے لیے ورشا مجھے انسان رہنے دو دیوتا مت بناؤ۔''
''تم میرے لیے کسی دیوتا سے کم نہیں۔'' اس نے بڑی عقیدت سے کہا۔
''او یار، میں کوئی دیوتا ویوتا نہیں، تم شرافت سے صوفے پر آ کر بیٹھ جاؤ۔ چائے پیو اور باہر نکلو۔'' ساحل عمر نے تنبیہی لہجے میں کہا۔
''اچھا۔'' وہ بڑی فرمانبرداری سے قالین سے اٹھ کر اس کے برابر بیٹھ گئی اور چائے پیتے ہوئے ایک خاص انداز میں دیکھنے لگی۔
''اب کیا ہوا؟'' وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے بولا۔
''ساحل، یو آر اے کلر۔'' وہ ایک ادا سے بولی۔
''یہ ڈائیلاگ میں نے کسی انگلش فلم میں سنا ہے اور شاید راکیل ویلچ کے لیے کہا گیا تھا۔ اس وقت وہ جس لباس میں تھی، یقیناً قاتل لگ رہی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ ایسا مکالمہ کسی عورت کے لیے ہی اچھا لگتا ہے۔'' ساحل عمر نے یہ کہہ کر کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔
''حالانکہ اصل قاتل مرد ہوتا ہے۔'' اس نے بات کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی۔
''میرا خیال ہے کہ مرد عورت کے معاملے میں خاصا بے وقوف واقع ہوا ہے۔ کوئی خوبصورت عورت کسی بھی مرد کو باآسانی بے وقوف بنا سکتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے الو بنا سکتی ہے۔ عورت مرد کی بڑی کمزوری ہے۔''

''کیا تم انہی مردوں میں سے ہو؟'' اس نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔
''میری کیا بات کرتی ہو...... میں تو پرلے درجے کا احمق ہوں۔''
''پھر تمہیں کیا الو بنانا' تم تو بنے بنائے ہو۔'' وہ ہنس کر بولی۔
''مجھے بے وقوف بنانے کا ارادہ تھا کیا؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں' میں بے وقوف بنانے پر یقین نہیں رکھتی۔ سچ بتاؤں ساحل' میں تمہارے بارے میں تضادات کا شکار ہوں۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔
''کیا کہنا چاہتی ہو؟''
''پتہ نہیں' ساحل میں کیا چاہتی ہوں۔ تم کیا چاہتے ہو۔ کوئی اور کیا چاہتا ہے۔'' وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔
''ارے' تم تو سیریس ہو گئیں۔'' ساحل عمر نے اپنا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''بھئی تم نے بہت اچھی چائے بنائی۔''
''تھینک یو۔'' ورشا نے مسکرا کر کہا۔
جب وہ بھی چائے پی چکی تو اس نے اپنا کپ میز پر رکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''آؤ چلو سمندر پر چلیں۔''
یہ ایک مخصوص بیچ تھا۔ یہاں عام لوگوں کا گزر نہ تھا۔ آج تو یہاں خاص لوگ بھی برائے نام تھے۔ بس دو چار جوڑے کچھ فاصلے پر اپنی اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ چھٹی کا دن جو نہ تھا۔
ساحل عمر اور ورشا دونوں ہی جینز اور شرٹوں میں تھے اور اس وقت یہ واحد جوڑا تھا جو سر سے پیر تک ڈھکا ہوا تھا جبکہ جو لوگ آس پاس نظر آ رہے تھے' ان کے مرد نیکر پہنے ہوئے تھے اور عورتیں نہانے کے لباس میں تھیں۔ یہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کوئی پاکستانی سمندر کا کنارہ ہے۔
سورج سمندر کی طرف جھک رہا تھا اور ورشا ساحل عمر کا ہاتھ پکڑے سمندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔
سامنے بے کراں سمندر پھیلا ہوا تھا۔ سمندر کا اپنا ایک حسن ہے۔ آپ اسے ڈوبتے سورج کے پس منظر میں دیکھیں یا نکلتے سورج کے پیش منظر میں۔ ماہ کامل میں اس کا نظارہ کریں یا مختلف موسموں میں اسے دیکھیں۔ آپ اسے ہر بار مختلف پائیں گے۔ یہ صبح کچھ ہوتا ہے' دوپہر کو کچھ اور شام کو کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کا مزاج بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس کے تیور محبوب جیسے ہوتے ہیں اور دلکشی میں بھی محبوب جیسا ہوتا ہے۔
ساحل عمر کو سمندر بہت پسند تھا۔ وہ اسے دیکھ کر پاگل ہو جاتا تھا۔ سمندر کی لہریں اس کے دل کے تاروں کو ہلا دیتیں۔ جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے سمندر اسے پکار رہا ہو' بلا رہا ہوں۔ وہ سمندر میں بے پناہ کشش محسوس کرتا تھا اور یہ کشش اس وقت دگنی ہو گئی تھی۔ ایک حسین لڑکی کا ہاتھ جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک طرف پر کشش لڑکی دوسری طرف پر کشش سمندر...... دو کششیں ایک ساتھ مل گئی تھیں۔ وہ پاگل کیسے نہ ہو جاتا۔

اس نے ورشا کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور سمندر کی طرف بھاگنے لگا۔
''رک جاؤ ساحل......زیادہ اندر مت جاؤ' مجھے اس کی موجوں سے ڈر لگتا ہے۔'' ورشا نے اسے مزید آگے جانے سے روکنا چاہا۔
''ڈرتی ہو۔'' ساحل عمر نے رک کر کہا۔
''ڈرتی نہیں ہوں' احتیاط لازم ہے۔ سمندر چڑھا ہوا ہے۔ زیادہ اندر جانا ٹھیک نہیں۔''
اتنی دیر میں سمندر کی ایک بڑی لہر آئی۔ ان دونوں کے قدم ڈگمگانے لگے۔
اسی وقت واسم پردہ چھوڑ کر برکھا سے مخاطب ہوا۔ ''وہ دونوں سمندر میں جا چکے۔'' وہ بڑی دیر سے پردے سے لگا بیٹھا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ پردہ ہٹا کر دیکھ لیتا تھا۔ بالآخر ورشا اور ساحل اسے سمندر میں جاتے ہوئے نظر آ ہی گئے۔
''آؤ' پھر نیچے چلو۔'' برکھا نے فوراً کہا۔
''آیئے!'' واسم نیچے کے دروازے کی اپنی جیب میں چابی ٹٹولتا ہوا زینہ اترنے لگا۔

☆......☆......☆

وظائف کی کتاب کے صفحہ سات پر جو عمل دیا گیا تھا' اس کو پڑھنے کے لیے حافظ موسیٰ نے جو ہدایات دی تھیں' اس کے مطابق اس عمل کو رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان کرنا تھا۔ دوسرے کمرے میں مکمل تاریکی کا ہونا بہت ضروری تھا۔
اس عمل کے لیے ناصر مرزا کا اسٹڈی روم بہترین تھا۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے جن کی وجہ سے کمرے میں گہری تاریکی ممکن تھی۔ کوئی پونے بارہ بجے کے قریب ناصر مرزا کمرے میں آیا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ گھر والوں کو ہدایت کر دی کہ اسے کسی بھی صورت میں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ پردے کھلے ہوئے تھے۔ اس نے پردے برابر کیے۔ عمل کرنے کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا۔ پھر ٹھیک بارہ بجے کمرے کی لائٹ آف کر کے وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔
اس وظیفے پر کوئی خاص محنت نہ تھی۔ پانچ راتوں کا وظیفہ تھا۔ وظیفے کے دوران زیادہ پڑھنا بھی نہ تھا۔ جو بتایا گیا تھا اسے پندرہ بیس منٹ میں بآسانی ختم کیا جا سکتا تھا۔
ناصر مرزا کو ابھی وظیفہ شروع کیے پانچ سات منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ اس نے اپنے بہت قریب کتے کے رونے کی آواز سنی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کتا کمرے میں موجود ہو۔
کتے کے رونے کی منحوس آواز کو سن کر ناصر مرزا بے اختیار چونک پڑا۔

☆......☆......☆

نیچے پہنچ کر واسم کھڑکی کا ذرا سا پردہ ہٹا کر بیٹھ گیا تا کہ اگر وہ دونوں ہٹ میں واپس آرہے ہوں تو برکھا کو بروقت اطلاع کر سکے۔ برکھا نے کچن کا رخ کیا۔ وہاں ایک ٹرے میں مرغی کا گوشت موجود تھا۔ برکھا نے گوشت میں سے مرغی کی دونوں ٹانگیں نکال لیں اور اوپر سے لائی ہوئی ایک ٹانگ اس نے گوشت میں شامل کر دی۔ اس ٹانگ پر اس نے عمل کیا ہوا تھا۔ یہ ٹانگ پروگرام کے مطابق ساحل عمر کو کھلائی جانی تھی۔ نکالی ہوئی دونوں ٹانگیں اس نے ایک پلیٹ میں ڈال کر فریج میں رکھ دیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے بیڈ روم کا رخ کیا۔ اس نے بیڈ پر بیٹھ کر ایک تکیہ اٹھایا اور اسے اپنی گود میں رکھ لیا۔ پھر کچن سے لائی ہوئی چھری کی نوک پر اس نے کچھ پڑھ کر پھونکا اور اس چھری سے تکیے پر ساحل کا نام لکھا۔ کوئی دس منٹ تک وہ اسی طرح بیٹھی چھری پر پڑھ کر پھونکتی اور ساحل کا نام لکھتی رہی۔

آخری بار جب اس چھری سے تکیے پر نام لکھا تو سفید تکیے پر اس کا نام ابھر آیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا نام تازہ خون سے لکھا گیا ہو اور یہ خون چھری سے نکلا ہو...... لیکن چھری کی نوک بالکل صاف تھی۔ تکیے پر ساحل کا نام دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

اس نے وہ تکیہ اپنی گود سے اٹھا کر بیڈ پر الٹ دیا اور اس پر اپنا بایاں ہاتھ رکھ کر دھیرے سے نعرہ لگایا۔ ''کالی واہ۔''

اور پھر فوراً ہی تکیے کو سیدھا کر دیا۔ اب اس تکیے سے ساحل عمر کا نام صاف ہو چکا تھا۔ اس بیڈ پر دو تکیے تھے اور دونوں یکساں تھے۔ ساحل عمر کے تکیے کی پہچان کے لیے اس نے تکیے کے ایک کونے پر لپ اسٹک لگا دی۔ اس نشان کو ساحل عمر محسوس نہیں کر سکتا تھا لیکن ورشا فوراً پہچان سکتی تھی۔

اس تکیے کو الگ رکھ کر اس نے دوسرے تکیے کو اپنے نزدیک کیا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی۔ اس نے آسودگی سے آنکھیں بند کر لیں۔

باہر سورج کب کا ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ واسم ان پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ دونوں جب سمندر کی موجوں سے کھیل کر تھک گئے تو انہوں نے سوچا کہ اب ہٹ کی طرف چلا جائے۔ ویسے بھی اندھیرا اب اتنا ہو گیا تھا کہ سمندر کی لہر کا ٹھیک طرح سے اندازہ کرنا ممکن نہ تھا۔

وہ دونوں جب ہٹ کی طرف بڑھنے لگے تو واسم نے فوراً پردہ چھوڑ دیا۔ ہٹ کے اندر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ واسم نے فوراً جیب سے لائٹر نکالا۔ اسے جلا کر تیزی سے بیڈ روم کی طرف بڑھا اور دروازے پر پہنچ کر اس نے اندازہ کیا کہ برکھا کہاں ہے۔ لائٹر کی دھیمی روشنی میں وہ اسے بیڈ پر لیٹی ہوئی نظر آئی۔ اس نے گھبرا کر آواز دی۔ ''برکھا جی!''

برکھا اس کی آواز سن کر فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''ہاں کیا ہوا؟''

''وہ آ رہے ہیں۔''

''اوہ' چلو پھر نکلو یہاں سے...... لیٹے لیٹے مجھے نیند آ گئی تھی۔'' برکھا تیزی سے اٹھتی ہوئی بولی۔

لائٹر کی روشنی میں ہی وہ دونوں جس طرح اوپر سے آئے تھے' ویسے ہی واپس چلے گئے۔

''اوہ' یار یہاں تو بھیانک اندھیرا ہے۔'' ساحل عمر نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں سمندر پر جانے سے پہلے لائٹیں جلا کر جانا چاہیے تھا۔''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں' تم دروازے پر رکو۔ میں اندر جا کر لائٹ جلاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"ورشا کیا تم اس سے پہلے بھی یہاں آچکی ہو؟"

"ہاں، میں کئی مرتبہ یہاں آئی ہوں، اپنی ممی کے ساتھ۔" ورشا اندر جاتے ہوئے بولی۔

"لیکن تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟"

"اس لیے کہ تمہیں اس ہٹ میں آکر ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ تم یہاں کی ہر چیز سے مانوس ہو۔ یہاں تک کہ تم یہ بھی جانتی ہو کہ لائٹ کے بٹن کہاں ہیں۔" ساحل عمر نے وضاحت کی۔

"تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا میرے رانجھن! تم کتنے ذہین ہو۔" ورشا نے لائٹ آن کرتے ہوئے کہا۔

"اب یہ ذہین آدمی تھوڑا سا نہانا چاہتا ہے۔" ساحل عمر نے اپنا بیگ کھول کر کپڑے نکالتے ہوئے کہا۔ "باتھ روم کدھر ہے؟"

"جناب تھوڑا سا کیوں...... بہت سا نہایئے۔ پانی کی یہاں کوئی کمی نہیں۔" ورشا نے ہنس کر کہا۔ "باتھ روم بیڈ روم کے ساتھ ہے، وہ سامنے۔"

ساحل عمر باتھ روم میں گھسا۔ یہ ایک صاف ستھرا باتھ روم تھا۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے پر قرینے سے رکھی تھی۔ باتھ روم میں داخل ہوتے ہی اسے اپنے تعویز کا خیال آیا۔ اس کا گلا خالی تھا۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ گھر سے نکلتے ہوئے عجلت میں تعویز پہننا ہی بھول گیا۔ بیگ میں دو جوڑے اور کچھ ضرورت کی چیزیں اماں نے رکھ دی تھیں۔ بس وہ ورشا کو بیٹھا دیکھ کر جلدی سے بیگ اٹھا کر گھر سے نکل آیا تھا۔

تعویز کو گلے میں نہ پا کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ جہاں تھا، وہاں اس تعویز کی اشد ضرورت تھی اور وہیں وہ موجود نہ تھا۔ آخر وہ تعویز گلے میں ڈالنا بھولا کیسے؟ کیا اس بھول میں ورشا کا ہاتھ تھا؟ اس بات کا جواب دینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔

وہ نہا کر باہر نکلا تو ورشا کو کچن میں مصروف پایا۔

"واہ، بڑی زبردست خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں۔" ساحل عمر کچن کے دروازے میں کھڑا ہو کر بولا۔

"میرے رانجھن، تم یہاں کھڑے ہوئے بہت اچھے لگ رہے ہو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تم سدا اسی طرح کھڑے رہو اور میں یونہی تمہارے لیے کھانا بناتی رہوں۔" ورشا نے الٹے ہاتھ کی پشت سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"اس طرح تو میں کھڑا کھڑا سوکھ جاؤں گا۔ تم کوئی ڈھنگ کی خواہش نہیں کر سکتیں؟" وہ ہنسا۔

"کیوں نہیں...... خواہشیں اتنی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔" اس نے ایک ادا سے دیکھا۔

"دم نہ نکالو، کھانا نکالو۔"

"بھوک لگی ہے؟" اس نے پوچھا۔

''ایسی ویسی۔'' ساحل عمر نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا۔
''بس دس پندرہ منٹ اور لگیں گے۔'' اس نے تسلی دی۔
''اوکے' میں جب تک ڈش سے دل بہلاتا ہوں۔'' وہ لاؤنج کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ پھر بولا۔ ''کیا تم نہاؤ گی نہیں؟''
''کیوں نہیں۔'' ورشا نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ ''شاور لینے میں مجھے دو منٹ لگتے ہیں۔''

اس نے کڑھائی گوشت اور بیسن کا حلوہ بنایا تھا۔ نان وہ ساتھ لے کر آئی تھی۔ اس نے سچ کہا تھا۔ اس نے کھانا بہت لذیذ اور منٹوں میں تیار کیا تھا۔ ساحل عمر گوشت بہت کم کھاتا تھا۔ جب اس نے تکلف دکھایا تو ورشا نے کہا۔ ''آج میں جو کھلاؤں گی' وہ کھانا پڑے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اس کی پلیٹ ڈشت سے بھر دی۔ اسی میں وہ ٹانگ بھی موجود تھی جس پر برکھا نے کچھ عمل کیا تھا۔ دوسری بوٹیوں کے ساتھ وہ ٹانگ بھی ساحل عمر کے پیٹ میں چلی گئی۔

کھانا کھاتے ہوئے ورشا اسے کچھ دینے کے لیے بار بار جھک رہی تھی۔ نہا کر اس نے پینٹ شرٹ پہن لی تھی۔ اس کی شرٹ کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔ وہ بٹن لگانا بھول گئی تھی یا دانستہ اس نے گلا کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ وہ کبھی پلیٹ دینے' کبھی سالن نکالنے' کبھی پانی دینے کے لیے بار بار جھک رہی تھی۔

ساحل عمر سے جب رہا نہیں گیا تو اس نے مہذبانہ انداز میں کہا۔ ''تمہاری قمیض کے بٹن کھلے رہ گئے ہیں شاید؟''

''اوہ سوری۔'' ورشا نے پریشان ہو کر اسے دیکھا اور پھر فوراً ہی اپنے گلے کو سنبھال لیا۔ اسے ساحل عمر سے اس جملے کی توقع نہیں تھی۔

لیکن ساحل عمر چند ایسے نوجوانوں میں سے تھا جن سے ایسے جملے کی توقع کی جانی چاہیے۔

کھانے کے بعد اس پر کچھ غنودگی سی چھانے لگی تو وہ صوفے پر ہی پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ ورشا نے چائے بنائی۔ اسے ہلا کر اٹھایا۔ ''جناب چائے' کیا نیند آ رہی ہے؟''

''ہاں' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مجھے نیند کیوں آ رہی ہے۔ شاید میں نے زیادہ کھانا کھا لیا ہے۔''

''کوئی زیادہ ویادہ نہیں کھایا۔ چڑیا جیسی تو آپ کی خوراک ہے۔ آپ سے زیادہ تو میں نے ہی کھا لیا تھا۔'' ورشا ہنس کر بولی۔ ''چلیں چائے پی لیں۔ ایک دم کڑک ہے۔ آنکھیں کھل جائیں گی۔''

ساحل عمر نے خاموشی سے چائے کا کپ لیا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔
''کیا بہت نیند آ رہی ہے؟''
''ہاں بھئی!''
''پھر بیڈ روم میں جا کر لیٹ جائیں' تھوڑی دیر سو لیں۔ پھر میں آپ کو اٹھا لوں گی۔'' پھر

اس نے ترچھی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ’’یہ بات یاد رکھیں کہ آپ یہاں سونے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ باتیں کریں گے، تاش کھیلیں گے، میوزک سنیں گے۔ میں اپنی پسند کے کیسٹ لے کر آئی ہوں۔‘‘

’’اچھا، ہاں، ضرور۔‘‘ اس نے بمشکل آنکھ کھول کر چائے کا گھونٹ لیا۔ پھر کپ اس کی طرف واپس کرتے ہوئے بولا۔ ’’بھئی مجھے نیند آ رہی ہے۔ کچھ دیر سو جاؤں۔ یہ تم نے کھانے میں کچھ ملا دیا تھا کیا؟‘‘

’’میرے رانجھن! جو کھانا تم نے کھایا ہے، وہی کھانا میں نے بھی کھایا ہے۔ مجھے تو نیند نہیں آ رہی۔‘‘

’’بھئی مجھے تو آ رہی ہے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ صوفے پر ہی لڑھک گیا۔

ورشا نے بیڈ روم سے لپ اسٹک لگا تکیہ اٹھایا اور اس کے سر کے نیچے رکھتی ہوئی بولی۔ ’’سر اٹھائیں، یہ تکیہ لگا لیں۔‘‘

’’اچھا!‘‘ ساحل عمر نے بمشکل سر اٹھایا۔ ورشا نے تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھ دیا اور بولی۔ ’’اب آرام سے سو جاؤ میرے رانجھن...... گڈ بائی......‘‘

ساحل عمر نے کچھ جواب دینا چاہا لیکن وہ بول نہ سکا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ نرم نرم روئی میں دھنستا چلا جا رہا ہو۔ چند لمحوں کے بعد وہ اپنے ہوش گنوا بیٹھا۔

ورشا کچھ دیر بیٹھی اس کی صورت دیکھتی رہی۔ ساحل عمر ایک خوبصورت لڑکا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت چھائی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے ہونٹوں کی بناوٹ ہی کچھ اس طرح کی تھی کہ وہ ہونٹ بند کرتا تو یوں لگتا جیسے دھیرے سے مسکرا رہا ہو۔

ورشا اس وقت متضاد کیفیت سے دوچار تھی۔ ماں کے پلان کے مطابق اس نے ہر وہ کام کر دیا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ وہ خوش تھی کہ اس نے اپنی ممی کے منصوبے کو بخیر و خوبی پایہ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔

ایک طرف وہ خوش تھی تو دوسری طرف وہ خوفزدہ بھی تھی، افسردہ بھی تھی۔ وہ اپنی ماں کے عزائم سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی ماں نے مچھلی پکڑنے کے لیے اسے چارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ چارہ بننے پر مجبور تھی۔ اس میں انحراف کی قوت ہی نہیں رہی تھی۔ شروع میں تو وہ اسے ایک کھیل ہی سمجھتی رہی تھی لیکن اب جبکہ ساحل عمر گہری نیند سو چکا تھا تو اس پر ایک افسردگی سی چھا گئی تھی۔ شاید وہ اپنے کیے پر پچھتا رہی تھی۔

پھر اچانک اس کے دماغ میں ایک امید کی کرن چمکی۔ اس نے ساحل عمر کے گلے کو ٹٹولا۔ پھر قمیض کا ایک بٹن کھول کر دیکھا۔ جانے کیوں اسے دیکھ کر شاک لگا۔ اس کے گلے میں تعویذ نہ تھا۔ اب ساحل عمر کو کوئی بچانے والا نہ تھا۔ اس کے بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔

ورشا کچھ دیر گم صم بیٹھی رہی، پھر وہ بے اختیار اس کے چہرے پر جھکنے لگی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر آئی بات ساحل عمر کے ہونٹوں کو سنا دی۔ پھر وہ اٹھی۔ اٹھتے ہوئے اس کے دل میں آیا کہ وہ کہے۔ ’’اللہ تمہارا نگہبان ہو۔‘‘ مگر وہ دل میں آئی بات ہونٹوں پر نہ لا سکی۔

اس نے زینے کے دروازے پر تین بار دستک دی۔ کچھ دیر توقف کیا۔ زینے پر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ دروازے کے تالے میں چابی گھومی اور پھر دروازہ کھل گیا۔
دروازہ واسم نے کھولا تھا۔ وہ ورشا کو دیکھ کر ایک طرف ہو گیا۔ ورشا خاموشی سے زینہ طے کرنے لگی۔

☆......☆......☆

ناصر مرزا نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ کتے کے رونے کی آواز سن کر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور عمل جاری رکھا۔ کمرے میں اندھیرا ہونے کے باوجود دو چمکدار آنکھیں اسے گھورتی ہوئی نظر آئیں۔ ساتھ ہی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ کتا تھا' بھیڑیا تھا جو بھی تھا لیکن تھا گدھے جتنا اونچا کیونکہ اس کی آنکھیں خاصی اونچی تھیں۔ وہ کتے کی طرح ہانپ رہا تھا اور بھیڑیئے کی طرح غرا رہا تھا۔
ناصر مرزا مضبوط دل گردے کا مالک تھا۔ پھر حافظ موسیٰ نے اس عمل کے تمام نشیب و فراز اسے سمجھا دیئے تھے۔ خوف کی ایک ہلکی سی لہر اس کے دل میں ضرور اٹھی تھی لیکن ساتھ ہی یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔
ناصر مرزا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور عمل جاری رکھا۔
"اوہ بے وقوف تو کن چکروں میں پڑا ہے۔" کمرے میں اچانک ایک آواز گونجی۔ یہ بڑی کرخت آواز تھی۔
ناصر مرزا نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں وہ موجود تھی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔
"آنکھیں کھول کر کیا دیکھتا ہے۔ اپنی یہ خرافات بند کر ورنہ پچھتائے گا۔" پھر وہی آواز گونجی۔
ناصر مرزا اندازہ نہ کر پایا کہ یہ آواز کس کی ہے۔ آیا یہی کتا یا بھیڑیا بول رہا ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی کمرے میں موجود ہے۔ ناصر مرزا نے خاموشی سے اپنا عمل جاری رکھا۔
"سنتا نہیں' کیا بہرہ ہے؟ دیکھتا نہیں' کیا اندھا ہے؟ کیوں اپنی زندگی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ تو جانتا نہیں کہ ہم جس کے پیچھے لگ جاتے ہیں' اسے مار کر ہی چھوڑتے ہیں۔" وہ جو بھی تھا' مسلسل دھمکیاں دیئے جا رہا تھا۔
ناصر مرزا مصلے پر بیٹھا تھا۔ دائیں ہاتھ میں اس کے تسبیح تھی۔ وہ پورے اعتماد سے اپنا عمل جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کی انگلی کے درمیان تیزی سے تسبیح کے دانے پھسل رہے تھے۔
"او بے وقوف بند کر اپنی بکواس...... نہیں تو میں تیرے اوپر چھلانگ لگا رہا ہوں۔ تیری کھوپڑی اتار کر لے جاؤں گا۔" اس کے ساتھ ہی غراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔
ناصر مرزا نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھایا۔ اس کے پاس ہی چھ سیل کی ایک پاورفل ٹارچ رکھی ہوئی تھی۔ اب حد ہو گئی تھی۔ اس کی بکواس مسلسل جاری تھی۔ اس کو تھوڑا سا سبق سکھانا ضروری ہو گیا

تھا۔ ناصر مرزا نے بائیں ہاتھ میں ٹارچ تھام کر اس کا بٹن ایک دم آن کر دیا۔ ٹارچ کی تیز روشنی اس خبیث پر پڑی۔

ایک لمحے کو ناصر مرزا کا دل کانپ کر رہ گیا۔ وہ انتہائی خوفناک شکل کا جانور تھا۔ وہ نہ کتا تھا نہ بھیڑیا تھا۔ وہ ان دونوں سے ملتا جلتا ضرور تھا لیکن وہ چیز ہی کچھ اور تھا۔ اس کا قد بھی گدھے جتنا تھا۔ ٹارچ کی روشنی پڑتے ہی وہ جیسے کسی غبارے کی طرح پھٹ گیا۔ ایک تیز غراہٹ سنائی دی اور پھر سامنے کچھ نہ رہا۔

ناصر مرزا نے فوراً ہی ٹارچ بند کر دی اور اپنا عمل جاری رکھا۔ کمرے میں پھر سے گہری تاریکی چھا گئی۔

☆......☆......☆

ورشا اوپر پہنچی تو برکھا کو شدت سے منتظر پایا۔ وہ اسے دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھی۔ "اوہ میری جان!" یہ کہہ کر اس نے ورشا کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ برکھا کے گلے لگتے ہی اسے شدید بدبو کا بھبکا محسوس ہوا۔ وہ جلدی سے اس سے الگ ہو گئی اور زبردستی مسکرائی۔ "ہائے ممی!"

"کیا ہوا؟" برکھا نے ورشا کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ پر بٹھا لیا جبکہ واسم دروازہ کھول کر گیلری میں چلا گیا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر سمندر کو دیکھنے لگا۔ سمندر دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ سنائی ضرور دے رہا تھا۔ لہروں کی آواز اندھیرے میں بڑی خوفناک محسوس ہو رہی تھیں۔

"ممی جو تم چاہتی تھیں وہ ہو گیا ہے۔" ورشا نے گہرا سانس لے کر کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے لہجے سے اداسی ظاہر نہ ہو اس لیے وہ تھوڑا سا مسکرائی بھی۔ "وہ سو رہا ہے گہری نیند۔ میں نے اسے بوٹی بھی کھلا دی ہے اور تکیہ بھی اس کے سر کے نیچے رکھ دیا ہے۔"

"اوہ میری بچی تیرا جواب نہیں۔" وہ ورشا کا ہاتھ چومتی ہوئی بولی۔ "مجھے مانا حاصل ہو جائے پھر دیکھ میں تیرے لیے کیا کرتی ہوں۔"

"ممی بھاڑ میں جائے تمہارا مانا۔" اسے ایک دم غصہ آ گیا لیکن یہ ایسا غصہ تھا جس کا اظہار ممکن نہ تھا۔ وہ اندر ہی اندر غصے کو پی گئی۔ اس طرح زبان پر آئے ہوئے الفاظ بھی آواز نہ بن سکے۔

اس نے خاموش نگاہوں سے ممی کو دیکھا اور پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"کیا ہوا ورشا...... تم کچھ پریشان ہو۔" برکھا نے پوچھا۔

"نہیں ممی! میں ٹھیک ہوں۔"

"اچھا تم لیٹ جاؤ...... لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں۔" برکھا نے تیز نظروں سے اس کی پیشانی کی طرف دیکھا اور کچھ پڑھ کر پھونکا۔ درد کی ایک تیز لہر اس کے سر میں اٹھی۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ "اوہ ممی۔"

"لیٹ جاؤ۔" برکھا نے حکم دیا۔ اس کے لہجے میں غراہٹ آ گئی تھی۔

"اچھا ممی۔" ورشا کے حواس یکدم جواب دے گئے۔ اسے لگا جیسے اسے جکڑ لیا گیا ہو۔ اس نے بے بسی سے برکھا کی طرف دیکھا اور بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

برکھا نے اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر دیئے۔ اس کے سر سے تکیہ نکال دیا۔ سر ذرا سا اوپر کو دیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ ایک ٹک چھت کو گھورے جا رہی تھی۔

''ورشا' آنکھیں بند کر لو اور یاد رکھو اب تم اس وقت تک نہیں اٹھو گی جب تک میں یہ نہ کہوں کہ ورشا اٹھ جاؤ۔ سن لیا تم نے ورشا۔'' اس نے حکم دیا۔

''جی ممی' میں نے سن لیا...... میں آنکھیں بند کر رہی ہوں۔'' ورشا نے کسی معمول کی طرح آنکھیں بند کر لیں۔

''واسم!'' برکھا نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے آواز دی۔

''جی برکھا جی۔'' وہ فوراً اندر آ گیا۔

''دیکھو' یہاں ورشا لیٹی ہے۔ میں نیچے جا رہی ہوں۔ تم گیلری میں کھڑے رہو گے۔ ذرا آنکھیں کھلیں رکھنا۔''

''جی!'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''جاؤ!'' برکھا نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

واسم فوراً دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کر لیا اور گیلری میں مستعد ہو کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ بند ہونے کے بعد برکھا نے ہاتھ اٹھا کر ایک زوردار انگڑائی لی۔ رقص کے انداز میں گھومی اور پھر بڑے سرشار انداز میں دروازہ کھول کر نیچے اترنے لگی۔

ساحل عمر آنکھیں موندے لیٹا تھا' اسے اپنی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس پر کیا گزرنے والی ہے۔ برکھا آنکھوں میں خواہشات کے خواب سجائے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے مذموم عزائم میں کامیاب ہوتی' زینے کا دروازہ دھاڑ سے کھلا۔ واسم تیزی سے اندر آیا۔ وہ واسم کو اپنے سامنے پا کر غصے سے چیخی۔ ''کیا ہے؟''

''برکھا جی غضب ہو گیا۔'' وہ بمشکل بولا۔

☆......☆......☆

واسم نے بڑے غلط وقت پر مداخلت کی تھی۔ برکھا اسے دیکھ کر ایک دم جل اٹھی تھی۔ وہ بھڑکتا شعلہ بن گئی تھی۔ لیکن جب اس نے واسم کے چہرے پر نظر کی' تو اسے احساس ہوا کہ کوئی سنگین صورت حال ہے۔ واسم کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ اگر کوئی سنگین صورت حال نہ ہوتی تو واسم ہرگز مداخلت بے جا کا مرتکب نہ ہوتا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ واسم حکم کا غلام تھا' لیکن عقل بھی رکھتا تھا۔ اس وقت اس نے اسی لیے حکم عدولی کی تھی۔ اپنی حدود توڑ کر برکھا کے ''شبستان'' میں داخل ہو گیا تھا۔

''کیا ہوا؟ جلدی بولو؟'' برکھا نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''وہ مہاکال آ رہا تھا؟'' واسم نے پوری صورت حال ایک جملے میں بیان کر دی۔

''مہاکال۔'' وہ کچھ حیرت اور کچھ غصے سے بولی۔ پھر وہ فوراً ہی قالین پر آسن جما کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بازو پر اس جگہ انگوٹھا رکھ کر دبایا جہاں بچھو اس کے بازو پر گدا ہوا تھا۔ انگوٹھا اس

نے بچھو کے منہ پر رکھا اور پھر اس نے اپنے منہ سے کچھ عجیب سے لفظ نکالے اور گھٹی گھٹی آواز میں بولی "اعور مدد...... اعور مدد...... اعور ہاسکل کو بھیج۔"

جھکال جواب ہٹ کے نزدیک آ پہنچا تھا اور جس کے لیے بند دروازے اور پتھر کی دیواریں کوئی معنی نہ رکھتی تھیں' چند لمحوں بعد وہ برکھا کو اس کے کیے کی سزا دینے والا تھا کہ اندھیرے کو چیرتا ہوا ہاسکل نمودار ہوا۔

وہ ہاسکل جو نہ کتا تھا اور نہ بھیڑیا' لیکن گدھے کی طرح جسیم تھا۔ اس کی خوفناک چمکتی آنکھیں...... سیاہ رات جیسا رنگ۔ وہ تاریکی میں محض اپنی آنکھوں کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ اس نے چھلانگیں مارتے جھکال کی ایک ٹانگ اپنے بڑے سے بھیانک منہ میں دبا کر چبا ڈالی۔

جھکال اس ناگہانی مصیبت کو سمجھ نہ پایا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو اپنے سامنے کسی ایسی چیز کو پایا' جسے اس نے اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔

دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے اور باہر کی فضا خوفناک آوازوں سے گونجنے لگی۔

کچھ دیر کے بعد ایک دم سناٹا چھا گیا۔ بس موجیں مارتے سمندر کی آواز باقی رہ گئی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن تین بجے کے قریب ساحل عمر کے گھر کے سامنے ایک گاڑی رکی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹوں پر دونوں ماں بیٹی براجمان تھیں اور اگلی سیٹ پر ساحل عمر موجود تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر پچھلی کھڑکی پر آیا۔ ادھر برکھا اور دوسری طرف ورشا بیٹھی تھی۔ ساحل عمر نے جھک کر گاڑی کے اندر جھانکا۔

ورشا نے اسے دیکھ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ لیکن ساحل عمر نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ برکھا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تب برکھا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا' اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ساحل عمر نے اس کا ہاتھ بے تابی سے تھام لیا۔ ورشا یہ دیکھ کر ایک دم بجھ سی گئی۔

"اچھا ساحل پھر ملیں گے۔ دیکھو فون کرنا نہ بھولنا۔ میں انتظار کروں گی۔" جو بات ورشا نے کہنا تھی' وہ برکھا نے کہی۔

"کیوں نہیں برکھا جی' میں آپ کو ضرور فون کروں گا۔" جو بات ورشا نے سننا تھی وہ برکھا نے سنی۔

"اچھا بائی۔" برکھا نے اسے چمکتی آنکھوں سے رخصت کیا۔

"بائی۔" وہ یہ کہہ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"واسم چلو!" برکھا نے حکم دیا۔

برکھا کے حکم کے ساتھ ہی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ ساحل عمر بڑی دلچسپی سے گاڑی کو جاتا دیکھتا رہا۔ جب وہ گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی' تو اس پر اداسی سی چھا گئی' اس کا جی چاہا کہ "اپنی گاڑی نکال کر ان لوگوں کے پیچھے ہو لے۔"

پھر وہ بوجھل قدموں سے اپنے گھر کی طرف بڑھا۔ بیل بجانے پر دروازہ اماں نے کھولا' وہ

اسے دروازے پر پا کر ایک دم کھل گئیں۔ ایک رات کی غیر موجودگی اماں پر بھاری پڑی تھی۔ ساحل عمر یاں گھر سے غائب تو رہتا تھا' لیکن کبھی پوری رات کے لیے غائب نہ ہوا تھا۔ اماں کو اسے دیکھے بغیر کہاں قرار تھا۔

''آ گئے بیٹے!'' اماں نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے ہاتھ سے بیگ لینے کی کوشش کی۔

''نہیں اماں! بیگ میں کوئی وزن نہیں ہے۔'' ساحل عمر نے مسکرا کر کہا۔ ''خیریت تو رہی؟''

''ہاں بالکل!'' اماں نے گیٹ بند کر کے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''ساحل رات تو گزر گئی لیکن آج کا دن بڑی مشکل سے گزرا ہے۔''

''کیوں اماں؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''بس تم یاد آئے جا رہے تھے۔'' اماں نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''واہ اماں! میں کون سا دبئی چلا گیا تھا۔'' ساحل عمر گھر میں داخل ہوتا ہوا بولا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا کہ گیارہ بارہ بجے تک آ جاؤں گا۔ میرا خیال تھا کہ ہم ناشتہ کر کے وہاں سے نکل آئیں گے۔ لیکن ورشا کھانا پکانے میں لگ گئی۔ پھر ہم وہاں سے کھانا کھا کر نکلے۔ اس لیے دیر ہو گئی۔''

''تو کیا ہوا...... اچھا ہوا تم گھوم پھر آئے۔'' اماں نے بیگ اس سے لیتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ آرام کرلو۔ پھر رات کو باتیں ہوں گی۔''

''بس اماں آرام کیا کروں گا۔ تھوڑا سا نہالوں۔ بدن چپک رہا ہے اور ہاں...... اماں کسی کا فون تو نہیں آیا؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''نہیں' اتفاق سے کسی کا فون نہیں آیا۔'' اماں نے بتایا۔

جب وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا' تو سب سے پہلے اس کی نظر رشا ملوک کی تصویر پر لٹکے تعویذ پر پڑی۔ اس تعویذ کو ساحل عمر نے بڑی اجنبی نگاہوں سے دیکھا اور رشا ملوک کے چہرے کو تو اس نے دیکھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ وہ اپنی تصویر کے سامنے سے اس طرح گزر گیا' جیسے یہ پینٹنگ کسی اور نے بنائی ہو۔ ایسی بے رخی کہ آدمی کا دل کٹ کر رہ جائے۔

جب وہ نہا کر باہر نکلا تو ایک خیال اس کے دل میں جڑ پکڑتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ خیال اس کے دل میں نہاتے ہوئے آیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس خیال کو کسی نے بلند آہنگ میں اس کے دل میں ڈالا ہو۔ پھر یہ خیال بوند بوند اس کے دل پر برستا رہا اور جب وہ نہا کر باہر آیا تو یہ خیال بڑی حد تک پختہ ہو گیا تھا۔

کپڑے تبدیل کر کے اس نے بال بنائے۔ پھر وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ہوئے اس کی نظر بار بار تعویذ پر پڑ رہی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا' تو وہ کب کا اس تعویذ کو اپنے گلے میں ڈال چکا ہوتا۔ لیکن اس وقت تو اس کے دماغ میں کچھ اور ہی بات تھی۔

بالآخر اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے تعویذ اتار کر اپنی قمیص کی جیب میں ڈال لیا اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اماں سامنے موجود نہ تھی۔ وہ خاموشی سے گھر کے پچھواڑے آ گیا۔

باغبانی کا اسے خاصا شوق تھا اور یہ شوق اسے اپنی ممی سے ملا تھا۔ اس گھر میں جتنے پیڑ پودے نظر آتے تھے وہ اس کی ممی کے ہاتھوں کے لگے ہوئے تھے۔ اس کی ممی پیڑ پودوں کی دیکھ بھال میں لگی ہوتیں تو ساحل عمر بھی ان کے ساتھ چلا آتا۔ وہ اپنی ممی کے ساتھ باغبانی میں دلچسپی لیتا' ان کا ہاتھ بٹاتا۔ ان کے انتقال کے بعد تو اس نے پوری ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ اگرچہ ہفتے میں دو تین بار ایک مالی پیڑ پودوں کی دیکھ بھال کے لیے آتا تھا اور یہ مالی بہت پرانا تھا' ممی کے زمانے سے آتا تھا۔ پھر بھی بہت کام ہوتے تھے۔ سب سے بڑا کام تو پودوں کو پانی دینے کا ہوتا ہے۔

گھر کے پچھواڑے ایک سلور کی پرانی بالٹی پڑی تھی۔ اس کے اندر کئی قسم کی کھرپیاں پڑی تھیں۔ ساحل عمر نے ایک تیز کھرپی نکال لی اور کھڑے ہو کر زمین کا جائزہ لینے لگا۔ تب اسے ایک کونا نظر آیا۔ یہ اس کام کے لیے مناسب جگہ تھی۔

اس نے جلدی جلدی تیز کھرپی سے اس کونے کی مٹی کھودی اور جب چھ انچ گہرا ایک چھوٹا سا گڑھا بن گیا' تو اس نے اپنی جیب سے تعویذ نکال کر گڑھے میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو مٹی ڈال کر دوبارہ بھر دیا۔ پھر کھرپی سے زمین کو برابر کر دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ بڑے اطمینان سے اٹھا اور کھرپی بالٹی میں پھینک کر جب مڑا تو اماں کو اپنے سامنے کھڑے پایا۔ ان کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی یہاں تک آ پہنچی تھیں۔

''کیا کر رہے تھے؟ کوئی نیا پودا لگایا ہے کیا؟'' اماں نے اسے اپنے دونوں ہاتھ جھاڑتے دیکھا تھا۔

''ہاں اماں!'' ساحل عمر نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بولا ''اماں' چائے اندر لے آؤ' میں ذرا ہاتھ دھو لوں۔''

''ہاں بیٹا چلو!'' اماں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیں۔

☆......☆......☆

یہ وظیفے کی دوسری رات تھی۔ پہلی رات بخیر و خوبی گزر گئی تھی۔ پہلی رات ہائکل ڈرانے آیا تھا۔ وہ جانور' جو نہ کتا تھا اور نہ بھیڑیا۔ ناصر مرزا نے جب اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی تو وہ اس طرح غائب ہوا جیسے کسی غبارے میں سوئی چبھو دی جائے۔ غبارہ پھٹ جائے تو پھر نظر کہاں آتا ہے۔ وہ بھی کسی غبارے کی طرح پھٹا تھا اور پھر غائب ہو گیا تھا۔ ناصر مرزا تیزی سے وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانے پھینک رہی تھیں۔

کمرے میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وظیفے کو اندھیرے ہی میں پڑھنا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اچانک کمرے میں روشنی کا احساس ہوا' انہیں حیرت ہوئی کہ یہ روشنی کہاں سے آئی۔ شبہ ہوا کہ کہیں کوئی پردہ تو ہٹا نہیں رہ گیا۔ سڑک سے کوئی گاڑی گزری ہو تو اس کی لائٹ اندر آ گئی ہو۔ ایسا نہیں تھا۔ اگر پردہ ہٹا ہوا ہوتا اور لائٹ کہیں باہر سے آئی ہوتی' تو وہ اب تک ختم ہو چکی تھی۔

یہ روشنی تو مسلسل تھی۔ تب ناصر مرزا نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو اس پر منکشف ہوا کہ یہ روشنی

باہر کی نہیں' اندر کی ہے۔ اس کے سامنے ایک دیا روشن تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے ہاتھ بڑھا کر اس دیے کے ساتھ ایک اور دیا رکھ دیا ہو۔

تکمیل شروع ہو چکا تھا۔ ناصر مرزا مستعد ہو گیا۔ اس کی انگلیاں مستقل دانے پھینک رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک اور دیے کا اضافہ ہوا۔ یہ تینوں دیے بڑے سلیقے سے برابر برابر رکھے تھے۔ کوئی دیا آگے تھا' نہ کوئی پیچھے تھا۔ ان کی لو بھی برابر تھی۔

کمرے میں ایک ناگوار بو پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔

تین دیوں کی روشنی سے کمرے کی خاصی تاریکی دور ہو گئی تھی۔ ناصر مرزا چوکس تھا۔ وہ اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا' اس کی توجہ ہٹانے کے لیے تھا۔ عمل کا تسلسل روکنے کے لیے تھا۔ حافظ موسیٰ نے ہر بات بہت واضح طور پر سمجھا دی تھی۔ انہوں نے بتا دیا تھا کہ عمل کا تسلسل روکنے کے لیے مختلف مظاہر سامنے آئیں گے۔

مظاہرہ ہو رہا تھا۔ تین دیے روشن ہو چکے تھے۔ ناگوار بو آنی شروع ہو گئی تھی۔ جب اس سے عمل کا تسلسل نہ ٹوٹا' تو نیا ناٹک رچایا گیا۔

ان تینوں دیوں کے پیچھے سے بچھوؤں نے برآمد ہونا شروع کیا۔ وہ بڑی تیزی سے چراغوں کے پیچھے سے نکل نکل کر ادھر پھیلنے لگے۔ کچھ ناصر مرزا کی طرف بڑھے۔ پھر چند لمحوں میں ان بچھوؤں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ کمرے میں ہر طرف بچھو ہی بچھو دکھائی دینے لگے۔

اب ان بچھوؤں نے چاروں طرف سے ناصر مرزا کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یہ ایک انتہائی خطرناک مرحلہ تھا۔ یہ ایک ایسا مظاہرہ تھا کہ مضبوط سے مضبوط دل والا بھی حوصلہ چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن ناصر مرزا حوصلہ چھوڑنے والوں میں سے نہ تھا۔

وہ وظیفہ شروع کرنے سے پہلے مصلے کے چاروں طرف حصار کھینچتا تھا۔ پھر مصلے پر بیٹھتا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس حصار کو توڑ کر اندر آنا کسی بھی مخلوق کا ممکن نہ تھا۔ یہ یقین اپنی جگہ' لیکن جب آدمی کسی تجربے سے گزرتا ہے اور وہ بھی کسی بھیانک تجربے سے' تو بعض اوقات یقین دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ یہ مرحلہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔

یہ بچھو جب حصار تک پہنچے تو حصار کی نادیدہ لائن سے ٹکراتے ہی وہ اس طرح واپس پلٹے' جیسے چوہے بلی کو دیکھ کر بھاگتے ہیں۔ ان میں بری طرح بھگدڑ مچ گئی۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر غائب ہونے لگے۔

چند لمحوں بعد وہاں ایک بھی بچھو نہ رہا۔ ناصر مرزا نے وظیفہ پڑھتے پڑھتے ایک پھونک ماری۔ پھونک مارتے ہی وہ دیے جھلملا کر بجھ گئے۔ کمرے میں پھر سے تاریکی پھیل گئی۔ ناگوار بو بھی جاتی رہی۔

اس طرح وظیفے کی دوسری رات بھی بخیر و خوبی گزر گئی۔

☆......☆......☆
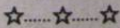
اماں ایک جہاندیدہ خاتون تھیں۔ وہ اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھیں۔ جب

سے ساحل عمر ایک رات سمندر پر گزار کر آیا تھا' اس کے اطوار تبدیل ہو گئے تھے۔ وہ ساحل عمر نہ رہا تھا کچھ اور ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ بڑی تیزی سے زرد ہوتا جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ یرقان کے مرض میں مبتلا ہو گیا ہو۔

اماں نے اسے ٹوکا تو ساحل نے اسے ان کا وہم گردانا۔ اس نے کہا ''اماں نہ میری صحت کو کچھ ہوا اور نہ میری رنگت کو۔ میں پہلے جیسا ہشاش بشاش ہوں۔ مکمل طور پر صحت مند آپ کو یونہی وہم ہوا ہے۔''

اس کی رنگت ہی تبدیل نہیں ہوئی تھی' اس کی عادتوں میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ وہ اگر کہیں بیٹھا ہے اور اس کی نظر کسی چیز پر جم گئی ہے' تو بس اسے دیکھے جا رہا ہے۔ اماں اس کو ٹوکتیں' تو وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگتا۔ پھر سوال کرتا: ''کیا ہوا اماں؟''

''تم دیوار کو کیا گھورے جا رہے تھے؟''

''ارے نہیں اماں! یہ محض آپ کا وہم ہے۔'' وہ ہنس کر انہیں ٹال دیتا۔

اماں جب بھی اسے اس کی کسی غیر معمولی حرکت سے ٹوکتیں یا نشاندہی کرتیں' تو وہ بڑی صفائی سے ان کا وہم قرار دے دیتا۔ اماں اس کی بات سن کر چپ تو ہو جاتیں' لیکن ان کا دل مطمئن نہ ہوتا۔ وہ جو کچھ دیکھ رہی تھیں' اس سے ان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اماں نے ساحل عمر کو جنم نہیں دیا تھا' لیکن وہ ان کے لیے جگر کے ٹکڑے سے کم نہ تھا۔ وہ ان کی گود میں پل کر جوان ہوا تھا۔ وہ اسے کسی مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

وہ جو کچھ محسوس کر رہی تھیں' صحیح محسوس کر رہی تھیں۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ساحل عمر کو ہوا کیا ہے۔ کوئی ایسا بھی نہ تھا' جس سے بات کر کے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتیں۔ لے دے کر ایک مرجینا تھی۔ وہ ایک ہمدرد قسم کی ملازمہ تھی۔ اس نے بھی ''صاحب'' میں ہوتی تبدیلیوں کو محسوس کیا تھا۔ اماں نے اس کی بات سن ضرور لی تھی' لیکن اسے ہم راز نہیں بنایا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مرجینا' ساحل عمر کے سامنے کوئی ایسی بات کرے' جو اس کی ناراضگی کا سبب بنے۔

وہ ساحل عمر کی طرف سے خاصی فکر مند تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ اس سلسلے میں کسی سے بات کریں۔ سوچتے سوچتے ان کے ذہن میں ناصر مرزا کا نام آیا۔ بات تو خیر مسعود آفاقی سے بھی کی جا سکتی تھی۔ دونوں ہی اس کے دوست تھے اور دونوں ہی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ لیکن مسعود آفاقی کچھ کھلنڈرا سا تھا۔ اماں کو یقین نہیں تھا کہ وہ جو کچھ اسے بتائیں گی' وہ بات اسی طرح اس کی سمجھ میں بھی آ جائے گی۔ البتہ ناصر مرزا کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ایک جہاندیدہ شخص ہے' وہ اسے جو کچھ بتائیں گی' اگر وہ من و عن اس بات پر یقین نہیں کرے گا' تو اس بات کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ ناصر مرزا کو فون کر کے ساحل عمر کے بارے میں بتائیں کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ ساحل عمر ابھی تک سو رہا تھا۔ یہ صبح دس بجے کا وقت تھا۔ اماں نے ٹی وی لاؤنج

میں رکھے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا۔
''ہیلو!'' اماں بولیں۔
''اماں! میں ناصر بول رہا ہوں۔ یہ ساحل کہاں ہے؟''
ناصر کی آواز سن کر اماں ایک دم خوش ہو گئیں۔ اس وقت اگر وہ کچھ اور بھی سوچ لیتیں تو پورا ہو جاتا۔ انہوں نے خوش ہو کر کہا ''بڑا اچھا ہوا جو تمہارا فون آ گیا۔''
''وہ کیوں اماں؟'' ناصر مرزا نے پوچھا۔
''میں تم سے خود بات کرنے کا سوچ رہی تھی۔''
''خیریت اماں! ساحل تو ٹھیک ہے؟'' وہ فوراً فکرمند ہوا۔
''ساحل کے بارے میں ہی بات کرنا چاہ رہی تھی۔ ساحل ٹھیک ہیں' اس وقت سو رہے ہیں۔'' اماں نے بتایا۔
''اب تک سو رہا ہے؟ کیا رات کو دیر تک جاگتا رہا۔''
''دو چار روز سے ساحل کے شب و روز بالکل تبدیل ہو چکے ہیں۔ مجھے تو ساحل' ساحل ہی نہیں لگتے۔'' اماں نے اصل موضوع چھیڑا۔
''ارے اماں ایسا کیا ہوا؟'' ناصر مرزا نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔
اماں نے جو تبدیلیاں نوٹ کی تھیں' وہ ناصر مرزا کے گوش گزار کر دیں۔ ساری باتیں سن کر ناصر مرزا نے پوچھا ''ایسا کب سے ہوا......؟ میرا مطلب ہے یہ تبدیلی کب سے آئی ہے۔''
''دو چار دن پہلے وہ سمندر پر گئے تھے' وہاں ایک رات رہے بھی۔'' انہوںؒ نے بتایا۔
''ہیں!'' ناصر مرزا حیران ہوا۔ ''کس کے ساتھ گیا تھا وہ' سمندر پر......؟''
''ورشا کے ساتھ' وہ خود لینے آئی تھی۔''
''اوہ!'' ناصر مرزا نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ ''اچھا اماں آپ پریشان نہ ہوں' میں گھر آتا ہوں۔ وہ اٹھ جائے تو ٹھیک ہے' ورنہ میں خود ہی آ کر اٹھاتا ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔'' اماں نے ایک پر اطمینان سانس لیا۔ ناصر مرزا سے بات کر کے انہیں خاصی تشفی ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

ساحل عمر ایک اونچے پتھر پر کھڑا بھیگ رہا تھا۔ بارش بہت تیز تھی' اتنی تیز کہ چاروں طرف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑی علاقہ' قریب میں بہتا دریا......موسلا دھار بارش...... تنہا بھیگتا ساحل......

اچانک ساحل کا کسی نے ہاتھ پکڑا۔ یہ ایک نرم ملائم ہاتھ تھا' لیکن اس ہاتھ کی گرفت سخت تھی۔ وہ اسے تیزی سے کھینچتی ہوئی ایک طرف لے جا رہی تھی۔
جب وہ ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچا تو ساحل عمر نے دیکھا کہ وہ رشا ملوک ہے۔ وہی سفید ریشمی لبادہ جو بارش میں بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گیا تھا۔ اس نے اپنے لباس کو درست

کیا اور کسی قدر غصے میں بولی ”تمہیں بارش میں بھیگنے کا زیادہ شوق ہے' تم بھاگ کر اس درخت کے سائے تلے کیوں نہیں آ گئے؟“

”ہاں! مجھے بارش میں بھیگنے کا بہت شوق ہے۔ میں بھیگ رہا تھا تو بھیگنے دیتیں۔ مجھے یہاں کیوں لے آئیں؟“ ساحل عمر نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

”تم نہیں جانتے کہ یہ کس قسم کی بارش ہے۔ تم پر یہ بارش کس قسم کے اثرات مرتب کرے گی۔ میں تمہیں کسی مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی۔“

”تم کون ہو' مجھے روکنے والی۔ میں جو چاہے کروں۔ بارش میں بھیگوں یا دریا میں نہاؤں۔ ہٹو میرے سامنے سے۔ کتنی خوبصورت بارش ہے اور تم خواہ مخواہ مجھے اس بارش میں نہانے سے منع کر رہی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ درخت کے نیچے سے نکلا اور تیزی سے بھاگتا ہوا' پھر اسی اونچے پتھر پر آن کھڑا ہوا' جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھڑا تھا۔ بارش موسلادھار جاری تھی۔ وہ آنکھیں موندے پھر سے اس بارش میں بھیگنے لگا۔

”ساحل' میری بات مان لو' مت بھیگو بارش میں...... یہ بے موسم کی بارش ہے۔ تم بیمار ہو جاؤ گے' کمزور ہو جاؤ گے' بے بس ہو جاؤ گے۔ وہ ایسا ہی چاہتی ہے۔“ رشاملوک نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن ساحل عمر نے اس کی باتوں کی طرف دھیان نہ دیا۔ وہ اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کی اس بے رخی پر رشاملوک کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ چاہتی تھی کہ جس بے موسم کی بارش میں وہ بھیگ رہا ہے' نہ بھیگے۔ اس نے پھر اس بارش سے بچانے کے لیے قدم اٹھائے' لیکن پھر رک گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ساحل عمر ضدی ہے' وہ کبھی اس کی بات نہ مانے گا۔ پھر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ساحل عمر انجان ہے۔ اسے ہوش نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے کتنا نقصان پہنچ گیا ہے اور مزید کتنا پہنچنے والا ہے۔

”ساحل عمر میں جا رہی ہوں۔“ اس نے چیخ کر کہا۔ ”اب بھی وقت ہے' اس گھنے درخت کے نیچے آ جاؤ۔“

”جاؤ!“ اس نے اس کی طرف پیٹھ موڑے موڑے کہا۔ ”مجھے کسی بات کی کوئی پروا نہیں۔“

”کاش! تمہیں پروا ہوتی۔ کاش! تم میری بات سمجھ سکتے۔“ رشاملوک نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”میں کسی کی کوئی بات نہیں سمجھنا چاہتا۔ مجھے یہ بارش بہت اچھی لگ رہی ہے' مجھے بہت مزا آ رہا ہے۔“ ساحل عمر نے خوش ہو کر کہا اور جب اس نے پیٹھ موڑ کر دیکھا تو درخت کے نیچے کچھ نہ تھا۔

ابھی اسے گئے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ یہ بارش خون کی بارش میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے کپڑے خون میں سرخ ہو گئے۔ پھر اس نے جہاں بھی نظر ڈالی' ہر طرف خون ہی خون نظر آیا۔ سارا پانی خون میں تبدیل ہو چکا تھا۔

تب گھبرا کر اس نے رشاملوک کو آواز دینا چاہی' لیکن آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے کوئی آواز دے رہا تھا۔ "ساحل اٹھو بھی...... آخر کب تک سوتے رہو گے؟"

جب اس کے حواس درست ہوئے تو اس نے دیکھا کہ ناصر مرزا اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

"کیا ہوا ساحل؟" ناصر مرزا نے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے فوراً ہی سر چھوڑ دیا۔ "تم کب آئے؟"

"ابھی آیا ہوں۔" ناصر مرزا نے کہا اور اس کا چہرہ غور سے دیکھتا ہوا بولا "یار! یہ تمہاری حالت کیا ہو رہی ہے۔ تمہارا چہرہ ایک دم زرد ہو رہا ہے۔ تمہیں یرقان تو نہیں ہو گیا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ صور اماں نے تمہارے کانوں میں پھونکا ہو گا۔" وہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"اماں کو کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے...... کیا مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ مجھے لگتا ہے تم نے کئی دنوں سے آئینہ نہیں دیکھا۔" ناصر مرزا نے کہا۔

وہ بغیر کچھ جواب دیئے واش روم میں گھس گیا اور دروازہ زور سے بند کر کے اندر سے چٹخنی لگالی۔

اماں' جو دروازے پر کھڑی تھیں۔ انہوں نے ناصر مرزا کی طرف دیکھا۔ ناصر مرزا نے ان کی نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ "اماں' معاملہ گڑبڑ ہے۔ یہ وہ ساحل عمر ہی نہیں۔ آپ نے بہت اچھا کیا' جو مجھے فون کر کے بتا دیا۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

اس کے واش روم سے نکلنے کے بعد ناصر مرزا نے اس سے جو بھی بات کی' اس بات کا اس نے مختصر اور گول مول جواب دیا۔ ناصر مرزا حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور پریشان ہو کر اس کے جوابات سن رہا تھا۔

"ساحل تمہیں میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا ہو گا' تم مجھے بیمار دکھائی دے رہے ہو۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بلکہ پہلے سے زیادہ چاق و چوبند ہوں۔"

"مرحوم عابد منجم نے تمہیں منع کیا تھا کہ ورشا سے اب نہیں ملنا۔ تم ملنا چھوڑنے کے بجائے اس کے ساتھ سمندر پر چلے گئے؟" اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

"عابد منجم کو بلاوجہ کوئی غلط فہمی تھی۔ ورشا بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اچھی اس کی ماں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان سے ملنے میں کوئی حرج ہے۔"

"یہ بات تم کہہ رہے ہو' تم نہیں جانتے ہو کہ میری بھتیجی کی قاتلہ بر کھا ہے۔"

"وہ دونوں ماں بیٹیاں اتنی معصوم سی تو ہیں' وہ کیا کسی کو قتل کریں گی یار!"

"ہیں!" ناصر مرزا کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ "تمہیں ضرور ان منحوسوں نے کچھ گھول کر پلا دیا ہے۔ پہلے تو تم نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کی۔"

پہلے میں انہیں زیادہ جانتا نہ تھا۔"

"تمہارے گلے میں مجھے تعویذ نظر نہیں آرہا۔" اچانک ناصر مرزا کی نظر اس کے گلے پہ پڑی۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ گلے میں تعویذ نظر نہیں آرہا تھا۔

تعویذ کا ذکر سن کر ساحل عمر ایک لمحے کو چونکا۔ پھر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا اور بڑے اطمینان سے بولا "یار پتا نہیں وہ تعویذ کہاں گیا۔ میں واش روم میں جاتا تھا تو اس تصویر کے فریم پر لٹکا دیا کرتا تھا۔ اسی تصویر سے وہ غائب ہوگیا۔"

اپنے اس جھوٹ پر ساحل عمر خود بڑا حیران ہوا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اصل بات ناصر مرزا کو بتا دے کہ اس نے تعویذ دفن کردیا ہے اور یہ دفن بھی اس نے اپنی مرضی کے خلاف کیا ہے۔ وہ دفن نہیں کرنا چاہتا تھا' لیکن اندر سے کوئی اسے اس بات پر اکسا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس تعویذ کو دفنانے پر مجبور کردیا گیا۔

اس وقت بھی اس کی خواہش تھی کہ وہ ساری بات پوری ایمانداری سے ناصر مرزا کو بتا دے' لیکن اندر سے اسے کوئی جھوٹ بولنے پر مجبور کررہا تھا۔ زبان اس کی تھی' لیکن بول کوئی اور رہا تھا' جیسے اسے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔

"ساحل تمہیں کیا ہوا ہے؟" ناصر مرزا نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ بتاؤ' تمہارے ساتھ سمندر پر کون کون تھا؟ کیا وہاں برکھا بھی تھی؟"

"رات کو میں اور ورشا اکیلے تھے' البتہ صبح کو برکھا پہنچ گئی تھیں۔" ساحل عمر نے بتایا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ رات کو وہاں نہیں تھی۔"

"کیا بات کرتے ہو یار' وہ وہاں ہوتیں تو کیا نظر نہ آتیں' پھر انہیں چھپنے کی کیا ضرورت تھی۔ جس طرح وہ صبح نظر آگئیں' رات کو بھی سامنے آسکتی تھیں۔ میں نے ورشا سے تنہا رہنے کی فرمائش تو نہ کی تھی۔" ساحل عمر نے ذرا ناگوار لہجہ بنا کر کہا۔

"اچھا' ساحل اب تم ایک بات کان کھول کر سن لو...... تم اب گھر سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ پرسوں صبح میں آؤں گا' تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم پر کیا بیت گئی ہے۔" ناصر مرزا نے فکرمند ہوکر کہا۔

"او یار شکاری مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم خواہ مخواہ فکرمند مت ہو۔"

"شکاری!" ناصر مرزا نے حیران ہوکر دہرایا۔ "یہ تم کس کی زبان بول رہے ہو؟"

"اپنی زبان بول رہا ہوں۔" ساحل عمر کو اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہوئی۔

"نہیں' تم یہ اپنی زبان نہیں بول رہے۔ میں جان گیا ہوں کہ تم کس کے انداز میں گفتگو کررہے ہو۔" ناصر مرزا نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ساحل عمر نے چند لمحے اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں جھکالیں۔ ناصر مرزا نے واضح طور پر یہ بات محسوس کی کہ ساحل کی آنکھوں میں محبت کی چمک کے بجائے اجنبیت کا اندھیرا تھا۔

☆......☆......☆

آج پانچویں رات تھی۔
ناصر مرزا نے چار راتیں بخیر و خوبی گزاری تھیں۔ ان چار راتوں میں ہر رات ایک نیا ڈرامہ سامنے آیا تھا۔ ناصر مرزا کو حافظ موسیٰ جیسے زبردست شخص نے ہدایات نہ دی ہوتیں اور ہر بات اچھی طرح کھول کر نہ سمجھا دی ہوتی، تو وہ کب کا حوصلہ ہار بیٹھتا۔
چار راتیں صحیح سلامت نکل جانے کے بعد ناصر مرزا میں ایک نئی قوت، نئی توانائی آ گئی تھی۔
بس اب آج کی رات باقی تھی۔ ناصر مرزا بڑے اہتمام سے اپنے اسٹڈی روم میں آیا تھا۔ بارہ بجنے والے تھے۔ وظیفہ بارہ اور ایک بجے کے درمیان کیا جانا تھا۔ ناصر مرزا نے کمرے کے تمام پردے برابر کر دیئے۔ پھر لائٹ بجھا کر یہ چیک کیا کہ کہیں سے روشنی تو نہیں آ رہی۔ سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف ایک پردہ ذرا کھسکا ہوا تھا۔ وہاں سے تھوڑی سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ناصر مرزا نے پردہ ٹھیک کیا، تو اسے ایک دم کسی کتے کے رونے کی آواز آئی۔
یہ آواز بڑی دل ہلانے اور دہلانے والی تھی۔ اس آواز کو اس نے سن رکھا تھا۔ یہ آواز اس کی سماعت میں محفوظ تھی۔ یہ اس عجیب جانور کی آواز تھی، جس کا قد گدھے کے برابر تھا اور صورت کتے کی تھی، نہ بھیڑیے کی۔ یہ آواز اتنے قریب سے آئی تھی کہ یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ جانور گھر کی چار دیواری میں موجود ہو۔
ناصر مرزا نے سوچا کہ ابھی تو اس نے وظیفہ بھی شروع نہیں کیا کہ ڈرامہ شروع ہو گیا۔ آج کی رات اللہ خیر کرے۔ وہ اسٹڈی روم کو اندر سے بند کر چکا تھا اور عمل کا وقت شروع ہونے والا تھا۔ ایک بار اس کے جی میں بھی آئی کہ وہ گھر سے باہر نکل کر دیکھے کہیں کوئی کتا تو اندر نہیں آ گیا۔ لیکن پھر وہ یہ سوچ کر رک گیا کہ ہو سکتا ہے اس طرح اسے عمل سے دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اس کی توجہ اور یکسوئی کو توڑنے کی ناکام جسارت کی جا رہی ہو۔ وہ کسی قیمت پر اب باہر نہیں جائے گا، چاہے چیک کوئی کتا ہی گھر میں کیوں نہ داخل ہو گیا ہو۔ گھر میں گھر کے دیگر افراد موجود ہیں۔ اگر واقعی یہ کسی کتے کی آواز ہے، تو وہ لوگ بھی سن لیں گے اور اگر محض اس کو بھٹکانے کے لیے یہ ناٹک کھیلا جا رہا ہے، تو یہ آواز محض اس تک ہی محدود رہے گی۔
دو تین بار اور یہ آواز آئی۔ ہر مرتبہ یہ آواز قریب ہوتی گئی۔ آخری بار تو یوں محسوس ہوا، جیسے وہ جانور کمرے میں ہی موجود ہو۔ ناصر مرزا نے روشنی چیک کرنے کے بعد لائٹ جلا دی تھی۔ وہ عمل کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس نے مصلہ بچھا دیا تھا۔ مصلہ بچھاتے ہوئے ہی رونے کی آواز آخری مرتبہ سنائی دی تھی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔
مصلہ بچھا کر ناصر مرزا نے گھڑی کی طرف دیکھا، بارہ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ وظیفے کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ اس نے لائٹ بجھا کر اپنے گرد حصار کھینچا اور پھر مصلے پر بیٹھ گیا۔
تسبیح ہاتھ میں لے کر اس نے پڑھنا شروع کیا کہ آج مصلے پر ایک کھلا ہوا چمکدار چاقو بھی رکھا تھا۔ یہ ایک خطرناک شکاری چاقو تھا۔ اس کا پھل سات آٹھ انچ سے کم نہ تھا۔ ناصر مرزا جب شکار پر جاتا، تو اس چاقو کو وہ اپنے ساتھ ضرور رکھتا تھا۔ اس چاقو سے اس نے بیشمار جانور

ذبح کیے تھے۔ تسبیح مکمل کر کے وہ اس چاقو کو اٹھاتا اور اس کے پھل پر پھونک مار کر مصلے پر رکھ دیتا تھا
ایک تسبیح مکمل کرنے تک اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ محض اندازے سے چاقو اٹھاتا' ایک لمحے کے لیے آنکھیں
وظیفے کے دوران اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ محض اندازے سے چاقو اٹھاتا' ایک لمحے کے لیے آنکھیں
کھول کر چمکتے پھل پر پھونک مارتا اور آنکھیں پھر سے بند کر لیتا۔ اگرچہ اس کی آنکھیں بند تھیں' لیکن
اس کے کان پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔ کمرے میں ہونے والی ہلکی سی آہٹ بھی اس کی سماعت میں
ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔

پڑھتے پڑھتے اچانک اس کے کانوں میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ اسے یوں
محسوس ہوا جیسے کئی چمگادڑیں کمرے میں گھس آئی ہوں۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ کمرے کا ہر دروازہ
اور ہر کھڑکی بند تھی۔ چمگادڑوں کا باہر سے آنا ممکن نہ تھا۔ یہ بات قریب سماعت تھی' لیکن وہ پروں
کی پھڑپھڑاہٹ کو اپنے سر پر اس طرح محسوس کر رہا تھا' جیسے حقیقت میں چمگادڑیں کمرے میں گھس
آئی ہوں۔

یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ حصار اس نے زمین پر کھینچا تھا۔ اس حصار کو توڑ کر اس
تک پہنچنا ممکن نہ تھا' لیکن اس کے سر پر تو کوئی حصار نہ تھا۔ اس طرح کی صورت حال کے بارے میں
کوئی نشاندہی بھی نہیں کی گئی تھی۔ اب جو کچھ کرنا تھا' اپنی حاضر دماغی سے کام لے کر ہی کرنا تھا۔
تسبیح پڑھتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ سے ٹارچ اٹھا کر روشنی کی اور اس کا رخ چھت
کی طرف کر دیا۔ کمرے میں چار پانچ چمگادڑیں موجود تھیں اور وہ بڑی تیزی سے ادھر ادھر اڑ رہی
تھیں۔

☆......☆......☆

سوا بارہ بجے کا عمل تھا۔
اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ساحل عمر اپنے بیڈروم میں موجود تھا۔ وہ کمرے میں اندھیرا
کیے میوزک سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ گھنٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ڈیک کی آواز کم
کر کے اس نے ریسیور اٹھایا اور دھیرے سے کہا "جی!"
"کیا کر رہے ہو ساحل؟" مترنم آواز میں پوچھا گیا۔
"اچھا! آپ ہیں۔" ساحل عمر نے اس کی آواز پہچان کر کہا۔ "میں میوزک سن رہا تھا۔"
"تم وہاں اکیلے ہو' یہاں میں اکیلی ہوں...... میرے پاس آ جاؤ ناں؟" پیار سے کہا گیا۔
"اس وقت...... کیا بجا ہے؟" ساحل عمر نے پوچھا۔
"رات آدھی ہوئی ہے۔ یہی تو وقت ہے دوستوں کا دوستوں سے ملنے کا۔"
"آپ کہاں ہیں؟"
"میں اپنے گھر پر ہوں اور تمہاری منتظر' آ رہے ہو ناں؟"
"جی میں آ رہا ہوں' آپ میرا انتظار کیجئے۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ لائٹ آن
کر کے تیزی سے کپڑے تبدیل کیے۔ اس وقت وہ کسی روبوٹ کی طرح کام کر رہا تھا۔ وہ اپنے اختیار

میں نہ تھا۔ اسے جو کہا گیا تھا اس پر عمل کرنے کے لیے وہ مجبور تھا۔

کپڑے تبدیل کر کے اس نے گھر کی اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ گیٹ کھول کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کھلے گیٹ سے وہ گاڑی لے کر نکل گیا۔ اس نے گیٹ بند کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔

گھر کا گیٹ کھلنے اور گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز پر جب اماں ہانپتی کانپتی گیٹ تک پہنچیں۔ اس وقت ساحل کی گاڑی گلی کا موڑ کاٹ چکی تھی۔

ساحل عمر کے اس طرح نکل جانے پر اماں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

☆......☆......☆

کچھ دیر وہ گیٹ پکڑے کھڑی رہیں۔ آنکھوں کے آگے سے اندھیرا چھٹا تو وہ گم سم ہو گئیں۔ ان کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ اچانک ہوا کیا؟ ساحل عمر کہاں چلا گیا؟ کیسے چلا گیا؟

وہ اماں سے اس قدر بے نیاز کیسے ہو گیا۔ اس نے تو اپنے گھر کا بھی خیال نہ کیا۔ اس طرح گھر چھوڑ کر بھاگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ چند دنوں قبل جب وہ سمندر پر گیا تھا' تو اماں کی تنہائی کا خیال کر کے اس نے مرجینا کو ساتھ رکھنے کی ہدایت کی تھی اور آج' آدھی رات کو اماں سے اجازت لینے کی بات تو دور کی تھی' وہ گھر کا گیٹ ہی کھلا چھوڑ گیا تھا۔ وہ ڈاکوؤں کو دعوت دے گیا تھا۔

اماں چکرائی ہوئی تھیں۔ تھوڑے ہوش و حواس بحال ہوئے' تو انہوں نے گھر کا گیٹ بند کیا۔ اندر آ کر دروازے کی چٹخنی چڑھائی' اسے لاک کیا اور ساحل عمر کے بستر پر آ کر لیٹ گئیں۔ بستر پر لیٹتے ہی ان کے دل میں جذبات کا جوار بھاٹا اٹھا اور وہ سسک سسک کر رونے لگیں۔

روتے روتے وہ جانے کہاں پہنچ گئیں۔ اس دن بھی تو وہ رو رہی تھیں۔ ایک دم ہی ان پر دکھ کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ وہ اپنے گھر میں جس طرح بیٹھی تھیں' ویسے ہی اٹھ کر نکل آئی تھیں۔ انہیں کسی نے روکنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ویسے بھی وہ رکنے والی نہ تھیں' لیکن اگر انہیں کوئی روکتا' تو وہ اس بات کو زندگی بھر نہ بھولتیں۔

بھولی تو خیر وہ کسی بات کو نہ تھیں۔ جب ماضی کی فلم ان کے دماغ میں چلنا شروع ہو جاتی' تو پھر یہ سلسلہ دور تک چلا جاتا۔ بچپن' شادی' شادی کے بعد کی زندگی' اولاد کا نہ ہونا' اولاد کے لیے سو جتن کرنا اور روز ساس کے طعنے سننا۔

وہ بے اولاد تھیں' تو اس میں ان کا کیا قصور تھا۔ اولاد تو اوپر والے کی دین ہے' جس کو چاہے دے' جس کو چاہے نہ دے۔ دینے پر آئے تو کچے آنگن کو بچوں سے بھر دے اور نہ دینے پر آئے تو سونے کے چھجے والے گھر میں ایک بچہ نہ پیدا ہونے دے۔ لیکن اماں کے گھر والے اور گھر والا' بھی ان کا دوش جانتے تھے۔

کئی مہینے سے ساس دوسری شادی کی کھچڑی پکا رہی تھی۔ شوہر بھی دبے دبے لفظوں میں اشارے دے رہا تھا۔ اماں ساری باتیں بڑے صبر و سکون سے سن رہی تھیں۔ آخر ایک دن ان کے شوہر نے صاف لفظوں میں دوسری شادی کا ذکر کر ہی دیا۔

اماں نے اپنے شوہر کی بات بڑے صبر کے ساتھ سنی اور صرف اتنا کہا "جس دن اس گھر

میں میری سوکن داخل ہوگی' اسی دن بلکہ اسی وقت میں یہ گھر چھوڑ جاؤں گی' بس اتنا یاد رکھنا۔"
اماں کی بات سن کر ان کا شوہر ہنسا۔ اس نے مذاق سمجھا۔ کون عورت اس طرح اپنا گھر چھوڑتی ہے اور ایسی عورت' جس کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو۔ ان کے شوہر اور شوہر کی ماں نے اپنی سی کر لی۔ وہ دونوں مل کر گھر میں ایک نئی عورت لے آئے۔ یہ عورت اماں کی سوکن تھی۔
اماں نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ سوکن کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سوکن کے قدم گھر کے اندر کی طرف اٹھ رہے تھے اور اماں کے قدم باہر کی جانب اٹھ رہے تھے۔ وہ جس طرح بیٹھی تھیں' ویسے ہی پیروں میں چپل ڈال کر چل دی تھیں۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا' نہ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔
اماں کے شوہر اور ساس نے انہیں گھر سے نکلتے دیکھا۔ شوہر نے چاہا بھی کہ وہ دروازے پر جا کر اماں کو روک لے۔ تب ساس نے فوراً ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بے نیازی سے بولی "کہیں نہیں جاتی' آجائے گی دھکے کھا کر۔"
ممکن تھا کہ اماں دھکے کھا کر واقعی اس گھر کی دہلیز پر لوٹ آتیں' لیکن ان کی قسمت میں دھکے نہ تھے۔ گھر سے نکل کر ان کا جدھر رُخ تھا' ادھر چل پڑیں۔
اور پھر وہ چلتی گئیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہیں۔ بس دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اب اس گھر میں نہیں رہنا' گھر سے بہت دور نکل جانا ہے۔ چلتے چلتے جب وہ تھک گئیں' تو فٹ پاتھ پر بیٹھ گئیں۔
ساحل عمر کے پاپا عمر عابد اور اس کی ممی ٹہل کر آ رہے تھے۔ ساحل عمر ان دنوں چھ ماہ کا تھا۔ وہ روحی کی گود میں تھا۔ عمر عابد پیچھے بیکری پر ڈبل روٹی مکھن خریدنے رک گئے تھے اور روحی' ساحل کو گود میں لیے بلڈنگ کے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس وقت یہ لوگ گارڈن کے علاقے میں نئے بنے فلیٹ میں رہتے تھے۔
ساحل اس وقت روحی کی گود میں بری طرح مچل رہا تھا۔ اسے اچانک جانے کیا ہوا تھا۔ ایک دم رونا شروع کر دیا تھا۔ شاید اسے اپنے پاپا نظر نہیں آئے تھے یا جانے کیا بات تھی۔
فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اچانک ہی اماں پر نظر پڑی تھی۔ وہ گھٹنوں میں منہ دیئے اور ٹانگوں کے گرد ہاتھ باندھے سسک سسک کر رو رہی تھیں۔
روحی نے ایک عورت کو رات کے دس بجے فٹ پاتھ پر روتے دیکھا تو وہ ٹھٹھک گئی۔ اس نے اس کے پاس کھڑے ہو کر پوچھا "کیا ہوا؟"
اماں نے کسی عورت کی آواز سنی تو فوراً گھٹنوں سے اپنا سر اٹھایا۔ جلدی جلدی دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ساحل عمر' جو ابھی تک روحی کی گود میں روئے جا رہا تھا' اماں کی شکل دیکھ کر ایک دم چپ ہو گیا۔ اماں نے بے اختیار اس کی طرف ہاتھ بڑھایا' تو وہ خاموشی سے ان کی گود میں چلا گیا۔
"بیگم صاحب! آپ کا بچہ بہت پیارا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسے پیار کر لوں؟" اماں

نے بڑے مہذبانہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" روحی نے فوراً کہا۔

اماں نے ساحل کو پیار کیا' تو اس نے ان میں جانے کیا دیکھا کہ گلے سے لپٹ گیا۔ روحی نے اماں کے چہرے کو' ان کے لباس کو غور سے دیکھا۔ وہ اسے ایک شریف گھرانے کی عورت نظر آئیں۔ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ وہ فٹ پاتھ پر بیٹھی رو کیوں رہی تھیں۔

"آپ کون ہیں؟" ساحل عمر کی ممی روحی نے پوچھا۔

"میں کوئی نہیں ہوں۔" جواب ملا' جواب میں بڑا دکھ تھا۔

"کہاں سے آئی ہیں؟" روحی نے پھر سوال کیا۔

"کہیں سے نہیں۔" وہی دکھ بھرا لہجہ۔

"یہاں کیوں بیٹھی تھیں اور رو کیوں رہی تھیں؟"

"اپنے نصیبوں کو رو رہی تھی۔" یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگیں۔ ساحل عمر نے بڑی معصومیت سے روتی ہوئی اماں کو جھک کر دیکھا' تو وہ روتے روتے ایک دم چپ ہو گئیں اور مسکرا کر اسے دیکھا۔ ساحل عمر پھر ان کے گلے سے لپٹ گیا اور اس طرح لپٹا کہ روحی کی بار بار کوشش کے باوجود اس کی گود میں واپس نہ آیا۔

تب روحی اماں کو اپنے گھر لے آئی۔ اماں پر جو گزری تھی' وہ انہوں نے سچ سچ کہہ سنائی۔ ان کی ساری روداد سن کر روحی نے اماں کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور اس فیصلے کی بڑی وجہ ساحل عمر تھا' جسے اماں پسند آ گئی تھیں۔ روحی گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ اماں کا ساتھ اسے سکھ دے سکتا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے اماں کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اماں کو بھی ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ روحی کے گھر سے اچھا ٹھکانہ ان کے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔ روحی نے اماں سے کہا "اس گھر میں میرے ساتھ جب تک رہنا چاہو رہو۔ جب تمہارا شوہر تمہیں لینے آ جائے تو چلی جانا۔"

"نہیں' بیگم صاحبہ! اب میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ شوہر کو تو میں چھوڑ آئی۔ اول تو وہ آئے گا نہیں' اگر بھولا بھٹکا کبھی ادھر نکل آیا' تو میں اس کے ساتھ جاؤں گی نہیں۔ آپ نے نہ رکھا تو کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ لوں گی' پر شوہر کے گھر نہیں جاؤں گی۔ یہ میں عہد کر کے نکلی ہوں۔" اماں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

بس پھر وہ دن اور آج کا دن' اماں نے اس گھر کی دہلیز کو ایسا پکڑا کہ پھر کبھی کہیں جانے کا نام نہ لیا۔ ساحل نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اب اس گرفت سے نکلنا ان کے بس میں نہ تھا۔ ساحل عمر بھی اماں کا دیوانہ تھا' وہ ان کے بغیر رہتا ہی نہ تھا' پھر ساحل کی ممی اور پاپا کا سلوک بھی اماں کے ساتھ بہترین تھا۔ وہ دونوں انہیں ملازم سمجھتے ہی نہ تھے۔ جس طرح گھر میں ایک بڑے کی حیثیت ہوتی ہے' بالکل وہی احترام اماں کو دیا جاتا تھا۔

ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ان کے شوہر نے انہیں کبھی ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی۔ اماں

نے بھی کبھی اپنے شوہر کی جستجو نہ کی۔ وہ تو اپنا گھر جانتی تھیں' لیکن انہوں نے کبھی ادھر کا رخ نہ کیا۔
اماں روحی کے ساتھ صدر گئیں' تو ایک مرتبہ ان کی اپنے شوہر پر ضرور نظر پڑی' اماں نے اسے دیکھتے ہی
اپنا منہ چھپا لیا۔ جب انہوں نے اس سے ہمیشہ کے لیے ناتا ہی توڑ لیا تھا' تو پھر اپنا آپ دکھا کر کیا
کرنا تھا۔

وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ ساحل عمر' جو چھ ماہ کی عمر میں ان کی گود میں آیا تھا' اب وہ ایک
کڑیل جوان بن چکا تھا۔ لیکن جو چاہت اماں کے دل میں پہلے دن سے ساحل کے لیے تھی' وہ آج
تک برقرار تھی۔ وہ اس پر جان نچھاور کرتی تھیں۔ اس پر صدقے واری جاتی تھیں۔ ساحل عمر کا بھی یہی
حال تھا' وہ دل سے ان کی عزت کرتا تھا۔ انہیں احترام دیتا تھا۔

چار پانچ سال پہلے ساحل عمر کے ممی پاپا اپنی شادی کی سالگرہ منانے گھر سے نکلے تھے۔
شادی کی سالگرہ والا دن وہ دونوں گھر سے باہر ہی گزارتے تھے اور یہ سارا دن وہ سمندر پر گزارتے
تھے۔ دوپہر کا کھانا وہ سمندر پر کھاتے اور شام ڈھلتے ہی وہ گھر کی طرف چل پڑتے۔ رات کا کھانا گھر
پر ہوتا۔ واپسی پر وہ کیک لے آتے۔ کیک کاٹا جاتا۔ اماں اس دن خوب اچھے اچھے کھانے تیار کرتیں۔
مزے سے کھانے کھائے جاتے۔ خوب ہلا گلا رہتا۔

اس دن بھی اماں نے کئی ڈشیں تیار کر لی تھیں۔ ساحل عمر اپنے ممی پاپا کا بے چینی سے
انتظار کر رہا تھا' انہیں اب تک آ جانا چاہئے تھا' لیکن وہ ابھی تک نہیں آئے۔ گارڈن والا فلیٹ وہ کب کا
چھوڑ چکے تھے۔ اب یہ لوگ نارتھ ناظم آباد کے ایک بڑے مکان میں رہتے تھے۔ یہ مکان عمر عابد نے
بڑے شوق سے بنوایا تھا۔ اس کی تعمیر میں قدم قدم پر روحی کے مشورے بھی شامل تھے۔ مکان کے آگے
اور پیچھے گارڈن ترتیب دیا گیا تھا۔ روحی کو باغبانی کا بے انتہا شوق تھا۔ اس نے جانے کہاں کہاں سے
پودے اکٹھے کیے ہوئے تھے۔

ساحل عمر گھر کے سامنے لان پر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ سڑک سے گزرنے والی ہر گاڑی
پر اسے گمان ہوتا تھا کہ یہ ممی پاپا کی گاڑی ہے۔ لیکن وہ ممی پاپا نہ ہوتے' کسی اور کی گاڑی ہوتی۔

پھر انتظار جب اپنی انتہا کو پہنچا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ساحل عمر نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا
اور جلدی سے کہا "جی!"

ادھر سے کوئی خاتون بول رہی تھیں۔ انہوں نے پہلے ٹیلی فون نمبر کنفرم کیا۔ ساحل عمر نے
نمبر سن کر کہا "جی یہی نمبر ہے۔"

"آپ عمر عابد صاحب کے کون ہیں؟" ادھر سے سوال ہوا۔

"جی' میں ان کا بیٹا بول رہا ہوں۔" ساحل عمر نے جلدی سے جواب دیا۔

"اوہ!" ادھر ایک ٹھنڈا سانس لیا گیا۔ "دیکھئے میں ڈاکٹر ظفرین بول رہی ہوں۔ میرے
پاس آپ کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ آپ کے ممی پاپا کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ دونوں کی کنڈیشن
اچھی نہیں ہے۔ آپ فوراً ہسپتال آ جائیے۔" یہ کہہ کر اس نے ہسپتال کا نام بتایا۔

ساحل عمر جب اماں کو ساتھ لے کر ہسپتال پہنچا تو عمر عابد گزر چکے تھے اور روحی کی زندگی

کے چند سانس باقی تھے۔ روحی نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں کھولیں، ساحل کو دیکھا۔ ساحل نے جھک کر اپنی ماں کی پیشانی چومی تو اس کی آنکھیں ایک دم چھلک پڑیں۔ اس نے گردن موڑ کر اپنی آنکھیں صاف کیں۔ اتنی دیر میں روحی چل بسی۔

ساحل سمندر سے واپسی پر ان کی گاڑی کو ایک تیز رفتار ٹرک نے ٹکر ماردی تھی اور پھر اس بدمست ڈرائیور نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا کہ گاڑی میں موجود مسافروں کا کیا بنا۔

ساحل عمر نے بڑے حوصلے سے کام لیا۔ اتنے بڑے حادثے کو اس نے دل پر پتھر رکھ کر سہہ لیا۔ اماں اس کو صبر کی تلقین کرتی تھیں اور خود کونوں بچالوں میں چھپ کر روتی تھیں۔ ساحل عمر انہیں روتا ہوا دیکھ لیتا، تو بڑے حوصلے سے ان کو سمجھاتا تھا۔ ساحل عمر کا صبر دیکھ کر اماں حیران ہوتی تھیں۔

سوئم کے بعد ساحل عمر نے ایک مرتبہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں اماں سے کہا تھا "اماں اب تم مجھے چھوڑ کر نہ چلی جانا۔"

ساحل عمر کی اس بات پر اماں کا دل کٹ کر رہ گیا۔ انہوں نے فوراً اسے اپنے گلے سے لگا لیا تھا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں۔ "میں اب کہاں جاؤں گی؟ میری جان تجھ میں ہے۔"

آج وہی ساحل عمر، جس نے اماں سے چھوڑ کر نہ جانے کی درخواست کی تھی، آج خود ہی ان کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ اس دکھ کو کیسے برداشت کرتیں۔

وہ سسک سسک کر روئے جا رہی تھیں اور ان کو تسلی دینے والا کوئی نہ تھا۔

اچانک انہیں یہ احساس ہوا جیسے کسی نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا ہو۔ انہوں نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور آنسو بھری آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ یہ ان کا محض وہم تھا۔ تسلی دینے کی خواہش نے شاید مجسم حیثیت اختیار کرلی تھی۔ پھر انہوں نے آنسو پونچھ ڈالے اور وضو کرنے کے لیے واش روم میں چلی گئیں۔

☆......☆......☆

ساحل عمر جب برکھا کے بنگلے پر پہنچا، تو نہ اسے ہارن بجانے کی ضرورت پڑی اور نہ بیل دینے کی۔ جب ساحل کی گاڑی گیٹ کے سامنے رکی، تو گیٹ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ساحل عمر نے دیکھا کہ گیٹ کھولنے والی خود برکھا ہے۔ اسے بڑی حیرت ہوئی، وہ جانے کب سے گیٹ کے پیچھے کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس احساس نے اس کے دل میں تفاخر پیدا کردیا۔

برکھا نے گیٹ کے ایک طرف کھڑے ہو کر اسے گاڑی اندر لے آنے کا اشارہ کیا، جب گاڑی اندر آ گئی تو اس نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ساحل عمر نے گاڑی کو بریک لگایا اور برکھا کو مڑ کر دیکھنے لگا۔

برکھا نے گیٹ بند کیا اور پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس کی طرف مسکرا کر ہاتھ بڑھایا۔ ساحل عمر نے ہاتھ ملایا۔ وہ ہنس کر بولی "مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"برکھا جی، کس بات کا؟"

"کہ میری ایک فون کال پر' آدھی رات کو آناً فاناً میرے پاس پہنچ جاؤ گے۔"
"بس مجھے نہیں معلوم کیا ہوا؟ آپ نے کہا آجاؤ...... آپ کی آواز سن کر میں فوراً یہاں آ گیا۔"
"اسے جانتے ہو' کیا کہتے ہیں؟" برکھا نے اس کی طرف ذرا سا جھک کر دیکھا۔
"نہیں جانتا۔"
"اسے محبت کہتے ہیں' تمہیں مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔"
"برکھا جی' شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"
"میں ٹھیک ہی کہتی ہوں' میں کبھی غلط نہیں کہتی۔ چلو گاڑی آگے بڑھاؤ' گاڑی بنگلے کے پیچھے کھڑی کرنی ہے۔" برکھا نے بڑی ادا سے کہا۔
ساحل عمر نے برکھا کی ہدایت کے مطابق گاڑی بنگلے کے پیچھے جا روکی اور انجن بند کر کے گاڑی سے اتر آیا۔
"ساحل عمر مجھے حیرت ہے کہ تم نے اب تک ورشا کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا؟"
"ہاں۔" ساحل عمر ایک دم چونکا۔ اسے فوراً ورشا یاد آئی۔ "کہاں ہے ورشا؟"
"ورشا اپنے کمرے میں ہے اور سو رہی ہے۔" یہ کہہ کر برکھا معنی خیز انداز میں ہنسی۔
ورشا اپنے کمرے میں ضرور تھی' لیکن سو نہیں رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب اس نے اپنے کمرے کی لائٹ بجھا دی تھی اور سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بار بار اس کا دھیان ساحل عمر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی ماں نے ساحل عمر کو کسی مکڑی کی طرح اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ اب اس کی ماں کو اس کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں اسے نیند نہیں آ رہی تھی کہ اس نے اپنے دروازے کی کنڈی بند ہونے اور پھر تالا ڈالے جانے کی آواز سنی۔ یہ کام بہت آہستگی سے کیا گیا تھا۔ اگر وہ سو رہی ہوتی تو ہرگز اسے پتا نہ چلتا۔ وہ دم سادھے لیٹی رہی۔ پھر کچھ دیر کے بعد اٹھی۔ اس نے اپنے کمرے کی اندر سے چٹخنی کھولی اور دروازے کو اپنی طرف کھینچا۔ دروازہ نہیں کھلا۔ اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ اس کی ماں نے اسے کمرے میں بند کر دیا ہے۔ وہ دوبارہ اپنے بیڈ پر آ گئی اور بڑے کربناک انداز میں سوچنے لگی کہ آج رات اسے کیوں بند کیا گیا ہے۔ اس کی ماں آج کس "واردات" میں مصروف ہے؟

☆......☆......☆

ناصر مرزا کا وظیفہ آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ پانچویں رات تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ چار پانچ چمگادڑیں بڑی تیزی سے اس کے سر پر اڑ رہی ہیں۔ ٹارچ کی روشنی پڑتے ہی وہ ایک ایک کر کے دیوار سے ٹکراتیں اور پٹ پٹ کر کے فرش پر آ گرتیں۔ چند لمحوں بعد ان کا وجود عدم وجود ہو گیا۔
ناصر مرزا نے چمگادڑوں کے ہوا میں تحلیل ہونے کے بعد ٹارچ بند کر دی۔ اس کا عمل جاری تھا' اس کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانے پھینک رہی تھیں۔ ٹارچ بند ہوتے ہی دوبارہ پروں کی

پھڑ پھڑاہٹ شروع ہوگئی۔ اس مرتبہ ناصر مرزا کو احساس ہوا کہ چگادڑیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں کیونکہ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ خاصی تیز تھی۔

ناصر مرزا نے فوراً ٹارچ روشن کردی۔ ٹارچ روشن ہوتے ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ ناصر مرزا کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ بیشمار چگادڑیں کمرے میں بھری ہوئی تھیں۔ ناصر مرزا نے بائیں ہاتھ میں چاقو اٹھا لیا اور اس کی نوک پر پھونک مار کر چاقو کو اپنے سر پر تیزی سے گھمایا۔ چاقو گھماتے ہی چگادڑیں اڑتے اڑتے اس طرح غائب ہوگئیں، جیسے کمرے میں تھیں ہی نہیں۔

چگادڑوں کے غائب ہوتے ہی بدبو پھیل گئی۔ اتنی شدید بدبو تھی کہ اگر ناصر مرزا اپنا سانس نہ روکتا، تو اپنے حواس گم کر بیٹھتا۔ ناصر مرزا کے ہاتھ میں ابھی چاقو موجود تھا۔ اس نے اندھیرے میں مصلے پر جلدی جلدی تین دائرے بنائے۔ وہ بدبو فوراً خوشبو میں تبدیل ہوگئی۔ ناصر مرزا نے پہلے ہلکا سا سانس لیا، جب اس نے محسوس کیا کہ خوشبو پھیل چکی ہے، تو اس نے گہرا سانس لیا۔

اس کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آخری مرحلہ بخیروخوبی گزر چکا تھا۔ تسبیح کے چند دانے رہ گئے تھے۔ بالاآخر تسبیح مکمل ہوگئی۔ کمرے میں بہت زبردست خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ عمل کے بخیروخوبی اختتام کی نوید تھی۔

ناصر مرزا خوشی سے جھومتا ہوا اٹھا۔ اس نے سب سے پہلے کمرے کی لائٹ روشن کی، مصلہ سمیٹا، چاقو بند کر کے میز پر رکھا اور ٹارچ اٹھا کر میز کی دراز میں ڈالی۔ پھر اس نے کھڑکیوں سے پردہ ہٹا کر کھڑکیاں کھول دیں۔ باہر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا کچھ دیر باہر کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے میز سے چاقو اٹھایا اور اپنے بیڈروم میں جانے کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆......☆......☆

رات کے تین بجے تھے۔

برکھا کا بنگلہ وحشت ناک تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے بنگلے کے گرد بھوت رقص کررہے ہوں۔ چڑیلیں ادھر ادھر گھوم رہی ہوں۔ اس بنگلے کی طرف دیکھتے ہی خوف کی لہر دل میں اٹھتی تھی۔

برکھا اپنے بیڈروم میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ بار بار اس کی نظر گھڑی پر جارہی تھی۔ تین بج چکے تھے۔ اب کسی بھی وقت ایک مخصوص آواز سنائی دینے والی تھی۔

تبھی کتے کے رونے کی بھیانک آواز سنائی دینے لگی۔ یہ آواز ایک خاص وقفے سے تین بار سنائی دی۔ برکھا فوراً اپنے بیڈروم سے نکل کر باہر گیٹ پر پہنچی۔ اس نے گیٹ کے اندر سے ہی پوچھا "یہ تم ہو؟"

"جی برکھا جی۔" فوراً ہی باہر سے آواز آئی۔ واسم گیٹ سے لگا کھڑا تھا۔

واسم کی آواز پہچان کر برکھا نے فوراً گیٹ کھول دیا اور واسم سے کہا "آؤ!"

واسم خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔

"واسم!" برکھا نے پلٹ کر کہا۔

لگا۔ واسم فوراً دو قدم آگے بڑھ کر اس کے برابر چلنے لگا۔

''برکھا جی!'' واسم نے کہا۔ ''جو کچھ میں نے تمھیں بتایا ہے وہ تم نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے ناں؟''

''جی برکھا جی۔'' واسم نے فرمانبرداری سے کہا۔

''ایک بار پھر تنبیہ کر رہی ہوں' اتنا جان لو کہ ساحل میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ اس سلسلے میں تمہاری ذرا سی بھی کوتاہی مجھے تباہ کر سکتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ اگر میں تباہ ہوئی تو پھر میرے ہاتھوں کوئی بھی نہ بچے گا۔'' برکھا نے یہ بات انتہائی سنگین لہجے میں کہی۔

''میں یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہوں' برکھا جی...... آپ بے فکر رہیں۔ مجھ سے اس سلسلے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔'' واسم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''میں آپ کے سرمائے کی اپنی جان پر کھیل کر حفاظت کروں گا۔''

''شاباش! مجھے تم سے یہی امید ہے۔'' برکھا نے خوش ہو کر کہا۔

بیڈروم کے دروازے پر پہنچ کر برکھا نے دھیرے سے کواڑ کھولے اور پیچھے مڑ کر واسم سے مخاطب ہوئی۔ ''آ جاؤ!''

واسم نے اپنے جوتے اتارے اور پھر بڑے احترام سے اندر داخل ہوا' جیسے بیڈروم میں نہیں کسی مندر میں داخل ہو رہا ہو۔ سامنے بیڈروم پر ساحل عمر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ رنگ زرد تھا اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑے ہوئے تھے۔

واسم نے گردن میں ہاتھ ڈال کر ساحل کو اٹھایا' تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن نقاہت اتنی تھی کہ آنکھیں زیادہ دیر کھلی نہ رہ سکیں۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھا۔

''سر! کھڑے ہو جائیے' میں آپ کو لینے آیا ہوں۔'' واسم نے اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ساحل عمر نے کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر آنکھیں کھول کر دیکھا اور لڑکھڑاتی زبان میں بولا ''تم کون ہو' بھائی؟''

''سر! میں آپ کا داس ہوں۔ خادم ہوں۔ سرونٹ ہوں۔'' واسم نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ پھر دھیرے سے بولا ''سر! آپ نے اتنی کیوں پی لی؟''

''ارے بھائی' برکھا نے پلائی ہے۔ اس نے پلائی' ہم نے پی لی۔ اس کے ہاتھوں سے تو زہر بھی پیا جا سکتا ہے۔'' ساحل عمر نے لڑکھڑاتے قدموں سے چلتے ہوئے نشیلے لہجے میں کہا۔

''سر! آپ بہت اچھے آدمی ہیں...... برکھا جی آپ سے بہت خوش ہیں۔''

''معلوم نہیں' وہ ہم سے خوش ہے یا ناراض...... لیکن ہم اس سے بہت خوش ہیں۔ وہ چڑھتی ندی ہے سب کچھ اپنے ساتھ بہا لے جانے والی۔'' پھر چلتے چلتے ایک دم جیسے اسے ہوش آیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بمشکل کھولا اور پھر بولا ''برکھا ہے کہاں؟''

''میں تمہارے پاس ہوں ساحل' میں بھلا کہاں جاؤں گی؟'' یہ کہہ کر برکھا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

پھر دونوں نے مل کر سڑک پر کھڑی گاڑی میں بٹھایا۔ برکھا نے واسم کو ایک چھوٹی سی شیشی دی' جس میں سرخ رنگ کا پانی تھا۔ واسم نے وہ شیشی ڈیش بورڈ میں احتیاط سے رکھ دی۔

''اس پانی کے دو قطرے بہت ہوں گے۔'' برکھا نے اسے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ہدایت نوٹ کرلی۔

''بس پھر جاؤ۔'' برکھا نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا' اس کے بعد وہ گھوم کر دوسری کھڑکی کی طرف آئی۔ ساحل آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

''اچھا! ساحل تم چلو میں آتی ہوں...... دیکھو پریشان مت ہونا۔'' برکھا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

ساحل عمر نے بمشکل اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ اسے دیکھ کر مسکرایا اور پھر فوراً ہی اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس پر نشے کی سی کیفیت طاری تھی۔

پھر واسم نے گاڑی سٹارٹ کی اور اسے تیزی سے نکال لے گیا۔

گاڑی کی لال بتی جب دکھائی دینا بند ہوگئی' تو برکھا نے سکون کا سانس لیا اور گیٹ بند کرکے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھنے لگی۔

☆......☆

صبح کا وقت تھا۔ ناصر مرزا رات کو سکون بھری نیند سویا تھا۔ صبح نہا دھو کر گھر سے نکلا تھا اب اس کا رخ ماڈل کالونی کی طرف تھا۔ حافظ موسیٰ نے پانچ دن بعد اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ وظیفہ مکمل کرنے کے ساتھ یہ ہدایت بھی کی تھی کہ ساحل عمر کو ہمراہ لانا' اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔

ناصر مرزا کو یہ ہدایت یاد تھی۔ اس نے ماڈل کالونی کا رخ کرنے سے پہلے ساحل عمر کو فون کیا۔ ایک تو وہ اسے وظیفے کی کامیابی کی خبر سنانا چاہتا تھا۔ دوسرے وہ اسے حافظ موسیٰ خان سے ملانا چاہتا تھا۔

اماں نے فون اٹھایا۔ ناصر مرزا نے اماں کی خیریت دریافت کرکے ساحل عمر کے بارے میں پوچھنا چاہا' تو اماں کی گھبراہٹ بھری آواز سنائی دی۔ ''ناصر! خیریت نہیں ہے۔''

''کیا ہوا اماں؟'' وہ پریشان ہوکر بولا۔

''ساحل رات سے غائب ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''غائب ہے؟'' ناصر مرزا حیران ہوکر بولا ''اس بات کا کیا مطلب ہے؟''

''وہ رات کو بارہ بجے کے قریب اچانک کہیں اٹھ کر چلا گیا۔'' اماں گویا ہوئیں۔

''آپ کو بتائے بغیر؟'' ناصر مرزا نے سوال کیا۔

''مجھے بتانا تو دور کی بات ہے' وہ گاڑی میں بیٹھا اور گھر کا گیٹ بھی کھلا چھوڑ گیا۔''

''ہیں!'' ناصر مرزا پریشان ہوا۔ ''اتنی کیا ایمرجنسی تھی۔ بعد میں اس کا کوئی فون وون بھی نہیں آیا؟''

''ابھی تک تو نہیں آیا۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولیں۔ ''میرے ساحل کو ضرور کچھ ہوگیا

ہے۔ اس پر کسی نے جادو کروا دیا ہے۔ وہ ایسا تو کبھی نہ تھا۔ چند دنوں میں اس کی حالت ہی بدل گئی

"اچھا' اماں آپ پریشان نہ ہوں۔ اس وقت میں ماڈل کالونی جا رہا ہوں۔ ضروری کام ہے۔ وہاں سے واپسی پر آپ کی طرف آتا ہوں۔ ساحل کہیں نہیں جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ میرے آنے سے پہلے ہی گھر پہنچ جائے۔" ناصر مرزا نے تسلی دی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" اماں کے دل سے دعا نکلی۔

ساحل عمر کے اس طرح اچانک چلے جانے کی وجہ سے ناصر مرزا خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ دو دن پہلے ساحل کی جو حالت ناصر نے دیکھی' اس سے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان جادوگر ماں بیٹی کے پھیر میں آ گیا ہے۔ لیکن ناصر مرزا کو یہ پتا نہ تھا کہ ان جادوگرنیوں کے اثرات اتنے گہرے ہو گئے ہیں کہ وہ بغیر بتائے دیوانوں کی طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نصف رات کو اس طرح نکل جائے گا۔

آخر اس پر ایسی کیا بیتی کہ وہ نصف رات کو گھر سے نکلنے پر مجبور ہو گیا۔

آخر وہ کہاں گیا؟

اس طرح کے سوالات اس کے دماغ میں چکراتے رہے۔ وہ اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ حافظ موسیٰ خان کا گھر آ گیا۔

ناصر مرزا نے اپنی گاڑی ان کے گھر کے سائے میں کھڑی کر کے بیل کا بٹن دبایا۔ کچھ دیر کے بعد وہی پندرہ سولہ سال کا لڑکا گیٹ پر آیا۔ اس نے ناصر مرزا کو دیکھ کر بڑے مہذبانہ انداز میں کہا "جی فرمائیے؟"

"مجھے حافظ صاحب سے ملنا ہے۔ انہوں نے مجھے آج کے دن بلایا تھا' میرا نام ناصر مرزا ہے۔" ناصر مرزا نے اپنے بارے میں تمام معلومات ایک ہی جملے میں فراہم کر دیں۔

"آیئے!" اس لڑکے نے راستہ چھوڑتے ہوئے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ناصر مرزا گیٹ میں داخل ہو کر رک گیا۔ لڑکا جب گیٹ بند کر کے پلٹا' تو اس نے ناصر مرزا کو اپنا منتظر پایا۔

"تشریف لے جایئے۔" اس نے مکان کے پچھلے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ وہیں ہیں۔ دروازہ کھٹکھٹا کر اپنا نام بتایئے گا' تو دروازہ کھل جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ لڑکا مکان کے اندر چلا گیا اور ناصر مرزا پختہ راستے پر چلتا ہوا بند دروازے کے سامنے آ پہنچا۔ اس نے دروازے پر ہاتھ سے دستک دی۔

"کون ہے بھائی؟" اندر سے ایک کڑک دار آواز سنائی دی۔

"میں ہوں جی ناصر مرزا۔"

"تو بھائی اندر آ جاؤ' دروازہ کھلا ہے۔" اندر سے پھر آواز آئی۔

ناصر مرزا نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا' تو کواڑ کھل گئے۔ وہ اندر داخل ہوا۔ سامنے درخت کے نیچے کھری چارپائی پر موٹی لاٹھی ہاتھ میں تھامے حافظ موسیٰ خان تشریف فرما تھے۔ وہ گویا ہوئے "بھائی دروازے کی کنڈی چڑھا کر آنا۔"

ناصر مرزا نے فوراً دروازہ بند کردیا اور ان کے نزدیک پہنچ کر سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا اور اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ناصر مرزا خاموشی سے ان کی پائنتی کی جانب بیٹھ گیا۔ حافظ موسیٰ نے دونوں ہاتھوں سے لاٹھی پکڑ کر گردن جھکا لی۔ یوں لگا جیسے وہ مراقبے میں چلے گئے ہوں۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے سر اٹھایا اور گویا ہوئے:

''اکیلے آئے ہو، وہ لڑکا کہاں ہے؟ کیا نام ہے اس کا؟''

''ساحل عمر۔'' ناصر مرزا نے فوراً بتایا۔

''میں اسے نہیں لا سکا۔''

''تم اسے لا نہیں سکے یا وہ تمہارے ہاتھ سے نکل گیا؟'' حافظ موسیٰ نے سوال کیا۔

''وہ گھر میں نہیں تھا' میں کیسے لاتا...... رات سے غائب ہے۔''

''بھائی' یہ اچھا نہیں ہوا۔'' محافظ موسیٰ نے کہا۔ ''خیر تم اپنی سناؤ؟''

''میں نے اپنا کام کرلیا ہے۔ آپ کی ہدایت کے مطابق۔''

''لاؤ چاقو کہاں ہے؟ اس پر مہر لگا دوں۔'' حافظ موسیٰ گویا ہوئے۔

ناصر مرزا نے جیب سے چاقو نکال کر ان کے ہاتھ میں دینا چاہا۔

''ابھی اپنے ہاتھ میں رکھو۔'' حافظ موسیٰ نے کہا۔ پھر انہوں نے اپنی لاٹھی سے زمین پر ایک دائرہ بنایا اور ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر بولے ''اس دائرے میں چاقو گاڑ دو۔''

ناصر مرزا فوراً نیچے بیٹھ گیا اور چاقو کھول کر گھاس لگی زمین پر دائرے کے درمیان اس چاقو کو گاڑ دیا۔ حافظ موسیٰ نے اپنی لاٹھی اس چاقو کے ہتھے پر رکھ دی۔ پھر انہوں نے کچھ پڑھتے ہوئے اپنی لاٹھی چاقو پر آہستہ آہستہ مارنا شروع کی۔ چاقو لاٹھی کی ہلکی ضربوں سے مزید زمین میں دھنسنے لگا۔ یہاں تک کہ چاقو کا پھل بالکل غائب ہوگیا۔ تب حافظ موسیٰ نے لاٹھی کی آخری ضرب لگائی اور پھر اپنے مخصوص انداز میں لاٹھی کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر گردن جھکا لی اور گردن جھکائے جھکائے بولے ''چاقو باہر نکال لو۔''

ناصر مرزا نے فوراً زمین سے چاقو نکال لیا اور بولا ''چاقو نکال لیا۔'' جی!!

''اس کی نوک پر کیا لگا ہے؟''

''ارے' اس کی نوک تو سنہری ہوگئی ہے۔'' ناصر مرزا نے چاقو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مبارک ہو' تمہاری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ اسے آنکھیں مل گئی ہیں۔''

''حافظ صاحب' میں سمجھا نہیں؟''

''ارے بھائی' یہ میرے جیسا اندھا نہیں رہا۔''

ناصر مرزا کی سمجھ میں بات اب بھی نہ آئی' لیکن اس نے مزید سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''یہ چاقو تمہارے بہت کام آئے گا۔ بس اس کی حفاظت کرنا۔''

''جی اچھا!'' ناصر مرزا نے کہا۔ پھر چند لمحے توقف کر کے بولا ''مجھے اپنے دوست کی بہت فکر ہے۔''

''ساحل عمر کی بات کر رہے ہو۔''

''جی!''

''اسے ڈھونڈو...... تلاش کرو۔'' حافظ موسیٰ نے کہا۔''اب جاؤ۔'' یہ کہہ کر انہوں نے پھر دونوں ہاتھوں سے لاٹھی پکڑ لی اور اپنی گردن جھکالی۔

ناصر مرزا کچھ دیر بیٹھا رہا۔ وہ ان سے سوال کرنا چاہتا تھا کہ کہاں تلاش کروں؟ مگر وہ یہ سوال باوجود کوشش کے نہ کر پایا۔ حافظ موسیٰ نے بھی سر نہ اٹھایا۔ بالآخر اسے وہاں سے اٹھنا پڑا۔

☆......☆......☆

وہ دونوں ساحل عمر کے گھر میں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ناصر مرزا نے مسعود آفاقی کو تمام صورتحال سے آگاہ کردیا تھا۔ وہ باتیں، جو مسعود آفاقی کے علم میں نہیں تھیں، وہ بھی اس نے بتا دی تھیں۔ دونوں کا ذہن بار بار ورشا اور برکھا کی طرف جارہا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ساحل عمر ورشا کے گھر کی طرف گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ اگر جاتا تو اب تک پلٹ کر آ گیا ہوتا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ورشا کے گھر جا کر کسی مصیبت کا شکار ہوگیا ہے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ ورشا کے گھر جا کر اسے کس طرح چیک کیا جائے۔ دونوں میں سے کسی نے ورشا کا گھر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ ورشا کا گھر کس طرح معلوم کیا جائے کہ مسعود کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ وہ بولا:

''اگر ورشا کا ٹیلی فون نمبر معلوم ہو جائے، تو پھر اس کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔''

اماں نے صبح سے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ اب بھی وہ بیٹھی رو رہی تھیں۔ ٹیلی فون نمبر کا ذکر سنا تو انہوں نے فوراً دوپٹے سے آنسو پونچھے اور ساحل عمر کی ڈائری اٹھالائیں، جس میں اس نے ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔

مسعود آفاقی نے جلدی جلدی اس ڈائری کے ورق اُلٹے۔ بالآخر ایک جگہ اسے ورشا کا ٹیلی فون نمبر لکھا نظر آ گیا۔ مسعود آفاقی کا ایک دوست ٹیلی فون کے محکمے میں ڈی ای لگا ہوا تھا۔ اس نے ٹیلی فون کر کے اپنا مسئلہ بتایا۔ اس نے جواب میں کہا ''پانچ منٹ انتظار کرو۔''

پانچ منٹ کے بعد جب گھنٹی بجی، تو وہ ٹیلی فون کی نہ تھی بلکہ گھر کی تھی۔

اماں فوراً گیٹ کی طرف بھاگیں۔ ناصر مرزا اور مسعود آفاقی بھی ان کے پیچھے چلے۔

اماں نے جلدی سے گیٹ کھولا۔

گیٹ پر جو شخص کھڑا تھا، اس سے وہ دونوں واقف نہ تھے، لیکن اماں اسے پہچانتی تھیں۔

☆......☆......☆

وہ باز غر تھا۔

وہ کچھ عرصہ پہلے ساحل عمر سے ملنے آیا تھا۔ اماں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر سوتے ہوئے ساحل کو اٹھایا تھا۔ وہ ساحل سے ایک چیتے کی تصویر بنوانے آیا تھا۔ ساتھ ہی وہ رشا ملوک کی

تصویر بھی خریدنا چاہتا تھا۔ ساحل عمر نے اس تصویر کو فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ جاتے ہوئے اپنا ٹیلی فون نمبر دے گیا تھا کہ جھکال کی تصویر مکمل ہونے پر اسے اطلاع دے دی جائے لیکن ساحل عمر تصویر مکمل کرنے کے بعد اسے اطلاع نہیں دے سکا تھا' کیونکہ پنسل سے لکھا ہوا نمبر کسی طرح مٹ گیا تھا۔ بعد میں وہ تصویر بھی نہ رہی تھی۔

آج وہ آیا تھا تو گھر میں جھکال کی تصویر تھی نہ وہ مصور تھا جس نے جھکال کی تصویر بنائی تھی۔

باز غر کا حلیہ وہی تھا۔ پہاڑی نقوش اور سر پر لگی ٹوپی۔

''جی فرمائیے!'' ناصر مرزا اس سے مخاطب ہوا۔

باز غر نے کوئی جواب دینے کے بجائے گھر کی جانب قدم بڑھائے۔ ناصر مرزا نے یہ سوچ کر کہ شاید یہ شخص گیٹ پر کھڑے رہ کر بات نہیں کرنا چاہتا' اس لیے اس نے اسے اندر جانے کا راستہ دے دیا۔ راستہ ملتے ہی وہ ایک لمحے کے لیے بھی وہاں نہیں رکا۔

ناصر مرزا اور مسعود آفاقی ''جی فرمائیے...... کیا کام ہے؟ کس سے ملنا ہے؟'' پوچھتے رہ گئے۔ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھا۔ اتنی تیزی سے کہ ان تینوں کو حیرت ہوئی۔ وہ اس کے پیچھے چلے اتنی دیر میں وہ گھر میں داخل ہو گیا۔

''ارے۔'' مسعود آفاقی حیران ہو کر اس کے پیچھے دوڑا۔ ناصر مرزا بھی بھاگا۔ ان دونوں کے پیچھے اماں بھی لپکیں۔

''یار' یہ عجیب شخص ہے' اپنے ابا کا گھر سمجھ کر اندر داخل ہو گیا۔'' مسعود آفاقی نے غصے میں کہا۔

پھر ان دونوں نے پورا گھر چھان مارا' لیکن وہ اندر آنے والا شخص انہیں کہیں نہیں دکھائی دیا۔ گھر کا اسٹور حتیٰ کہ واش روم تک دیکھ لیے گئے۔ اس گھر کا ایک دروازہ پچھلے حصے کی طرف کھلتا تھا اسے چیک کیا گیا' وہ لاک تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ شخص گھر میں داخل ہونے کے بعد کدھر سے نکل گیا جبکہ وہ دونوں' اس کے گھر میں داخل ہونے کے فوراً بعد اندر آ گئے تھے۔ چند لمحوں بعد اماں بھی ہانپتی کانپتی گھر میں داخل ہو گئی تھیں۔

گھر کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد گھر کے باہر بھی اگلے پچھلے دونوں حصوں میں اسے تلاش کر لیا گیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔

جب یہ تینوں اس کے پیچھے بھاگے تو گیٹ کھلا ہوا چھوڑ آئے تھے' لیکن اس وقت وہ گیٹ بند تھا۔ باقاعدہ اندر سے کنڈی تو نہ لگی تھی لیکن گیٹ کے دونوں پٹ اس طرح بند تھے کہ دور سے دیکھنے میں ہی احساس ہوتا تھا کہ گیٹ اندر سے بند ہے۔

کیا وہ شخص اندر جانے کے بعد فوراً ہی باہر آ گیا تھا اور باہر آ کر پورے اطمینان سے گیٹ سے نکل گیا تھا اور جاتے جاتے کھلے گیٹ کو بند کر گیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ وہ گھر میں کیا کرنے کے لیے داخل ہوا تھا۔

اس سوال کا جواب بھی بہت آسان تھا لیکن ان کے لیے مشکل اس لیے تھا کہ وہ اس بات کی توقع نہ رکھتے تھے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے' وہ شخص محض اس کام کے لیے گھر میں داخل ہوا تھا؟

یہ چوری اماں نے پکڑی تھی۔ جب گھر میں داخل ہونے والے شخص کی تلاشی جاری تھی تو اماں کی ایک دم نظر خالی دیوار پر پڑی تھی۔ ان کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا تھا۔

ساحل عمر کے بیڈروم کی وہ دیوار جس پر رشالوک کی تصویر بجی تھی' خالی تھی۔

رشالوک کی تصویر غائب تھی۔ بازغر وہ تصویر لے گیا تھا۔ اسے آتے ہوئے تو سب نے دیکھا تھا' وہ جاتے ہوئے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک گیا تھا۔ اس نے کوئی ایسا عمل کیا تھا کہ وہ ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے کے باوجود کسی کو نظر نہ آیا تھا۔

وہ تینوں حیران تھے کہ یہ سب کیسے ہوا؟ ان تینوں میں سب سے زیادہ پریشان ناصر مرزا تھا۔ اس کی تو عقل میں ہی نہیں سما رہی تھی یہ بات...... بازغر کے بارے میں اماں کے تفصیل سے بتانے پر یہ بات تو سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ رشالوک کی تصویر کیوں اٹھا کر لے گیا۔ اس کا رشالوک سے تعلق بنتا تھا لیکن یہ بات اس کے گلے سے نہیں اتر رہی تھی کہ وہ انسان نہیں' کوئی اور مخلوق تھا۔

ابھی وہ تینوں بیٹھے اس کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جس کے علم میں جتنی بات تھی' وہ سامنے لا رہا تھا اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

ناصر مرزا نے مسعود آفاقی کو اشارہ کیا "ریسیور اٹھاؤ۔"

اس کا خیال تھا کہ یہ ٹیلی فون مسعود کے دوست کا ہو گا۔ اس کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا' ادھر سے وہی بول رہا تھا۔

"ہاں' مسعود تم نے جو ابھی ٹیلی فون نمبر دیا تھا' اس کا ایڈریس لکھ لو۔"

"ایک منٹ یار۔" مسعود آفاقی نے اماں کو کاغذ پنسل لانے کا اشارہ کیا۔ اماں ایک سادہ کاغذ اور بال پوائنٹ ساحل عمر کی میز پر سے اٹھا لائیں۔

ادھر سے ایڈریس لکھوایا گیا۔ پھر اس نے کہا: "مسعود! یہ ٹیلی فون کسی مناف نامی شخص کا ہے۔ ظاہر ہے مناف اس کے باپ کا نام ہو گا تمہارا بہت شکریہ یار' تم نے ہمارا ایک بڑا مسئلہ حل کر دیا۔"

یہ کہہ کر مسعود آفاقی نے ریسیور رکھ دیا اور جو ایڈریس اس نے کاغذ پر اتارا تھا' وہ ناصر مرزا کے سامنے رکھ دیا۔

"گارڈن ایسٹ۔" ناصر مرزا نے پتے پر ایک نظر ڈال کر کہا۔ "پتہ تو زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔"

"کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"ورشا کے بنگلے پر چل کر دیکھنا ہو گا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ اس طرح وہ اسے ہمارے سامنے کر دے گی۔"

"اس سے مل کر یہ اندازہ تو ہو جائے گا کہ آیا وہ اس کے بنگلے پر گیا ہے یا نہیں۔ ورشا اگر

گھر پر ہوگی تو اس سے کچھ نہ کچھ آئیڈیا ضرور ہو جائے گا۔"
"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ساحل عمر اس کے گھر میں موجود ہو اور وہ جھوٹ بول دے۔"
"ہاں' ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن میں اس کے گھر جا کر اس سے بات ضرور کرنا چاہتا ہوں۔
اس سے ملنے کے بعد ہی آگے کا لائحہ عمل طے کیا جا سکتا ہے۔"
"ہم اس سلسلے میں پولیس سے مدد کیوں نہیں لیتے؟"
مسعود آفاقی نے رائے دی۔ تمہارے وہاں تعلقات بھی ہیں۔"
"پولیس کیا کرے گی؟" ناصر مرزا بیزاری سے بولا۔
"تعلقات کے باوجود میری بھتیجی کا قاتل آج تک نہیں پکڑا گیا۔ عابد منجم کے قتل کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ساحل عمر کے سلسلے میں وہ کیا کرے گی۔ ابھی تو صورت حال بھی واضح نہیں ہے۔ وہ خود گھر سے گیا ہے۔ ہم پولیس سے کیا کہیں گے' کس کے نام ایف آئی آر میں درج کرائیں گے۔ ابھی میں پولیس کو درمیان میں نہیں لانا چاہتا۔ خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔" ناصر مرزا نے سمجھایا۔
"چلو پھر اٹھو' چلتے ہیں۔" مسعود آفاقی اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"ارے' ابھی کہاں جا رہے ہو' دوپہر کا کھانا کھا کر جانا۔"
"نہیں اماں کھانے کا تکلف نہ کریں۔ ہم لوگ چلتے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ تسلی رکھیں۔ انشاء اللہ جلد ہی ساحل عمر مل جائے گا۔"
"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" اماں کے دل سے دعا نکلی۔
تب وہ دونوں اٹھ کر گھر سے باہر نکل آئے اور اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر آگے پیچھے چل دیئے۔

گارڈن ایسٹ کا علاقہ ناصر مرزا کا دیکھا ہوا تھا۔ اسے ورشا کا بنگلہ تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ جب وہ دونوں اپنی اپنی گاڑیاں بنگلے کی دیوار کے ساتھ لگا کر گیٹ کی طرف بڑھے تو ناصر مرزا نے اس بنگلے پر ایک نظر ڈال کر کہا۔ "مسعود اس بنگلے پر تو وحشت برس رہی ہے۔"
"صحیح کہہ رہے ہو' واقعی کوئی بھوت بنگلہ محسوس ہو رہا ہے۔" مسعود آفاقی نے تائید کی۔
بنگلے کی کال بیل دبا کر وہ دونوں گیٹ سے ذرا پیچھے کھڑے ہو گئے۔
تھوڑی دیر کے بعد انہیں گیٹ کے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ گیٹ کے درمیان خلاء میں ایک آنکھ نظر آئی۔ پھر وہ آنکھ فوراً ہی غائب ہو گئی اور آنے والا واپس چلا گیا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی اخلاقیات کو پرے رکھ کر آگے بڑھ کر گیٹ کے درمیان سے جھانک لیتا تو اسے اندازہ ہو جاتا کہ آنے والا' آنے والا نہ تھا' آنے والی تھی اور یہ آنے والی برکھا کے سوا کوئی نہ تھی۔
اس نے گیٹ پر کھڑے دونوں بندوں کو صاف دیکھ لیا تھا۔ ایک کو اس نے پہچان بھی لیا تھا۔ وہ ناصر مرزا تھا۔ دوسرے شخص کے بارے میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ساحل عمر کا نوکر یا دوست ہوگا۔ وہ ان دونوں کے سامنے جانا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی وہ کچھ دیر ورشا کی آڑ لینا چاہتی تھی۔ اسے امید تھی کہ ورشا ان دونوں کو اچھی طرح نپٹ کر لے گی۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر کوئی گیٹ پر محسوس ہوا۔ اس نے بھی گیٹ سے باہر جھانکا اور پھر ذرا سا ہٹ کر مترنم لہجے میں سوال کیا۔ ”آپ کون؟“

”ہم دونوں ساحل عمر کے دوست ہیں۔ ہمیں ورشا صاحبہ سے ملنا تھا۔“ ناصر مرزا نے آگے بڑھ کر کہا۔

”ایک منٹ۔“ ادھر سے آواز آئی۔ پھر چند لمحوں بعد ہی گیٹ کھل گیا۔ ورشا گیٹ سے تھوڑا سا باہر آئی اور بڑے مودبانہ انداز میں بولی۔ ”جی فرمایئے! میرا نام ورشا ہے۔“

ناصر مرزا نے برکھا کو تو دیکھا تھا لیکن ابھی تک اس کا ورشا سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ مسعود آفاقی نے تو برکھا کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

اب دونوں نے ایک ساتھ ورشا کو دیکھا تو دیکھتے رہ گئے۔

وہ زرد رنگ کی ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ بغیر آستین کا سرخ بلاؤز، کھلے ہوئے بال، شاید وہ کچھ دیر قبل نہائی تھی۔ اس کا چہرہ بے حد فریش تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ کشش۔ ہونٹوں پر دل لبھانے والی مسکراہٹ...... وہ ایک قیامت تھی۔ اس لڑکی کے لیے اگر ساحل عمر گھر سے دیوانہ وار نکلا ہے تو ٹھیک ہی نکلا ہے۔ مسعود آفاقی نے اپنے دل میں سوچا اور ایک ٹھنڈا سانس لے کر ناصر مرزا کی طرف دیکھا۔

”یہاں ساحل عمر صاحب تو نہیں ہیں۔“ ناصر مرزا، نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔ ”میرا مطلب ہے یہاں آئے تو نہیں؟“

”ساحل عمر صاحب!“ اس نے اپنی مترنم آواز میں دہرایا۔ پھر بے نیازانہ انداز میں بولی۔ ”کیا انہوں نے یہاں آنے کو کہا تھا۔“

”وہ آدھی رات سے گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔ کچھ بتا کر نہیں گئے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ بعد میں فون وغیرہ بھی نہیں کیا۔ ہم لوگ پریشان ہیں۔ ان کی اماں کا برا حال ہے......“

”اماں کا......؟ اچھا ان کی نوکرانی۔“ ورشا نے بات کاٹ کر سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دے دیا۔

”ہم انہیں صبح سے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ کئی جگہ جا چکے ہیں۔ سوچا آپ سے بھی معلوم کرتے چلیں۔“

”آپ نے ناحق زحمت کی۔ یہ بات تو آپ ٹیلی فون کر کے بھی معلوم کر سکتے تھے۔“ ورشا نے یہ کہہ کر دونوں کو بغور دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولی۔ ”خیر کوئی بات نہیں...... آپ ساحل صاحب کے دوست ہیں۔ آیئے اندر تشریف لے آیئے۔ کچھ ٹھنڈا وغیرہ پی کر جایئے گا۔ میں آپ دونوں کے نام جان سکتی ہوں۔“

”مسعود آفاقی ہوں، فوٹوگرافر۔“

”میں ناصر مرزا ہوں، شکاری۔“ ناصر مرزا نے مسعود کے انداز میں جواب دیا اور ہنس پڑا۔

”اوہ۔“ بے ساختہ ورشا کے منہ سے نکلا لیکن ناصر مرزا سمجھ نہ سکا کہ اس نے ”اوہ“ کس

بات پر کی۔
وہ ابھی تک گیٹ پر جمی کھڑی تھی۔ اُس نے انہیں اندر آنے کی دعوت ضرور دی تھی۔ لیکن انہیں گھر میں لے جانے کے موڈ میں نہ تھی۔ دوسرے اس نے اتنے سوال جواب کر لیے تھے لیکن ساحل عمر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔
ناصر مرزا نے تب براہ راست سوال کیا۔ ''جی آپ نے ساحل عمر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''
''وہ اگر یہاں آئے ہوتے تو میں ضرور ان کے بارے میں کچھ بتاتی۔'' ورشا نے پھر بھی واضح جواب نہ دیا۔
''آپ کی ساحل سے کب ملاقات ہوئی تھی؟''
''میری ان سے ملاقات پر کوئی پابندی تو نہ تھی۔ ہم جب چاہتے تھے مل لیتے تھے۔'' ورشا نے پھر گول مول جواب دیا۔
''اچھا جی...... ہم چلتے ہیں۔ آپ کو زحمت ہوئی۔ اگر ان کا کوئی فون آجائے تو ہمارے بارے میں ضرور بتا دیجئے گا۔'' ناصر مرزا نے کہا۔
''جی بہت بہتر۔ میں ضرور بتا دوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ واپس پلٹی۔ اس نے ان دونوں کے جانے کا ابھی انتظار نہ کیا فوراً گیٹ بند کر دیا۔
وہ دونوں ہکا بکا گیٹ کو دیکھتے رہ گئے۔
''یار ناصر مرزا' تم یہاں کیوں آئے تھے؟'' مسعود آفاقی نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
''ایک تو میں ان قیامتوں کا گھر دیکھنا چاہتا تھا۔ دوسرے میں ساحل عمر کے بارے میں ان سے براہ راست معلوم کرنا چاہتا تھا۔'' ناصر مرزا نے وضاحت کی۔
''چلو گھر تو تم نے دیکھ لیا۔ ایک مسئلہ حل ہو گیا لیکن ساحل عمر کے بارے میں تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔'' مسعود فاقی کے لہجے میں غصہ تھا۔
''اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ ساحل عمر گھر سے نکل کر سیدھا ادھر ہی آیا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ گھر کے اندر موجود ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ ورشا سے پہلے گیٹ پر بر کھا آئی تھی۔ اس نے گیٹ پر مجھے دیکھا اور واپس چلی گئی کیونکہ پہلے آنے والی کالے لباس میں تھی۔ لباس کی جھلک میں نے گیٹ کے خلا سے دیکھی تھی۔ اندر جا کر اس نے ورشا کو بھیج دیا کہ وہ گول مول جواب دے کر ہمیں ٹرخا دے' لیکن ہم ٹرخنے والوں میں سے نہیں ہیں۔'' ناصر مرزا پرعزم لہجے میں بولا۔
''اے بھائی' کیا کرنے کا ارادہ ہے۔'' مسعود آفاقی ذرا چونک کر بولا۔
''یار ایک بات ہے' ساحل اپنی گاڑی پر گھر سے نکلا ہے۔ اگر وہ اس وقت گھر میں موجود ہے تو اس کی گاڑی بھی یہاں موجود ہوتی۔'' ناصر مرزا نے قیاس آرائی کی۔
''تم نے یہ بات تو عقلمندی کی کی ہے۔''

"میں ذرا گیٹ سے اندر جھانک کر دیکھ لوں۔ ممکن ہے گاڑی اندر کھڑی نظر آ جائے۔"

"ہاں دیکھو......"مسعود آفاقی اپنی گاڑی میں بیٹھتا بیٹھتا باہر نکل آیا۔

دونوں نے باری باری گیٹ کے درمیان جو خلا تھا اس سے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس سے سامنے کا ایک محدود حصہ نظر آ رہا تھا' وہاں گاڑی نہ تھی۔

"مسعود کیا خیال ہے بنگلے کے پیچھے نہ چلیں۔" ناصر مرزا نے پوچھا۔ "ایک نظر پچھواڑے بھی ڈال لیں۔"

"چلو!" مسعود آفاقی نے اتفاق کیا۔

وہ دونوں اپنی گاڑیاں وہیں چھوڑ کر بنگلے کے پیچھے آ گئے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اچھی خاصی گرمی تھی۔ پچھلی گلی میں کوئی نہ تھا۔ دیوار اونچی تھی لیکن اتنی اونچی نہ تھی کہ اس پر چڑھا نہ جا سکے۔ دیوار میں ایک جگہ بلاک ٹوٹا ہوا تھا۔ ناصر مرزا نے پیر اس میں ٹکایا اور ذرا سا اچک کر دیوار کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

جب اس نے سامنے نظر ڈالی تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ساحل عمر کی گاڑی ایک درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ وہ فوراً دیوار سے اتر آیا اور مسعود آفاقی کو فوراً اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا' وہ جلد سے جلد یہاں سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔

"ساحل کی گاڑی اندر موجود ہے۔" ناصر مرزا نے راستے میں بتایا۔

"پھر کیا کہتے ہو......گھر میں گھس جائیں۔" مسعود آفاقی کو جوش آ گیا۔

"برکھا بڑے اثر و رسوخ والی عورت ہے' گھر میں زبردستی داخل ہونے کی صورت میں ہم پر کیس بھی بن سکتا ہے۔" ناصر مرزا نے اسے سمجھایا۔ پھر چند لمحے توقف کر کے بولا: "گھر چلو وہاں کچھ بیٹھ کر سوچتے ہیں۔"

"یار معاملہ بہت سنگین ہو گیا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا دوست کسی مشکل میں گرفتار ہو گیا ہو۔ مسعود آفاقی نے بڑے تشویش بھرے انداز میں کہا اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گیا۔

پھر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اپنے رستے پر ہولیں۔

دونوں گاڑیوں کے جانے کے بعد وہ شخص درخت کی اوٹ سے نکل آیا۔ قریب ہی اس کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ موٹر سائیکل کی گدی پر بیٹھ کر اس نے اپنی شرٹ کی جیب سے موبائل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملانے لگا۔ مشکل سے تیس سیکنڈ اس نے کسی سے بات کی۔ پھر موبائل فون اپنی جیب میں ڈال لیا۔ وہ اگرچہ ورشا کے بنگلے سے ذرا فاصلے پر کھڑا تھا لیکن اتنی دور نہ تھا کہ اسے بنگلے کا گیٹ دکھائی نہ دے رہا ہو۔

وہ وہاں انجان بنا کھڑا تھا لیکن اس کی نظریں بنگلے کے گیٹ پر تھیں۔ وہ وہاں کئی گھنٹے سے تھا۔ کبھی وہ اپنی موٹر سائیکل چیک کرنے بیٹھ جاتا۔ کبھی بنگلے کے گیٹ تک آ کر واپس اپنی جگہ پہنچ جاتا' کبھی درخت کے سہارے کھڑے ہو کر سگریٹ پینے لگتا۔ وہ ورشا کے بنگلے کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس بات

میں کسی قسم کا شبہ نہ تھا۔ وہ نگرانی کیوں کر رہا تھا۔ یہ بات ابھی راز میں تھی۔
پھر یہ بات بھی زیادہ راز میں نہ رہ سکی۔ جیسے ہی بنگلے کے گیٹ سے گاڑی نکلی وہ بجلی کی سی تیزی سے موٹر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ موٹر سائیکل پر سوار ہوتے ہوئے اس نے یہ چیک کر لیا تھا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے۔
گاڑی میں ورشا تھی۔ زرد ساڑھی اور سرخ بلاؤز میں۔ اس نے اپنے بال سنوار لیے تھے۔ چہرے کی نوک پلک درست کر لی تھی۔
ورشا کی گاڑی آگے نکلتے ہی اس نے موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے موبائل فون کا نمبر ڈائل کیا اور بڑے کرخت لہجے میں کہا۔ ''موسم بہت خوشگوار ہے۔''
پھر اس نے فون اپنی جیب میں ڈالا۔ موٹر سائیکل کو کک لگائی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی وہ کسی گولی کی طرح ورشا کی گاڑی کی طرف چلا۔
ورشا کی گاڑی بڑی سڑک پر آئی تو وہاں سے ایک پجیرو اس کے پیچھے لگ گئی۔ اس جیپ میں چار خونخوار بندے موجود تھے۔
ورشا کی گاڑی برج کراس کر کے تین تلوار والی چورنگی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ورشا کو پتہ نہ تھا کہ اس کی گاڑی کے ساتھ ایک موٹر سائیکل سوار اور اس کے پیچھے ایک جیپ مسلسل تعاقب میں ہے۔ اس نے اپنی پسند کا ایک کیسٹ لگایا ہوا تھا اور وہ برق رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔
آگے جا کر اس کی گاڑی سپر مارکیٹ سے دائیں جانب گھومی۔ اس کے بعد اس نے خرکار چورنگی کی طرف رخ کیا۔ ابھی وہ چورنگی کے قریب پہنچنے والی تھی کہ موٹر سائیکل سوار اچانک اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ ورشا نے اپنی گاڑی بچا کر دائیں جانب نکلنے کی کوشش کی تو پجیرو نے اسے دوسری سائیڈ سے گھیر لیا۔
ورشا کو اب گاڑی روکے بنا چارہ نہ تھا۔
گاڑی رکتے ہی پجیرو سے چاروں خونخوار بندے گوریلوں کی طرح باہر نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں آتشیں ہتھیار تھے۔ ورشا ابھی مسئلے کو سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ اسے اٹھا کر پجیرو میں ڈال دیا گیا اور پجیرو آندھی طوفان کی طرح وہاں سے نکل گئی۔
موٹر سائیکل سوار نے اپنی گاڑی ایک سائیڈ پر کھڑی کر کے ورشا کی گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کی۔ گاڑی لاک کر کے اس کی چابی اپنی جیب میں ڈالی پھر وہیں کھڑے ہو کر موبائل فون کا نمبر ڈائل کیا اور بڑے مودبانہ انداز میں بولا۔
''سر آپریشن کٹی پتنگ بخیر و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچا۔''
ٹیلی فون بند کر کے اس نے جیب میں ڈالا اور پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے واپس شہر کی طرف چل دیا۔

☆......☆......☆

ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل چیخ رہی تھی۔ ریسیور اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ برکھا اپنے بیڈروم میں نہ

تھی۔ وہ واش روم میں تھی۔ گھنٹی کی آواز اسے سنائی دے رہی تھی لیکن وہ فوراً نکل نہیں سکتی تھی۔ وہ نہانے میں معروف تھی۔ اس اثناء میں ٹیلی فون کی گھنٹی وقفے وقفے سے بج کر بند ہو چکی تھی۔ کوئی برکھا کو مسلسل فون کر رہا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بجنے کی وجہ سے وہ جلدی جلدی نہا کر نکل آئی۔ اس نے اپنے جسم کے گرد ایک بڑا سا تولیہ لپیٹا ہوا تھا۔ بالوں سے پانی بوند بوند موتی کی طرح ٹپک رہا تھا۔

اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو!''

''برکھا جی! اتنی دیر سے ٹیلی فون کر رہا ہوں' کہاں تھیں آپ؟'' ادھر سے بے چینی سے پوچھا گیا۔

''ابھی نہا کر نکلی ہوں۔'' برکھا نے بتایا۔ ''ورشا تو وقت پر پہنچ گئی ناں۔''

''اسی لیے فون کر رہا ہوں۔ صاحب آنے والے ہیں اور ورشا ابھی تک نہیں پہنچی ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔'' برکھا ایک دم پریشان ہوگئی۔ ''وہ یہاں سے ٹھیک وقت پر نکلی ہے۔ اسے تو وہاں کب کا پہنچ جانا چاہیے۔''

''وہ یہاں ابھی تک نہیں پہنچیں۔'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ ''صاحب کا فون آ چکا ہے۔ وہ آنے والے ہیں' برکھا جی بڑا غضب ہو جائے گا۔ میری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''ارے بھاڑ میں گئی تمہاری نوکری۔'' برکھا کو ایک دم غصہ آ گیا۔ ''مجھے اپنی بیٹی کی فکر پڑی ہے۔ وہ اب تک وہاں کیوں نہیں پہنچی۔ کہاں رہ گئی وہ۔''

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''اب میں صاحب کو کیا جواب دوں گا۔''

''تم پریشان مت ہو' صاحب سے میری بات کرا دینا میں سنبھال لوں گی۔ تم ایسا کرو' فوراً کسی آدمی کو بھیجو۔ کہیں اس کی گاڑی نہ خراب ہوگئی ہو' ویسے ایسا امکان تو نہیں' احتیاطاً کہہ رہی ہوں۔ ٹائر پنکچر نہ ہو گیا ہو۔'' برکھا نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے' برکھا جی' میں آدمی بھیج کر راستہ چیک کراتا ہوں۔'' اس نے کہا ''آپ دس منٹ بعد ذرا فون کر لیجیے گا۔ میں آپ کی صاحب سے بات کرا دوں گا۔ ان کو بس آپ ہی سنبھال سکتی ہیں۔''

''مروت...... میں فون کر لوں گی۔ تم فوراً بندہ بھیجو۔'' یہ کہہ کر برکھا نے ریسیور رکھ دیا۔

☆......☆......☆

ورشا کی آنکھوں پر کس کر پٹی باندھ دی گئی تھی اور اس کے برابر ایک بندہ بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس ریوالور کی نال اس کی پسلیوں میں چبھ رہی تھی۔ چلتے ہوئے اس سے کہا گیا تھا: ''اگر زندگی چاہتی ہو تو خاموش بیٹھی رہنا۔''

لیکن وہ خاموش نہیں بیٹھی رہ سکی تھی۔ اسے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے لیکن وہ یہ نہیں سمجھ پائی تھی کہ اسے کس کے ایما پر اغوا کیا گیا ہے اور وہ اسے کہاں لیے جا رہے ہیں۔ اس نے پوچھا تھا: ''مجھے صرف اتنا بتا دو کہ اس واردات کے پیچھے کون ہے' یہ معلوم ہونے کے بعد میں ایک

لفظ بھی نہیں بولوں گی۔"

"یہ بات ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ بس اب سوال مت کرنا۔" اس کے برابر بیٹھے ہوئے شخص نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیا تم لوگوں سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں جس سے ملاقات کرنے جارہی تھی' وہ کتنا بڑا آدمی ہے۔ کہو تو اس کا نام بتاؤں۔"

"بس بہت ہوگئی۔ اب تم بولیں تو میں گولی چلا دوں گا۔" یہ بات اس نے کچھ اس انداز میں کہی کہ ورشا نے خاموش ہو جانا ہی بہتر جانا۔

پھر اس کے بعد کوئی نہ بولا۔ گاڑی میں موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ ورشا اندازہ نہیں کرسکی کہ اسے کہاں لے جایا گیا۔ ویسے سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ وہ محسوس کررہی تھی جیسے وہ ابھی شہر میں ہی ہے۔ گاڑی سے اتار کراسے کسی اچھے گھر میں لے جایا گیا۔ اس گھر کی سیڑھیاں چڑھنے سے لے کر جہاں تک اسے لے جایا گیا' وہاں اس کے پیروں میں قالین رہا۔

اس نے ایک دروازے کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز سنی۔ ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا گیا۔ دروازے کی ہلکی سی چرچراہٹ محسوس ہوئی۔ پھر اسے ایک بیڈ پر بٹھا دیا گیا۔ جب اس کی آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو اس نے خود کو ایک عالیشان بیڈروم میں پایا۔ ورشا کو اندازہ تھا کہ آنکھیں کھلتے ہی اسے منحوس چہروں کو دیکھنا پڑے گا لیکن اس وقت کمرے میں کوئی خونخوار چہرہ نہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی پٹی جس نے کھولی تھی' وہ کوئی مرد نہ تھا عورت تھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کے تجربے کی چمک تھی۔ وہ شلوار قمیص میں تھی اور وہ ورشا کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

برکھا نے نمبر ملا کر ریسیور کان سے لگایا۔

"ہیلو!" ادھر سے بھاری آواز میں کہا گیا۔ اس آواز کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اسے امید نہ تھی کہ وہ براہ راست فون اٹھالیں گے۔

"اوہ' سر میں برکھا بول رہی ہوں۔" برکھا نے بڑی تھکاوٹ سے کہا۔

"برکھا جی' آپ نے ہم پر بڑا ظلم کیا۔ اب دیکھو ناں' قوم نے ہمارے کاندھے پر کتنی بھاری ذمہ داری ڈال دی ہے۔ اس قومی وقت میں سے ہم نے دو گھنٹے کس مشکل سے نکالے ہیں۔ آپ یہ بات نہیں جانتی ہوں گی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ دو گھنٹے ہم کسی کی حسین رفاقت میں گزاریں گے لیکن یہاں آکر تو بدمزگی ہوگئی۔ برکھا جی' آپ نے ہم پر بڑا ظلم کیا۔"

"سر' میں معذرت چاہتی ہوں۔ آپ یقین کریں ورشا یہاں سے بالکل ٹھیک وقت پر نکلی تھی۔ وہ وہاں ابھی تک نہیں پہنچی' یہ سن کر میں خود پریشان ہوگئی ہوں۔ میں نے کچھ دیر پہلے عرفی سے بات کی تھی۔ پتہ نہیں اس نے راستہ چیک کرنے کے لیے کسی بندے کو بھیجا یا نہیں۔"

"یہ عرفی میرے سامنے بیٹھا ہے۔ اس سے بات کرلیں۔" سر نے کہا اور موبائل فون اس

کے ہاتھ میں دینے کے بجائے آف کر دیا اور موبائل میز پر پھینک کر کھڑے ہو گئے۔ ''ناٹک کرتی ہے ہمارے ساتھ۔''

ہر وقت قوم کا درد دل میں لیے پھرنے والے کا دل خراب ہو چکا تھا۔ وہ یہاں اپنا ''غم غلط'' کرنے آیا تھا۔ کسی اور کے غم میں مبتلا نہیں ہونے آیا تھا۔ اس نے جلتی آنکھوں سے عرفی کو دیکھا اور پھنکارتا ہوا بولا۔ ''ڈرائیور سے کہو گاڑی باہر نکالے۔''

''جی سر۔'' عرفی کانپتا ہوا بولا۔ ''مجھے معاف کر دیجئے، غلطی ہو گئی۔''

قوم کا درد بانٹنے والے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسے غصے سے دیکھتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' ورشا نے اس عورت کو اس قدر محویت سے دیکھتے ہوئے پایا تو سوال کر بیٹھی۔

''تمہیں دیکھ رہی ہوں، اتنی سندر، اتنی سوہنی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ بالکل ہرنی جیسی ہو۔ تمہیں کہاں سے پکڑا گیا ہے؟'' وہ اسے بدستور دیکھ رہی تھی۔

''مجھے آدمیوں کے جنگل سے پکڑا گیا ہے۔'' ورشا نے ہنس کر کہا۔

''سوہنی ہونے کے ساتھ ساتھ ہمت والی بھی ہو۔'' اس نے رائے دی۔

''کیسے پہچانا!'' وہ متعجب ہوئی۔

''اس کمرے میں جب میں کسی لڑکی کی آنکھوں سے پٹی کھولتی ہوں تو وہ تھر تھر کانپ رہی ہوتی ہے۔ خوف کے مارے زبان نہیں کھلتی۔ تم تو ہنس رہی ہو، کون ہو تم؟'' اس تجربے کار عورت نے اپنا تجربہ بیان کیا۔

''اب تک کتنی پٹیاں کھول چکی ہو۔'' ورشا نے سادگی سے سوال کیا۔

''یہ بتانے سے تمہیں کیا حاصل ہو گا۔'' وہ نرم لہجے میں بولی۔

''میں کہاں ہوں...... کیا یہ بتا سکتی ہو؟'' ورشا نے دوسرا سوال کیا۔

''بتانا چاہوں تو بتا سکتی ہوں لیکن اس سے بھی تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا۔''

''تم بتا سکتی ہو تو بتا دو۔'' فائدہ نقصان مجھ پر چھوڑ دو۔'' اس نے دوٹوک انداز اختیار کیا۔

''تم ڈیفنس کے ایک بنگلے میں ہو؟'' اس نے انکشاف کیا۔

''اتنی مہربان ہو گئی ہو تو یہ بھی بتا دو کہ مجھے یہاں کس کے حکم پر لایا گیا ہے۔'' اس نے پانسہ پھینکا۔

''یہ بات میں تمہیں نہیں بتا سکتی لیکن یہ بات زیادہ عرصے راز میں رہے گی نہیں۔ تم خود اپنی آنکھ سے دیکھ لو گی کہ کون ہے وہ؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم کون ہو؟" ورشا نے سوال کیا۔
"میں ایک خادمہ ہوں اور یہاں تمہاری خدمت کرنے کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔ بولو
تمہیں کیا چاہیے۔ ٹھنڈا پیو گی یا گرم۔" اس نے بڑے مودبانہ لہجے میں کہا۔
"شکریہ...... فی الحال مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"
"ٹھیک ہے پھر تم آرام کرو۔ اگر میری ضرورت پڑے تو یہ بیڈ کے اوپر دیوار میں لگا گھنٹی کا
بٹن دبا دینا۔ میں حاضر ہو جاؤں گی۔ میں اب چلتی ہوں۔ جاتے ہوئے باہر سے دروازہ لاک کر جاؤں
گی۔ اس بیڈروم میں تم آزاد ہو جو مرضی آئے کرو۔"
"جاتے جاتے اپنا نام بتاتی جاؤ۔" ورشا مسکرائی۔ "اگر بتانا چاہو تو۔"
"میرا نام چندن ہے اور تم؟" اس نے سوال کیا۔
"میں ورشا ہوں۔" ورشا نے اپنا نام بتایا۔
"اچھا نام ہے۔ کم سننے میں آتا ہے۔ کس نے رکھا یہ نام؟" اس نے ایسے ہی پوچھا۔
"میری ممی نے' ان کا نام برکھا ہے۔" ورشا نے بتایا۔
"اوہ۔" برکھا کا نام سن کر چندن ایک دم چونک گئی۔ "تو تم برکھا جی کی بیٹی ہو؟"
"ہاں' کیا تم میری ممی کو جانتی ہو؟" ورشا نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔
"ہاں بہت اچھی طرح...... وہ بڑے صاحب کے پاس آیا کرتی تھیں۔ انہوں نے ان کے
بہت کام کیے۔ انہوں نے ایک کام میرا بھی کیا تھا۔ میرا شوہر مجھے بہت تنگ کرتا تھا۔ بات بے بات
مارتا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک پڑیا دی۔ اس میں راکھ جیسی کوئی چیز تھی۔ وہ میں نے اپنے شوہر کو چائے
میں گھول کر پلا دی۔ بس وہ دن اور آج کا دن' پھر کبھی اس نے مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ بڑے صاحب
کی زندگی تک وہ یہاں آتی رہیں۔ اسی بنگلے میں۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے آنا چھوڑ
دیا۔" چندن نے بتایا۔
"چندن' میری ماں نے تم پر احسان کیا ہے۔ آج اس کی بیٹی تمہارے سامنے ہے۔ کیا تم
اس پر کوئی احسان نہیں کر سکتی ہو۔" ورشا نے امید بھری نظروں سے دیکھا۔
"ورشا بی بی...... مجھے مشکل میں مت ڈالو۔ وہ بڑا جلاد آدمی ہے۔ ایک سیکنڈ میں بندے کی
پیشانی پر ریوالور رکھ کر گولی چلا دیتا ہے۔ بی بی مجھے معاف کرنا...... میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔"
اس نے گھبرا کر کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ پھر ورشا نے دروازے کے تالے میں چابی گھومنے
کی آواز سنی۔ وہ بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔

☆......☆......☆

یہ ایک وسیع و عریض فارم تھا۔ اس فارم میں خاصا اندر جا کر کاٹیج بنا ہوا تھا۔ واسم نے اپنی
گاڑی کاٹیج کے دروازے سے ملا کر کھڑی کی اور ہارن دیا۔

چند لمحوں بعد کاٹیج کا دروازہ کھلا۔ سوناں مسکراتی ہوئی باہر آئی۔
"واسم تمہیں آنے میں کچھ دیر نہیں ہوگئی۔"
سوناں نے گاڑی میں جھانک کر ساحل عمر کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"راستے میں ایک جگہ چیکنگ ہو رہی تھی۔ راستہ بدل کر آیا ہوں۔" واسم نے بتایا۔
پھر ان دونوں نے ساحل عمر کو سہارا دے کر گاڑی سے اتارا۔ گاڑی سے اترتے ہوئے ساحل عمر نے ایک دم آنکھیں کھولیں۔ خالی نگاہوں سے باری باری دونوں کو دیکھا اور پھر ان کے کندھوں کا سہارا لے کر یوں چلنے لگا جیسے وہ دونوں اس کی مرضی کے مطابق اسے کہیں لیے جا رہے ہوں۔
اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ وہ کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے۔
"برکھا جی نے اس کے بارے میں کیا ہدایت کی ہے۔ اسے کہاں رکھنا ہے۔" سوناں نے کاٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پوچھا۔
"اندر والے کمرے میں رکھنا ہے۔ سیج پر لٹانا ہے۔"
واسم نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"واسم تم بھی خوب ہو' اسے تم سیج کہتے ہو۔" سوناں نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔
"اچھا چلو' سیج مت کہو...... موت کی سیج کہہ لو۔ اب تو ٹھیک ہے۔"
"ہاں' وہ کمرہ تو قربان گاہ ہے۔" سوناں نے گہرا سانس لے کر کہا۔
"سوناں' ایک بات کان کھول کر سن لو' کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ برکھا جی نے بہت سخت تنبیہ کی ہے۔ اگر ذرا بھی کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم لوگوں کی خیر نہیں۔" واسم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے سمجھایا۔
"نہیں کوئی غلطی نہیں ہوگی...... تم بے فکر رہو۔" سوناں نے اسے یقین دلایا۔ پھر توقف کرکے بولی۔ "برکھا جی کب آئیں گی؟"
"ان سے فون پر بات کرنا ہوگی۔ پھر جب وہ کہیں گی' انہیں جا کر لانا ہوگا۔" واسم نے بتایا۔
پھر وہ دونوں اندر والے کمرے کے دروازے پر رک گئے۔ سوناں نے اپنا کندھا اس کے بازو سے نکالا اور واسم سے بولی۔ "واسم ذرا سنبھالو۔"
واسم نے جھولتے ساحل عمر کو مضبوطی سے تھام لیا۔ تب وہ زمین پر بیٹھ کر ساحل عمر کے جوتے اتارنے لگی۔ پھر ان دونوں نے بھی اپنے جوتے اتارے اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔
یہ ایک چوکور کمرہ تھا۔ سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی سامان نہ تھا۔ اس کمرے کے درمیان میں شاید ایک تخت پڑا ہوا تھا۔ وہ چاروں طرف سے ایک کالی چادر سے

ڈھکا ہوا تھا۔ ساحل عمر کو اس پر احتیاط سے لٹا دیا گیا اور پھر دونوں الٹے قدموں واپس دروازے کی طرف گئے اور باہر نکل کر دروازہ مقفل کر دیا۔

صبح ہو چکی تھی۔ سورج کی روشنی ایک دم ہی اس کی آنکھوں پر پڑی تھی۔ اس کی بند آنکھوں پر تمازت محسوس ہوئی تو اس نے فوراً آنکھیں کھولیں اور پھر فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

سورج کی روشنی اوپر بنے روشندان سے آ رہی تھی اور ایک مخصوص جگہ پر پڑ رہی تھی۔ ساحل عمر نے نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک عجیب وغریب کمرہ تھا۔ وہ جس چیز پر بیٹھا ہوا تھا وہ پتھر کی طرح سخت تھی اور اس پر ایک بڑی سی کالی چادر پڑی ہوئی تھی۔

اس نے کھڑے ہو کر جب یہ دیکھنے کے لیے چادر کھینچی کہ وہ کہاں لیٹا ہوا تھا۔

دکھ کی ایک لہر اس کے اندر اترتی چلی گئی۔

وہ کسی کی قبر تھی۔
اور اس قبر کا کتبہ سرہانے کے بجائے درمیان میں لگا ہوا تھا۔ جس پر صاحب قبر کا نام' سن ولادت اور سن وفات لکھا ہوا تھا۔ اسے دکھ اس بات کا ہوا تھا کہ وہ کسی کی قبر پر لیٹا ہوا تھا۔ شاید وہ رات کو سویا بھی اسی قبر پر تھا۔
اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے؟ یہ کیا جگہ ہے؟ اور اسے یہاں کون لایا ہے؟ اسے بس اتنا یاد تھا کہ رات کو برکھا کا فون آیا تھا۔ اس نے اسے آنے کے لیے کہا تھا۔ اس کی آواز میں جانے ایسا کیا جادو تھا کہ وہ فوراً اس کے پاس جانے کے لیے بے قرار ہو گیا تھا اور ایک منٹ ضائع کیے بغیر گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر سے نکل گیا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال تھا کہ جلد از جلد برکھا کے پاس پہنچ جانا ہے۔ اس کے خیال کے علاوہ سارے خیال اس کے دماغ سے مٹ گئے تھے۔ اس کی نظروں کے سامنے بس برکھا کا چہرہ تھا۔ اس چہرے کے علاوہ اسے کوئی چہرہ یاد نہ رہا تھا۔ حتیٰ کہ ورشا کا چہرہ بھی غبار راہ ہو گیا تھا۔
پھر برکھا نے اسے اپنے بیڈ روم میں لے جا کر جانے کیا پلا دیا تھا کہ اس کے پیتے ہی وہ اپنے ہوش گنوا بیٹھا تھا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اس پر خواب کی سی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اسے یہ احساس تو تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے اس کا پوری طرح ادراک نہ تھا۔ کبھی وہ برکھا کا چہرہ دیکھتا' کبھی اسے واسم نظر آتا' کبھی وہ خود کو گاڑی میں بیٹھا ہوا پاتا۔ کبھی وہ کہیں لیٹا ہوا محسوس کرتا۔
اس وقت وہ ذرا ہوش میں آیا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا گیا ہو۔ سر چکرا رہا تھا اور جسم سن سا ہو رہا تھا۔ اس نے ورزش کے انداز میں ہاتھ پیروں کو حرکت دی اور سوچنے لگا کہ یہ کیا جگہ ہے؟
یہ برکھا کا بیڈ روم تو نہ تھا۔ یہ بڑا عجیب و غریب کمرہ تھا۔ کمرے میں ایک قبر بھی تھی اور دیوار سے دیوار تک سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کمرے میں دو روشندان تھے جو آمنے سامنے تھے اور خاصے اونچے تھے۔ کوئی کھڑکی نہ تھی۔ سامنے ایک دروازہ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے تک گیا۔ چلتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اس نے دروازے کا ہینڈل نیچے کر کے دروازہ کھولنا چاہا لیکن دروازہ لاک تھا۔

اب اس کا دماغ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔

☆......☆......☆

برکھا کا بنگلہ اس وقت تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ناصر مرزا اسی جگہ سے دیوار پھلانگ کر اندر آیا تھا جس جگہ سے اس نے دن کی روشنی میں ساحل عمر کی گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔ دیوار کود کر وہ چند لمحے اطمینان سے کھڑا رہا۔ اس نے بنگلے کی پچھلی سائیڈ کو بغور دیکھا۔ عمارت میں کہیں بھی روشنی نہ تھی۔ اسے اس بات کا خدشہ تھا کہ بنگلے میں کوئی کتا نہ ہو۔ اگرچہ وہ پوری تیاری سے بنگلے میں داخل ہوا تھا اور ہر خطرے سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ بنگلے میں کتا وغیرہ نہ ہو تو بہتر ہے۔ خواہ مخواہ اسے ختم کرنا پڑے گا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ بنگلے میں کوئی کتا موجود نہیں ہے تو وہ نپے تلے قدموں سے آگے بڑھا۔ اسٹریٹ لائٹ جہاں تک اندر آرہی تھی' وہاں تک وہ اس کی روشنی میں آگے بڑھتا رہا اور جب اندھیرا بڑھنے لگا تو اس نے محدود دائرے والی چھوٹی سی ٹارچ روشن کر لی۔

یہ بنگلہ درخت اور بے ترتیب جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ جھینگروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ بنگلے کی ویرانی اندھیرے میں مزید بڑھ گئی تھی۔ بنگلے کی طرف بڑھتے ہوئے دل میں ہول سی اٹھتی تھی۔ ناصر مرزا مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ وہ بغیر پریشان ہوئے محتاط انداز میں آگے بڑھتا رہا۔

اس وقت اسے حیرت کا جھٹکا لگا جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں دن میں ساحل عمر کی گاڑی کھڑی تھی' وہاں اب گاڑی موجود نہ تھی۔ وہ پیچھے سے گھومتا ہوا آگے آ گیا۔ مین گیٹ تک چلا گیا لیکن اسے گاڑی کہیں نظر نہ آئی۔ اس پر مایوسی چھانے لگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساحل عمر یہاں سے نکل گیا۔ وہ مین گیٹ سے یہ سوچتا ہوا پھر پچھلی طرف آیا۔ تب اسے ایک جگہ جھاڑیوں کے اندر ایک ہیولا سا محسوس ہوا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو ساحل عمر کی گاڑی پر نظر پڑی۔ وہ ایک دم کھل اٹھا۔

اب سوال یہ تھا کہ اس بنگلے میں بے شمار کمرے تھے اور ایک بھی روشن نہ تھا۔ پھر وہ کیسے اندازہ کرے کہ ساحل عمر کس کمرے میں موجود ہے۔ اسے ایک ایک کمرہ جھانکنا ہوگا۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے ٹارچ بائیں ہاتھ میں تھام لی اور جیب سے چاقو نکال کر کھول لیا اور ایک ایک کمرے کو چیک کرتا آگے بڑھنے لگا۔

بیشتر کمرے اندر سے بند تھے اور جو کھلے تھے وہ خالی پڑے ہوئے تھے۔ ان میں کوئی سامان تک نہ تھا۔ اسی طرح کمروں کی تلاشی لیتا جب وہ ایک کمرے کے سامنے آیا تو اس کا دروازہ بھی حسب معمول بند تھا۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ ٹارچ روشن کر کے سامنے دیکھا تو اسے اس کمرے میں قالین بچھا نظر آیا۔ پھر ٹارچ کے دائرے نے ایک بیڈ دریافت کیا۔

ناصر مرزا ابھی بیڈ پر ٹارچ کی روشنی ڈال کر یہ دیکھنے ہی والا تھا کہ آیا بیڈ پر کوئی موجود ہے کہ نہیں کہ اچانک کمرہ تیز روشنی میں نہا گیا۔

کمرے میں برکھا موجود تھی۔ بیڈ سے اٹھ کر اسی نے لائٹ روشن کی تھی۔ اپنے سامنے ناصر

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

مرزا کو پا کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔
''شکاری تو...... تو یہاں کیا سوچ کر آیا ہے۔'' وہ ناگن کی طرح بل کھا کر بولی۔

''میرا دوست کہاں ہے...... میں اپنے دوست کو لینے آیا ہوں۔ اسے میرے حوالے کر دے۔ میں یہاں سے خاموشی سے چلا جاؤں گا۔'' ناصر مرزا نے دوٹوک انداز میں بات کی۔

''کس دوست کی بات کرتا ہے...... میں تیرے کسی دوست کو نہیں جانتی۔''

''اس دوست کی جس کی گاڑی تیرے گھر کی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ہے۔'' ناصر مرزا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''اچھا تو تو پورے گھر کی تلاشی لے آیا ہے۔'' برکھا جواب تک کھڑی تھی' بیڈ پر بیٹھ گئی اور اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''تو نے میرے گھر میں داخل ہو کر اچھا نہیں کیا؟''

''میں نے یہاں آ کر اچھا کیا ہے یا برا کیا ہے' اس بات کو چھوڑ...... مجھے باتوں میں الجھانے کی کوشش نہ کر۔ دوپہر کو بھی تو نے یہی کہا تھا خود سامنے آئی نہیں مجھے دیکھ کر ڈر گئی۔ اپنی بیٹی کو بھیج دیا۔ اس نے غلط بیانی سے کام لیا جبکہ ساحل عمر اس گھر میں موجود تھا۔ تو اس لڑکے کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔ وہ میرا بہت پیارا دوست ہے۔ اگر اس کو کچھ ہو گیا تو پھر تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''میرے گھر میں گھس کر مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے۔ ابھی اگر میں پولیس کو کال کرلوں تو تو جانتا ہے تجھ پر کتنے مقدمے بن جائیں گے۔ تو یہ بات اچھی طرح جانتا ہوگا۔ جانتا ہے ناں؟'' برکھا نے ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔

''میں تیرے گھر کی دیوار پھلانگ کر آیا ہوں۔ میں اس طرح کود کر اندر آیا ہوں تو کچھ سوچ کر ہی آیا ہوں گا۔ تو اپنا شوق پورا کر' پولیس کو کال کر۔ پھر دیکھ تماشا۔'' ناصر مرزا پولیس بلانے کی دھمکی پر تھوڑا پریشان ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنی پریشانی ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے اسے الٹی دھمکی دے کر چکرا دیا۔ اگر وہ ڈر جاتا تو وہ اسے اور ڈراتی لیکن وہ ڈرنے والوں میں سے نہ تھا۔

''تو کیا چاہتا ہے؟'' برکھا کا لہجہ تھوڑا نرم ہوا۔

''میں یہاں ساحل عمر کو لینے آیا ہوں۔ اسے میرے حوالے کر دے۔''

''اور میری بیٹی کا کیا ہوگا؟'' ایک انوکھا سوال ہوا۔

''کہیں تو ساحل عمر اور ورشا کی شادی کے چکر میں تو نہیں ہے۔ یاد رکھ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

''میں کیا کہہ رہی ہوں تو کیا کہہ رہا ہے؟''

''تو جو کہنا چاہ رہی ہے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔''

''ورشا کہاں ہے؟'' ناصر مرزا اس سوال پر چونکا۔

''اس سوال کا کیا مطلب ہے؟''

''تمہارے جانے کے بعد سے میری ورشا غائب ہے۔ اس کی گاڑی کلفٹن چورنگی کے نزدیک سے ملی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوگوں نے اسے اغوا کروایا ہے۔'' برکھا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اوہ' تو ورشا اغوا ہو چکی ہے...... ورشا کے اغوا کا ذکر سن کر ناصر مرزا کے دل میں ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ کوئی تو ان ظالموں کو نقصان پہنچانے والا پیدا ہوا جس نے بھی ورشا کو اغوا کیا ہے۔ اس کے لیے اس کے دل سے دعا نکلی۔ واہ بھائی تو نے کمال کیا۔ اللہ تیرا بھلا کرے۔

ناصر مرزا نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یہ بات طے کر لی کہ وہ اغوا کے معاملے کو ہرگز کلیئر نہیں کرے گا۔ برکھا خود بخود جال میں پھنس گئی تھی۔ اب وہ بارگیننگ پوزیشن میں آ گیا تھا۔ وہ اس بات سے فائدہ اٹھائے گا۔

لیکن وہ بھی کچی گولی نہیں کھیلے ہوئے تھی۔ وہ ایک شاطر تھی۔ جب سے اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ ورشا کی گاڑی کلفٹن چورنگی کے نزدیک کھڑی ہے تب سے اس نے اپنے تمام ہرکارے ادھر ادھر دوڑائے ہوئے تھے۔ جن جن لوگوں پر اسے شبہ تھا' وہاں وہاں وہ چیک کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ پورے بنگلے میں اندھیرا کر کے اپنے بیڈ پر بیٹھ کر ایک عمل کر رہی تھی کہ ناصر مرزا اس کے گھر میں آ کودا تھا۔

یہ لوگ اس کی فہرست میں شامل نہ تھے۔ ناصر مرزا کا چہرہ دیکھ کر اچانک اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہ کام ان لوگوں نے کیا ہو...... یہ سوچ کر اس نے اندھیرے میں تیر چھوڑ دیا تھا۔ اگر ناصر مرزا کے اشارے پر یہ اغوا ہوا ہے تو یہ فوراً اگل دے گا۔ اس طرح ورشا کے بدلے میں ساحل عمر کو دے دیا جائے گا۔ اور آیندہ وہ ورشا کو محفوظ کر کے ساحل عمر کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے گی۔

''تم کسی کو اغوا کر سکتی ہو تو کوئی اور بھی تمہاری بیٹی کو اغوا کروا سکتا ہے۔ سیر کو سوا سیر ملنا کون سا مشکل ہے۔'' ناصر مرزا نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔

''میں نے ساحل عمر کو اغوا نہیں کیا۔'' برکھا نے کہا۔

''پھر اس کی گاڑی تمہارے گھر میں کیسے موجود ہے؟'' ناصر مرزا نے سوال کیا۔

''ہو سکتا ہے تمہاری بیٹی کو بھی کسی نے اغوا نہ کیا ہو۔ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ گئی ہو۔''

''شکاری میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ جو کچھ کہنا ہے صاف لفظوں میں کہو۔'' یہ کہہ کر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا جگ اور گلاس اٹھایا۔ جگ سے پانی نکال کر پورا گلاس بھرا۔

اتنی دیر میں اس نے کچھ پڑھ کر گلاس پر پھونکا اور بیڈ سے اچانک اٹھ کر دو قدم آگے بڑھی اور اس سے پہلے کہ ناصر مرزا کچھ سمجھتا' اس نے پانی سے بھرا گلاس اس کے اوپر پھینک دیا۔

بظاہر پانی نظر آنے والی چیز اس کے پڑھ کر پھونکتے ہی پانی نہ رہی تھی' تیزاب بن گئی تھی۔ ناصر مرزا کی جگہ اس وقت اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہ جل کر رہ جاتا۔ اس کا چہرہ اور جسم جھلس جاتا۔ مگر یہ پانی ناصر مرزا کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ پانی پڑتے ہی اس کے جسم میں آگ لگنی شروع

ہوئی تھی کہ ناصر مرزا کو فوراً ہوش آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو موجود تھا۔ وہ چاقو فوراً اس نے اپنے جسم سے لگا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پانی بھاپ بن کر اڑ گیا۔
برکھا اسے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

ورشا بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں دروازے پر جمی تھیں۔ وہ اس شخص کا انتظار کر رہی تھی جس نے یہ سارا کھیل رچایا تھا...... اسے بند دروازے کے کھلنے کا شدت سے انتظار تھا......

یہ وہ بیڈ روم نہ تھا جہاں اس کی چندن نے پٹی کھولی تھی۔ وہ بیڈ روم تو ڈیفنس کے ایک بنگلے کا تھا۔ اس بنگلے میں وہ اندھیرا ہونے تک رہی تھی۔ اندھیرا ہوتے ہی چندن دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔ اس مرتبہ وہ اکیلی نہ تھی' اس کے ساتھ کچھ منحوس شکلیں بھی تھیں اور یہ شکلیں ان سے مختلف تھیں جو اسے پجیرو میں ڈال کر یہاں تک لائے تھے۔
وہ دو تھے اور دونوں کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں۔
''ورشا بی بی ...... چلنا ہے۔'' چندن نے اس کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔
''یہاں سے کہاں جانا ہے؟'' ورشا نے پوچھا۔
''میں نہیں جانتی...... مجھے حکم ملا ہے کہ میں آپ کو جیپ میں لے آؤں۔'' اس نے بتایا۔
''اچھا' چلو!'' ورشا کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔
''ایک منٹ بی بی۔'' چندن نے کہا۔
''اب کیا ہے؟'' ورشا اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
''ذرا بیٹھ جائیں۔ آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھنی ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔
''چندن کاش تم اس شخص کی عقل پر پٹی باندھ سکتیں جس نے مجھے اغوا کروا کے ایک قیامت کو دعوت دے دی ہے۔''
''ایسی قیامتیں ہمارے راجہ سائیں نے بہت دیکھی ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کلاشنکوف سیدھی کی اور چندن سے مخاطب ہو کر بولا: ''چل چندن جلدی کر' باندھ پٹی ...... لمبا سفر ہے۔''
ورشا نے ایک نظر اس شخص کو دیکھا سوچا کچھ پوچھے۔ پھر کچھ سوچ کر رہ گئی۔ چندن نے جلدی سے ورشا کی آنکھوں پر کالی پٹی باندھ دی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
پچھلی سیٹ پر ورشا کے ساتھ چندن بیٹھ گئی اور پھر سفر شروع ہو گیا۔ رات کو تین چار بجے تک یہ لوگ اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ گاڑی بڑی سی حویلی کے بڑے سے گیٹ میں داخل ہو گئی اور کافی اندر جا کر اصل عمارت کے سامنے رکی۔ چندن نے ورشا کو گاڑی سے اتارا۔ ہاتھ پکڑ کر اسے مختلف راستوں سے گزارتی ہوئی بالآخر ایک کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ اندر سے بند کر کے ورشا کی آنکھوں سے پٹی کھول دی۔
پٹی کھلنے کے بعد ورشا نے آہستہ سے اپنی آنکھوں کو ملا' آنکھیں میچیں اور کھولیں۔ پھر

کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتی ہوئی بولی۔ ''پوری رات سفر میں گزر گئی۔''

''جی بی بی...... ہم کراچی سے بہت دور نکل آئے ہیں۔''

''یہ کیا جگہ ہے؟'' ورشا نے حسب معمول اپنی معلومات میں اضافہ چاہا۔

''اس جگہ کا نام میں نہیں جانتی...... میں پہلی بار یہاں آئی ہوں۔'' چندن نے دھیرے سے کہا۔ ورشا نے محسوس کیا کہ وہ سفید جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ اس کی مجبوری سمجھتی تھی۔ لہٰذا اس نے جگہ سے متعلق کوئی اور سوال نہ کیا۔

''بی بی آپ کچھ پئیں گی۔''

''ہاں' چائے پیوں گی۔'' ورشا نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''تھکن ہوگئی ہے۔''

''آپ چہرے پر چھینٹے مار لیں...... میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' اس نے مشورہ دیا۔

ورشا نے باتھ روم میں جا کر اپنا چہرہ اچھی طرح دھویا۔ سامنے لگے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ چہرے پر تھکن برس رہی تھی۔ یہ ایک مشکل اور دشوار گزار سفر تھا۔ آخری دس میل انتہائی تکلیف دہ تھے۔ راستہ اونچا نیچا اور کچا تھا۔ آنکھوں پر پٹی ہونے کی وجہ سے وہ بار بار چندن پر گر رہی تھی۔ گاڑی کو خاصے جھٹکے لگ رہے تھے۔

دس منٹ میں چندن چائے لے آئی۔ چائے کے ساتھ کھانے کی کچھ اشیاء بھی تھیں۔ چندن نے یہ بہت اچھا کیا تھا۔ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس نے چند بسکٹ لیے' تھوڑا سا خشک میوہ چکھا اور پھر چائے پی کر ذرا تازہ دم سی ہوگئی۔

''ورشا بی بی ...... چار بجنے والے ہیں۔ اب آپ سو جائیں اور مجھے بتائیں کہ آپ کو کتنے بجے آ کر اٹھاؤں۔''

''ایک قیدی کو اپنی مرضی سے سونے کی اجازت ہے؟'' ورشا نے مسکرا کر پوچھا۔

''آپ چاہیں تو پورا دن سو سکتی ہیں...... آپ کو مکمل آزادی ہے...... آنے والا تو رات کو آئے گا۔''

''اچھا!'' ورشا نے چندن کو گہری نظروں سے دیکھا۔ ''تم اسے جانتی ہو۔''

''نہیں بی بی ...... میں کسی کو نہیں جانتی۔'' چندن نے پھر سفید جھوٹ بولا۔

''چندن' تمہیں جھوٹ بولنا اچھا لگتا ہے؟'' ورشا نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ چندن نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے پر یکدم اداسی پھیل گئی۔ پھر وہ مری سی آواز میں بولی:

''ورشا بی بی' میں کب آ کر اٹھاؤں۔''

''گیارہ بجے تک آ جانا۔'' ورشا نے اسے بتایا۔

''اچھا ٹھیک ہے بی بی۔''

''چندن سنو۔'' جب وہ جانے لگی تو ورشا نے پیچھے سے آواز دی۔

چندن فوراً رک گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ''جی بی بی۔''

''چندن میری ماں میرے لیے تڑپ رہی ہوگی' تم ایک کام کر دو۔ میں تمہیں ایک فون نمبر دیتی ہوں۔ اس نمبر پر فون کر کے صرف اتنا بتا دو کہ میں خیریت سے ہوں۔'' ورشا نے کہا۔

''کاش بی بی ...... میں ایسا کر سکتی۔ بی بی یہ حویلی ہے۔ آپ حویلی میں ہیں اور میں اس حویلی کا تنکا ہوں۔ ایک تنکا فون تک کیسے پہنچے گا' اس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتی ہیں۔'' اس نے التجا آمیز لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا یوں کرو' میں چند لائنیں تمہیں لکھ کر دے دیتی ہوں' تم یہ خط لفافے میں رکھ کر اس پر پتہ لکھ کر پوسٹ کر دینا ...... یہ تو کر سکتی ہو؟ ورشا نے ایک اور راستہ بتایا۔

''ابھی جب میں یہاں سے باہر نکلوں گی تو میری اچھی طرح سے تلاشی لی جائے گی۔ بی بی اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں خط لے جانے کے جرم میں پیشانی پر گولی کھا کر ماری جاؤں تو لائیں دے دیں ...... میں لے جاتی ہوں۔''

چندن نے یہ بات کچھ اس انداز میں کہی کہ ورشا پھر اسے مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

اس نے خاموشی سے گردن ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی' چندن بوجھل قدموں سے باہر نکل گئی اور اس نے باہر سے دروازہ بند کر کے تالا ڈال دیا۔

چندن کے جانے کے بعد ورشا کروٹ لے کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ اس لیے آرام ملتے ہی اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔

وقت مقررہ پر چندن نے اسے آ کر اٹھا دیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ پھر سو گئی۔ شام کو اٹھی۔ چندن نے چائے کی ٹرے مع لوازمات اس کے سامنے رکھی۔ اس نے صرف چائے پی۔

شام کو سات بجے کے قریب چندن پھر آئی۔ اس نے رات کے کھانے کے بارے میں پوچھا۔ ورشا نے کوئی فرمائش نہ کی۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اسے کھانا پیش کیا گیا۔

نو بجے کے قریب جب ورشا کھانے اور چائے وغیرہ سے فارغ ہو گئی تو چندن نے ورشا سے کہا: ''بی بی' آپ منہ ہاتھ دھو لیں' میک اپ وغیرہ کر لیں' کپڑے تبدیل کر لیں۔''

''یہ سب میں کیوں کروں؟ تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟'' ورشا یکدم بپھر گئی۔

''بی بی' مجھ پر غصہ نہ ہوں...... میں نے آپ کو کچھ نہیں سمجھا۔ مجھے جیسے جیسے حکم ملتا جا رہا ہے' میں آپ کو بتاتی جاتی ہوں۔ میں حکم کی غلام ہوں۔''

''تمہیں جو کہا گیا...... وہ تم نے مجھے بتا دیا...... تمہارا کام ختم ہو گیا۔ بس اب تم جاؤ' مجھے جو کرنا ہو گا کر لوں گی۔ آنے والے کو آنے دو۔ میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گی۔ اس نے مجھے کوئی معمولی لڑکی سمجھ لیا ہے۔ شاید وہ نہیں جانتا کہ میں اس پر کس طرح قیامت بن کر ٹوٹوں گی۔''

''بی بی ...... میں آپ کو ایک مرتبہ پھر سمجھائے دیتی ہوں۔ وہ بہت ظالم ہے۔ ایک لمحے میں ریوالور پیشانی پر رکھ کر گولی داغ دیتا ہے۔ کوئی ایسا کام مت کیجئے گا کہ آپ کی ممی زندگی بھر روتی رہیں۔'' چندن نے بہت محبت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ انہی محبت بھرے لفظوں میں دھمکی بھی چھپی تھی۔

''تم فکر مت کرو چندن۔ اس ظالم کو آنے دو۔ میں اسے دیکھ لوں گی۔'' وہ کسی دھمکی میں آنے والی نہ تھی۔

چندن کے جانے کے بعد وہ بیڈ سے اٹھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنا جائزہ لیا۔ بہت ہلکا سا میک اپ کیا۔ کئی ڈریس وارڈروب میں موجود تھے۔ وہ ڈریس بھی تبدیل کر سکتی تھی۔ اس زرد ساڑھی کو پہنے چوبیس گھنٹے سے زائد ہو گئے تھے۔ مسلسل باندھنے سے ساڑھی میں شکنیں پڑ گئی تھیں لیکن وہ اس ساڑھی کو تبدیل کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے ڈریس چھوڑ دیا۔ گلے میں ہلکا سا زیور پہن لیا اور پھر پاؤں لٹکا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں بند دروازے پر تھیں اور وہ اس شخص کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی جس نے یہ سارا کھیل رچایا تھا۔ بالآخر اس کا انتظار ختم ہوا۔

دس بجے کے قریب دروازے پر آہٹ ہوئی۔ آہٹ ہوتے ہی ورشا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور ایک نوجوان بڑی تیزی سے اندر داخل ہوا اور پھر اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہوا۔

پھر وہ ایک خاص اسٹائل سے چلتا ورشا کی طرف بڑھا اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

وہ سفید قمیص شلوار میں تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی کوٹی پہن رکھی تھی۔ سانولا رنگ، گھنے سیاہ بال، بھاری مونچھیں جو نیچے کو لٹکی تھیں۔ بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، چوڑی پیشانی اونچا قد......

ورشا نے اسے اندر آتے ہوئے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ اسے وہ نوجوان کچھ جانا پہچانا سا لگا لیکن وہ اسے پہچان نہ پائی، لیکن اس کی چال ڈھال اور انٹری سے اندازہ لگا لیا کہ کوئی چھوٹے دماغ کا بگڑا ہوا رئیس ہے۔ اس طرح کے لوگ اس نے بہت دیکھے تھے۔ دن رات اس کی ممی کے گرد اسی طرح کے لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ اس سے کیا خوفزدہ ہوتی۔

''مجھے پہچانا۔'' اس کے لہجے میں تکبر تھا۔

''ہاں، ایسا لگا جیسے میں کسی فلم کے سیٹ پر دلہن بنی بیٹھی اپنے شوہر کا انتظار کر رہی ہوں کہ درمیان میں کوئی اور شخص کمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ میرا جی چاہا کہ آپ کے اندر داخل ہونے کے بعد کٹ کہوں اور شاٹ او کے ہونے کی نوید سنا کر آپ کی انٹری پر داد دوں۔ سائیں آپ تو پکے ولن لگتے ہو۔''

ورشا نے کچھ اس انداز سے یہ بات کہی کہ وہ قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکا۔

''بہت خوب...... آپ یہی سمجھو کہ کسی فلم کے سیٹ پر ہو۔ آج ایسی اداکاری کرو کہ ہمارا دل خوش ہو جائے۔ شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں۔''

''کچھ پہچان گئی ہوں۔ کچھ اور پہچان جاؤں گی۔ کچھ اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔'' وہ ہنسی۔

''واہ...... تم آرٹ کا شاہکار تو ہو ہی باتیں بھی خوب کرتی ہو۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔

''سائیں! آپ نے یہ ظلم مجھ پر کیوں کیا؟ کیا تاوان کے لیے۔''

''ظاہر ہے۔'' وہ ایک کرسی اٹھا کر بیڈ کے نزدیک بیٹھ گیا۔ ''ہماری واردات کا طریقہ ذرا مختلف ہے' ہم تاوان اس کے گھر والوں سے وصول نہیں کرتے' جس کو اٹھاتے ہیں' تاوان اسی سے وصول کرتے ہیں۔''

''اچھا جی......'' ورشا نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھ پر یہ عنایت کس لیے۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''ہم نے تمہیں دیکھا' تمہیں چاہا اور پالیا۔'' اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ڈرامہ بولا۔

''سائیں اس جملے میں تھوڑی سی ترمیم کرلیں۔ ابھی آپ نے مجھے دیکھا ہے۔ مان لیتی ہوں چاہا بھی ہوگا لیکن ابھی پایا نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک خاص انداز میں مسکرائی۔

''پانے میں دو قدم کا فاصلہ ہے۔''

''کبھی کبھی دو قدم کا فاصلہ...... صدیوں کا فاصلہ بن جاتا ہے......'' اس کے لہجے میں بڑا یقین تھا۔

''تم نہیں جانتیں کہ وقت ہماری مٹھی میں ہے۔ زمین ہمارے قدموں تلے اور آسمان ہماری گرفت میں ہے۔''

''بڑے دعوے ہیں صاحب۔'' وہ ہنسی۔

''لگتا ہے کچھ زیادہ چڑھا گئے ہیں۔''

''ورشا...... تم خود ایک نشہ ہو...... تم......''

''بس' بس ...... میرے بارے میں کوئی عامیانہ سا جملہ نہ کہنا۔'' اس نے اسے فوراً روک دیا۔

''چلو نہیں کہتا...... کیا تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں پہلی بار کہاں دیکھا؟'' اس نے بات کا رخ بدلا۔

''نہیں جانتی۔'' ورشا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہیں پہلی بار طاہرہ زیدی کے ساتھ دیکھا تھا...... اس کی تصویروں کی نمائش میں۔'' اس نے بتایا۔

ایک دم ورشا کے ذہن میں جھماکا ہوا' وہ اسے فوراً یاد آ گیا۔

''اچھا تو تم وہ ہو؟''

''وہ کون؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''جس نے طاہرہ زیدی کی ایک شاہکار پینٹنگ کا ستیاناس مار دیا تھا۔ وہ تم تھے جس نے گولی چلا کر اس کی پینٹنگ میں سوراخ کر دیا تھا۔ سائیں آپ تو بڑے بدذوق آدمی ہیں۔''

''یہ مت بھولو کہ میں نے تمہیں پسند کیا ہے' کیا تمہیں پسند کرنے والا کوئی بدذوق ہو سکتا ہے۔''

''ہرگز نہیں...... لیکن اس کی نیت میں فتور تو ہو سکتا ہے۔'' ورشا نے اسے ترچھی نظروں سے

دیکھا۔ ''اچھا خیر پھر ہوا کیا؟اس شام تو آپ مجھ تک نہیں پہنچے۔''
''بھئی اس شام یہ ہوا کہ جب میں نے آپ کو طاہرہ زیدی کے ساتھ کھڑا ہوا دیکھا تو میں ساری تصویروں کو بھول گیا۔ سوچا کہ اس آرٹ کے شاہکار کو حاصل کرلوں جب میں طاہرہ زیدی کے پاس پہنچا تو تم وہاں نہیں تھیں۔ میں بالکل اس کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ تمھیں نہ پا کر میرا دماغ بھنا گیا۔ طاہرہ زیدی اس وقت مجھ سے مخاطب ہو چکی تھی۔ میں نے اس سے ایسے ہی تصویر خریدنے کی بات کردی۔ بات بڑھ گئی۔ مجھے غصہ آ گیا۔ بس پھر ایک بار مجھے غصہ آ جائے تو میرے ہاتھ سے گولی ضرور چل جاتی ہے اور اس کی پیشانی ضرور داغدار ہو جاتی ہے۔'' یہ بات کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں درندگی عود کر آئی۔
''ہائے!'' اس نے فوراً اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔
''سائیں مجھے ڈرائیں نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے فوراً اپنے دونوں پاؤں اٹھا کر بیڈ پر رکھ لیے۔ وہ ایک دم گھوم گئی تھی۔ اب اس کی طرف ورشا کی پیٹھ تھی۔
ورشا ویسے ہی کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ وہ یونہی اچھے اچھوں کے ہوش اڑا دیتی تھی۔ اس وقت تو اس کی پیٹھ پر ساڑھی کا پلو بھی نہ تھا۔ چھوٹا سا بلاؤز' نیم عریاں پیٹھ...... وہ تو پاگل ہو اٹھا۔
''سائیں آپ کا نام کیا ہے؟'' وہ پیٹھ موڑے موڑے بولی۔ اس کی آواز میں ہیجان تھا۔
وہ محو نظارہ تھا۔ ایک دم چونکا اور بولا۔
''میرا نام اختر شاہ ہے......''
کرسی پر مزید بیٹھے رہنا' اب اختر شاہ کے بس سے باہر تھا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا۔ ورشا بھی چاہتی تھی کہ وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آئے۔ وہ زیر لب کوئی منتر پڑھ رہی تھی اور ساتھ ہی کہتی جاتی تھی۔
''اعور آ...... اعور مدد......''
اختر شاہ بالکل اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور اس کے بے چین ہاتھوں نے وہ کر دیا جس بات کی وہ منتظر تھی۔ بلاؤز کھلتے ہی اختر شاہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ایک خوفناک بچھو اس کی پیٹھ پر حرکت میں تھا۔ وہ اس نظارے کی تاب نہ لاسکا۔ پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگا۔ اس نے دھاڑ دھاڑ دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ بلاتاخیر کھل گیا۔
ورشا نے اپنا بلاؤز درست کر کے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا تو وہ اسے تیزی سے نکلتا ہوا نظر آیا۔ فوراً دروازہ بند ہو گیا۔ ورشا نے اس کی اس حالت پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔
''چھوٹے دماغ کا...... آیا تھا مجھے پانے......''

☆......☆......☆

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔
وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ اسے دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گئے۔ وہ قالین پر بیٹھا ہوا تھا

اور اپنے ہوش وحواس میں تھا۔ کالی چادر قبر پر سے اتری ہوئی تھی۔
واسم نے سوناں کو اور سوناں نے واسم کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ برکھا نے کہا کہ کوئی غلطی نہ ہو لیکن غلطی ہو گئی تھی۔ وہ شیشی جس میں سرخ پانی تھا' وہ ڈیش بورڈ میں رکھی رہ گئی تھی۔
''سوناں آؤ۔'' واسم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔
وہ دونوں تیزی سے باہر نکل گئے اور دروازہ پھر سے بند ہو گیا۔
ان دونوں کو دیکھ کر ساحل عمر کو یہ اندازہ تو ہو گیا کہ وہ کن لوگوں میں ہے' لیکن یہ اندازہ نہ لگا پایا کہ وہ کس جگہ پر ہے۔ اس کمرے میں ایک قبر ہے۔ یہ کس کی قبر ہے؟
قبر پر جو پتھر نصب تھا اس پر صاحب قبر کا نام چتر دبھیل لکھا تھا۔ اس شخص کا پانچ سال پہلے انتقال ہوا تھا۔ پتہ نہیں یہ کون شخص تھا اور اسے بے ہوش کر کے اس کی قبر پر کس مقصد کے لیے لٹایا گیا۔ اس کام کے پیچھے کوئی نیک مقصد تو ہو نہیں سکتا تھا۔
ساحل عمر ابھی اسی طرح کی باتیں سوچ رہا تھا کہ دروازے پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ چند لمحوں بعد پھر دروازہ کھلا۔ دروازے پر سوناں نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چائے اور کچھ کھانے پینے کا سامان نظر آ رہا تھا۔ سوناں چپل اتار کر اندر آئی۔
اس نے خاموشی سے ساحل عمر کے سامنے ٹرے رکھ دی۔ ساحل عمر کو بہت زور کی بھوک لگی تھی۔ سامنے ناشتے کا بھرپور سامان موجود تھا۔ وہ سوناں سے بغیر کوئی بات کیے ناشتے میں مصروف ہو گیا۔

سوناں نے کالی چادر جو قالین پر پڑی تھی دوبارہ قبر پر ڈال دی اور دو زانو ہو کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ناشتہ کرتے کرتے جب ساحل عمر نے سوناں کی طرف دیکھا تو اس نے اسے آنکھیں موندے کچھ پڑھتے ہوئے پایا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھے ہوئے تھے اور وہ بہت تیزی سے کچھ پڑھ رہی تھی۔
ساحل عمر اسے دیکھتا رہا اور ناشتہ کرتا رہا۔ سرخ پانی کی دو بوندیں چائے میں اس طرح شیر وشکر ہو گئی تھیں کہ یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ چائے میں کچھ ملایا گیا ہے لیکن یہ دو بوندیں اس قدر تیز اثر تھیں کہ چائے کا کپ خالی ہوتے ہوتے اس کے دماغ میں غبار چھانے لگا۔ غنودگی سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔

کچھ دیر کے بعد اس نے ایک زوردار جمائی لی اور پھر قالین پر لڑھکتا چلا گیا۔
اسے لڑھکتا دیکھ کر سوناں فوراً اٹھی۔ اس نے ٹرے اٹھائی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔
کچھ دیر کے بعد واسم اور سوناں دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ دونوں نے مل کر اسے پھر قبر پر لٹایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہلا کر دیکھے۔ وہ بے جان ہو چکے تھے۔ ساحل عمر اب ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ ساحل عمر کی طرف سے اس نے جیب سے موبائل فون نکالا۔ گھڑی پر نظر ڈال کر اس نے برکھا کا نمبر ڈائل کیا اور ادھر سے ریسیور اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔
''کون؟'' ادھر سے برکھا کی آواز سنائی دی۔

''برکھا جی...... واسم بول رہا ہوں۔''

''ہاں واسم ادھر سب خیر ہے۔ جو بتایا تھا اس پر عمل ہو رہا ہے؟'' برکھا نے پوچھا۔

''ہاں، برکھا جی...... آپ کے حکم کے مطابق حرف بہ حرف عمل ہو رہا ہے۔'' واسم نے بڑے یقین سے جھوٹ بولا۔

''اس وقت کہاں ہے وہ؟'' پوچھا گیا۔

''استھان پر لیٹا ہے۔'' جواب دیا گیا۔

''لیٹا نہیں، لیٹے کہو...... تم داس ہو اس کے...... کیا تم نہیں جانتے کہ اس کا مقام کیا ہے؟''

برکھا کی آواز کرخت ہو گئی۔

''برکھا جی، غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسا نہ ہو گا؟'' واسم نے فوراً معافی مانگ لی۔

''سوناں کہاں ہے؟''

''وہ یہیں ہے؟''

''اسے فون دو۔'' برکھا نے حکم دیا۔

''جی اچھا۔'' یہ کہہ کر اس نے موبائل سوناں کے ہاتھ میں دے دیا۔ موبائل سنبھال کر وہ بڑے مودبانہ لہجے میں بولی۔

''جی، برکھا جی......''

''تیرا پاٹھ جاری ہے؟''

''جی، برکھا جی...... پاٹھ جاری ہے۔'' اس نے فوراً کہا۔

''چترو بھیل نظر آیا۔'' برکھا نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔'' سوناں نے جواب دیا۔

''برکھا جی، آپ کب آرہی ہیں۔''

''میں اب تک وہاں پہنچ جاتی مگر ادھر ایک گڑبڑ ہو گئی ہے...... کسی نے ورشا کو اغوا کرلیا ہے۔''

''ارے...... یہ کس کی کم بختی آئی جو ہماری راجکماری کو اٹھا لیا۔ آپ کہیں تو واسم کو ادھر بھیج دوں۔''

سوناں نے واسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اس کو وہیں رہنے دو...... میں دیکھ رہی ہوں۔''

''جب اس کی ضرورت ہوئی بلالوں گی۔'' برکھا نے کہا۔

''دیکھو ایک بات کا خیال رکھنا، فارم کا کوئی ملازم کاٹیج میں داخل نہ ہو۔''

''آپ بے فکر رہیں برکھا جی۔'' سوناں نے اسے یقین دلایا۔ پھر جیسے ہی اس کی نظر قبر پر پڑی تو وہ خوفزدہ ہو کر چیخی۔ ''ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟''

☆......☆......☆

سوناں کی یہ بات سن کر برکھا پریشان ہو گئی۔ اس نے ادھر سے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''سوناں کیا ہوا؟''

موبائل فون سوناں کے کان سے لگا ہوا تھا اور آنکھیں قبر پر جمی ہوئی تھیں۔ سامنے جو ہو رہا تھا اس نے زبان گنگ اور کان بہرے کر دیئے تھے۔ وہ سن رہی تھی لیکن سمجھ نہیں رہی تھی۔ بولنا چاہ رہی تھی لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

تب برکھا بہت غصے سے چیخی۔ ''کتیا کی بچی بولتی کیوں نہیں؟''

''برکھا جی...... بتاتی ہوں' بتاتی ہوں۔'' وہ بہ مشکل بولی۔

''فون واسم کو دے۔'' برکھا نے حکم دیا۔

سوناں نے فون فوراً واسم کی طرف بڑھا دیا۔ وہ خود پریشان ہو گیا تھا۔ وہ قبر کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھا برکھا نے فون بند کر دیا ہے' لہٰذا سوناں نے اسے موبائل فون واپس کر دیا ہے کہ وہ جیب میں ڈال لے۔ واسم نے فون آف کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اس کی نظریں قبر پر جمی ہوئی تھیں۔

جو کچھ ہوا تھا آناً فاناً ہوا تھا۔ بس چند لمحوں میں کھیل مکمل ہو گیا تھا۔ قبر اچانک دو حصوں میں تقسیم ہوئی تھی اور ساحل عمر جو قبر پر لیٹا ہوا تھا مع چادر اندر چلا گیا تھا اور وہ پھر قبر اپنی جگہ آ گئی تھی۔

وہ دونوں گم صم حیران پریشان اس قبر کو دیکھ رہے تھے جو ساحل عمر کو نگل گئی تھی۔ اب یہ احساس ہی نہ رہا تھا کہ چند لمحے قبل یہ قبر شق ہوئی تھی۔

فون بند ہونے پر برکھا کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے جلدی جلدی دوبارہ ڈائل کیا۔ رنگ ہونے پر واسم نے جلدی سے موبائل فون جیب سے باہر نکالا اور کان سے لگا کر بولا:

''ہیلو!''

''ہیلو کے بچے...... تو نے فون کیسے بند کیا؟'' برکھا دھاڑی۔

''برکھا جی...... مجھے سوناں نے فون دیا تو میں سمجھا اس نے مجھے فون رکھنے کو دیا ہے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''تم دونوں پاگل ہو گئے ہو کیا؟ آخر ہوا کیا ہے؟''

''برکھا جی...... استھان دو حصوں میں تقسیم ہوا اور ساحل صاحب اندر چلے گئے۔''

''یہ کیا بکواس کر رہا ہے تو؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں برکھا جی...... بے شک آپ سوناں سے بات کر لیں۔''

''سوناں' برکھا جی سے بات کرو۔'' واسم نے موبائل فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہیلو!'' سوناں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''سوناں...... یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟''

''ایسا ہی ہوا ہے برکھا جی...... استھان نے ساحل جی کو نگل لیا۔ چترو بھیل لے گیا انہیں۔'' سوناں نے مزید وضاحت کی۔

''میں دیکھ لوں گی' اس نٹ کی اولاد کو...... یہ سب میری غیر موجودگی کی وجہ سے ہوا ہے۔

میں وہاں ہوتی تو وہ ایسی جرأت نہ کر پاتا۔ میں ادھر ورشا کی وجہ سے پھنس گئی۔ میں نمٹ لوں گی اس سے۔ تم لوگ وہیں رہو۔ سوناں تو نے استھان ایک منٹ کو خالی نہیں چھوڑنا ہے تو سمجھ گئی ہے ناں!''

''جی برکھا جی۔'' وہ سہم کر بولی۔

''اور سن...... میں تجھے کچھ پاٹھ بتاتی ہوں۔ وہ وہاں بیٹھ کر پڑھ۔ مجھے جیسے ہی ورشا کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو اس معاملے سے نمٹ کر میں فوراً وہاں پہنچ جاؤں گی۔ ٹھیک ہے سوناں۔ دیکھ ذرا ہوشیاری سے رہنا' بس تو استھان سے ضرورت کے وقت نکلے گی۔ تیرا کھانا پینا وہیں ہوگا۔ داسم تیرے کھانے پینے کا بندوبست کرے گا۔'' یہ کہہ کر برکھا نے فون بند کر دیا اور ایک گہرا سانس لیا۔

وہ خاصی پریشان ہوگئی تھی۔ ہر طرف سے اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔

ورشا کو اس نے ایک خاص مشن پر بھیجا تھا۔ ورشا وہاں وقت پر نہ پہنچ سکی جس کی وجہ سے برکھا کی ایک بڑے آدمی کے ساتھ ناراضگی ہوگئی۔ چلو ناراضگی تو کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہ تھا وہ کسی اور موقع پر اس بڑی شخصیت کو منا لے گی۔ مسئلہ ورشا تھی۔ جانے وہ کہاں غائب ہوگئی۔ جانے اس پر کیا بیتی۔

ابھی وہ ورشا کے غائب ہونے کا معمہ حل نہ کر پائی تھی کہ وہ شکاری ناصر مرزا گھر میں آ کودا۔ اس نے اسے سزا دینا چاہی تو وہ صاف بچ نکلا۔ برکھا کو اپنے وار کی ناکامی پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ شاید کہیں سے کچھ سبق پڑھ کر آ گیا تھا۔ خیر اس سے وہ اچھی طرح نمٹ لے گی۔

اس کا اصل مشن تو ساحل عمر تھا۔ اس کی زندگی کا حاصل ...... جسے اس نے بڑی مشکل سے تلاش کیا تھا اور ایک لمبے عرصے سے اس کے پیچھے لگی تھی۔ اب جبکہ کامیابی نزدیک تھی' وہ اس کی بلی دے کر ''مانا'' کو حاصل کر سکتی تھی اور مانا کے ذریعے کتاب سحر ''ربطول'' تک رسائی ممکن تھی کہ درمیان میں یہ حادثہ پیش آ گیا۔

چتر وبھیل آخر رہا جنگلی کا جنگلی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ صحرا کا بڑا جادوگر تھا اور اس کا استھان ساحل عمر کی بلی کے لیے ایک سیڑھی تھا' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چتر وبھیل کی ساحل عمر کو دیکھ کر خود نیت خراب ہوگئی۔ سوال یہ ہے کہ اسے دنیا سے اٹھے ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ ساحل عمر سے اب وہ کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اسے کیوں لے گیا؟''

وہ سوچتی رہی اور اپنی ناکامیوں پر پریشان ہوتی رہی۔ بالآخر اس کا دماغ سن ہو گیا۔ اس نے پوری رات جاگ کر گزاری تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہ سو گئی۔

وہ جانے کب تک سوتی رہتی کہ کسی نے گیٹ پر لگی کال بیل کا بٹن دبایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہ کئی گھنٹے سو چکی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف بھاگی۔ کال بیل ایک مخصوص انداز میں بجائی جا رہی تھی اور یہ وہ انداز تھا جس سے برکھا کے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

گیٹ پر پہنچنے سے پہلے برکھا نے زور سے آواز لگائی۔

''آ رہی ہوں۔''

پھر گیٹ کھولنے سے پہلے اس نے گیٹ کے درمیان سے جھانک کر دیکھا۔ وہ سامنے کھڑا

کھڑی تھی۔ برکھا نے بڑی بے قراری سے گیٹ کھولا۔
گیٹ کھلتے ہی وہ اندر آ گئی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ ورشا تھی۔
"اوہ میری جان...... تو کہاں چلی گئی تھی۔" برکھا نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔
"مائی سویٹ ممی......" یہ کہہ کر وہ آہستگی سے الگ ہو گئی جبکہ برکھا چاہتی تھی کہ وہ اس کے سینے سے لگی رہے تاکہ وہ اسے بھینچ بھینچ کر پیار کر سکے مگر برکھا کے جسم سے اٹھتی بدبو نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ فوراً اس کے سینے سے الگ ہو جائے۔
برکھا نے جلدی سے گیٹ بند کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے دیکھتی ہوئی اپنے بیڈروم میں لے آئی۔ راستے میں اس نے اس سے کوئی بات نہ کی۔
ورشا انہی کپڑوں میں تھی جن میں گھر سے نکلی تھی لیکن ان کپڑوں کی حالت تباہ ہو رہی تھی۔
برکھا نے اسے فوراً بیڈ پر لٹا دیا اور نرم ملائم تکیے اس کے سر کے نیچے رکھ دیئے اور ورشا کا حسین ہاتھ پکڑ کر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔
"کیا دیکھ رہی ہو ممی؟" ورشا نے پوچھا۔
"تجھے دیکھ رہی ہوں میری جان...... تو خیریت سے تو ہے ناں!"
"ہاں ممی...... میں خیریت سے ہوں، بس ذرا تھک گئی ہوں...... لمبا سفر کر کے آئی ہوں ناں۔"
"ہوا کیا تھا؟"
"مجھے اغوا کیا گیا تھا۔"
"کون تھے وہ لوگ؟" برکھا نے غصے سے کہا۔
"ممی تھے نہیں ...... تھا...... اغواء تو مجھے کرائے کے بندوں نے کیا تھا لیکن اغوا کروانے والا ایک تھا۔"
"کون ہے وہ کتے کا بچہ...... میں اس کی سات پشتوں کو جلا کر راکھ کر دوں گی۔" وہ طیش میں آ گئی۔
"ممی اختر شاہ...... تم اسے ضرور جانتی ہو گی۔"
"اختر شاہ......؟" برکھا نے اپنی یادداشت کو کھنگالا۔
"ارے، وہ فیروز شاہ کا بیٹا تو نہیں۔"
"جی امی...... وہی۔" ورشا نے بتایا۔
"باپ کے مرنے کے بعد اب وہ بالکل ہی بے لگام ہو گیا معلوم ہوتا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی فیروز شاہ اس کی آوارگیوں پر نالاں رہتے تھے۔ اچھا تو یہ حرکت اس کی تھی۔ کیا چاہتا تھا وہ؟"
"ایک آوارہ نوجوان جس کے پاس بے پناہ دولت ہو، کیا چاہ سکتا ہے؟" ورشا نے سوال نما جواب دیا۔
"لیکن اس نے تجھے دیکھا کہاں؟" برکھا حیرت زدہ تھی۔

''میرا فیروز شاہ کے پاس آنا جانا تھا' لیکن میں نے آج تک اختر شاہ کو نہیں دیکھا تھا۔ تو اس نے تجھے کیسے دیکھ لیا۔''

''اس نے مجھے ایک پینٹنگ کی نمائش میں دیکھا تھا۔ اسی نمائش میں جہاں ساحل عمر سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔'' ورشا نے بتایا۔

''وہ جاہل پینٹنگ کی نمائش میں کہاں آ پہنچا۔''

''پتہ نہیں ممی...... ویسے وہ ہے بہت وحشی...... ایک لمحے میں بندے کی پیشانی پر ریوالور رکھ کر اسے ختم کر دیتا ہے۔ اس کے لوگوں میں اس کی بڑی دہشت ہے۔ وہاں ایک چندن نام کی عورت بھی تھی' اس کو جب معلوم ہوا کہ میں آپ کی بیٹی ہوں تو اس نے میرا بہت خیال رکھا لیکن وہاں سے نکالنے میں وہ میری کوئی مدد نہ کر سکی۔ وہ اختر شاہ کے نام سے کانپتی تھی۔''

''چندن' وہ گوری سی چھوٹے قد کی عورت تو نہیں۔'' برکھا نے پہچان بتائی۔

''جی وہی۔'' ورشا نے تصدیق کی۔

''وہ فیروز شاہ کی خاص خادمہ تھی' مجھ سے اس نے اپنے شوہر کے لیے ایک پڑیا لی تھی۔''

''ہاں' وہ بتا رہی تھی۔'' ورشا نے کہا۔ پھر مسکرا کر بولی:

''ممی' یہ اختر شاہ تو بہت ڈرپوک نکلا۔''

''کیا ہوا؟'' برکھا نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''میں نے پیٹھ موڑ کر جب اعور کی ایک جھلک دکھائی تو وہ اس بری طرح بھاگا کہ میں قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکی۔ ممی ایک اتنا نڈر شخص کہ ایک لمحے میں گولی مار کر بندے کو پرے پھنکوا دے' اتنا بزدل بھی ہو سکتا ہے کہ پیٹھ پر حرکت کرتا ہوا بچھو دیکھے اور خوفزدہ ہو کر کمرے سے بھاگ جائے۔ نہ صرف بھاگ جائے بلکہ اپنے قیدی کو آزاد کرنے کا حکم بھی دے دے۔'' ورشا اس وقت کا تصور کر کے پھر ہنس پڑی۔

''ہاں' ایسا ہو سکتا ہے میری جان...... دور کیوں جاؤ' تمہارا باپ ایک انتہائی نڈر شخص تھا لیکن کبھی ٹہلتے ہوئے سڑک پر کوئی کتا دکھائی دے جاتا تو یقین کرو' وہ میرے پیچھے ہو جاتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔

''میں ایک اور ایسے شخص کو جانتی ہوں کہ اگر اس کے سامنے کوئی شیر آ جائے تو وہ اس سے نہ ڈرے لیکن لال بیگ کو دیکھ کر اس کی جان نکل جاتی تھی۔ اسے صوفے کے پیچھے سے نکالنے کے لیے مجھے لال بیگ کو مارنا پڑتا۔''

''صوفے کے پیچھے سے نکالنے کے لیے؟'' ورشا نے دہرایا۔ ''میں سمجھی نہیں۔''

''لال بیگ کو دیکھ کر وہ صوفے کے پیچھے چھپ جاتا تھا۔'' برکھا نے وضاحت کی۔

''اچھا!'' ورشا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ورشا' تیرے یوں اچانک غائب ہو جانے کی وجہ سے میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔ رات بھر میں نے جاگ کر گزاری ہے۔ بس اب تھوڑا سا سوئی تھی۔ اب تو یوں کر کہ نہا دھو لے۔ کپڑے

تبدیل کر لے۔ میں تیرے لیے چائے بناتی ہوں۔ چائے پی کر تم سو جانا۔'' برکھا نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے ممی۔'' ورشا نے بڑی فرماں برداری سے کہا اور واش روم کی طرف چلی گئی۔

دس پندرہ منٹ کے بعد جب شاور لے کر نکلی تو برکھا اس کے لیے چائے تیار کر چکی تھی۔ وہ چائے اس کی منتظر تھی۔ سرخ پانی کے دو قطرے اس نے ورشا کے خالی کپ میں ڈال دیئے۔ جب وہ نہا دھو کر نکلی تو اس نے کپ میں چائے انڈیل دی۔ ورشا پاپڑ بہت شوق سے کھاتی تھی۔ برھ... مرے لوازمات کے ساتھ اس کے لیے چند پاپڑ بھی تل دیئے تھے۔

چائے ... فراغت کے بعد ہی ورشا کو نیند نے آ گھیرا۔ اس نے منہ پھاڑ کر جمائی لی اور اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اچھا ممی، میں اپنے کمرے میں چلتی ہوں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم سو جاؤ۔'' برکھا نے کہا۔ ''میں رات کا کھانا ہاٹ پاٹ میں تمہارے کمرے میں رکھ دوں گی۔ جب آنکھ کھلے کھا لینا۔ تم کچن میں جانے، کھانا گرم کرنے کی الجھن سے بچ جاؤ گی۔''

''اچھا ممی۔'' ورشا پر نیند طاری ہو رہی تھی، اس لیے اس نے آدھی بات سنی۔ آدھی نہیں سنی اور اپنے کمرے میں آ کر کسی شہتیر کی طرح بیڈ پر گری اور سو گئی۔

برکھا کچھ دیر کے بعد ورشا کے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ وہ بالکل بے خبر بکھری ہوئی بیڈ پر سو رہی تھی۔ برکھا نے اپنی بیٹی کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ کچھ دیر پہلے نہائی تھی، اس لیے اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کے ریشم جیسے بال تکیے پر ڈھیر تھے۔ چہرے پر جوانی کی چمک تھی۔ گھنیری پلکیں خوبصورت آنکھوں پر پہرہ دے رہی تھیں۔ بھرے ہوئے گلابی لب دو کلیوں کی طرح لپٹے ہوئے تھے۔ برکھا اسے کچھ دیر بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ اچانک اسے اپنی جوانی یاد آ گئی۔ کبھی وہ بھی اتنی ہی حسین تھی یا شاید ورشا سے بھی دلکش...... یہ حسن چلا کیوں جاتا ہے؟ جوانی ختم کیوں ہو جاتی ہے؟ جوانی آ کر ٹھہر کیوں نہیں جاتی۔ اگر ایسا ہوتا کہ جوانی آ کر جانے کا نام نہ لیتی تو کس قدر اچھا ہوتا۔ وہ اس مسئلے پر تحقیق کرے گی۔ کوئی ایسا عمل ضرور ہوگا جس کے کرنے سے جوانی ٹھہر جاتی ہوگی یا گزری ہوئی جوانی کو واپس لایا جا سکتا ہوگا۔ اس کا شیطانی ذہن اس مسئلے کی طرف راغب ہو گیا تھا۔

پھر فوراً ہی اسے ساحل عمر کا خیال آیا۔ ابھی تو ساحل عمر فوری مسئلہ تھا۔ وہ ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ پہلے اسے حاصل کرنا تھا۔ پھر اس کی بلی دے کر ''مانا'' کا مالک بننا تھا۔ مانا کے مل جانے کے بعد اس سے مدد لی جا سکتی تھی۔ طویل عمر کے ساتھ مستقل جوانی کا راز معلوم کیا جا سکتا تھا۔ برکھا اصل میں ورشا کے کمرے میں یہ دیکھنے آئی تھی کہ وہ گہری نیند سو گئی یا نہیں۔ یہاں آ کر وہ اس کے چہرے میں کھو گئی اور کہاں سے کہاں بھٹک گئی۔ اسے گہری نیند میں دیکھ کر وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ ٹیلی فون ملانے لگی۔

''ہیلو!'' ادھر سے واسم نے کال ریسیو کی۔

''ہاں واسم، کیا صورت حال ہے؟'' برکھا نے واسم کی آواز پہچان کر سوال کیا۔

سے صورت حال بتائی۔

''ابھی تو کچھ پتہ نہیں چلا۔'' واسم نے صورت حال بتائی۔

''سوناں کہاں ہے؟''

''اندر استھان پر...... آپ کے حکم کے مطابق وہاں سے ہلی نہیں ہے۔''

''بہت اچھی بات ہے...... ذرا اس کو فون دو۔''

کچھ دیر فون پر خاموشی چھائی رہی' پھر سوناں کی آواز سنائی دی۔ ''جی' برکھا جی۔''

''ہاں' سوناں پاٹھ جاری ہے۔''

''برکھا جی' پاٹھ تو جاری ہے لیکن وہ پکڑ میں نہیں آ رہا۔''

''وہ جنگلی اتنی آسانی سے پکڑ میں نہیں آئے گا۔ شہر میں آتی ہوں۔ سوناں ایسا کرو' واسم کو فوراً میرے پاس بھیج دو۔'' اس نے حکم دیا۔

''جی...... اچھا۔'' سوناں نے فرماں برداری سے کہا۔

واسم اس کا حکم سنتے ہی فوراً چل پڑا۔ جب وہ بنگلے پر پہنچا تو برکھا اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس نے ورشا کے لیے کھانا رکھ دیا تھا اور اس کے کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ وہ ورشا پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ گھر سے نکل کر اس نے بنگلے کے گیٹ پر بھی تالا لگا دیا اور واسم کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر فوراً ہی ''استھان'' کی طرف چل دی۔

کوئی سوا بارہ کا عمل ہو گا کہ اچانک ورشا کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ جلائی۔ گھڑی میں وقت دیکھا تو آدھی رات گزرنے کا احساس ہوا۔

بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ہاٹ پاٹ موجود تھا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ برکھا کچن میں بالکل نہیں گھستی تھی۔ کچن کا زیادہ تر کام ورشا کو کرنا پڑتا تھا لیکن آج وہ اتنی مہربان ہوئی تھی کہ شام کو اس نے نہ صرف چائے مع لوازمات بنا کر پلائی تھی اور اب کھانا بھی تیار کر کے اس کے سرہانے رکھ دیا تھا کہ رات کو جب بھی اس کی آنکھ کھلے تو گرما گرم کھانا مل جائے۔

پھر ایک دم ہی ایک خیال اس کے دماغ میں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے کھانا دے کر کمرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ وہ فوراً دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو وہ نہیں کھلا۔ اس کا خیال درست نکلا' آج پھر اس کی ممی کسی ''واردات'' میں مصروف تھی۔

اسے بے اختیار ساحل عمر یاد آیا۔ ساحل عمر کے بارے میں برکھا نے صرف اتنا بتایا تھا کہ ساحل عمر بنگلے پر آیا تھا اور اس نے اسے واسم کے ساتھ کہیں بھیجا ہے۔ یہ بات بھی ورشا کو اس وقت بتائی گئی تھی جب ناصر اور مسعود اس کی تلاش میں بنگلے پر آ گئے تھے اور انہیں ٹالنے کے لیے برکھا نے اسے گیٹ پر بھیجا تھا۔

اس نے بیڈ پر بیٹھ کر فون اپنی گود میں رکھا اور ساحل عمر کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس کی نظریں گھڑی پر تھیں۔ یہ وقت اگرچہ فون کرنے کا نہ تھا' پھر بھی وہ فون کرنے بیٹھ گئی۔ اگر اس نے فون اٹھا لیا تو ٹھیک ہے' ورنہ بند کر دے گی۔

دو گھنٹیوں کے بعد فون تو ادھر سے اٹھا لیا گیا لیکن یہ آواز ساحل عمر کی نہ تھی۔ اماں ''ہیلو''

چلو" کرتی رہ گئیں۔
درشا نے خاموشی سے فون بند کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ فون اماں نے کیوں اٹھایا' کیا ساحل عمر گھر پر نہیں ہے یا اتنی جلدی سو گیا ہے۔
وہ سویا کہاں تھا' اسے تو سلا دیا گیا تھا اور کوشش یہ تھی کہ وہ سوتا ہی رہے۔ اسے سرخ پانی کے قطرے مسلسل دیئے جا رہے تھے۔ بیچ میں ذرا وقفہ آیا تو وہ جاگ گیا تھا اور ہوش آنے پر اس نے خود کو کسی قبر پر لیٹا پایا تھا۔ ابھی وہ حالات کا جائزہ ہی لے رہا تھا اور معاملات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پھر سے اس پر نیند کا غلبہ ہو گیا تھا۔
اس مرتبہ جو اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ریت پر لیٹا ہوا پایا۔ شام کا وقت تھا۔ سورج آگ کا گولا بنا زمین کے اوپر جھک رہا تھا۔ ساحل عمر کے پیروں کی طرف کوئی بیٹھا تھا۔ وہ جو بھی تھا' اپنا منہ گھٹنے میں دبائے بیٹھا تھا۔ اس کا سر گنجا تھا۔ وہ گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کندھے پر گیروے رنگ کی ہی چادر پڑی تھی۔ ابھی ساحل عمر اس بیٹھے ہوئے شخص کو حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ اس نے اچانک اپنا سر گھٹنوں کے درمیان سے نکالا اور گردن موڑ کر ساحل عمر کی طرف دیکھا۔
وہ ایک لمبے چہرے کا کرخت صورت شخص تھا۔ وہ کلین شیو تھا حتیٰ کہ اس کی بھنویں تک صاف تھیں۔ اس کے چہرے میں جو سب سے زیادہ نمایاں چیز تھی' وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ انتہائی بڑی اور بالکل گول اس کی آنکھیں دیکھ کر الو کی آنکھیں یاد آتی تھیں۔
وہ اسے دیکھ کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ اس نے کندھے پر پڑی چادر کو اپنے سر پر صافے کی طرح باندھا اور ساحل عمر کو ایک انگلی سے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور یہ دیکھے بغیر کہ ساحل عمر اس کے پیچھے چل پڑا ہے یا نہیں' وہ ایک طرف چل دیا۔
ساحل عمر فوراً اٹھا اور یہ سوچے بغیر کہ اس کے ساتھ جانا چاہیے یا نہیں' وہ کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے رہے۔ وہ لمبے چہرے والا وقفے وقفے سے ساحل عمر کو مڑ کر دیکھ لیتا تھا۔ اس کے دیکھنے کے عمل میں جانے کیا بات تھی کہ ساحل عمر کے جسم میں سنسنی سی پھیل جاتی تھی۔ پھر وہ مزید تیز تیز اس کے پیچھے چلنے لگتا تھا۔
سورج چھپنے تک وہ میدانی علاقے سے جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل میں گھستے ہی اندھیرا گہرا ہو گیا۔ تب وہ شخص رکا۔ ساحل عمر دس پندرہ قدم پیچھے تھا۔ ساحل کو اب چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ تب وہ اس کے نزدیک پہنچا اور اس نے ساحل عمر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ساحل عمر نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہے۔
اب گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ جنگل میں اتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اس شخص کی آنکھیں پتہ نہیں بلی کی تھیں یا وہ الو کی نسل سے تھا کہ وہ بڑی تیزی سے آگے چلتا جا رہا تھا۔ اور ساحل عمر اس کے ہاتھ کے سہارے کھنچا چلا جا رہا تھا۔
ساحل عمر اندازہ نہیں کر پایا کہ وہ اس طرح اندھیرے میں کتنی دیر چلے' لیکن یہ سفر اب اتنا لمبا ہو گیا تھا کہ اس پر تھکن طاری ہو گئی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر کہیں بیٹھ کر ستا لے لیکن وہ شخص

رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔
اس سے پہلے کہ ساحل عمر چلنے سے انکار کر دیتا کہ اس شخص کی منزل آ گئی۔
مکمل تاریکی ہونے کی وجہ سے ساحل عمر اندازہ نہیں کر پایا کہ وہ کہاں پہنچا ہے۔ یہ کس قسم کی جگہ ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ شخص چراغ روشن کرے گا تو اسے اندازہ ہو گا کہ یہ کیسی جگہ ہے لیکن اس شخص نے چراغ روشن کرنے کے بجائے اپنے ٹھنڈے ہاتھوں سے ساحل عمر کا سر پکڑ کر زور سے دبایا۔ اس عمل کے کرتے ہی اس کا دماغ تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں پہلے ہی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اسے کوئی ہوش نہ رہا۔
جب اسے ہوش آیا تو اچھا خاصا اجالا پھیل چکا تھا۔ وہ ایک بڑے سے پتھر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس پتھر کے اطراف میں کٹے ہوئے درخت تھے۔ یہ درخت چھ فٹ اونچے تھے اور چار فٹ ان کا قطر ہوگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان درختوں کو ایک سائز میں کسی آرے سے کاٹا گیا ہو۔ کیونکہ یہ درخت محض تنے تھے' اس لیے روشنی کے لیے رکاوٹ نہ تھے۔ باقی چاروں طرف جنگل تھا۔
ساحل عمر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سر میں شدید قسم کا درد ہو رہا تھا۔ وہ شخص جو اسے یہاں تک لایا تھا' وہاں موجود نہ تھا۔ اس پتھر کے بائیں جانب ایک بانس گڑا ہوا تھا۔ اور اس بانس میں جو چیز لگائی گئی تھی' وہ ایک ہوش مند کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھی۔
وہ چھ عدد کھوپڑیاں تھیں۔ جن کے سر میں سوراخ کر کے اس بانس میں پرو دیا گیا تھا۔ یہ ایک دوسرے پر اس طرح رکھی تھیں کہ مینار بن گیا تھا۔
ساحل عمر پتھر پر بیٹھا اطراف کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ وہ شخص اچانک سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی اوٹ سے نکلا ہو۔
وہ ایک اونچے قد کا شخص تھا۔ اس وقت اس کی چادر کندھے پر پڑی تھی اور اس کی کھوپڑی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اس شخص نے اپنے ہاتھوں میں ایک تھال اٹھایا ہوا تھا۔ وہ تھال اس نے پتھر پر ساحل عمر کے سامنے رکھ دیا۔ اس تھال میں چھوٹی چھوٹی کٹوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں مختلف قسم کی چٹنیاں تھیں۔ ایک پلیٹ میں آلو کی بجھیا تھی اور گھی میں تربتر پوریاں تھیں۔
ساحل عمر کو سخت بھوک لگی تھی۔ اس نے یہ سوچنے میں اپنا وقت ضائع نہ کیا کہ اس جنگل میں یہ ناشتہ وہ کہاں سے لے آیا۔ وہ فوراً تھال پر ٹوٹ پڑا۔ جلد ہی اس نے تھال میں رکھا ناشتہ اپنے پیٹ میں اتار لیا۔ اسی تھال میں ایک مٹی کا برتن تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا' پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ جب وہ ناشتے سے فارغ ہو چکا تو اس نے اس شخص کی طرف دیکھا جو ایک پتھر کے کونے پر بیٹھا اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔
اس سے پہلے کہ ساحل عمر اس سے کوئی سوال کرتا' اس سے پوچھتا' آپ کون ہیں' اس نے خود ہی جواب دے دیا۔
وہ بولا: ”میں چترو بھیل ہوں۔“
”چترو بھیل۔“ ساحل عمر نے دہرایا۔ بڑا عجیب نام تھا۔ اس نام کو اس نے کہاں سنا تھا۔ پھر

ایک دم اسے یاد آیا کہ اس نے اس نام کو سنا نہیں بلکہ لکھا ہوا دیکھا تھا۔ اس قبر پر اس کے نام کا کتبہ نصب تھا۔

''ہاں چترو بھیل۔ میں تمہیں برکھا کے چنگل سے چھڑا کر لایا ہوں۔'' چترو بھیل نے بتایا۔

''میں برکھا کے قبضے میں تھا' لیکن مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ میں قبر والے کمرے میں تھا اور وہاں برکھا نہ تھی۔''

''کیا اس استھان پر برکھا کے بندے نہ تھے؟'' چترو بھیل نے سوال کیا۔

''ہاں' وہ تو تھے۔'' ساحل عمر نے اقرار کیا۔ ''لیکن برکھا کہاں تھی؟''

''میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ برکھا نے تمہارے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے۔'' چترو بھیل نے کہا۔ ''اس نے جادو کے زور پر تمہیں اپنے بنگلے پر بلایا' پھر سرخ پانی کی بوندوں کے ذریعے تمہیں بیہوش کر کے میرے استھان پر پہنچایا۔ میں اپنے وقت کا بہت بڑا جادوگر ہوں۔ اس نے میرے سہارے تمہیں بلی کے لیے تیار کرنا تھا لیکن جب میری نظر تم پر پڑی تو میں نے اس سے تمہیں چھین لیا۔ میں نے تمہاری زندگی بچائی ہے۔ میں تمہیں یہاں ایک خاص مقصد کے لیے لایا ہوں۔ جب میرا کام ہو جائے گا تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے برکھا سے آزادی دلا دوں گا۔ وہ پھر تم پر کبھی قبضہ نہیں جما سکے گی۔''

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں' مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تمہیں کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ صرف ایک قتل کرنا ہوگا۔''

''ہیں' کیا کہا؟'' ساحل عمر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''قتل کرنا ہوگا...... مجھے؟''

''ہاں تمہیں۔'' چترو بھیل نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہیں۔''

''گویا قتل کرنا آپ کے نزدیک کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ مجھے قتل کرنے کے لیے اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے آئس کریم کھانے کے لیے کہہ رہے ہوں؟'' وہ خفگی سے بولا۔

''ہاں' تم نے ٹھیک سمجھا' قتل کرنا میرے لیے آئس کریم کھانے جیسا لذت آمیز عمل ہے۔ افسوس کہ اب میں اس لذت سے محظوظ نہیں ہو سکتا۔'' چترو بھیل کے لہجے میں بڑی افسردگی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پھر بولا:

''یہ جو تم بانس میں لگی ہوئی چھ کھوپڑیاں دیکھ رہے ہو' یہ سارے بندے میں نے قتل کیے ہیں۔ ان کو میں نے کیسے قتل کیا۔ کس طرح ڈھونڈ کر مارا' یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس داستان میں میں تمہیں الجھانا نہیں چاہتا۔ بس اتنا سن لو کہ ان لوگوں نے میری بیوی اور بیٹیوں کو مارا تھا۔ مجھے اپنا انتقام لینے میں سات سال لگے۔ پھر مجھے ایک عورت ملی۔ اس عورت نے میرے دل پر قبضہ کر لیا۔ میں اسے پہچان نہ سکا۔ وہ ان چھ بھائیوں میں سے ایک کی بیوی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کی موت پر قسم کھائی تھی کہ وہ مجھے ختم کر کے رہے گی۔ اور پھر اس نے ایسا کر دکھایا۔ میں اپنے علاقے کا بڑا جادوگر تھا۔ جادو کے نشے میں مست۔ اس نشے میں' میں کاویری کو پہچان نہ سکا۔ وہ ایک دن مجھے دریا کنارے بے ہوش ملی۔ بھیگی ہوئی۔ میں روز دریا کنارے پوجا پاٹھ کے لیے جاتا تھا۔ وہ اس بات کو جانتی تھی کہ میں ایک خاص وقت میں دریا کے کنارے آتا ہوں۔ تب اسی وقت اس نے ناٹک کھیلا اور میں اس کے

جال میں پھنس گیا۔ بھیگی ہوئی کاویری نے میرے ہوش اڑا دیئے۔ میں پوجا پاٹھ بھول کر اسے اپنے استھان پر اٹھا لایا۔ اور پھر وہ میرے من مندر کی داسی بن گئی۔ جب اس نے مجھ پر اچھی طرح قبضہ جما لیا۔ اور میرے بارے میں ہر وہ راز جان لیا جو جاننا چاہتی تھی تو ایک رات اس نے اپنا ہاتھ دکھا دیا۔ میرے پاس ایک نایاب سانپ کا زہر تھا جو ایک چھوٹی سی شیشی میں موجود تھا۔ یہ زہر میں نے ایک جوگی سے حاصل کیا تھا۔ یہ زہر مجھے ایک جادو کے عمل میں درکار تھا۔ یہ زہر اتنا تیز تھا کہ اس کا ایک قطرہ انسان کی ہلاکت کا باعث بن سکتا تھا۔ اس نے اس زہر کا ایک قطرہ دودھ میں ملا دیا۔ میں روز رات کو ایک گلاس دودھ پی کر سونے کا عادی تھا۔ کاویری نے اس رات میری طرف دودھ کا گلاس بڑھاتے ہوئے شرارت آمیز لہجے میں کہا:

''چترو! اس دودھ کو سنبھل کر پینا۔''

وہ اس طرح کی شوخیاں اکثر کیا کرتی تھی۔ اور ان شوخیوں کی وجہ سے وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس کی طنز آمیز گفتگو، دھمکی آمیز لہجہ، مجھے بہت پسند تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ رکھتا تھا۔ میں جب بھی اسے تنگ کرتا، وہ لہجے میں مٹھاس بھر کر کہتی: ''دیکھ چترو، مان جا، ورنہ میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔''

اس رات جب اس نے مجھے دودھ کا گلاس پکڑایا تو میں نے گلاس پکڑتے ہوئے اس کا ہاتھ بھی تھام لیا اور ہنس کر بولا: ''کیا اس میں زہر ملا ہے۔''

''ہاں یہی سمجھ۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

''کاویری کیا تو مجھے زہر بھی دے سکتی ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں دے سکتی۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ میں تجھ سے بہت پیار کرتی ہوں۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''ہاں، میں یہی سمجھتا ہوں کہ تو مجھ سے بہت پیار کرتی ہے اور جو پیار کرتا ہے، وہ کبھی اپنے پیار کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

پھر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر گلاس تھام لیا اور اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا:

''کاویری تیرے ہاتھوں سے تو زہر پینا بھی منظور ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے گلاس اپنے منہ سے لگا لیا اور چند لمحوں میں بغیر سانس لیے دودھ غٹا غٹ کر کے چڑھا گیا۔

دودھ حلق سے اترتے ہی، مجھے یوں لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ میری زندگی کا دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا اور میں چل بسا۔

''چل بسا۔'' ساحل عمر نے حیرت سے دہرایا۔ ''تم اس وقت زندہ نہیں ہو۔''

''نہیں، میں زندہ نہیں ہوں، زندگی تو مجھ سے کاویری چھین کر لے گئی۔'' چترو بھیل کے لہجے میں تپش آ گئی۔

''میں مرنے کے بعد اپنی لاش کے نزدیک موجود تھا۔ یہ بات تو مجھے فوراً معلوم ہو گئی تھی کہ

کاویری نے مجھے زہر دے دیا ہے۔ میری زندگی بن کر میری زندگی مجھ سے چھین لی ہے لیکن میں یہ نہیں جان سکا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ یہ بات بھی مجھے فوراً ہی معلوم ہو گئی۔ اس نے میری لاش کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چترو! تو نے میرے شوہر اور اس کے بھائیوں کو مارا...... میں نے تجھے مار دیا۔ تو نے میرے شوہر اور اس کے بھائیوں کو گھات لگا کر بے خبری میں مارا' لیکن میں نے تجھے جتا کر مارا۔ میں عورت ہو کر تجھ سے بہادر نکلی۔ لعنت ہے تجھ پر۔''

یہ کہہ کر اس نے میری لاش کو ٹھوکر لگائی' میرے منہ پر تھوکا اور میرے استھان سے نکل گئی۔

''اوہ' وہ عورت تو بڑی چالباز نکلی۔'' ساحل عمر نے بڑی سادگی سے کہا۔

''ہاں ایسی ویسی۔ اس کی اس حرکت نے میری روح تک میں شعلے بھڑکا دیئے۔ اس آگ میں جلتے ہوئے مجھے پانچ سال ہو گئے۔ ان پانچ سالوں میں تم پہلے آدمی تھے جسے میرے حوالے کیا گیا۔ اگرچہ برکھا کا مقصد کچھ اور تھا' لیکن میں نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا۔ اب تم نے میری مدد کرنی ہے۔ میری روح کو سکون پہنچانا ہے اور یہ سکون اسی طرح پہنچ سکتا ہے کہ تم کاویری کو قتل کر دو۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ وہ روز دریا پر کپڑے دھونے آتی ہے۔ تم بھی اسی کی طرح دریا کے کنارے بے ہوش ملو گے۔ تمہاری خوبصورتی اس کے دل کی دنیا تہس نہس کر دے گی۔ وہ تمہیں اپنے گھر لے جائے گی۔ ہوش میں آنے پر تم اسے خودکشی کی فرضی داستان سناؤ گے' جیسے اس نے مجھے سنائی تھی۔ چند دن تم اس کے ساتھ رہو گے۔ تم اس کے ساتھ محبت کا ناٹک کھیلو گے۔ وہ تمہارے فریب میں آ جائے گی۔ پھر میں تمہیں زہر فراہم کروں گا۔ تم اسے دودھ میں ملا کر دو گے اور وہی مکالمے بولو گے جو اس نے بولے تھے۔ وہ تمہارے ہاتھوں انجانے میں زہر پینے پر راضی ہو جائے گی۔ جیسے میں ہو گیا تھا۔ اس کے زہر پینے کے بعد میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا جہاں تمہاری رہائش ہے۔ میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ برکھا سے تمہیں نجات مل جائے گی۔ تم نہیں جانتے کہ وہ تمہیں قتل کر کے کالی دنیا کی ایک زبردست طاقت ''مانا'' کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔

بولو اب تم کیا کہتے ہو۔ میری مدد کر کے زندگی چاہتے ہو یا انکار کر کے برکھا کے ہاتھوں قتل ہونا چاہتے ہو۔ اگر تم نے کاویری کو قتل نہ کیا تو میں پھر تمہیں برکھا کے حوالے کر دوں گا۔ اب تم اچھی طرح سوچ لو کہ تم کیا چاہتے ہو۔ قتل کے بدلے زندگی چاہتے ہو یا انکار کے بدلے خود اپنا قتل۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

ساحل عمر کو چترو بھیل نے عجیب مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ یہ انکشاف بھی اس کے لیے ہولناک تھا کہ برکھا اپنی ساحرانہ قوتوں میں اضافے کے لیے اسے بھینٹ چڑھانا چاہتی ہے۔ اس کی بلی دینا چاہتی ہے۔ اسے قربانی کا بکرا بنانا چاہتی ہے۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ یوں آدھی رات کو اس کی ٹیلی فون کال پر کس طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ دیوانوں کی طرح اس کے بنگلے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ اس کی ساحرانہ قوتوں کے زیر اثر آ گیا تھا۔ اس کے اثر سے نکلنے کے لیے چترو بھیل اس کی مدد کرنے کو تیار تھا' لیکن اس آزادی کے عوض وہ اسے قاتل بنا دینا چاہتا تھا۔ اب وہ انکار کر سکتا تھا' نہ

اقرار......

''نوجوان تو کب تک سوچے گا۔ جلدی فیصلہ کر' میرے پاس وقت کم ہے۔ میں دھول اڑتی ہوئی دیکھ رہا ہوں۔ برکھا نے میرے استھان پر میری واپسی کا عمل شروع کر دیا ہے۔ تو اپنا فیصلہ جلدی سنا۔ میں دس تک گنتی گنتا ہوں۔ ایک......دو......تین۔'' اور اس سے پہلے کہ وہ دس تک پہنچتا۔

ایک آواز گونجی۔ ''میں کاویری کو قتل کروں گا۔''

یہ آواز ساحل عمر کی نہ تھی۔

☆......☆......☆

اسے اپنی آواز بڑی اجنبی لگی۔ اسے اپنی آواز پر یقین نہ آیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی کے قتل پر راضی ہو جائے گا۔ یہ فیصلہ اس نے دل سے نہیں کیا تھا۔ یہ اس کے دل کی آواز نہیں تھی۔ بس لاشعوری طور پر اس کے منہ سے نکل گیا تھا کہ وہ کاویری کو قتل کرنے پر راضی ہے۔

ساحل عمر کا فیصلہ سن کر چتر وبھیل کی باچھیں کھل گئیں۔

''شاباش نوجوان تم نے دل خوش کر دیا۔ اب میں برکھا کو دیکھ لوں گا۔ اسے میری فکر نہیں ہے۔ اسے تمہاری فکر ہے۔ میں اپنے استھان پر جاؤں نہ جاؤں۔ اسے میری واپسی سے کچھ فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر تم اسے واپس نہ ملے تو اس کی زندگی بھر کی کمائی منٹوں میں لٹ جائے گی اور ایسا وہ کبھی نہیں ہونے دے گی۔''

''وہ کیا کرے گی؟'' ساحل عمر نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

''وہ ہوا کا جال بھیجے گی، تمہاری گرفتاری کے لیے۔'' چتر وبھیل نے کہا۔

''ہوا کا جال...... میں سمجھا نہیں۔'' ساحل عمر حیران ہوا۔

''تم سمجھو گے بھی نہیں...... جب تک تم دیکھ نہیں لو گے سمجھو گے نہیں۔ ویسے وہ دکھائی دینے والی چیز بھی نہیں۔ تم صرف محسوس کر سکو گے۔ تمہیں یوں محسوس ہو گا کہ اچانک ہی کوئی ان دیکھا جال تم پر آ گرا ہے اور اس جال میں تم جکڑتے جا رہے ہو۔ پھر اس جال کی گرفت سخت سے سخت ہوتی جائے گی اور تمہارے پاؤں زمین سے اکھڑ جائیں گے۔ پھر یہ ہوا کا جال تمہیں اڑا لے جائے گا اور تمہیں برکھا کے سامنے جا کر ڈال دے گا۔''

''اوہ، پھر کیا ہو گا......؟ مجھے کون بچائے گا۔''

''میں بچاؤں گا...... میرے سامنے ابھی وہ بچی ہے۔ وہ اگر ہوا کا جال بھیج سکتی ہے تو میں اس ہوا کے جال کی کاٹ تمہیں بتا سکتا ہوں۔ تم پریشان نہ ہو۔''

''تم کہہ رہے ہو کہ وہ جال اچانک ہی مجھ پر گرے گا اور دکھائی بھی نہ دے گا تو ایسی صورت میں میرے پاس بچاؤ کا راستہ موجود ہونا چاہیے۔ پتہ نہیں وہ جال کب مجھ پر آ گرے۔''

''ابھی اس کا عمل ختم ہونے میں کچھ وقت ہے۔ چلو تمہاری تسلی کے لیے تمہیں اس کی کاٹ بتائے دیتا ہوں بلکہ تمہارے حوالے کیے دیتا ہوں، چند لمحے انتظار کرو۔'' یہ کہہ کر وہ کٹے ہوئے درخت کے پیچھے چلا گیا۔

چند لمحوں بعد وہ اس کی اوٹ سے مسکراتا ہوا نکلا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چمکتا ہوا استرا تھا۔ وہ اس کے نزدیک آ کر استرا اس کے حوالے کرتا ہوا بولا: "یہ لو۔"

"استرا......!" ساحل عمر نے چمکتے استرے کو ہاتھ میں لیتے ہوئے حیرت سے کہا۔ "اس سے کس طرح کاٹ ہوگی۔"

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔ میری بات پوری توجہ سے سنو۔" یہ کہہ کر چتر وبھیل نے اسے ساری بات تفصیل سے سمجھا دی۔ وہ ساری بات اچھی طرح سمجھ گیا۔ اس نے استرے کو بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"اب میرے ساتھ آؤ!" چتر وبھیل نے پتھر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" وہ بولا۔

"تمہیں دریا کی سیر کروا دوں۔ نزدیک ہی وہ دریا ہے جہاں تم کاویری کو بے ہوش ملو گے۔ تمہیں وہ جگہ دکھا دوں۔" چتر وبھیل اٹھتے ہوئے بولا۔

"چلو......!" ساحل عمر اس کے ساتھ ہو لیا۔

"کاویری کہاں رہتی ہے؟"

"وہ دریا کے اس پار رہتی ہے۔" چتر وبھیل نے بتایا اور پھر تیز تیز چلنے لگا۔

اب وہ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ چتر وبھیل اسے مڑ کر دیکھ لیتا تھا۔ جب ان دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ بڑھ جاتا تو وہ ٹھہر جاتا اور جب ساحل قریب آنے لگتا تو چتر وبھیل پھر قدم بڑھانے لگتا۔

اس وقت وہ گھنے جنگل سے گزر رہے تھے۔ اگرچہ آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا' لیکن اس جنگل میں اس کی روشنی کا زیادہ گزر نہ تھا۔ درخت آپس میں اس طرح ملے ہوئے تھے کہ روشنی کی کرنیں کہیں کہیں سے چھن کر زمین پر پڑ رہی تھیں۔ یہی حال کچھ ہوا کا بھی تھا۔ اس جنگل میں ہوا کا بھی گزر نہ تھا۔ گرمی نہ تھی بلکہ دھوپ نہ ہونے کی وجہ سے ٹھنڈک کا احساس تھا۔

ابھی وہ زیادہ دور نہ گئے ہوں گے کہ ساحل عمر کو اچانک اپنے گرد تیز ہوا محسوس ہوئی۔ ساحل عمر چلتے چلتے فوراً کھڑا ہو گیا۔ اسے ایک دم خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے جیب سے فوراً استرا نکال کر کھول لیا۔ ہوا مزید تیز ہوتی جا رہی تھی اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہوا اسے اپنی گرفت میں لیتی جا رہی ہے۔

یہی عمل کا وقت تھا۔ اس میں ذرا سی بھی غفلت' ذرا بھی دیر ساحل عمر کو کہاں سے کہاں پہنچا سکتی تھی۔ ساحل عمر فوراً ایکشن میں آ گیا۔ اس نے اپنا بایاں بازو کھول کر جلدی جلدی استرا چلایا جیسے اپنے اوپر پڑے جال کو کاٹ رہا ہو۔ پھر یہی عمل اس نے دائیں بازو کے نیچے بغل کے نزدیک کیا۔ پھر وہ فوراً ہی جھک گیا اور اس نے ٹانگوں کے درمیان بہت تیزی سے استرا چلانا شروع کر دیا۔

چتر وبھیل چلتے چلتے رک گیا تھا۔ اب وہ بڑی دلچسپی سے ساحل عمر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خوش تھا

کر اس نے جس طرح اسے بتایا تھا' وہ بالکل ویسے ہی عمل میں معروف تھا۔
ساحل عمر کو یکا یک محسوس ہوا کہ ہوا کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ جو بات اس نے ابتداء میں محسوس کی تھی وہ بات اب نہیں رہی تھی۔ وہ ہوا کی رگوں کو کاٹنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ احتیاطاً استرا چلانے کے عمل کو اب بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔
تب چتر وبھیل جلدی سے اس کے نزدیک آیا اور زور سے بولا:
"بس......بس......کام ہو گیا۔"
چتر وبھیل کی آواز سن کر اس نے فوراً اپنا ہاتھ روک لیا۔ اس نے دیکھا کہ ہوا کا یہ تیز جھونکا اس سے الگ ہو کر سامنے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مٹی کے ذرے اور سوکھے پتے اس کے ساتھ چل رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کے اس مرغولے میں کوئی چیز ظاہر ہوئی۔ وہ سرخ رنگ کی کوئی چیز تھی جو تیزی سے چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ پھر وہ زمین پر گری اور ہوا ایک دم ساکت ہو گئی۔ یہ سرخ رنگ کا ریشمیں دھاگوں کا کوئی جال سا تھا جو سمٹتا سکڑتا جا رہا تھا۔ پھر اس کا ایک گولا سا بن گیا اور اس میں اچانک آگ بھڑک اٹھی۔ یہ بہت تیز آگ تھی۔ چند سیکنڈ میں گولا جل کر کوئلہ ہو گیا۔

"دیکھ لیا تم نے۔" چتر وبھیل اس کے قریب آ کر بولا۔
"میں نے جیسا کہا تھا' ویسا ہی ہوا نا۔ اب تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہو گا کہ برکھا کس طرح تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔"
"ہاں واقعی۔"
ساحل عمر اس جلے ہوئے گولے پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ "شروع میں تو یہ سمجھا تھا کہ تم محض ڈرا کر مجھ سے اپنا کام کروانا چاہتے ہو لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ برکھا واقعی میری جان کی لاگو ہو گئی ہے۔"
"تم فکر مت کرو...... پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے' میں تمہیں اس کے چنگل سے نکال دوں گا۔ بس تم میرا یہ کام کر دو۔"
"ٹھیک ہے۔ آؤ دریا کی طرف چلیں۔" ساحل عمر نے کہا اور پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

چتر وبھیل کسی سانپ کی طرح "موذی" تھا۔ انتہائی خبیث' شاطر اور بے وفا شخص۔ وہ اپنے وقت کا ایک بڑا ساحر تھا۔ اس نے چھ قتل کیے تھے۔ خباثت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جس طرح سانپ اپنے دودھ پلانے والے کو بھی نہیں بخشتا' ویسے ہی اس نے ساحل عمر کے بارے میں فیصلہ کر لیا تھا۔

فی الحال تو اس نے اسے کاویری کے پیچھے لگانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کاویری کے قتل کے بعد اس نے آئندہ کا لائحہ عمل سوچ لیا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ ساحل عمر کو کسی قیمت پر آزاد نہیں کرے گا۔

چتر وبھیل اپنے جسم سے محروم ہو گیا تھا۔ اب اسے ایک جسم کی تلاش تھی۔ ساحل عمر سے اچھا جسم اسے بھلا کہاں مل سکتا تھا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کر رہا تھا۔ ساحل عمر سے کاویری کا قتل کروا کر ایک طرف تو وہ اپنی انتقام کی آگ بجھا رہا تھا دوسری طرف وہ اسے قاتل بنا کر گندا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے جسم پر اسی صورت میں قبضہ جما سکتا تھا کہ وہ مجرم ہو جائے۔ مجرموں پر ہی اصل میں گرفت کی جاتی ہے۔ کسی بے گناہ اور معصوم شخص کو نہیں پکڑا جاتا۔

ساحل عمر کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ آئندہ چند روز میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کاویری کے قتل پر اگرچہ وہ اوپری دل سے راضی تو ہو گیا تھا لیکن کاویری کے قتل کا تصور کر کے وہ کانپ جاتا تھا۔ اس وقت وہ چتر وبھیل کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ اس سے جان چھڑا کر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ فی الحال اس نے یہ طے کیا تھا کہ پہلے کاویری تک پہنچا جائے۔ اگر ممکن ہو سکا تو اسے اعتماد میں لے کر راہ فرار اختیار کی جائے گی۔ وہ اسے اصل حقائق سے آشنا کر دے گا۔ اس انکشاف کے بدلے میں کاویری ضرور اس کی مدد کرے گی۔ وہ اس علاقے سے نکلنے کا ضرور کوئی نہ کوئی بندوبست کر دے گی۔

دونوں اپنے اپنے طور پر منصوبہ بندی میں لگے ہوئے تھے اور قسمت دور کھڑی ان دونوں پر ہنس رہی تھی۔

☆......☆......☆

صبح تڑکے کا وقت تھا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا لیکن ہلکا ہلکا اجالا پھیل گیا تھا۔ ساحل عمر کٹے ہوئے درختوں کے درمیان اسی بڑے سے پتھر پر لیٹا تھا جہاں کل اس کی آنکھ کھلی تھی۔ چتر وبھیل اسے کھلا پلا کر رات اس پتھر پر گزارنے کا کہہ کر چلا گیا تھا۔ وہ صبح ہی صبح آنے والا تھا تاکہ ساحل عمر کو دریا کے کنارے بے ہوشی کے عالم میں لٹائے اور پھر کسی درخت کے پیچھے چھپ کر کاویری کی آمد اور ساحل عمر کو وہاں سے اٹھا لے جانے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ اسے یقین ہو جائے کہ مچھلی نے کانٹا نگل لیا ہے...... اس کے بعد تو اسے محض ڈور کھینچے جانے کا انتظار کرنا تھا۔

رات کو ساحل عمر بہت دیر میں سویا تھا۔ وہ دنیا جہاں کی باتیں سوچتا رہا تھا۔ پھر نرم گداز بستر پر سونے والے شخص کو بستر کی جگہ پتھر فراہم کیا گیا تھا وہ کیسے سوتا۔ کہتے ہیں، نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے، وہ تو ایک بینچ نما پتھر تھا، وہ اپنے بازو پر سر رکھ کر سوچتے سوچتے جانے کب سو گیا۔

اس وقت بھی وہ سو رہا تھا۔ صبح قریب تھی۔ اندھیرا ملگجے اجالے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ چتر وبھیل ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔

لیکن وہ چھلانگیں مارتا ہوا کسی راکٹ کی رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ پھر وہ بینچ نما پتھر کے قریب آ کر رک گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے چاروں طرف گردن گھما کر دیکھا۔ ہر طرف سکون پھیلا ہوا تھا۔

اس نے دو قدم آگے بڑھ کر چہرہ ساحل عمر کے چہرے کے قریب کر دیا۔ جلد ہی ساحل عمر نے اپنے چہرے پر غیر انسانی سانسوں کو محسوس کر لیا۔

فوراً اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے نزدیک پا کر وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ اس کے سامنے ایک چیتا موجود تھا۔ روشنی زیادہ نہ ہونے کے باوجود اس نے پہچان لیا کہ وہ جھکال ہے۔ وہ اسے کیسے نہ پہچانتا' اس نے اس کے جسم کے ہر حصے پر برش چلایا تھا۔ اس نے اسے پینٹ کیا تھا۔

جھکال نے کسی پالتو بلی کی طرح اپنا جسم اس کی ٹانگوں سے رگڑا۔ اسے نزدیک پا کر ساحل عمر نے ذرہ بھر بھی خوف محسوس نہیں کیا بلکہ اسے دیکھ کر اس کے دل میں محبت کے جذبات ابھرے۔ اس نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ جھکال تھوڑا سا پیچھے ہوا تو وہ مزید اس پر جھک گیا۔ جھکال مزید پیچھے ہو کر ایک دم اس کے نزدیک آیا۔ اس آگے پیچھے ہونے میں یہ ہوا کہ وہ جھکال کے اوپر سوار ہو گیا۔

جھکال کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ اس نے اپنی کمر ہلا کر ساحل عمر کو اپنی پیٹھ پر سوار کیا اور تیزی سے دوڑ لگائی۔

ساحل عمر نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس کی گردن کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کی کمر پر اچھی طرح جم گیا۔

جھکال نے جب دیکھا کہ سوار نے اپنی نشست اچھی طرح سنبھال لی ہے تو پھر اس نے ایک لمبی زقند بھری اور چند لمحوں میں وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ ساحل عمر بہت مضبوطی سے اس کی گردن سے چمٹا ہوا تھا۔

چتر دبھیل جھومتا جھامتا بڑی تیزی سے چلا آ رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ آگ جو اس کی روح میں لگی ہوئی تھی' اس آگ کے ٹھنڈی ہونے کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ منزل بہت قریب تھی۔ وہ ساحل عمر کو دریا میں ایک غوطہ لگا کر کنارے پر لٹا دے گا۔ ایک ٹانگ اس کی دریا میں ہو گی باقی جسم خشکی پر ہو گا اور وہ بے سدھ لیٹا ہو گا۔ کاویری جب اسے دیکھے گی تو اس کے چلتے قدم رک جائیں گے۔

ارے......! کاویری کے چلتے قدم اسے دیکھ کر پتہ نہیں رکتے کہ نہیں لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر چتر دبھیل کے چلتے قدم ضرور رک گئے اور منہ سے بے اختیار حیرت کا کلمہ نکل گیا۔ درختوں کے درمیان اسے وہ بینچ نما پتھر صاف نظر آیا جو خالی تھا۔ اس نے جلدی جلدی چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اس نے سوچا شاید ساحل عمر ضرور تا اٹھا ہو لیکن وہ آس پاس کہیں نظر نہیں آیا۔

یہ بات اس کے لیے سوہان رُوح ہو گئی۔ وہ خود روح تھا۔ وقت اور جگہ کی قید سے آزاد...... اس نے جلدی جلدی آس پاس کا علاقہ چھان مارا۔ دریا کے دونوں کنارے خالی پڑے تھے۔ حتیٰ کہ کاویری بھی اپنے گھر میں موجود تھی۔

چتر دبھیل ایک موہوم سی امید پر اسے جگہ جگہ تلاش کرتا رہا۔ اب تو سورج بھی نکل آیا تھا۔ ہر سو سورج کی کرنیں بکھر چکی تھیں لیکن ساحل عمر کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

کہاں گیا وہ؟ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ چتر دبھیل سوچ سوچ کر پریشان ہونے لگا۔ اس کی خوشی لمحوں میں غائب ہو گئی۔ ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی۔ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

تب اسے برکھا کا خیال آیا۔ کہیں یہ کام اس عیار لومڑی نے تو نہیں کر دکھایا۔ اس سے غلطی ہوگئی کہ وہ برکھا کی طرف سے غافل ہوگیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ ہوا کے جال کے کٹ جانے کے بعد اب ادھر سے کوئی خطرہ نہیں' اسے جاتے ہوئے کوئی ''نشانی'' لگا کر جانا چاہیے تھا۔ اگر اس کے پاس ''نشانی'' لگی ہوتی تو اس کے بارے میں فوراً نشاندہی ہو جاتی۔ لگتا ہے برکھا ہاتھ دکھا گئی۔ اگر واقعی ایسا ہے تو وہ اسے بخشے گا نہیں۔ وہ غصے سے کھول اٹھا۔

☆............☆............☆

برکھا کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ اس پر پاگل پن کا دورہ پڑنے والا تھا۔ ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ وہ غصے میں چترو بھیل کے ''استھان'' کے چاروں طرف چکر کاٹ رہی تھی۔ سوناں اور واسم دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔ وہ پریشان نظروں سے برکھا کو چکر کاٹتا دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔

''برکھا جی...... کچھ بتائیں تو آخر ہوا کیا؟'' واسم نے ہمت کر کے پوچھا۔

''وہ ہوگیا جو آج تک نہیں ہوا!'' برکھا نے افسردگی سے کہا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس طرح مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ میری کئی راتوں کی محنت یوں اکارت چلی جائے گی۔''

''کچھ بتائیں تو۔'' سوناں نے اس مرتبہ لب کھولے۔

واسم کے بولنے سے اس میں ہمت آ گئی تھی۔

''ہوا کا جو جال میں نے ساحل عمر کی گرفتاری کے لیے بھیجا تھا' وہ جال ساحل عمر نے کاٹ دیا۔''

''کیسے پتہ چلا۔'' سوال ہوا۔

''یہ تم اندھوں کو جلا ہوا گولا نظر نہیں آ رہا' یہ کیا ہے؟ یہ وہی کٹا ہوا جال ہے۔''

برکھا نے اس جلے ہوئے گولے کی طرف اشارہ کیا۔ جو اچانک ہی کہیں سے قالین پر نمودار ہوگیا تھا۔

اس گولے کو ان دونوں نے بھی دیکھا تھا لیکن وہ اس بات کو سمجھ نہ پائے تھے اور برکھا سے پوچھنے کی ان میں ہمت نہ تھی کہ یہ کیا ہے؟ صورت حال سے آگاہی پر دونوں کو افسوس ہوا' سوناں بولی:

''یہ تو بہت برا ہوا؟''

ابھی برکھا جواب دینے کے لیے منہ کھول ہی رہی تھی کہ وہ چکر کاٹتے کاٹتے ایک دم ٹھٹک گئی۔

سوناں اور واسم نے برکھا کو اس طرح رکتے دیکھا تو وہ دونوں فوراً چوکنا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سوناں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ برکھا جی!''

''وہ آ رہا ہے؟''

یہ کہہ کر برکھا جہاں کھڑی تھی وہیں آسن جما کر بیٹھ گئی اور تیزی سے منہ ہی منہ میں کچھ منتر پڑھنے لگی۔ منتر پڑھتے پڑھتے اس نے ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

سوناں اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے فوراً اٹھی اور تیزی سے آگے بڑھ کر استھان کا دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی چتر دبھیل کسی آندھی کی طرح اندر داخل ہوا اور اپنے استھان کے نزدیک پہنچ کر برکھا کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھتے ہو مجھے۔'' برکھا ایک دم کھڑی ہو گئی اور غصے سے بولی۔ ''اب یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

''بتا کہاں چھپایا ہے تو نے اسے...... اگر تو نے اسے میرے حوالے نہ کیا تو یاد رکھ تیرا استھان بھی یہیں بنے گا۔'' چتر دبھیل کے لہجے میں آگ بھری تھی۔

''ارے الٹی مجھے دھمکی دے رہے ہو...... میں نے اپنا بڑا سمجھ کر اپنی تپسیا کو تمہارے استھان ربھیجا تھا کہ تمہارے ذریعے میری کچھ راہیں آسان ہو جائیں گی۔ مجھے آسانی مہیا کرنا تو در کنا تم میری بلی کو ہی لے اڑے۔ تم جانتے نہیں کہ میں اس پر کب سے محنت کر رہی ہوں تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں لے گئے اسے مجھ سے چھین کر۔ بولو جواب دو۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ میں اسے تجھ سے چھین کر لے گیا لیکن تو نے اسے میرے پاس رہنے کب دیا۔ میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنے پاس بلا بھیجا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ ہوا کا جال کاٹنے کے باوجود تو اسے اپنے پاس پکڑ بلائے گی۔ تو اتنی طاقتور ہو گئی ہے؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''چتر دبھیل تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' برکھا اس سے زیادہ حیران ہوئی۔

''دیکھ برکھا...... میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تو بس چند روز کے لیے اسے میرے حوالے کر دے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں خود اسے تیرے پاس چھوڑ جاؤں گا اور تیری راہیں بھی آسان کر دوں گا۔'' اس نے چال چلی۔

''ارے چتر دبھیل کیا ساحل تمہارے پاس نہیں...... کیا تم اسے یہاں سے نہیں لے گئے......''

''اسے میں لے گیا تھا' میں اس بات سے کب انکاری ہوں...... لیکن اب وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' برکھا کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ''جو کچھ کہہ رہے ہو سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں...... کالی دیواہ کی قسم سچ کہہ رہا ہوں۔''

وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''لیکن چتر دبھیل پھر وہ کہاں گیا...... وہ میرے پاس تو نہیں۔ کالی دیواہ کی قسم وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''ہیں۔''

یہ سن کر چتر و بھیل پر اس قدر صدمہ طاری ہوا کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ اس کی آنکھیں کانپنے لگیں۔ وہ فوراً قالین پر بیٹھ گیا اور بے حد اداس لہجے میں بولا۔ ''پھر اسے کون لے اڑا......''

''اوہ......'' برکھا نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''چترو' یہ کیا کیا تم نے؟ اسے نہ میرا رہنے دیا' نہ اپنا۔''

''وہ کہاں جا سکتا ہے؟'' چترو بھیل نے سوال کیا۔

''اسے ڈھونڈنا ہوگا۔'' برکھا بولی۔

''ڈھونڈیں گے...... ہم دونوں مل کر اسے تلاش کریں گے۔''

''ہم دونوں مل کر نہیں۔'' برکھا نے فوراً تردید کی۔

''میں اسے تنہا ڈھونڈوں گی۔ اب تم اسے بھول جاؤ۔ تمہارا اس پر کوئی حق نہیں' سمجھے۔ میں یہاں سے جاؤں گی تو تمہیں استھان پر باندھ کر جاؤں گی۔ پھر تم یہاں سے ہل بھی نہ سکو گے۔ تمہاری اس حماقت نے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ میں تمہیں بخشوں گی نہیں۔''

''تم ایسا نہیں کرو گی برکھا...... ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

''یہ بات تو نے ٹھیک کہی' تجھ سے برا واقعی یہاں کوئی اور نہیں...... لے دیکھ' میں نے باندھ دیا۔ اب تو اس کمرے کی دیواروں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اگر تو نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو تیری روح میں شعلے بھڑک اٹھیں گے۔ اتنی بات تو تو خود بھی سمجھتا ہوگا۔ تو نے کالی دنیا کا اصول توڑا ہے تو نے جادوگر ہو کر ایک دوسری جادوگر کو دھوکا دیا ہے۔ میں تیری شکایت کالی دیواہ سے کروں گی۔ تجھے دوسرے جنم میں ضرور کتا بنایا جائے گا۔'' یہ کہہ کر برکھا اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

چترو بھیل نے جب چاروں طرف نظریں گھمائیں تو اسے ہر طرف آگ بھڑکتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ ایسی آگ تھی جو صرف اسے ہی دکھائی دے رہی تھی اور صرف اسی کے لیے تھی۔

''واسم ......سوناں......'' برکھا غصے سے چیخی۔

''جی' برکھا جی۔'' وہ دونوں بھاگ کے اس کے قدموں میں آ گرے۔

''آؤ' چلو...... نکلو یہاں سے...... دروازے کو تالا لگاؤ اور چابی مجھے دو۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر آ گئی۔ اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ چترو بھیل پر اس عمل کا کیا ردعمل ہوا۔ باہر نکل کر سوناں نے دروازے کو لاک کیا اور چابی برکھا کی طرف بڑھا دی۔ برکھا نے چابی کو ہاتھ میں لے کر کوئی منتر پڑھا اور پھر اسے اپنی ساڑھی کے پلو میں باندھ لیا۔

اور کاٹیج سے باہر نکل آئی۔

☆............☆............☆

اماں' ناصر مرزا کے سامنے بیٹھی ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ ناصر مرزا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں کیسے چپ کروائے۔ انہیں کیا کہہ کر تسلی دے۔

وہ آج حافظ موسیٰ سے ملاقات کے لیے نکلا تھا۔ اس نے سوچا کہ اماں کو بھی دیکھتا چلے۔''

جب یہاں آیا تو اسے دیکھتے ہی اماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
"ارے اماں کیا ہوا؟ آپ کیسی ہیں۔" ناصر مرزا نے فکرمندی سے کہا۔
بس اتنا سننا تھا کہ وہ پھپک کر رو پڑیں۔ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ اس طرح رو رہی تھیں جیسے خدانخواستہ ساحل عمر چل بسا ہو۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر اس کرسی پر بیٹھی تھیں جس پر بیٹھ کر ساحل عمر ناشتہ کیا کرتا تھا۔ گھر میں مرجینا بھی موجود تھی۔ اب وہ اماں کے ساتھ چوبیس گھنٹے رہ رہی تھی۔ ساحل عمر کے لاپتہ ہونے کے بعد مرجینا نے ان کے ساتھ مستقل رہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات ناصر مرزا نے اس سے کہی تھی کیونکہ اماں کا اس عمر میں تنہا رہنا ٹھیک نہ تھا۔ ناصر مرزا نے تو انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے کا کہا تھا لیکن وہ مانی نہیں۔ کہنے لگیں۔ "نہیں بھیا...... میں اپنے ساحل کا گھر نہیں چھوڑ سکتی۔"
تب مجبور ہو کر ناصر مرزا نے مرجینا کو ہدایت کی تھی کہ ساحل عمر کے آنے تک وہ اس گھر میں مستقل رہنا شروع کر دے۔ اس نے خوشی سے یہ بات مان لی تھی۔
اماں روئے جا رہی تھیں اور ناصر مرزا خاموشی سے انہیں تکے جا رہا تھا۔ رونے کی آواز سن کر مرجینا بھی کام چھوڑ کر ان کے پاس آ گئی تھی۔ وہ انہیں تسلیاں دے رہی تھی۔ صاحب کی واپسی کا یقین دلا رہی تھی لیکن اماں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔
تب ناصر مرزا نے مرجینا سے ایک گلاس پانی لانے کو کہا۔ وہ فوراً ہی پانی لے آئی۔ ناصر مرزا نے گلاس پکڑ کر کچھ پڑھا اور پھر تین بار پانی میں پھونکیں ماریں۔ پھر بولا: "اماں...... پانی پی لیں۔"
ان کے دل میں جو غبار تھا وہ آنسو بہہ جانے کی وجہ سے خاصا دب گیا تھا۔ انہوں نے ناصر مرزا کی آواز سن کر سر اٹھایا۔ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے اور پھر پانی اس کے ہاتھ سے لے کر گھونٹ گھونٹ پینے لگیں۔ اس پانی کو پی کر اماں کو خاصا سکون ملا۔
"بھئی...... میں نے اپنے ساحل کو خواب میں دیکھا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پریشان سی ہو گئیں۔
ناصر مرزا نے ان کا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ اماں نے ساحل عمر کے بارے میں ضرور کوئی الٹا سیدھا خواب دیکھ لیا ہے۔ اس نے کہا: "اماں، خوابوں کا کیا بھروسہ...... آپ نے ساحل کے بارے میں ضرور کوئی برا خواب دیکھ لیا ہے۔"
"ناصر جب سے میں نے ساحل کو خواب میں دیکھا ہے، میرا دل پریشان ہے۔ کسی طرح بہلتا ہی نہیں۔ میرا ساحل ضرور کسی مصیبت میں مبتلا ہے۔"
"آپ نے کیا دیکھا؟" ناصر مرزا نے پوچھا۔
"میں نے ایک جنگل بیابان دیکھا...... اس جنگل میں میرا ساحل ننگے پاؤں، ایک کالی چادر اوڑھے مارا مارا پھر رہا ہے۔ میں اسے دیکھ کر اس کے پیچھے بھاگتی ہوں۔ اسے آوازیں دیتی ہوں لیکن وہ کچھ سنتا ہی نہیں۔ میں چیخ چیخ کر اس کا نام پکارتی ہوں لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اتنے میں مرجینا مجھے اٹھا دیتی ہے۔ اماں اٹھ جاؤ، کوئی خواب دیکھ رہی ہو کیا؟ فوراً ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔" اماں اپنا خواب سنا کر پھر پریشان ہو گئیں۔ ناصر مرزا کو محسوس ہوا جیسے وہ پھر رونے والی ہیں۔ ناصر مرزا

فوراً بولا: ''اماں آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ خواب کی تعبیر ہمیشہ الٹی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ساحل عمر جہاں ہوگا آرام سے ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں ابھی حافظ موسیٰ کی طرف جا رہا ہوں۔ ان سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔ چلو ٹھیک ہے۔''

ناصر مرزا اٹھنے لگا تو اماں نے مرجینا کو اشارہ کیا۔ ''چائے لاؤ۔''

''اچھا' اماں جی' ابھی لائی۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے کچن کی طرف بڑھی۔

''ارے' مرجینا رکو...... میں چائے نہیں پیوں گا۔ ابھی ناشتہ کر کے آرہا ہوں۔'' وہ اماں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اچھا اماں میں چلتا ہوں۔ جو بھی بات ہوگی میں آپ کو فون پر بتا دوں گا۔''

''اچھا بھیا...... اللہ تمہیں خوش رکھے۔''

اماں ناصر مرزا کو گھر کے دروازے تک چھوڑنے آئیں اور جب تک وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ نہیں ہو گیا گیٹ پر کھڑی رہیں۔

☆............☆............☆

ناصر مرزا جب حافظ موسیٰ کے گھر میں داخل ہوا تو اسے امید تھی کہ وہ حسب معمول چارپائی پر لاٹھی تھامے بیٹھے ہوں گے لیکن آج ناصر مرزا کو گھر کے پچھلے حصے میں جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ اسے گیٹ کے اندر آتے ہی نظر آ گئے۔ وہ املی کے درخت کے نیچے ایک مونڈھے پر بیٹھے تھے' ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ وہ لاٹھی کو دونوں ہاتھوں میں تھامے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

ناصر مرزا نے نزدیک جا کر انہیں سلام کیا۔ سلام کا جواب دے کر انہوں نے پوچھا: ''ناصر مرزا کیسے ہو؟''

''حضرت میں تو ٹھیک ہوں لیکن ساحل عمر ابھی تک واپس نہیں آیا۔'' ناصر مرزا نے وقت ضائع کیے بنا فوراً ساحل عمر کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے ڈھونڈنا ہوگا' تم نے اسے کہاں تلاش کیا؟''

''حضرت میں نے اسے ڈھونڈا تھا۔ میں تو برکھا کے گھر میں بھی کود گیا تھا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا' البتہ اس کی گاڑی ضرور وہاں کھڑی تھی۔ میں اس کی گاڑی وہاں سے نکال لایا۔ اس دن میں اس چاقو کی وجہ سے بچ گیا ورنہ برکھا نے مجھے جلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔'' ناصر مرزا نے ساری روداد سنائی۔

''اچھا' وہ سفلی والی...... اللہ اس سے بچائے۔ وہ پکی شیطان کی خالہ ہے۔'' وہ مسکرائے اور پھر لاٹھی میں بنی آنکھ سے اپنی آنکھ لگا لی۔

''حضرت پھر ساحل عمر کا کیا کروں...... مجھے یقین ہے کہ وہ برکھا کے چنگل میں ہے۔'' ناصر مرزا نے پوچھا۔

''ہاں' وہ تھا اس کے چنگل میں...... سفلی والی نے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اب وہ اس کے چنگل سے نکل گیا۔'' حافظ موسیٰ لاٹھی سے اپنی آنکھ لگائے لگائے بولے۔

''اب وہ کہاں ہے؟'' ناصر مرزا نے پھر سوال کیا۔

''اب وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے...... اچھے لوگوں میں ہے۔'' گول مول سا جواب ملا۔

''مجھے بتائیں...... وہ کہاں ہے' میں جا کر اسے لاؤں...... اماں نے رو رو کر برا حال کر رکھا ہے۔''

''اماں!'' انہوں نے حیرت آمیز لہجے میں دہرایا۔

''اصل میں وہ ان کی گود میں پلا بڑھا۔ آپ آیا سمجھ لیں اس کی......'' ناصر مرزا نے وضاحت کی۔

''اچھا...... میں اس کے لیے تمہیں ایک چیز بتا دیتا ہوں۔ ایک بوتل پانی پر پڑھ کر دے دینا۔ اسے پیتے ہی قرار آ جائے گا۔ اسے میرے حوالے سے بتا دینا کہ ساحل عمر کی طرف سے بالکل پریشان نہ ہو۔ اسے آنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔''

''حضرت...... میں ساحل سے ملنا چاہتا ہوں...... کیا وہ اسی شہر میں ہے؟''

''نہیں...... وہ یہاں سے بہت دور جا چکا ہے۔ میں اگر بتا بھی دوں کہ وہ کہاں ہے ......تو تم اس سے مل نہ پاؤ گے۔ یوں سمجھو کہ وہ کسی اور دنیا میں' اور لوگوں میں چلا گیا ہے۔ میں ہوں اس کی دیکھ بھال کے لیے۔ تم پریشان مت ہو۔'' انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اب آپ کی زبان سے سن لیا ہے کہ وہ جہاں ہے' ٹھیک ہے تو میرے دل کو قرار آ گیا ہے۔ اب میں اس سفلی والی کی خبر لیتا ہوں۔''

''کوشش کر دیکھو...... ویسے وہ تمہارے قابو میں آئے گی نہیں...... وہ بہت عیار عورت ہے۔''

''اس نے میری بھتیجی کو مارا ہے۔ اس نے عابد منجم کو قتل کیا ہے۔'' ناصر مرزا کے لہجے میں تپش آ گئی۔

''تو کیا تم اسے قتل کر کے خود قاتل بننا چاہتے ہو؟''

حافظ موسیٰ نے تنبیہ کی۔

''جی تو یہی چاہتا ہے۔'' ناصر مرزا نے کہا۔

''تو پھر اس میں اور تم میں کیا فرق رہے گا۔ تم بھی قاتل وہ بھی قاتل...... تم بھی مجرم وہ بھی مجرم۔ تم بھی سزا کے مستحق' وہ بھی سزا کی مستحق۔''

''پھر میں کیا کروں...... میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔''

''صبر کرو...... وقت کا انتظار کرو۔ میں بھی یہیں ہوں۔ تم بھی یہیں ہو۔ میں بھی دیکھوں گا' تم بھی دیکھو گے۔''

''جی بہت بہتر۔'' ناصر مرزا نے یہ بات بڑی مایوسی سے کہی۔

''بہت بہتر کہا ہے......تو میری بات کو بہتر سمجھو بھی۔'' حافظ موسیٰ نے اچانک اپنی آنکھ لاٹھی سے ہٹائی اور اسے اپنی بے نور آنکھوں سے دیکھا۔

ناصر مرزا کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ واقعی اس کو دیکھ رہے ہوں۔ ناصر مرزا نے فوراً اپنی

آنکھیں نیچی کر لیں۔ انہوں نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔

''اماں کے لیے آپ جو چیز بتانے والے تھے' وہ بتا دیں' میں پڑھ کر پانی کی بوتل ان کے حوالے کر دوں گا۔''

''ہاں...... دیکھو ایسا کرنا۔'' پھر ایک لمحے انہوں نے توقف کیا اس کے بعد بتا دیا کہ کیا پڑھ کر پھونکنا ہے۔ اس کے بعد بولے: ''ٹھیک ہے ناصر مرزا تم جاؤ۔''

''اچھا حضرت...... میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور خاموشی سے ان کے گھر سے نکل آیا۔

☆..........☆..........☆

تہکال نے تھوڑی ہی دیر میں ساحل عمر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس کی گردن کو مضبوطی سے تھامتے ہی اس پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ جب ذرا اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک دریا کے کنارے پایا لیکن یہ دریا میدانی علاقے کا نہ تھا' پہاڑی علاقے کا تھا۔ چاروں طرف خوبصورت مناظر پھیلے ہوئے تھے۔

وہ چھوٹے مگر گول پتھروں پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے برابر سے ٹھنڈے اور شفاف پانی کا دریا جھاگ اڑاتا بہہ رہا تھا' سامنے پانی میں تہکال بیٹھا تھا۔ وہ اپنے پاؤں کسی بلی کی طرح چاٹ رہا تھا۔

ساحل عمر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دریا کے کنارے بیٹھ کر ٹھنڈے میٹھے پانی سے اپنا منہ دھویا۔ پھر چلو میں پانی لے کر خوب سیر ہو کر پیا۔ پانی بہت لطیف تھا۔ کوئی آدم نہ آدم زاد۔

اس نے تہکال کی طرف دیکھا۔ تہکال نے اپنا پاؤں چاٹنا فوراً چھوڑ دیا اور اپنی خوبصورت آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اٹھ کر آیا اور اس کی پیٹھ سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

ساحل عمر نے اپنا ایک ہاتھ پیچھے کر کے اس کے سر پر پھیرا اور بولا: ''تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟''

''اس وقت آپ کاغان میں ہیں؟''

''ہیں...... وہ کون بولا۔ کیا تہکال؟ اس نے فوراً مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ تہکال بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ ساحل عمر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ''یہ کاغان ہے؟''

''جی' یہ کاغان ہے۔'' فوراً جواب ملا لیکن یہ جواب تہکال نے نہیں دیا تھا۔ یہ جواب اس شخص نے دیا تھا جو تہکال کی انتہائی بائیں جانب دم کے نزدیک کھڑا تھا اور اسے دیکھنے کے لیے ساحل عمر کو اپنی گردن خاصی گھمانا پڑی اور جب اس شخص پر نظر پڑی تو وہ حیران ہو کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

''بازغر تم...... یہ تم ہو؟'' ساحل عمر نے کہا۔

''جی ساحل صاحب...... یہ میں ہوں۔ آپ کا خادم!'' بازغر کے لہجے میں بڑی فرمانبرداری تھی۔

''تم میرے کب سے خادم ہو گئے...... اور یہ سب کیا ہے؟''

"کچھ نہیں ہے...... یہ تہکال ہے۔ اس علاقے کا نام کاغان ہے۔ اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ آگے چلنا ہے۔ ابھی ہماری منزل نہیں آئی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ہماری منزل کہاں ہے؟"

"زیادہ دور نہیں ہے...... چند گھنٹوں کا سفر ہے...... آیئے چلیں۔ پہلے چل کر کچھ کھا پی لیں۔ پھر سفر اختیار کریں گے۔"

ان دونوں کے چلتے ہی تہکال بھی اٹھ کھڑا ہوا اور پھر وہ دریا میں اتر گیا۔ کچھ دیر تو وہ پانی میں نظر آیا پھر اچانک ہی غائب ہو گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ پانی میں غوطہ لگا گیا ہو۔

ساحل عمر نے اس منظر کو بڑی حیرت سے دیکھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟" بازغر نے ساحل عمر کو دریا کی جانب حیرت آمیز انداز میں دیکھتے ہوئے پایا تو پوچھا۔

"تہکال کو دیکھ رہا تھا۔" ساحل عمر نے جواب دیا۔ "دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔"

"اب تو آپ کو اس بات کا عادی ہو جانا چاہیے۔ وہ آپ کو کہاں سے کہاں لے آیا...... اور کتنے کم وقت میں اس بات کا اندازہ ہے آپ کو...... تہکال بہت زبردست چیز ہے۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔" بازغر نے دریا کی طرف دیکھتے ہوئے تہکال کی تعریف کی۔

"مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے۔ واقعی تہکال کوئی انوکھی شے ہے۔" ساحل عمر بولا۔

"آپ ننگے پاؤں ہیں...... یہ لیجیے میرے چپل پہن لیجیے۔" بازغر نے اپنے سینڈل اتارتے ہوئے کہا۔ "ابھی آپ کو پیدل چلنا پڑے گا۔ اوپر کاغان کے بازار میں پہنچ کر آپ کے لیے کچھ انتظام کرتا ہوں۔"

ساحل عمر کو یاد آیا کہ جب وہ قبر والے کمرے میں تھا' اس کے پاؤں میں جوتے نہ تھے۔ وہاں سے چترو بھیل اسے لے اڑا۔ چترو بھیل کے ساتھ اس نے جتنا سفر کیا' ننگے پاؤں ہی کیا' اب اسے پھر ننگے پاؤں چلنا تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ یہاں ننگے پیر چلنا آسان نہ تھا۔ اس لیے اس نے بازغر کے چپل پہن لینے میں ہی عافیت جانی۔ اگرچہ وہ سینڈل اس کے پاؤں میں تھوڑے سے بڑے تھے لیکن ننگے پاؤں چلنے سے کہیں بہتر تھا کہ بڑے سینڈل پہن لیے جائیں۔

بازغر نے کاغان کے ایک اچھے ہوٹل میں اسے ٹھہرایا اور کمرے میں پہنچا کر بولا۔ "آپ اتنی دیر میں نہا دھولیں' میں ذرا بازار گھوم کر آتا ہوں۔"

ساحل عمر جب نہا دھو کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ بیڈ پر شلوار قمیض کا ایک جوڑا رکھا ہے اور بیڈ کے ساتھ نئے سینڈل نما چپل رکھے ہیں۔ اس نے فوراً کپڑے تبدیل کر لیے اور بیڈ پر نیم دراز ہو کر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ ساحل عمر نے دروازے کی طرف منہ کر کے زور سے کہا۔ "آ جاؤ بھئی۔"

اس کا خیال تھا کہ ہوٹل کا کوئی بیرا ہوگا۔ کچھ کھانے پینے کا پوچھنے آیا ہوگا لیکن جب دروازہ

کھلا تو اسے سامنے بازغر نظر آیا جس کے ہاتھ میں لوازمات سے بھری ٹرے تھی۔

''ارے یہ آپ کیوں لائے؟ ہوٹل کے کسی بندے سے کہہ دیا ہوتا۔'' ساحل عمر اٹھتا ہوا بولا۔

''یہ سب چیزیں میں اپنی نگرانی میں تیار کروا کر لایا ہوں۔ آپ کو بھوک لگی ہوگی۔''

''ہاں، بھوک تو شدید لگی ہے۔'' ساحل عمر نے ناشتے کے سامان سے بھری ٹرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس تو پھر شروع ہو جائیے۔ میں جب تک جیپ کا انتظام کر کے آتا ہوں۔ آپ کچھ دیر آرام کریں گے یا فوراً ہی چلیں گے۔'' جاتے جاتے اس نے پوچھا۔

''ناشتہ کرنے کے بعد مجھے بس ایک گھنٹے کا ریسٹ دے دیں۔ پھر جہاں کہیں گے، چلوں گا۔ ویسے جانا کہاں ہے؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''آپ کبھی اس علاقے میں آئے ہیں؟'' بازغر نے سوال کیا۔

''نہیں، آج تک نہیں......ویسے سوات، گلگت، کشمیر اور مری وغیرہ میں نے دیکھ رکھے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''بس تو پھر اب اس علاقے کا حسن دیکھئے، میں آپ کو جھیل سیف الملوک تک لے چلوں گا۔''

''وہ جھیل سیف الملوک جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اتنی حسین ہے کہ وہاں پریاں اترتی ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہے؟'' ساحل عمر نے بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کیا آپ پریوں پر یقین رکھتے ہیں؟'' وہ جاتے جاتے ٹھہر گیا اور ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''میں نے آج تک کوئی پری نہیں دیکھی۔'' ساحل عمر نے ہنس کر جواب دیا۔ ''پھر یقین کیونکر آئے۔''

''کیا آپ نے کوئی جن دیکھا ہے؟'' بازغر نے سوال کیا۔

''نہیں، میں نے کوئی جن بھی نہیں دیکھا۔'' وہ بولا۔

''کیا آپ ان کے وجود کے قائل ہیں؟'' بازغر نے پوچھا۔

''ہاں، بالکل...... جنات کا ذکر اللہ کی آخری کتاب میں موجود ہے۔''

''گویا آپ کا ان چیزوں پر بھی یقین ہے جو آپ نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھیں؟''

''جی بالکل...... میں اپنے خالق پر یقین کامل رکھتا ہوں۔ حالانکہ میں نے اسے نہیں دیکھا۔''

''اللہ کی بات کر رہے ہیں؟'' بازغر نے وضاحت چاہی۔

''جی ہاں، اسی عظیم ہستی کی بات کر رہا ہوں جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں ...... میرے اور آپ کے اللہ نے بس یہ دنیا ہی بنائی ہے؟'' بازغر نے ایک نیا سوال اٹھایا۔

''نہیں...... ہماری دنیا کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے اس کائنات میں...... چاند' سورج' ستارے' سیارے۔ یہ ایک ہمارا نظام شمسی ہے۔ جانے ایسے کتنے نظام شمسی ہوں گے۔ ہمارے سائنسدان تحقیق میں لگے ہیں۔ مریخ پر انہوں نے زندگی کے آثار تلاش بھی کر لیے ہیں۔'' ساحل عمر نے بات آگے بڑھائی۔

''آپ کا کیا خیال ہے۔ ہمیں اور آپ کو تخلیق کرنے والے نے یہ چاند' یہ سورج' یہ ستارے' یہ سیارے بس یونہی بنا کر چھوڑ دیئے...... بے مقصد...... میں سمجھتا ہوں کہ جب اللہ کوئی چیز بناتا ہے تو ساتھ ہی اس چیز کو دیکھنے والا بھی بناتا ہے۔ یہ حسین دنیا اس نے تخلیق کی تو ساتھ ہی اس دنیا کو دیکھنے والے بھی بنائے۔ چاہے یہ انسان کی صورت میں ہوں یا جنات کی صورت میں یا کسی اور مخلوق کی صورت میں ہوں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنا اظہار چاہتا ہے۔ اپنے وجود کا اقرار چاہتا ہے۔ اپنی وحدت کو تسلیم کروانا چاہتا ہے۔ یہ دنیا ہوتی لیکن دنیا والے نہ ہوتے تو پھر دنیا میں بکھرے ہوئے حسن کو کون دیکھتا...... اور جب کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا تو تخلیق والے کو کون پہچانتا۔ میں اصل میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اللہ نے دنیا کے علاوہ جو کچھ پیدا کیا ہے' وہاں ان کو دیکھنے والے بھی پیدا کیے ہوں گے۔ ممکن ہے کسی سیارے پر شیشے کے انسان بستے ہوں۔ ہوسکتا ہے کسی اور سیارے پر اسٹیل کے انسان پیدا کیے گئے ہوں۔ ممکن ہے سورج پر بھی کوئی مخلوق آباد ہو۔ آپ دور کیوں جائیں' اپنی دنیا کو ہی لے لیں۔ ممکن ہے اس دنیا میں انسان اور جنات کے علاوہ بھی جانے کتنی مخلوق آباد ہو۔ انسان کی نظر محدود ہے۔ ممکن ہے وہ دوسری مخلوق کو دیکھ نہ پاتا ہو۔ ممکن ہے پریوں کا بھی وجود ہو۔ ہمیں سوچنا چاہیے' تفکر کرنا چاہیے۔ جب آدمی سوچتا ہے' تفکر کرتا ہے تو چیزیں وجود میں آنے لگتی ہیں۔ ایجادات ہونے لگتی ہیں۔ ہم جو کچھ ایجاد کرتے ہیں' اس کا وجود پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ وہ ''موجود'' تفکر کے ذریعے ہمارے خیال کی گرفت میں آجاتا ہے۔ اس کائنات میں جتنی بھی مخلوق ہے' اس کے دماغ ایک دوسرے سے خیال کی لہروں کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ انسان نے جو کمپیوٹر ایجاد کیا ہے اور ان کمپیوٹروں کو دنیا میں پھیلے ہوئے کمپیوٹروں کو انٹرنیٹ کے ذریعے جو جوڑا ہے تو یہ خیال کہاں سے آیا؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ جس طرح کمپیوٹر کو ایک عام آدمی نہیں چلا سکتا' ایسے ہی کائنات میں پھیلی دوسری مخلوق سے ہر شخص رابطہ نہیں کر سکتا۔ یہ رابطہ ایک تربیت یافتہ ذہن ہی کر سکتا ہے۔ یہ دماغ کسی خاص انسان کا ہی ہوسکتا ہے۔ ایسا انسان جسے اللہ کا قرب حاصل ہو۔'' یہ کہہ کر بازغر خاموش ہوگیا۔

کچھ دیر کمرے میں گہری خاموشی چھائی رہی۔ ساحل عمر بازغر کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بازغر کو ایک عام سا آدمی سمجھ رہا تھا لیکن اس نے ابھی جو کچھ کہا تھا' وہ ایک عام آدمی کی سمجھ میں آنے والی باتیں نہ تھیں۔

''آپ کون ہیں؟'' ساحل عمر نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

''میں...... اللہ کی مخلوق ہوں۔'' بازغر نے غیر واضح جواب دیا۔

''انسان ہیں؟'' ساحل عمر نے وضاحت چاہی۔

''انسان ہونا کتنا مشکل ہے۔ کاش میں انسان بن سکتا۔'' بازغر نے بڑی ذہانت سے جواب

دیا۔ اس جواب سے کسی قسم کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔
ساحل عمر نے اسے مسکرا کر دیکھا' بولا کچھ نہیں۔ وہ بھلا اس سے اب اور کیا پوچھتا۔
تب بازغر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''اچھا' میں چلتا ہوں۔ آپ کو خوامخواہ باتوں میں الجھا لیا۔ آپ اطمینان سے ناشتہ کیجیے۔''
یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا' اس نے ساحل عمر کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا۔
ناشتہ کرنے کے بعد ساحل عمر پر نیند کا سا غلبہ ہونے لگا۔ وہ بیڈ پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔
لیٹے لیٹے اس کا دھیان برکھا کی طرف چلا گیا۔ برکھا اپنی ساحرانہ صلاحیتوں میں اضافہ کے لیے اسے قربان کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی جان کے درپے تھی۔ ساحل اس کے سحر میں مبتلا ہو کر اس کے بنگلے پر پہنچ گیا تھا۔ برکھا نے اسے چترو بھیل کے استھان پر پہنچا دیا۔ چترو بھیل صحرا کا ایک بڑا ساحر تھا۔ اس کی موت واقع ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ چترو بھیل کی روح کاویری سے اپنی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس نے ساحل عمر کو برکھا سے چھین لیا۔ وہ اسے لے اڑا۔ ابھی وہ چترو بھیل کے چنگل میں پھنسا اس کے انتقام کا ذریعہ بننے والا تھا کہ تہکال اسے وہاں سے نکال لایا۔ فضا اور مقام بدل گیا' لوگ بدل گئے۔ اب وہ ایک پہاڑی مقام پر بازغر کی تحویل میں تھا۔
ساحل عمر سوچ رہا تھا کہ شاید وہ کوئی سونے کی چڑیا ہے جسے ہر شخص حاصل کرنے کے چکر میں ہے۔ برکھا اور چترو بھیل کا معاملہ تو اس کی سمجھ میں آ گیا کہ ایک اپنی ساحرانہ قوتیں بڑھانے اور ایک اپنے انتقام کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ اب یہ بازغر کس پھیر میں ہے اور وہ اسے جھیل سیف الملوک کیوں لے جانا چاہتا تھا' یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ابھی تک اس کے رویئے سے یہ تاثر نہیں ملا تھا کہ وہ اس کی قید میں ہے۔ وہ اس کے ساتھ نہایت پروقار طریقے سے پیش آ رہا تھا۔ اسے انتہائی اہم شخص سمجھ رہا تھا۔ ساحل کے ساتھ اس کا برتاؤ ایک غیر معمولی شخص جیسا تھا۔
حالات کا تجزیہ کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ نیند میں ڈوب گیا۔
دروازے پر دستک کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ دو گھنٹے سے زائد سو چکا ہے۔ وہ فوراً اٹھ کر دروازے پر پہنچا۔ اس نے دروازہ کھولا تو بازغر کھڑا مسکرا رہا تھا۔
''آپ کو میں نے نیند سے تو نہیں اٹھا دیا۔ آپ نے مجھ سے ایک گھنٹہ آرام کی بات کی تھی' میں تو ڈھائی گھنٹے کے بعد واپس آیا ہوں۔ میں جیپ لے آیا ہوں۔ جیپ ہوٹل کے باہر کھڑی ہے۔ آپ منہ ہاتھ دھو کر باہر آ جائیے۔ تب تک میں ہوٹل والوں کا حساب چکاتا ہوں۔'' اور پھر وہ دروازے سے ہی واپس چلا گیا۔
ساحل عمر نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ اس کی ساری تھکن دور ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں اس کا کوئی سامان نہ تھا۔ بس وہ کپڑے تھے جو اس نے اتارے تھے۔ اس نے ان کپڑوں کو باتھ روم میں ہی چھوڑ دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔
جب وہ ہوٹل کے دروازے سے باہر نکلا تو بازغر کو اپنا منتظر پایا۔ بازغر نے جیپ کا اگلا

دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود وہ پیچھے چلا گیا۔ جیپ کا ڈرائیور ایک نوجوان تھا اور اپنے چہرے مہرے سے کشمیری دکھائی دیتا تھا۔

''چلو بھائی!'' بازغر نے پیچھے سے گرین سگنل دیا۔ جیپ چل پڑی۔

کاغان سے ناران تک سفر ایک کچی سڑک پر طے ہوا۔ درمیان میں متعدد بار گلیشیر آئے۔ جیپ ہچکولے کھاتی ان گلیشیروں کے اوپر سے گزری۔ بالاخر ناران آگیا۔

ناران کے سب سے اچھے ہوٹل میں بازغر نے ساحل عمر کو ٹھہرایا۔ کھانا کھانے تک بازغر ساحل عمر کے ساتھ رہا۔ پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ اب وہ کل صبح اس کے پاس آئے گا۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ جھیل سیف الملوک کا سفر اختیار کریں گے۔

ساحل عمر اسے ہوٹل کے گیٹ تک چھوڑنے آیا۔ اس کے جانے کے بعد ساحل عمر نے اطراف کا جائزہ لیا۔ یہ ہوٹل بہت خوبصورت جگہ واقع تھا۔ ساحل عمر یونہی ٹہلتا ہوا ہوٹل کی حدود سے باہر نکل آیا۔

پھر وہ تختوں والا چھوٹا سا پل کراس کر کے ناران کے بازار میں آگیا۔ ایک لمبا اور دور تک پھیلا ہوا بازار تھا۔ اس نے بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگایا اور پھر اپنے ہوٹل واپس آگیا۔

ہوٹل کے دروازے سے ایک فیملی باہر نکل رہی تھی۔ دو تین لڑکیوں کے ساتھ ایک بزرگ خاتون تھیں۔ ان خاتون میں ''اماں'' کی بڑی شباہت تھی۔ انہیں دیکھ کر اسے اپنی اماں یاد آگئیں۔ اسے گھر سے نکلے کئی دن ہو گئے تھے۔ وہ گھر سے نکلا بھی کس قدر عجلت میں تھا۔ اس نے اماں سے بھی بات نہ کی۔ بس گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے نکل آیا۔ اس کے آنے کے بعد جانے اماں کا کیا حال ہوا ہو۔ انہیں اس کی اس حرکت پر کس قدر صدمہ ہوا ہوگا۔ ناصر مرزا اور مسعود آفاقی الگ پریشان ہوں گے۔ اسے چاہیے کہ وہ یہاں سے اماں کو ٹرنک کال کرے۔ انہیں فون پر بتا دے کہ وہ کہاں ہے۔

یہ سوچ کر اس نے ہوٹل کے ٹیلی فون آپریٹر کو اپنے گھر کا نمبر دیا اور ارجنٹ کال ملانے کی ہدایت کی۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ کوئی دس پندرہ منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ ''سر کراچی بات کیجیے۔''

''اچھا!'' ساحل عمر نے بے قراری سے کہا۔ ''ہیلو!''

''آپ کون؟'' ادھر سے مرجینا کی آواز سنائی دی۔

''مرجینا' میں ساحل بول رہا ہوں...... اماں کو بلاؤ۔'' ساحل نے اس کی آواز پہچان کر کہا۔

''ارے صاحب جی آپ...... اوہ...... اماں جی' جلدی آئیں۔'' مرجنیا اس کا نام سن کر خوشی سے دیوانی ہوگئی۔ وہ زور سے چیخی۔ ''صاحب جی کا فون ہے۔''

اماں اپنے کمرے میں عصر کی نماز پڑھ کر مصلے پر بیٹھی ساحل عمر کے لیے دعا مانگ رہی تھیں کہ مرجینا کی بے تابانہ آواز کان میں پڑی۔ وہ مصلہ سمیٹ کر فوراً اٹھ کر بھاگیں۔ ''میرے اللہ نے میری سن لی۔ میرے ساحل کا فون آگیا۔''

''صاحب جی' اماں جی آ گئیں۔ بات کریں۔'' مرجینا نے یہ کہہ کر ریسیور اماں کے ہاتھ میں دے دیا اور وہیں کھڑے ہو کر اماں کی گفتگو سننے لگی۔

''میرے ساحل' میری جان تم کہاں ہو؟'' اماں بے قراری سے بولیں۔

''اماں' اس وقت میں ناران میں ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ آپ کو بتائے بغیر گھر سے نکل آیا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں جلد ہی کراچی واپس آ جاؤں گا۔'' ساحل عمر نے جلدی جلدی اپنے بارے میں بتا کر اماں کو تسلی دی۔

''شکر ہے اللہ کا کہ تمہارا فون آ گیا۔ تم جہاں ہو' خیریت سے ہو۔ بس اتنا جاننا میرے لیے کافی ہے۔ ناصر اور مسعود بھی تمہارے لیے پریشان تھے۔ اب میں فون کر کے انہیں تمہاری خیریت بتائے دیتی ہوں۔ تمہارے یہ دونوں دوست بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف میرا خیال رکھا بلکہ تمہارے لیے تو یہ بھائیوں کی طرح پریشان تھے۔'' اماں نے کہا۔

''صاحب جی! اماں جی نے خود اپنا رو رو کر برا حال کیا ہوا ہے۔'' مرجینا نے ریسیور کے قریب اپنا منہ کر کے کہا۔

''اماں! یہ مرجینا...... کیا کہہ رہی ہے۔ آپ اپنا خیال رکھیں۔ بس اب بالکل رونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کل جھیل سیف الملوک جاؤں گا۔ یہاں بازغر میرے ساتھ ہے۔ اماں آپ کو وہ شخص یاد ہے ناں جو ایک چیتے کی تصویر بنوانے آیا تھا؟'' ساحل عمر نے اماں کو یاد دلایا۔

''ہاں' اسے میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ تمہاری غیر موجودگی میں یہاں آیا تھا۔ کیا تم نے اسے بھیجا تھا۔'' اماں کو فوراً بازغر کا گھر میں آنا یاد آ گیا۔

''نہیں اماں...... میں نے تو اسے نہیں بھیجا۔ وہ کیا کہنے آیا تھا۔'' ساحل عمر نے سوال کیا۔

''اے بھیا...... اس نے کہا وہا تو کچھ نہیں...... اس وقت گھر میں ناصر اور مسعود دونوں موجود تھے۔ وہ ہم تینوں کو گھر میں چھوڑ کر گھر میں گھستا چلا گیا۔ جب ہم لوگ اس کے پیچھے گھر میں آئے تو وہ ہمیں کہیں نہیں ملا۔ جانے وہ کدھر سے نکل گیا اور ساتھ میں تصویر بھی لے گیا۔''

''تصویر!'' ساحل عمر نے حیرت سے پوچھا۔ ''اماں! کون سی تصویر؟ کہیں وہ رشا ملوک کی تصویر' میرا مطلب ہے وہ دلہن والی تصویر تو نہیں لے گیا جو میرے بیڈ روم میں لگی تھی۔'' ساحل عمر نے پریشان ہو کر کہا۔

''ہاں' ساحل وہی تصویر...... وہ لے اڑا۔'' اماں نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''بھیا' مجھے تو وہ کوئی جن ون لگتا ہے۔ گھر میں گھستے تو سب نے دیکھا' تصویر لے کر گھر سے نکلتے کسی نے نہ دیکھا۔ وہ کوئی جادوگر ہے کہ سب کو اندھا کر کے نکل گیا۔ اب تم بتا رہے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ ہے تو کیا اس نے یہاں آنے اور تصویر اپنے ساتھ لے جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''نہیں اماں! اب وہ صبح آئے گا تو اس سے بات کروں گا۔'' ساحل عمر نے فکرمند ہو کر کہا۔

''اچھا اماں! اب آپ پریشان مت ہونا' میں بہت جلد آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ!''

''اللہ تمہیں حفظ و امان میں رکھے...... خدا حافظ!''

ساحل عمر ریسیور رکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ بازغر اس کے گھر جا کر رشا ملوک کی تصویر کیوں لے آیا؟ اسے یاد آیا کہ وہ رشا ملوک کی تصویر خریدنا چاہتا تھا۔ ساحل عمر کو یہ بھی یاد آیا کہ وہ اس تصویر کے ایک کروڑ سے زائد دینے کو تیار تھا۔ بالاخر وہ اس تصویر کو گھر میں موجود لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اڑا لایا اور اس نے ساحل عمر کو اس سلسلے میں کچھ بتایا بھی نہیں۔ بازغر کے بارے میں وہ پہلے ہی مشکوک تھا۔ اسی لیے اس نے اس سے پوچھا تھا کہ آپ کون ہیں؟ اور وہ اس بات کا جواب غیر واضح انداز میں دے کر اپنا پہلو بچا گیا تھا۔ اب اماں نے جس طرح اس کے گھر میں داخل ہونے کی تصویر کشی کی ہے۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انسان نہیں ہے' کوئی اور مخلوق ہے یا پھر کوئی بڑا ساحر ہے اور آج اس نے جس انداز کی باتیں کیں' اس سے اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف ایک ذہین شخص ہے بلکہ جدید معلومات بھی رکھتا ہے۔

وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔ اسے جھیل سیف الملوک کیوں لے جانا چاہتا ہے۔ رشا ملوک کی تصویر اس نے کیوں اڑائی۔ وہ اسے اس قدر اہمیت کیوں دے رہا ہے؟ اس کا میزبان کیوں بنا ہوا ہے؟ ان ساری باتوں کے پیچھے کیا سازش چھپی ہوئی ہے؟ برکھا اور چترو بھیل کی طرح کیا یہ بھی کوئی مذموم مقاصد رکھتا ہے۔

وہ بازغر کے بارے میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

ساحل عمر کی آنکھ کسی آواز پر کھلی تھی۔ آنکھ کھلنے پر احساس ہوا کہ کوئی دروازے پر بڑے مہذبانہ انداز میں دستک دے رہا ہے۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس سے اس نے اندازہ لگایا کہ صبح ہو چکی ہے۔ پھر اس نے تکیے کے نیچے سے اپنی رسٹ واچ نکال کر ٹائم دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔

وہ جلدی سے اٹھا۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ہنستا مسکراتا بازغر نظر آیا۔ وہ شلوار قمیض پر کڑھی ہوئی کوٹی پہنے ہوئے تھا۔ سر پر گول ٹوپی تھی اور اس ٹوپی کے سامنے ایک چھوٹا سا رنگ برنگا پر لگا ہوا تھا۔ وہ اس وقت خاصا ترو تازہ نظر آ رہا تھا۔

''آپ ابھی تک سو رہے ہیں؟'' اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''رات کو ذرا دیر سے نیند آئی۔'' ساحل عمر نے اس کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے دماغ میں کل شام اماں سے ہونے والی گفتگو گونجنے لگی۔ یہ شخص کس قدر معصوم بنا ہوا ہے۔ اس کے گھر جا کر اس کی غیر موجودگی میں پینٹنگ چرا لایا اور اس بات کا ذکر ابھی تک نہیں کیا۔

ساحل عمر کو بڑا غصہ تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس پینٹنگ کے بارے میں سوال کرے۔ پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ ابھی کچھ دیر انتظار کرنا چاہیے' ہو سکتا ہے وہ خود ہی ذکر کر دے۔

''کیوں کیا سوچتے رہے؟'' بازغر نے پوچھا۔

''بازغر صاحب! میں آپ کے بارے میں سوچتا رہا۔'' وہ واش روم جاتے جاتے رک گیا۔ اس نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"میرے بارے میں سوچتے رہے۔ میں بھی کوئی سوچنے کی چیز ہوں۔" اس کے لہجے میں بڑی انکساری تھی۔

"کیوں نہیں..... کل آپ نے بہت اچھی باتیں کیں، میں آپ کی باتوں سے خاصا متاثر ہوا۔"

"آپ کیوں مجھے بنا رہے ہیں۔"

"میں بنا رہا ہوں یا آپ مجھے بنا رہے ہیں؟" یہ بات اس نے کہنا چاہی لیکن ضبط کر گیا۔

"میں ذرا منہ ہاتھ دھولوں۔ آپ اتنی دیر میں اپنی پسند کا ناشتہ منگوا لیجیے۔ آپ نے ابھی تک ناشتہ تو نہیں کیا ہوگا؟"

"میں تمام کاموں سے فارغ ہو کر آ رہا ہوں۔" وہ خوشدلی سے بولا۔

"رات کو آپ کہاں رہے؟" ساحل عمر نے سوال کیا۔

"ارے ساحل عمر صاحب! ہم غلاموں کا کیا ہے۔ جہاں جگہ ملی، سو گئے۔" بازغر نے گول مول سا جواب دیا۔ پھر فوراً ہی بولا۔ "آپ جلدی سے منہ ہاتھ دھو لیجیے، میں ناشتہ منگوا رہا ہوں۔ ذرا جلدی نکلنا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر ساحل عمر واش روم میں گھس گیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر بازغر نے کہا۔ "آیئے اب چلیں..... جیپ والا ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔"

ساحل عمر فوراً کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں کاؤنٹر پر آئے۔ بازغر نے کمرے کی چابی واپس کی۔ ہوٹل کا حساب کتاب کیا اور ساحل عمر کی طرف مسکرا کر دیکھا اور آنکھ سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

بازغر نے ہوٹل کا حساب کر دیا تھا۔ چابی بھی واپس دے دی تھی۔ اس سے ساحل عمر نے اندازہ لگایا کہ اب ادھر لوٹ کر نہیں آنا یا اگر آنا ہے تو اس ہوٹل میں واپس نہیں آنا۔ ساحل عمر کو یہ بات معلوم تھی کہ جھیل سیف الملوک پر کوئی ہوٹل نہیں۔ لوگ وہاں صبح جاتے ہیں اور شام تک ناران واپس آ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ بازغر کا واپسی پر ناران رکنے کا ارادہ نہ ہو۔ وہ سیدھا کاغان نکل جانا چاہتا ہو۔ اس نے اس مسئلے پر بازغر سے کوئی بات نہ کی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

پھر وہ جیپ میں بیٹھ کر جھیل سیف الملوک کی طرف چل دیئے۔

ان کی جیپ کچے اور پتھریلے راستے پر چل رہی تھی۔ یہ ایک خطرناک راستہ تھا۔ کبھی اونچائی، کبھی ڈھلان، جیپ موڑ کاٹتی تو سینے میں دم اٹکتا۔ یوں محسوس ہوتا کہ جیپ اب کھائی میں گری، تب گری۔ جیپ کا ڈرائیور ایک ماہر شخص تھا۔ وہ بڑی مشاقی سے جیپ چلا رہا تھا۔ پھر بھی دل لرز رہا تھا۔

جیپ میں خاموشی چھائی تھی۔

خدا خدا کر کے یہ سفر ختم ہوا۔ گلیشیر آ گیا تھا۔ اس ایک فرلانگ لمبے گلیشیر کو پیدل طے کرنا تھا۔ یوں گلیشیر کے اس پار پہنچانے کے لیے گھوڑے بھی یہاں موجود تھے لیکن ساحل عمر نے پیدل چلنے کو ترجیح دی۔ یہ ایک خطرناک برفانی راستہ تھا۔ سیمنٹ کی طرح جمی ہوئی برف۔ اس پر اس طرح سنبھل

سنبھل کر چلنا کہ پاؤں نہ پھسلے۔ ایک طرف برف کی دیوار' دوسری طرف کھائی اور مشکل سے ایک ڈیڑھ فٹ چوڑا راستہ۔

شروع میں ساحل عمر کو تھوڑی سی دقت ہوئی لیکن پھر اسے اس گلیشیئر کو پار کرنے میں مزہ آنے لگا۔ ابھی صبح کا وقت تھا' اس لیے لوگوں کا زیادہ رش نہیں تھا۔ پھر بھی کئی فیملیاں ان کے آگے پیچھے تھیں اور جھیل سیف الملوک جانے والوں میں عورتیں بھی تھیں' بچے بھی تھے' جوان بھی تھے۔ سبھی اپنی اپنی ہمت اور جرات کا مظاہرہ کرتے گلیشیئر پار کر رہے تھے۔

برف کا تنگ اور پھسلواں راستہ طے کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر جیپ کا سفر شروع ہوا۔ اچانک تیز اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ بادل گھر آئے اور بارش کے آثار پیدا ہو گئے۔ ساحل عمر کو ہلکی سی سردی لگنے لگی۔

بازغر نے اپنے کندھے سے اتار کر ایک گرم چادر اس کے کندھے پر ڈال دی۔ ساحل عمر نے شکریہ کہہ کر اس چادر کو کھول کر اوڑھ لیا۔ پھر وہ ایک جیپ میں سوار ہو گئے' ابھی اور بلندی پر جانا تھا۔

یہ سب سے خطرناک راستہ تھا۔ بے حد تنگ' پتھریلا اور جان لیوا۔ یہاں چلنے والی جیپیں بھی خاص تھیں۔ طاقتور انجنوں والی' ان کو چلانے والے بھی انتہائی ماہر ڈرائیور تھے۔ موت کے کنویں میں شاید جیپ چلانا آسان ہو لیکن ان راستوں پر جہاں ہر فٹ کے فاصلے پر موت کا جال بچھا ہوا تھا' جیپ چلانا آسان نہ تھا۔ ایک تو راستہ اتنا خطرناک اوپر سے بارش شروع ہو گئی۔ ایک قیامت پر دوسری قیامت۔ ساحل عمر دم سادھے بیٹھا تھا۔ ہر موڑ پر' ہر چڑھائی پر' ہر ڈھلان پر اللہ یاد آتا تھا اور موت سامنے کھڑی دکھائی دیتی تھی۔

ساحل عمر کیونکہ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس لیے راستے کی ہولناکی پوری طرح اس کی نظر میں تھی۔ جب بارش اور تیز ہو گئی تو اس نے پیچھے مڑ کر بازغر سے کہا۔ ”بارش رکنے کا انتظار نہ کریں۔ راستوں پر پھسلن ہو گئی ہو گی۔“

اس سے پہلے کہ بازغر کچھ بولتا' برابر بیٹھا ہوا ڈرائیور بولا۔

”صاحب ڈرو مت' یہ بارش ابھی رک جائے گی۔ راستوں پر پتھر پڑے ہیں۔ اس لیے راستوں پر پھسلن نہیں ہوتی۔ آپ آرام سے بیٹھے رہیں۔ یہ ہمارا روز کا کام ہے' آپ بے فکر ہو جائیں۔“

ڈرائیور کے بیان سے ساحل عمر کو تسلی نہ ہوئی۔ اس نے بازغر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ تب بازغر بولا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں' کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”اچھا!“ یہ کہہ کر ساحل عمر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی تھوڑی سی تسلی ہو گئی۔ بارش کی وجہ سے جیپ کے پھسلنے کا جو خوف اس کے دل میں پیدا ہوا تھا' وہ ڈرائیور کی وضاحت اور بازغر کی تائید کے ساتھ کم ہو گیا لیکن راستے کی خطرناکی اپنی جگہ موجود تھی۔

خدا خدا کر کے یہ سفر ختم ہوا' آگے راستہ بند تھا۔ جیپ اس سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ بارش

رک چکی تھی۔ اب جھیل سیف الملوک تک جانے کے لیے پیدل سفر کرنا تھا۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے جن پر برف جمی ہوئی تھی۔ ہر طرف سحرانگیز مناظر تھے۔ اللہ نے یہ حسن کہاں لاکر بکھیرا تھا۔

وہ دونوں خاموشی سے کبھی ایک ساتھ اور کبھی آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔

پھر اچانک وہ لمحہ آیا۔ لمحہ حیرت' سانس جہاں ہو' وہیں رک جائے۔

ایک موڑ مڑتے ہی جیسے ہی سامنے نگاہ اٹھی تو آنکھیں پلک جھپکنا بھول گئیں۔ سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ روح پر ایک دم سرشاری سی چھا گئی۔ سبحان تیری قدرت۔

سامنے جھیل سیف الملوک تھی۔

ساحل عمر آرٹسٹ تھا۔ نازک دل اور حساس دماغ رکھنے والا۔ وہ تو اس منظر کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہر چیز ایک لمحے کو ساکت ہو گئی ہو۔ اس نظارے کے علاوہ ہر نظارہ مٹ گیا ہو۔ اس جھیل کے حسن کے بارے میں اس نے جو کچھ سنا تھا' اس سے بڑھ کر پایا تھا۔

یہ جھیل تخلیق کرنے والے کی نادر پینٹنگ تھی۔ ایک ایسی پینٹنگ جسے دیکھ کر قدم چلنا بھول جائیں۔ آنکھیں پلکیں جھپکانا بھول جائیں' دل دھڑکنا بھول جائے اور روح کو سانس لینا یاد نہ رہے۔

اے اللہ تیرا کوئی جواب نہیں۔ تو نے کہاں لا کر یہ پینٹنگ نصب کی اور پھر اسے نمائش کے لیے انسانوں کے لیے کھولا۔ وہ پہلا شخص کون ہوگا جس نے جھیل سیف الملوک کو دریافت کیا۔ پھر پہاڑوں کا سینہ چھلنی کر کے ان پر راستوں کا جال بچھایا گیا۔ یہ راستے اگرچہ بے حد خطرناک اور جان لیوا ہیں لیکن اس جھیل کی کشش انسانوں کو اپنی طرف کھینچ لیے جاتی ہے۔ بازغہ نے ٹھیک ہی کہا تھا' جب اللہ کوئی چیز تخلیق کرتا ہے تو اس کی نمائش کا انتظام بھی کرتا ہے۔ وہ خود کو چھپا کر نہیں رکھنا چاہتا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا مظہر بن جاتا ہے۔ وہ ہر طرف دکھائی دینے لگتا ہے۔ بس ذرا سی توجہ چاہیے' دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔

جھیل سیف الملوک جہاں سے اچانک دکھائی دیتی ہے اور بندے پر سحر طاری کر دیتی ہے' وہ مقام اونچائی پر ہے جبکہ جھیل سیف الملوک گہرائی میں ہے اور اس مقام سے ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ تھوڑا سا آگے بڑھ کر یہاں چند دکانیں اور ایک چھوٹا سا ریستوران ہے۔ اس کے بعد ڈھلان شروع ہو جاتی ہے۔ جھیل پر کسی قسم کا کوئی ہوٹل وغیرہ نہیں۔

جھیل سیف الملوک برف پوش پہاڑوں میں گھری ہے۔ ان پہاڑوں کے دامن میں یہ پیالہ نما جھیل ہے۔ یہ ہے وہ جھیل جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں پریاں اترتی ہیں۔ ساحل عمر نے سوچا کہ اگر یہ بات مشہور ہے تو اس میں ضرور صداقت ہوگی کیونکہ پریوں کو اترنے کے لیے اس سے کم حسین جگہ نہیں چاہیے۔ اگرچہ ساحل نے پریاں نہیں دیکھی تھیں لیکن بچپن میں جو کہانیاں سنی تھیں' ان سے یہ تصور ہی ابھرتا تھا کہ پریاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ ہر خوبصورت چیز کے لیے خوبصورت جگہ ہی درکار ہوتی ہے۔

ساحل عمر نے جھیل کے کنارے کنارے دور تک چکر لگایا۔ پھر وہ برف پوش پہاڑ پر چڑھا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ جھیل پر اب خاصے لوگ آ چکے تھے۔ بازغر اور ساحل عمر نے اوپر آ کر کھانا کھایا' چائے پی۔ کچھ دیر بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ پھر وہ دونوں جھیل پر آ گئے۔

ساحل عمر جھیل کے نظاروں میں محو تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کے پاس کاغذ اور پینسل ہوتی تو وہ مختلف منظروں کو اسکیچ کر لیتا۔ اس کے پاس تو کیمرہ بھی نہیں تھا۔ اگر کیمرہ بھی ہوتا تو وہ ان منظروں کی عکسبندی کرنے کے بعد انہیں دیکھ کر پینٹنگ بنا لیتا۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ اچانک اس نے محسوس کیا کہ بازغر اس کے آس پاس نہیں ہے۔ اس نے جلدی جلدی آس پاس نظریں دوڑائیں۔ لوگوں کے ہجوم میں اسے دیکھا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ پھر اس کی نظر سامنے اونچائی پر پڑی۔ وہ اونچائی پر برف پر چلتا ہوا دکھائی دیا۔ پھر وہ پہاڑ کے پیچھے گم ہو گیا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ پہاڑ کے پیچھے اتنی آسانی سے کیسے چلا گیا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ اتنے میں ایک چھوٹی سی بچی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے ہلایا اور بولی۔ "انکل' انکل۔"

وہ پانچ سال کی پیاری سی بچی تھی۔ ساحل عمر نے سوچا کہ اس بچی نے کسی غلط فہمی میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"انکل...... انکل!" اس نے پھر کہا۔

"جی!" ساحل عمر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ کو ہماری باجی بلا رہی ہیں۔"

"کہاں ہیں آپ کی باجی؟"

"وہ سامنے۔" لڑکی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ساحل عمر نے نظر اٹھائی تو قریب ہی ایک فیملی موجود تھی۔ ان میں تین چار لڑکیاں آگے کھڑی تھیں۔ ان چاروں لڑکیوں میں ایک لڑکی سب سے آگے تھی۔ وہ حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ساحل عمر اس لڑکی کو یا ان لڑکیوں میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ بچی ہاتھ پکڑ کر اسے آگے کی طرف کھینچنے لگی تو وہ اس کے ساتھ چلا۔

کچھ یہ آگے بڑھا' کچھ وہ لڑکیاں اس کی طرف بڑھیں۔ قریب ہونے پر وہ لڑکی بولی۔ "معاف کیجئے گا...... میں یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ کیا آپ ساحل عمر ہیں؟"

"جی! میں ساحل عمر ہوں لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا۔" ساحل عمر حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"ایک رسالے میں پینٹنگ کے ساتھ آپ کی تصویر چھپی تھی۔ اس تصویر سے آپ کو پہچانا۔ میں نے اپنی بہنوں کو بتایا تو یہ لوگ شک و شبہ میں پڑ گئیں۔ انہیں یقین نہیں آیا لیکن مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور ساحل عمر ہیں۔ اس لیے میں نے گڑیا کو آپ کے پاس بھیجا۔ آئیے میں آپ کو اپنے ڈیڈی

اور بڑے بھائی سے ملاؤں۔" یہ کہہ کر اس نے پیچھے دیکھا۔
ساحل عمر نے دس بارہ قدم کے فاصلے پر دو مردوں کو کھڑے ہوئے پایا۔ وہ ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔
"میرا نام شگفتہ ہے۔" پھر اس نے اپنی بہنوں کے نام بتائے اور آگے بڑھی۔
"آپ کے ساتھ کون ہے؟" شگفتہ نے آگے چلتے ہوئے سوال کیا۔
"میرے ساتھ میرے ایک دوست ہیں۔ وہ ابھی اس پہاڑ کے پیچھے گئے ہیں۔"
"کس پہاڑ کے پیچھے؟"
"وہ سامنے۔" ساحل نے ادھر اشارہ کیا۔
"لیکن وہاں وہ کیا کرنے گئے ہیں اور وہاں تک چلے کیسے گئے۔ کسی بندے کا وہاں جانا آسان نہیں۔" وہ لڑکی حیرت زدہ رہ گئی۔
"تو وہ بندہ ہے کب...... وہ تو جن ہے جن۔" ساحل عمر نے ہنس کر کہا اور اس طرح بات ہنسی مذاق میں اڑ گئی۔
شگفتہ نے اپنے ڈیڈی کے نزدیک پہنچ کر ساحل عمر کا تعارف کرایا۔ شگفتہ کے ڈیڈی اور بڑے بھائی ساحل عمر سے اچھی طرح ملے۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی جو ساحل عمر نے فوراً قبول کر لی۔
شگفتہ فائن آرٹس کی طالبہ تھی۔ وہ کراچی کے ایک اسکول سے فائن آرٹس میں ڈپلومہ کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک بولڈ اور بولنے والی لڑکی تھی۔ اس لیے زیادہ وہی اس سے سوال جواب کرتی رہی۔
ساحل عمر ان لوگوں کے ساتھ دری پر بیٹھ گیا اور گپ شپ میں مشغول ہو گیا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے دائیں بائیں اور سامنے نظریں اٹھا کر دیکھ لیتا تھا لیکن بازغر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پتہ نہیں وہ کہاں چلا گیا تھا اور کہیں گیا تھا تو اسے بتا کر کیوں نہیں گیا تھا۔
خیر کوئی بات نہیں، اگر اسے اکیلے واپس جانا پڑا تو وہ اس فیملی کے ساتھ واپس چلا جائے گا پریشانی کی اب کوئی بات نہ تھی۔ یہ لوگ بھی کراچی کے تھے۔
اب شام ہونے کو تھی، بہت سے لوگ واپس جا چکے تھے، کچھ راستے میں تھے اور کچھ جھیل سے اٹھنے کی تیاری میں تھے۔ ساحل عمر اب بازغر کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا، لہٰذا اس نے اس فیملی کے ساتھ ہی واپسی کا سفر کرنے کی ٹھان لی تھی۔
جب یہ لوگ واپس جانے کے لیے اٹھے تو وہ بھی ان کے ساتھ باتیں کرتا چل پڑا۔ ابھی ساحل عمر اوپر ان دکانوں تک ہی پہنچا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر بڑی نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔
ساحل عمر نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بازغر شرمندہ سا کھڑا تھا۔
"میں معافی چاہتا ہوں، مجھے دیر ہو گئی۔"

بازغر کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ خوانخواہ اس فیملی کا احسان لینا پڑتا۔ اس کی جیب میں ایک پیسہ نہ تھا۔ اس کی کلائی پر ایک قیمتی گھڑی ضرور تھی۔ اس گھڑی کو فروخت کرنا پڑتا یا ان لوگوں سے پیسے ادھار مانگنے پڑتے، تبھی کراچی واپسی ممکن تھی۔

"کوئی بات نہیں...... آیئے واپس چلیں۔" ساحل عمر نے نرم لہجہ اختیار کیا۔

"ہم ابھی یہاں رکیں گے۔" بازغر نے یہ بات اتنی زور سے کہی کہ وہ لوگ بھی سن لیں۔

"اچھا' ٹھیک ہے۔ ساحل صاحب آپ رکیں' ہم چلتے ہیں۔ اب آپ سے ناران میں ملاقات ہوگی۔ آپ ہمارے ہوٹل آجایئے گا۔ دیکھئے آیئے گا ضرور۔" شگفتہ نے اپنے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتایا۔

"جی ٹھیک ہے...... میں ضرور آؤں گا۔" ساحل عمر نے ایسے ہی وعدہ کر لیا۔

اس فیملی کے آگے بڑھ جانے کے بعد اس نے بازغر کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"صاحب' آپ بغیر بتائے کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"میں اس سلسلے میں آپ سے معذرت کر چکا ہوں۔" بازغر نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہوگا۔ آیئے اب میرے ساتھ جھیل پر چلیے۔"

"اب جھیل پر کیا ہے؟ اندھیرا ہونے والا ہے۔ سب لوگ واپس جا رہے ہیں۔ اب ہم وہاں کیا کریں گے؟"

"ساحل عمر صاحب! اصل نظارہ تو اب شروع ہوگا۔ آج چودھویں رات ہے اور چودھویں کی بھی ایک خاص رات ہے۔ چاند اس قدر روشن ہوگا کہ آپ چاندنی میں جھیل کو دیکھ کر پتھر کے ہو جائیں گے۔"

"کیا مطلب ہے۔ آپ رات یہاں گزارنا چاہتے ہیں؟" ساحل عمر نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"اسی لیے تو میں آپ کو یہاں لایا ہوں...... اس رات کا بڑی بے قراری سے انتظار تھا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ رات ہم کسی پتھر پر بیٹھ کر ٹھٹھرتے ہوئے گزاریں گے۔" ساحل عمر نے پوچھا۔

"ارے نہیں جناب...... یہ آپ کا خادم آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کو ذرا بھی تکلیف پہنچ جائے تو میرے سر پر سات جوتے ماریئے گا۔"

چاندنی رات میں جھیل سیف الملوک کا نظارہ...... ساحل عمر کا اندر کا آرٹسٹ ایک دم مچل اٹھا۔ یہ ایک نیا تجربہ ہوگا۔ یہ نظارہ بہت کم لوگوں نے کیا ہوگا۔ چلو ایک رات یہاں ٹھہر کر دیکھتے ہیں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

جب وہ جھیل پر واپس پہنچے تو وہاں سے سب لوگ جا چکے تھے۔ ایک شخص بھی وہاں موجود نہ تھا۔ البتہ جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک چھوٹا سا سرخ خیمہ ضرور نظر آ رہا تھا۔ ساحل عمر نے اس

طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ''اس خیمے میں کون ہے؟''

چند لمحوں تک جب کوئی جواب نہ آیا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے فوراً اپنے دائیں بائیں پھر پیچھے دیکھا۔ بازغر کا کہیں پتہ نہ تھا۔

ساحل عمر کے ہوش اڑ گئے۔ اب واپسی کا وقت نہیں رہا تھا۔ ساری جیپیں واپس جا چکی ہوں گی۔ سامنے ایک خیمہ تھا اور وہ تھا۔

ابھی تھوڑا سا اجالا باقی تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس خیمے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

بازغر کے اچانک اس طرح غائب ہو جانے پر ساحل عمر کو شدید غصہ تھا۔ دوپہر کو بھی اس نے یہی کیا تھا۔ ساحل عمر کسی نظارے میں محو ہوا تو بازغر اس کے برابر سے غائب ہو گیا۔ خیر وہ تو دن کا وقت تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ یہاں سے واپس چلا جاتا لیکن اس وقت تو اس کی کیفیت ایسی تھی جیسے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کسی اندھے کنویں میں پھینک دیا گیا ہو۔ واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ اسے ہر قیمت پر رات گزارنی تھی۔ اب وہ رات کیسے گزرے گی' اس کے بارے میں اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

اب وہ اس خیمے کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ یہ سرخ رنگ کا خیمہ چھوٹا سا تھا۔ اتنا چھوٹا کہ اس میں ایک دو آدمیوں سے زائد کی گنجائش نہ نکلتی۔ خیمے کے دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ خیمے کے نزدیک پہنچ کر رک گیا۔ ایک مرتبہ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر بازغر کو تلاش کیا۔ بازغر کا دور تک پتہ نہ تھا۔ اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ دور پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر سنہری دھوپ سنولاتی جا رہی تھی۔

اس نے اندھیرا بڑھتے دیکھ کر گھبرا کر سوچا۔ کیا کرے؟ پردہ اٹھا کر خیمے میں جھانکے یا آواز دے کر معلوم کرے کہ خیمے میں کون ہے؟ اس نے آواز دینا ہی مناسب سمجھا۔

''اندر کوئی ہے کیا؟'' ساحل عمر نے جھک کر آواز لگائی۔ پھر چند لمحے انتظار کیا۔ کوئی جواب نہ آیا تو پھر آواز لگائی۔ ''اندر کون ہے؟''

اندر سے پھر کوئی جواب نہ آیا۔ اسے خیمے پر سناٹا طاری نظر آیا۔ خیمے میں شاید کوئی نہیں تھا۔

اب اس نے آگے بڑھ کر پردہ ہٹا کر اندر جھانکنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سامنے پردے کو ہاتھ لگایا تو وہ نہیں کھلا۔ دونوں پردوں کو بڑے بڑے سوراخوں میں سفید رسی پرو کر بند کیا گیا تھا۔ اس رسی کو اندر کی طرف سے بھی کھولا جا سکتا تھا اور باہر کی طرف سے بھی۔

ساحل عمر نے اکڑوں بیٹھ کر پردے کی رسی کھولی۔ پھر رسی ڈھیلی کر کے پردے کو نیچے سے تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر کوئی نہ تھا۔ اس نے خیمے کے اندر گھسنے کا فیصلہ کر لیا۔

اندر جانے سے پہلے اس نے کھڑے ہو کر ایک مرتبہ پھر چاروں طرف نظریں گھمائیں لیکن اسے کہیں بازغر نظر آیا نہ اس خیمے کا مالک۔ اس نے برف پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتارے اور ہاتھوں کے بل گردن جھکا کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر بیٹھ کر اس نے اپنے جوتے اٹھائے اور اندر ایک کونے میں رکھ

دیئے۔
پھر اس نے خیمے کا جائزہ لیا۔ اس خیمے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ آرام دہ بستر' زبردست اونی کمبل' پہننے کے لیے گرم کپڑے' کھانا' چائے' ایمر جنسی لائٹ' کیا چیز ایسی تھی جو وہاں نہیں تھی۔
اس خیمے میں بڑے آرام سے رات گزاری جاسکتی تھی۔ بشرطیکہ خیمے والے نے اسے آکر باہر نہ نکال پھینکا۔
آج کا پورا دن ساحل عمر نے جھیل پر گھومتے پھرتے گزارا تھا۔ اس پر تھکن طاری ہو رہی تھی۔ ایسا پر آسائش خیمہ دیکھ کر مزید دل مچل گیا تھا۔
اس نے ایمر جنسی لائٹ جلا کر ہاٹ پاٹ پر رکھی اور اس کے برابر رکھا ہوا تھرماس اٹھالیا۔ اس کا ڈھکن کھول کر جھانکا تو اس میں سے بھاپ اڑتی نظر آئی۔ وہ پورا تھرماس نفیس چائے سے بھرا ہوا تھا۔ ایک کپ میں چائے بھر کر اس نے تھرماس بند کر دیا اور کمبل اپنے جسم پر ڈال کر نیم دراز ہو کر چائے پینے لگا۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیا تو ایک لطیف ذائقہ حلق سے اترتا چلا گیا۔ وہ بہت مزیدار چائے تھی۔
چائے پی کر وہ تکیہ سر کے نیچے کھسکا کر کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔ اس نے کمبل اپنے سینے تک ڈال لیا۔ سردی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ جسم کو تھوڑا آرام ملا تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر وہ یہ سوچتا سوچتا نیند کی آغوش میں چلا گیا کہ جانے کب خیمے والا آجائے اور اسے خیمے سے باہر کر دے۔
دو گھنٹے کے بعد اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا کہ وہ کہاں لیٹا ہے۔ وہ ابھی خیمے میں ہی تھا اور خیمے کی ہر چیز اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔ کلائی گھڑی دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ وہ دو گھنٹے نہایت اطمینان سے سویا ہے۔ اٹھا تو بھوک کا شدت سے احساس ہوا۔
اس نے ایمر جنسی لائٹ بستر پر رکھی اور ہاٹ پاٹ کھول کر اس نے کھانا پلیٹ میں نکال لیا۔ بڑے مزے سے اس نے روسٹ مرغی تنوری نان سے کھائی۔ اس کھانے کا ذائقہ بھی بالکل مختلف اور بہترین تھا۔ پانی کے بھرے ہوئے کین سے پانی گلاس میں نکال کر خوب سیر ہو کر پیا۔ یہ پانی نہایت شفاف اور لطیف تھا۔
جانے یہ کس کا خیمہ تھا۔ جانے کون اتنے اہتمام سے یہاں رات گزارنے آیا تھا۔ جانے وہ خیمہ چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا۔ ساحل عمر نے بڑے اطمینان سے اس خیمے پر قبضہ کر لیا تھا اور اپنے اباجی کا مال سمجھ کر یہاں رہنے اور کھانے پینے میں مشغول تھا۔ اندر سے اس کا دل ملامت کر رہا تھا لیکن وہ یہاں رہنے اور یہاں موجود چیزوں کو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔
پھر اس نے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ اس نے اونی اوور کوٹ پہنا۔ بالوں والی گول اور اونچی ٹوپی سر پر رکھی۔ دستانے اور موزے چڑھائے۔ اپنے چپل پہننے لگا تو ایک طرف جوتے رکھے ہوئے نظر آئے۔ اس نے وہ بوٹ پہن لیے اور ایمر جنسی لائٹ لے کر خیمے سے باہر آگیا۔

باہر گہرا سناٹا طاری تھا۔ اتنا گہرا سناٹا کہ اگر کوئی سوئی زمین پر پھینکی جائے تو شاید اس کی آواز بھی سنائی دے جائے۔ ساحل عمر ایک پرشور شہر کا باسی تھا۔ اتنا گہرا سناٹا اس نے کاہے کو دیکھا تھا۔ یہ سناٹا اس کی روح میں اترا جاتا تھا۔

چاند نکل آیا تھا لیکن وہ ابھی پہاڑوں کے پیچھے تھا۔ چاندنی برف پوش پہاڑوں پر برس رہی تھی۔ یہ برف پوش چوٹیاں برف کا لبادہ اوڑھے چاند کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ یہ ایک سحر انگیز نظارہ تھا۔ ساحل عمران چمکتی چوٹیوں کو مبہوت ہو کر دیکھنے لگا۔ یہ ایک نادر حسن تھا' ایسا حسن دیکھنے کو کہاں ملتا ہے۔

وہ پھر جھیل کے اطراف ٹہلنے لگا۔ اسے بازغر کا انتظار تھا۔ اس کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر بھٹک کر واپس آجاتی تھیں۔

آسمان روشن تھا۔ بالکل صاف تھا۔ چاند دھیرے دھیرے اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔ ساحل عمر کا جہاں خیمہ تھا' وہاں ابھی اندھیرا تھا۔ وہ جگہ پہاڑ کے سائے میں تھی۔ پھر اچانک ہی چاند پہاڑ کی اوٹ سے نکل آیا۔ جھیل سیف الملوک ایک دم روشن ہو گئی۔ اس پیالہ نما جھیل میں چاند کا عکس نظر آنے لگا۔ چاروں طرف دودھیا چاندنی پھیل گئی۔ برف سے ڈھکے پہاڑوں پر چاندنی کچھ اس طرح منعکس ہو رہی تھی کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اچانک چاندنی کا سیلاب آگیا ہو۔

آج چاند کچھ ضرورت سے زیادہ روشن تھا۔ بازغر نے صحیح کہا تھا۔ یہ چودھویں کے چاند کی کوئی خاص رات تھی۔ چاندنی رات میں نہائی جھیل سیف الملوک دن کی روشنی کے مقابلے میں کہیں حسین نظر آرہی تھی۔ یہ ایک ایسا نظارہ تھا جس کے لیے پتھر کا ہوا جا سکتا تھا۔

ساحل عمر چاندنی رات میں نہائی جھیل سیف الملوک کو دیکھ کر وجد میں آگیا۔ اسے بے اختیار اللہ یاد آیا اور خدائی مسکرا اٹھی۔ دیکھا میرا جمال' میں یہاں ہوں' میں کہاں نہیں ہوں۔

پھر ایک گونج سی پیدا ہوئی جیسے پوری فضا گنگنا اٹھی ہو۔ جیسے یہاں کی ہر شے پکار اٹھی ہو۔

"اللہ ہو اللہ ہو۔"

اور یہ وہ لمحہ تھا جب ساحل عمر نے سوچا کہ وہ کھڑے کھڑے پتھر کا ہو جائے۔ بس اسے دیکھنے والی آنکھ مل جائے اور یہ نظارہ ہمیشہ کے لیے اس کی آنکھوں میں منجمد ہو جائے۔ وہ اس نظارے کو دیکھ کر کبھی نہ تھکے۔ تب اسے بازغر یاد آیا' وہ اسے بہت اچھا لگا۔ اس نے اسے فوراً معاف کر دیا۔ یہ بازغر ہی تو تھا جس کی بدولت وہ جھیل کے اس حسن سے روشناس ہوا تھا۔

ساحل عمر نے گھڑی دیکھی۔ گھڑی میں اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔ چاند اپنے پورے شباب پر تھا۔ گہرا سناٹا' سخت سردی' برستی ہوئی چاندنی' گنگناتی فضا۔ وہ اس نظارے کو اپنی آنکھوں میں بھر لینا چاہتا تھا۔ اپنی روح میں اتار لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھول جانا چاہتا تھا۔ اس وادی میں کھو جانا چاہتا تھا۔

تب اچانک اسے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکا۔ ارے یہاں کون ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہاں کوئی ہے۔ وہ ایک ہنسی کی آواز نہ تھی۔ وہ کئی ہنسیوں کی آواز تھی۔ ارے یہاں کون ہنس رہا

ہے۔ شاید یہ وادی ہنس رہی ہے۔ کائنات گنگنا رہی ہے۔

پھر اس نے سامنے نگاہ کی تو پہاڑ کے پیچھے سے ان چشمے والیوں کو آتے دیکھا۔ وہ بڑی تیزی سے لہراتی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔ چھن چھن گھنگھرو بج رہے تھے۔ نقرئی ہنسی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

ساحل عمر جلدی سے خیمے کی اوٹ میں چلا گیا۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ وہ اسی طرف آ رہی ہیں تو وہ جلدی سے خیمے میں گھس گیا اور پردے کی اوٹ سے باہر جھانکنے لگا۔

آٹھ سبز لبادے میں تھیں اور ان میں سے ایک جوان کے درمیان تھی' وہ سفید ریشمی لبادے میں تھی۔ اس کے سر پر رومال بندھا ہوا تھا۔ باقی آٹھوں ننگے سر تھیں اور ان کے سنہری بال کھلے ہوئے تھے۔

وہ ابھی ذرا دور تھیں' اس لیے ان کے چہرے واضح نہ تھے۔ پھر جب وہ قریب آ گئیں تو ساحل عمر نے دیکھا کہ وہ آٹھوں کی آٹھوں اپنے حسن میں یکتا ہیں اور وہ نویں جوان کے درمیان سبز پتوں میں کھلے کسی سفید پھول کی طرح تھی' اس کے حسن کی کوئی مثال نہ تھی۔ وہ بے نظیر تھی۔ اپنے حسن کی مثال آپ تھی۔

اور یہ وہ تھی جس نے اس کے خوابوں میں آ کر ہلچل مچا دی تھی۔

وہ رشا ملوک تھی۔

جس کے اس نے خواب دیکھے تھے۔ پھر اس نے رشا ملوک کو اپنے خوابوں سے چرا لیا تھا۔ اس نے اسے کاغذ پر اتار دیا تھا۔ ایک ایسی حسین پینٹنگ بنائی تھی کہ جو دیکھتا تھا' دیکھتا رہ جاتا تھا۔

آج وہی پینٹنگ اس کے سامنے زندگی کا لبادہ اوڑھے پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اتنی خوبصورت کہ آدمی پلکیں جھپکانا بھول جائے۔ وہ اس کے تصور سے بھی کہیں حسین تھی۔

اس کا بے اختیار جی چاہا کہ وہ خیمے سے باہر نکل کر اس کے سامنے آ جائے اور کہے۔ "دیکھو میں ہوں ساحل عمر۔ جس کے خوابوں میں آ کر تم نے قیامت مچا دی تھی۔ کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟"

لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ اپنے دل کو سنبھال لیا۔ باہر جانے سے رک گیا۔ ہو سکتا ہے وہ اسے پہچانتی نہ ہو۔ کیا ضروری ہے کہ وہ اگر اس کے خوابوں میں آتی تھی تو وہ بھی اس کے خوابوں میں آتا ہوگا۔ اگر اس نے پہچاننے سے انکار کر دیا تو پھر کیا ہوگا۔ اگر اس کے پاس رشا ملوک کی پینٹنگ ہوتی تو پھر کچھ بات بن سکتی تھی۔ وہ ثبوت کے طور پر اس پینٹنگ کو پیش کر سکتا تھا۔

ابھی وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ باہر ہلچل مچی۔ وہ آٹھوں حسینائیں چھن چھن کرتیں رشا ملوک سے دور ہوئیں۔ وہ چاروں طرف پھیل گئیں۔ انہوں نے اپنے نازک ہاتھوں کے پیالے بنا کر منہ پر رکھے اور مترنم آواز میں اعلان کرنے لگیں۔

"یہاں کون ہے......؟ اگر یہاں کوئی ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لے۔ رشا ملوک کو ہم نہلائیں گے۔ اگر کسی نے دیکھنے کی کوشش کی تو اس کی آنکھیں جاتی رہیں گی۔"

آٹھوں باندیاں یہ اعلان بار بار کر رہی تھیں اور اس اعلان کی گونج پہاڑوں تک سنائی دے رہی تھی۔ ساحل عمر کا دل بہت مچلا کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور وہ جلوہ دیکھے جس کی تاب نہ لا کر اس کی آنکھیں بے نور ہو جائیں۔ پھر اس نے سوچا کہ اگر واقعی اس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں تو وہ کیا کرے گا۔ آنکھیں ہیں تو جہان ہے' یہ نظارے ہیں۔ اسے کسی قسم کی حماقت نہیں کرنا چاہیے۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے دل پر جبر کر کے خیمے کے پردے کے پاس سے ہٹ گیا۔ وہ بستر پر سیدھا لیٹ کر خیمے کی چھت کو گھورنے لگا۔

خیمے کے باہر سے نقرئی قہقہوں کی آوازیں آتی رہیں اور وہ خیمے کی چھت کو گھورتا رہا۔

یہ ایک خاص رات تھی۔ چودھویں کا چاند یوں تو ہر ماہ ہی طلوع ہوتا تھا لیکن یہ رات سال میں ایک مرتبہ آتی تھی۔ اس رات رشا ملوک اپنی ہمجولیوں اور باندیوں کے ساتھ جھیل پر نہانے کے لیے آتی تھی۔ یہ خاص غسل اس کے حسن میں مزید چار چاند لگا دیتا تھا۔

اس رات رشا ملوک کے حسن بے مثال کو بے نقاب چاند نے دیکھا' ستاروں نے دیکھا' پہاڑوں نے دیکھا' جھیل کے پانی نے اسے اپنی آغوش میں لیا۔ محروم رہا تو صرف ساحل عمر۔

دو باندیوں نے رشا ملوک کو ہاتھ پکڑ کر جھیل میں اتارا۔ جھیل میں اتر کر انہوں نے رشا ملوک کو لباس سے آزاد کیا اور اسے مل مل کر نہلانے لگیں۔ پھر وہ اسے جھیل کے اندر اتنی دور تک لے گئیں کہ وہ سر تک ڈوب گئیں۔ پھر چند لمحوں بعد وہ اچانک جھیل سے ابھری تو پوری جھیل اس کے بدن کی روشنی سے منور ہو گئی۔

اس کے بدن کی چاندنی کے آگے چاند کی روشنی بھی جیسے ماند پڑ گئی تھی۔

جھیل سے نکلتے ہی اسے لباس پہنا دیا گیا اور پھر اعلان ہوا۔

"اب کوئی چاہے دیکھے یا سوئے' اس کی مرضی......ہم تو چلے۔"

یہ اعلان دیر تک گونجتا رہا۔ ساحل عمر بڑی بے تابی سے خیمے کے دروازے پر آیا۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا' اب وہاں کچھ نہ تھا۔ نہ رشا ملوک تھی' نہ اس کی ہمجولیاں۔ وہ ایک دم ہی فضا میں تحلیل ہو گئی تھیں۔

ساحل عمر تڑپ کر خیمے سے باہر نکل آیا۔ اس نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر بے سود۔ اب وہاں دور تک کوئی نہ تھا۔ وہی سناٹا تھا' وہی چاند تھا اور نکھری ہوئی چاندنی تھی۔ وہی سحر انگیز فضا تھی۔

ساحل عمر کو جیسے شبہ ہوا کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔

اس نے دستانہ اتار کر اپنے گال پر چٹکی بھری۔ فوراً ہی اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ یہ خواب نہ تھا اس نے جو دیکھا تھا' وہ کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

وہ کچھ دیر جھیل پر ٹہلتا رہا۔ بار بار پلٹ کر ادھر دیکھ لیتا تھا جدھر سے رشا ملوک ہنستی مسکراتی آئی تھی۔ جس طرح روز روز عید نہیں ہوتی' ویسے ہی روز روز محبوب کی دید نہیں ہوتی۔ رشا ملوک کو جھیل سے گئے ہوئے تو ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا۔

پھر وہ پوری رات اس نے جاگ کر اور ٹہل کر گزار دی۔
ایسی حسین جگہ ہو' فضا خوابناک ہو اور محبوب کی دید کا امکان ہو تو پھر کس کافر کو نیند آتی ہے۔ وہ چار ساڑھے چار بجے تک جھیل کے کنارے ٹہلتا رہا۔
جب چاندنی بے نور ہونے لگی۔ منظر دھندلانے لگا اور اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی تو وہ خیمے میں چلا گیا۔ خیمے کی ڈوریاں کس کر وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ ایسی سردی میں ایسا نرم گرم بستر...... وہ کمبل اوڑھ کر جب اس نے آسودگی سے پاؤں پھیلائے تو اس کی آنکھوں میں خمار بھرنے لگا۔ پھر اسے نیند کی آغوش میں جاتے ہوئے چند منٹ سے زیادہ نہ لگے۔
جب ساحل عمر گہری نیند میں ڈوب گیا تو خیمے کے باہر آہٹ ہوئی۔ قدموں کی چاپ خیمے کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ آنے والے نے پردے کے درمیان سے اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر ایمرجنسی لائٹ روشن تھی اور ساحل عمر منہ پر کمبل ڈالے پرسکون انداز میں سو رہا تھا۔
آنے والے نے خیمے کے پردے کی رسیاں کھول ڈالیں اور پردے کے پٹ خیمے کے اوپر دائیں بائیں ڈال دیئے۔ پھر وہ کسی بندر کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتا ہوا' بڑی احتیاط کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے آہستہ آہستہ ساحل عمر کے چہرے سے کمبل کھینچا۔ جب کمبل ساحل عمر کی ناک تک ہٹ گیا تو آنے والے نے اپنی جیب سے ایک پتھر کا ٹکڑا نکالا اور اس کی ناک پر رکھ دیا۔ چند لمحے اس نے اس پتھر کو اس کی ناک پر رکھا رہنے دیا۔ پھر تین بار اس نے اس پتھر کو اس کی ناک پر رگڑا اور اطمینان بھرا سانس لے کر اس نے اس پتھر کو دوبارہ جیب میں ڈال لیا اور کمبل سے اس کا منہ ڈھک دیا۔
پھر آنے والا خیمہ سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر ایک عجیب سی آواز نکالی۔ یہ آواز کسی چیخ سے مشابہ تھی۔
اس چیخ کے نمودار ہوتے ہی پتھر کی ایک گاڑی پہاڑ کی اوٹ سے برآمد ہوئی اور بہت تیز رفتاری سے چلتی خیمے کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ یہ ایک کھلی گاڑی تھی۔ اس میں دو پہیے لگے ہوئے تھے اور آگے تہکال اس میں جتا ہوا تھا۔ گاڑی بان کوئی نہ تھا' تہکال خود ہی اس کو چلاتا ہوا لایا تھا۔
اس گاڑی کے پیچھے البتہ چار بندے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے آئے تھے۔
"دانا! کیا حکم ہے؟" وہ چاروں ہاتھ باندھ کر غلاموں کی طرح اس شخص کے سامنے کھڑے ہو گئے جس نے چیخ مار کر انہیں طلب کیا تھا۔ وہ بازغر تھا۔
"خیمہ اکھاڑو۔" بازغر نے چاروں کو حکم دیا۔
چند لمحوں میں ان چاروں نے خیمے کے چاروں کھونٹے اکھاڑ لیے اور خیمہ اس آہستگی سے ساحل عمر کے اوپر سے اتارا کہ ذرا سا بھی شور نہ ہوا۔
"دانا کو احتیاط سے اٹھا کر مع بستر گاڑی پر رکھ دو۔" بازغر نے دوسرا حکم دیا۔
ان چاروں غلاموں نے ساحل عمر کو مع بستر اٹھا کر گاڑی پر رکھ دیا۔ بازغر نے ساحل عمر کو کمبل اچھی طرح اڑھا دیا اور پھر ایک ریشمی ڈوری سے ساحل عمر کو اس طرح باندھ دیا کہ وہ گاڑی سے

پھسل کر نیچے نہ گرے۔ اس کے بعد بازغر نے جھکال کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''جھکال بہت احتیاط سے۔ دیکھ دانا کو کوئی تکلیف نہ ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے منہ سے ''خخ'' کی آواز نکالی اور بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

جھکال ساحل عمر کو بڑی برق رفتاری سے لے چلا۔ چند لمحوں میں وہ پہاڑ کی اوٹ میں چلا گیا۔

''تم لوگ خیمہ اور اس کا سامان سمیٹ کر پہنچو' میں چلتا ہوں۔'' بازغر ان سے مخاطب ہوا۔

''اچھا دانا۔'' اس میں سے ایک غلام نے مودبانہ کہا۔

بازغر نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں لہرائے۔ پھر وہاں کچھ نہ رہا۔

جب ساحل عمر کی آنکھ کھلی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ جھیل سیف الملوک کے نزدیک نصب ایک پرآسائش خیمے میں سویا تھا۔ اب نہ وہ خیمہ تھا' نہ وہ مقام تھا۔ البتہ بستر وہی تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا' وہ کہاں آ گیا۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کمرے کی دیواریں پتھروں کی تھیں۔ کمرہ گول تھا۔ زمین پر سفید بالوں کا قالین بچھا ہوا تھا۔ اس قالین کے اوپر ساحل عمر کا بستر تھا اور یہ بستر کمرے کے عین درمیان میں تھا۔ گنبد نما چھت تھی اور یہ چھت اطراف سے کھلی ہوئی تھی جس سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ سامنے ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔

پھر ساحل عمر نے اپنی پشت کی طرف گھوم کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ سامنے دیوار پر ایک قد آدم تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ تصویر ساحل عمر کی تھی۔ صورت تو ساحل عمر کی تھی لیکن لباس ساحل عمر کا نہ تھا۔ وہ ایک بند گلے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر آسمانی رنگ کا صافہ تھا۔ کوٹ کے کالر پر دو ہیرے لگے ہوئے تھے جو جگمگا رہے تھے۔ گلے میں ایک کالی ڈوری میں بندھی انگوٹھی پڑی تھی۔ یہ چاندی کی انگوٹھی تھی اور اس میں سبز رنگ کا گول پتھر لگا ہوا تھا۔ کوٹ کا رنگ سرمئی تھا۔

ساحل عمر بستر کو چھوڑ کر اپنی اس تصویر کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے پہلے تو چیک کیا کہ یہ تصویر کس چیز سے بنائی گئی ہے۔ یہ تصویر چھوٹے چھوٹے رنگین پتھروں سے بنائی گئی تھی اور اتنی نفاست سے بنائی گئی تھی کہ دور سے دیکھنے پر پینٹنگ نظر آتی تھی۔ اس تصویر کو بہت محنت اور بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا۔ یہ ایک جیتی جاگتی تصویر تھی۔ ساحل عمر اپنی اس تصویر کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

اگر اس تصویر کا خالق اس کے سامنے ہوتا تو وہ بے اختیار اس کے ہاتھ چوم لیتا۔

تبھی دروازہ کھلا اور وہ ہستی پوری شان سے چلتی ہوئی اندر آئی جس نے اس تصویر کو تخلیق کیا تھا۔ ساحل عمر اپنی تصویر کو دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ اسے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ کوئی خاموشی سے اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا ہے۔

ایک دلفریب خوشبو نے اچانک اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا عقب سے آواز آئی۔ ''کیا دیکھتے ہیں؟''

یہ ایک مانوس آواز تھی۔

ساحل عمر بڑی بے قراری سے پلٹا۔ وہ کیا پلٹا جیسے اس کی دنیا ہی پلٹ گئی۔ جیسے اس کی تقدیر بدل گئی۔ اسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ گویا اسے وہ مل گیا جو سب کو کہاں ملتا ہے۔ محبوب تو نصیبوں والے کو ملتا ہے۔ وہ نصیبوں والا تھا۔

اس کے سامنے رشاملوک کھڑی تھی‘ شرمیلے چہرے اور نیچی نگاہوں کے ساتھ۔

''کون ہیں آپ؟'' ساحل عمر کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے پہچان کر بھی نہ پہچانا۔

''کون ہوں میں......؟'' رشاملوک نے اپنی جھیل جیسی آنکھوں سے پلکوں کا شامیانہ ہٹایا اور اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ''میں وہ ہوں جس کے آپ خواب دیکھتے تھے۔''

''کیا یہ خواب میں نے اکیلے دیکھے تھے؟'' ساحل عمر نے مڑ کر اپنی تصویر کو دیکھا اور رشاملوک کے چہرے پر معنی خیز نگاہیں ڈالیں۔

''نہیں‘ اس جرم میں میں برابر کی شریک ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ شرم سے گلنار ہو گئی۔

''یہ میں ہوں؟'' ساحل عمر نے اپنی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی نگاہوں میں سوال تھا۔

''آپ کو کوئی شبہ ہے؟''

''میں اتنا اچھا تو نہیں۔'' ساحل عمر نے سادگی سے کہا۔

''تصویر کی برائی کرنا چاہتے ہیں۔'' رشاملوک نے اس بات کو کسی اور زاویئے سے پرکھا۔

''اتنی اچھی تصویر کی کون برائی کر سکتا ہے؟ یہ کس نے بنائی ہے؟''

''میں نے۔'' رشاملوک نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''رشاملوک نے۔''

''تم نے ......واقعی؟'' وہ بہت حیران ہوا۔

''ہاں۔ واقعی میں نے بنائی ہے۔ یہ تصویر پتھروں کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہے۔ اس فن کا نام طبنزہ ہے۔ اس فن کو میں نے بابا صاعق سے سیکھا۔'' رشاملوک نے خوش ہو کر بتایا۔

''بہت عمدہ...... یہ ایک شاہکار تصویر ہے اور اصل سے کہیں بہتر ہے۔'' ساحل عمر ہنس کر بولا۔

''کوئی چیز......اصل سے کبھی بہتر نہیں ہو سکتی۔'' رشاملوک نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' ساحل عمر نے اپنے بستر سے کمبل ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا اور تکیے ٹھیک کر کے اس نے رشاملوک کو بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ تکیوں سے ٹیک لگا کر بڑے شاہانہ انداز میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے ساحل عمر سے کہا۔ ''آپ بھی بیٹھ جائیں۔''

ساحل عمر اس کے سامنے دو زانو ہو کر بستر کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا۔

''آپ کچھ پوچھ رہے تھے؟''

''ہاں‘ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ میری تصویر تم تک کیسے پہنچی؟ میرا مطلب ہے یہ تصویر تم نے میری کس تصویر کو دیکھ کر بنائی اور وہ تصویر تم نے کہاں سے حاصل کی؟''

''میں نے یہ تصویر کسی اور تصویر کو دیکھ کرنہیں بنائی ہے۔ یہ صورت میرے خوابوں نے تراشی

''میں سمجھا نہیں۔'' ساحل عمر نے اس کی بات کو شاعری جانا۔
''یہ بات خیر اتنی مشکل بھی نہیں۔'' رشا ملوک نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے گھورا۔
''میں سمجھاتی ہوں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اس بستی میں جب کوئی لڑکی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو اس خوشی کی رات اس سے اس کی ماں کہتی ہے کہ اپنے لیے مور تلاش کرو۔ ہماری بستی میں زندگی کا ساتھی تلاش کرنے کی پوری آزادی ہے اور یہ آزادی یہاں صرف لڑکی کو ہے۔ لڑکی اپنے لیے مور کا انتخاب کرتی ہے۔ یہاں ہر چھٹے مہینے شادی کا جشن منایا جاتا ہے۔ جتنی لڑکیاں اپنے موروں کا انتخاب کر چکی ہوتی ہیں وہ اس جشن میں ان کا ہاتھ پکڑ کر آتی ہیں اور اس طرح ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہاں انتخاب پر کوئی قید نہیں۔ یہ لڑکی پر منحصر ہے کہ وہ جتنی جلد چاہے اپنے مور کا انتخاب کر لے۔ یہاں انتخاب پر کوئی پابندی ہے اور نہ وقت کی کوئی قید۔ جسے چاہو اور جب چاہو منتخب کرو۔ خیر میں اپنی بستی کی اس رسم سے واقف تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ رات مجھ پر بھی آئے گی جب میری ماں مجھے مور تلاش کرنے کا مشورہ دے گی۔ جوں جوں میری عمر سن بلوغت کی طرف بڑھ رہی تھی اور مشورے کی رات نزدیک آتی جارہی تھی، توں توں میری پریشانی بڑھتی جارہی تھی کیونکہ میرے خوابوں میں جو بسا ہوا تھا ایسا پوری بستی میں کوئی نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں انتخاب کے سلسلے میں کوئی قید نہیں۔ پھر بھی لڑکیاں مشورے کی رات آتے ہی اپنے لیے مور تلاش کر لیتی ہیں اور پہلے ہی جشن میں شریک ہو کر شادی کر لیتی ہیں۔ یہی بات اچھی سمجھی جاتی ہے......لیکن میری مشکل پسند طبیعت نے مجھے مشکل میں ڈال دیا۔ میں نے طے کر لیا کہ چاہے کتنا ہی وقت لگ جائے، میں اپنے لیے ایسے مور کا انتخاب کروں گی جو اپنی مثال آپ ہوگا۔ جب لگن سچی ہو تو راستے خود بخود کھلنے لگتے ہیں۔ پھر اس رات جب میں چاند پر نظریں جمائے اپنے مور کے تصور میں کھوئی تھی تو ایک شبیہہ ابھری۔ پھر وہ شبیہہ واضح ہوتی گئی۔ میں آپ کے خواب دیکھنے لگی۔ آپ کو خواب میں دیکھنے لگی۔ پھر میں نے بابا صاعق سے اپنی مشکل بیان کی۔ بابا نے ایک عمل بتایا وہ عمل کر کے سوئی تو آپ واضح طور پر میرے سامنے آ گئے۔ پھر میں نے آپ کا چہرہ بنانا شروع کیا۔ اس کے بعد آپ میرے خوابوں میں آتے گئے اور میں آپ کی صورت کو پتھروں کے ٹکڑوں میں ڈھالتی گئی۔ میں نے آپ کو اپنی پسند کا لباس پہنایا۔ بالآخر شب و روز کی محنت رنگ لے آئی اور میں آپ کی تصویر بنانے میں کامیاب ہو گئی۔''

ساحل عمر بڑی محویت سے اس کی بات سن رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی نظریں اس کے چہرے کے دلآویز نقوش پر جمی تھیں۔ اسے اپنے آپ پر بڑا فخر ہو رہا تھا کہ ایک حسین ترین لڑکی کا وہ آئیڈیل تھا۔ اس کے خوابوں میں بستا تھا۔ کچھ اس انداز سے کہ اس نے اس کے نقوش پتھر کی دیوار پر پتھروں میں ڈال لیے۔ میرا شوق دیکھ میرے شوق کا حصول دیکھ۔

''پھر کیا ہوا؟'' ساحل عمر نے اسے خاموشی اختیار کرتے دیکھ کر پوچھا۔
''بس پھر کیا ہونا تھا۔ روز آپ کی تصویر کو دیکھتی تھی اور سوچتی تھی۔'' رشا ملوک بولی۔

''کیا سوچتی تھیں؟'' اس نے پوچھا۔
''سوچتی تھی..... اور اپنے آپ سے مخاطب ہو کر سوال کرتی تھی..... دیکھ رشا ملوک تو نے سپنوں کے شہزادے کی تصویر تو بنالی۔ پر اب تو اسے پائے گی کس طرح؟ اس تصویر سے تو تیری شادی نہیں ہو سکتی۔ اسے ڈھونڈ، اسے تلاش کر۔ یہ کہاں ہے..... پھر میں نے آپ کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ میرے پاس جو بھی ذرائع تھے سب استعمال کر ڈالے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کہاں ہیں؟ اتنا مجھے یقین تھا کہ جب آپ میرے خوابوں میں آتے ہیں تو آپ کا وجود کہیں نہ کہیں ضرور ہے۔ جب میں بہت زیادہ پریشان ہوئی تو بابا صاعق کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے اپنا مسئلہ بیان کیا تو انہوں نے تین راتوں کے بعد مجھے بلایا۔ یہ تین راتیں میں نے بڑی بے قراری سے گزاریں۔ جب میں چوتھی رات ان کی خدمت میں حاضر ہوئی تو ان کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ میں سمجھ گئی کہ میرا گوہر مراد مل گیا۔ پھر انہوں نے آپ کے ملنے کی خوشخبری سنائی۔ ساتھ میں کچھ پریشان کن باتیں بھی بتائیں۔ میں نے ان باتوں کو صبر و سکون کے ساتھ سنا اور انہیں اپنا فیصلہ سنایا کہ اب جو بھی ہو میں نے اسے اپنا مور چن لیا۔ میرا فیصلہ سن کر بابا صاعق خاموش ہو گئے۔ پھر مجبور ہو کر انہوں نے آپ کے حصول کے لیے کارروائی شروع کی۔ ایک طرف آپ کی حفاظت کا مسئلہ تھا تو دوسری طرف آپ کو اپنی بستی کی طرف لانا تھا۔ اس کام کو بابا صاعق نے بڑی دانائی سے کیا۔ انہوں نے آپ کے پاس بازغر کو روانہ کیا۔ اس کے بعد جو کچھ آج تک ہوا' اس سے آپ واقف ہیں۔'' رشا ملوک یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔
''کچھ اسی طرح کا قصہ میرے ساتھ بھی ہوا..... تم تو جانتی ہو گی؟''
''ہاں' کچھ جانتی ہوں' کچھ نہیں جانتی..... آپ سنائیں۔ آپ کی زبانی سن کر دل کو سکون ملے گا۔''
''جس طرح تم نے مجھے خوابوں میں دیکھا' ویسے ہی تم میرے خوابوں میں آئیں۔ میں نے تمہیں خوابوں میں دیکھا۔ پھر میں نے سینکڑوں لڑکیوں کی تصویریں دیکھ کر ان میں سے تمہیں نکالا۔ تمہاری تصویر بناتا گیا۔ میں نے تمہیں دلہن والا لباس پہنا دیا اور تمہاری تصویر کو انوکھا بنانے کے لیے تمہاری پیشانی پر جھومر کی جگہ ایک بچھو کو بنا دیا۔'' ساحل عمر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''کتنا برا کیا آپ نے۔'' وہ ناراضگی سے بولی۔
''ہاں' واقعی میں نے برا کیا..... وہ بچھو میری جان کا عذاب بن گیا۔''
''ہاں' جب بازغر آپ سے مل کر آیا تو اس نے بڑی حیرت سے بتایا کہ آپ نے میری تصویر بنالی ہے۔ پھر ساتھ ہی غصے کا اظہار کیا کہ اس نے تمہاری پیشانی پر اعور کو بٹھا دیا ہے۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ یہ آگ یکطرفہ نہیں۔ اگر میں نے آپ کو اپنا مور منتخب کر لیا تو آپ نے بھی اپنے مور ہونے کی تصدیق کر دی ہے۔ البتہ اعور کا میری پیشانی پر ہونا میرے لیے بھی باعث پریشانی تھا لیکن اس میں آپ کا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ لوگ ہیں ہی اسی قسم کے..... وہ اعور جن کا بیٹا ہے' ان کا کام ہی لوگوں کو تکلیف میں مبتلا کرنا ہے۔ وہ اس تصویر کے ذریعے مجھ پر اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا لیکن''

ایسا نہ کر سکا۔ بالآخر اسے میری پیشانی کو چھوڑنا پڑا۔ پھر اس نے وہاں جو جو جال پھیلایا' اس سے میں اچھی طرح واقف ہوں اور ابھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں ہے۔ ہمیں پوری طرح چوکنا رہنا ہے۔ وہ یہی چاہتا ہے کہ میں اسے اپنا مور منتخب کر لوں۔'' رشا ملوک نے انکشاف کیا۔

''ارے نہیں۔'' ساحل عمر بے اختیار چونک اٹھا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' رشا ملوک نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کا قبیلہ ہماری بستی کے نزدیک ہی آباد ہے لیکن آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اس وقت محفوظ ترین مقام پر ہیں۔''

''رشا ملوک کیا تم جانتی ہو کہ یہ لوگ میرے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہیں؟''

''سب کی اپنی اپنی غرض ہے۔ اعور کچھ اور چاہتا ہے اور وہ جادوگرنیاں کچھ اور چاہتی ہیں۔''

''کیا یہ صحیح ہے' برکھا مجھے زندگی سے محروم کر کے اپنی ساحرانہ قوتیں بڑھانا چاہتی ہے؟''

''ہاں' یہ بات بالکل ٹھیک ہے...... وہ ایک خطرناک ساحرہ ہے۔ اسے اعور اور اس کے باپ کی پشت پناہی حاصل ہے۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر مسکرا کر بولی۔ ''اچھا چھوڑیں ان باتوں کو...... میں بھی آتے ہی کیا قصہ لے بیٹھی۔''

''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں...... تمہاری باتوں سے میری کئی الجھنیں دور ہو گئیں۔''

''اور مجھ سے ملنا کیسا لگا؟'' رشا ملوک نے اپنی شرگیں آنکھیں اٹھائیں۔

''یوں لگا جیسے میں نے چاند کو چھو لیا ہو۔''

''آپ نے بڑی سچی اور اچھی بات کہی ...... مجھ سے ملنا' مجھے دیکھنا واقعی ایسا ہے جیسے کوئی چاند کو چھو لے۔''

''اس کا کیا مطلب ہے...... میں نے کوئی اور بات کہی تھی' تم نے کوئی اور بات کہی ہے۔''

''جو آپ نے کہا' وہ بھی سچ اور جو میں نے کہا' وہ بھی سچ۔''

''کیا تمہارا تعلق چاند سے ہے؟'' ساحل عمر نے وضاحت چاہی۔

''میرا تعلق چاند سے ہو یا زمین سے...... رشا ملوک تو اب آپ کی ہو گئی۔'' اس نے ایک ادائے خاص سے کہا۔ وہ اصل بات کا جواب گول کر گئی۔

''میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں...... میری اماں گھر پر تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ یہ کتنی عجب بات ہے کہ میں انہیں تمہاری تصویر دکھا کر تمہیں دلہن کہہ چکا ہوں۔ تم میرے خوابوں کی تعبیر ہو۔ مجھے ایسی ہی شریک زندگی کی تلاش تھی۔ تمہارا حسن بے مثال ہے۔ تم ایک انوکھی چیز ہو۔''

''اور آپ میں کیا کمی ہے۔ رشا ملوک کا مور کوئی عام سی چیز ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ ایک خاص آدمی ہیں۔ رشا ملوک کا انتخاب۔ جسے رشا ملوک منتخب کر لے' پھر اسے منتخب کرنے کی کوئی جرات نہیں کر سکتا۔ بالآخر برکھا اور ورشا منہ دیکھتی رہ گئیں۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

ساحل عمر ہنستے ہوئے بڑی محویت سے دیکھنے لگا۔ اس کی ہنسی کی آواز' اس کی ہنسی کا انداز اتنا دلفریب تھا کہ ساحل عمر نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی ہنسی روکے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ہنستی رہے اور وہ اسے

یونہی دیکھتا رہے۔
تب وہ ہنستے ہنستے اچانک رک گئی اور پریشان نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

عمر نے جب ہنسی رکتے اور اس کے چہرے پر پریشانی پھیلتے دیکھی تو اس نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ اس کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں لیکن دروازہ بند تھا۔ ساحل عمر کو بڑی حیرت ہوئی کہ رشا ملوک آخر کس چیز کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

اس سے پہلے کہ ساحل عمر اس سے کوئی سوال کرتا وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔ ''ارے بابا صاعق یہاں کیسے آ گئے۔''

''بابا صاعق'' ساحل عمر نے دہرایا۔ اسے تو بابا صاعق کہیں نظر نہ آئے۔ بھلا وہ نظر آتے بھی کیسے جبکہ دروازہ بند تھا پھر رشا ملوک کو بند دروازے سے وہ کیسے نظر آ گئے۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رشا ملوک نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور بڑے احترام سے دروازے کے ایک طرف ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔ ''بابا آپ۔''

ساحل عمر دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ جب دروازہ کھلا تو اسے دروازے پر ایک اونچے قد کا سفید ریش شخص نظر آیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔ نوے سے اس کی عمر کیا کم ہو گی۔ بھنویں تک سفید ہو چکی تھیں۔ سر پر کڑھی ہوئی ایک گول ٹوپی تھی۔ سر کے بال سفید، بھنویں سفید، داڑھی سفید اور چہرے کی رنگت سرخ و سفید۔ زرد رنگ کا تہبند اور اس پر اسی رنگ کی چادر اوڑھے، کمر نیلے رنگ کی ریشمیں ڈوری سے کسی ہوئی تھی۔ تہبند ٹخنوں سے اوپر تھا اور پیروں میں ایک ہلکی سی چپل تھی۔ ایک نظر میں بابا صاعق کی شخصیت بڑی دلفریب، جاذب نظر اور وجیہہ محسوس ہوئی تھی۔

''ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔'' بابا صاعق نے دروازے پر کھڑے کھڑے بڑے شیریں لہجے میں کہا۔

''بابا آپ کمال کرتے ہیں۔ آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ مجھے بلوا لیا ہوتا۔''

''ہمارا شوق ہمیں یہاں لے آیا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے چپل دروازے پر اتار دیئے اور سفید اونی قالین پر چلتے ہوئے آگے بڑھے۔

رشا ملوک نے فوراً دروازہ بند کر دیا اور بھاگتی ہوئی بابا صاعق کے نزدیک آئی اور ان کا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھ گئی کہ آپ کیوں آئے ہیں۔ آخر صبر نہیں ہو سکا ناں...... آپ میرے مور کو دیکھنے آئے ہیں۔''

''ہاں۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''میں تیرے مور کو دیکھنے آیا ہوں اور اس کیلئے ایک تحفہ لایا ہے۔ وہ اسے دینے آیا ہوں۔'' پھر وہ اچانک ساحل عمر سے مخاطب ہوئے جو بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا اور انہیں اپنے نزدیک آتے دیکھ کر وہ کب کا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ''اے لڑکے تو ہمیں تو پہچان گیا ہو گا۔''

"جی بابا صاعق...... میں جانتا ہوں کہ آپ اسی بستی کے دانا ہیں۔ آپ کو بہت ہنر آتے ہیں اور رشاملوک پر آپ خاص طور پر مہربان ہیں۔"

"اے لڑکے ہماری مہربانیاں تجھ پر بھی کچھ کم نہیں...... تو یہاں تک بحفاظت پہنچ گیا ہے۔ یہ بات اگر سوچی جائے تو بہت بڑی ہے۔" انہوں نے احسان جتایا۔

"میں آپ کی اس مہربانی کا شکرگزار ہوں۔" وہ واقعی ممنون احسان تھا۔

"خالی خولی شکرگزار ہونے کا کیا فائدہ۔ ہمارے حضور کوئی نذر پیش کر۔"

"بابا آپ میرے مور کو پریشان کیوں کر رہے ہیں...... آپ جانتے ہیں کہ وہ یہاں کس طرح پہنچا ہے۔ اس کے پاس اس وقت کچھ دینے کو کہاں ہے۔ آپ کی نذر پکی ہے۔ جب یہ آپ کی نگاری پر آئیں گے تو خالی ہاتھ نہیں آئیں گے۔" رشاملوک نے بابا صاعق کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے لڑکی تو ناراض کس لئے ہوتی ہے۔ ہم مذاق کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب یہ ہماری نگاری پر آئے گا تو خالی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس وقت تو ہم اس کے لئے کچھ لائے ہیں۔" یہ کہہ کر بابا صاعق نے اپنی چادر میں ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو ان کے ہاتھ میں چاندی کے خول میں بند ایک تعویذ تھا۔ یہ تعویذ کالی ڈوری میں بندھا ہوا تھا۔ بابا صاعق نے یہ تعویذ ساحل عمر کی طرف بڑھایا۔ "یہ لو اسے گلے میں ڈال لو۔"

"بابا یہ کیا ہے؟" رشاملوک نے اس تعویذ کو حیرت زدہ ہو کر دیکھا اور اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"یہ تعویذ ہے۔ اس کی بستی سے آیا ہے۔ اسے حافظ موسیٰ نے بھیجا ہے۔ وہ اپنی بستی کا بڑا دانا شخص ہے۔ اس جیسا شخص آس پاس کوئی نہیں۔ یہ تعویذ اس کی حفاظت کرے گا۔"

"حافظ موسیٰ!" ساحل عمر نے خود کلامی کی۔ یہ نام اس کے حافظے میں موجود تھا۔ ناصر مرزا ان بزرگ سے ملا تھا تو انہوں نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ناصر مرزا اسے ان کے پاس لے جانا چاہتا تھا لیکن اس وقت وہ برکھا کے فریب میں مبتلا تھا۔ اس کا جادو اس کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ اسی سحر کے زیر اثر گھر سے نکل آیا تھا۔ اس طرح حافظ موسیٰ سے اس کی ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ اب انہی حافظ موسیٰ نے اس کیلئے تعویذ بھیجا تھا تا کہ اس کی حفاظت میں رہ سکے۔ سوال یہ تھا کہ یہ تعویذ انہوں نے اتنی دور کس کے ہاتھ بھیجا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے بابا صاعق سے سوال کرنا چاہا۔

"محترم بزرگ......!"

"اے لڑکے ذرا ٹھہرنا...... میرے ساتھ بڑے بڑے القاب لگانے کی ضرورت نہیں، میں پوری بستی کا بابا صاعق ہوں۔ تم بھی مجھے اسی نام سے پکارو...... اگر بہت زیادہ ہی احترام کرنا ہے تو چلو نام مت لو تو صرف بابا کہہ لو۔ ہاں تو میں کون ہوں؟"

"بابا صاعق" ساحل عمر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے اس انداز پر دونوں ہی ہنس

پڑے۔

''یہ ہوئی ناں بات...... اب کہو کیا کہتے ہو۔''

''بابا میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ یہ تعویذ آپ تک کیسے پہنچا۔ حافظ موسیٰ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں آپ کی بستی میں۔''

''اے لڑکے......''

''بابا ذرا ٹھہریئے' میرا نام اے لڑکے نہیں' ساحل عمر ہے۔ آپ مجھے میرے نام سے پکاریں تو مجھے خوشی ہو گی۔'' ساحل عمر نے مسکرا کر بڑے مودبانہ انداز میں کہا تو رشا ملوک منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں آئندہ تجھے تیرے نام سے پکاروں گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تیرا نام بہت اچھا ہے۔ ہاں تو ساحل عمر وہ تیری بستی کا حافظ موسیٰ بڑا زبردست دانا ہے۔ اس کے بہت سے کارندے ہیں۔ وہ جس جگہ چاہے اور جب چاہے کوئی بھی چیز منتقل کر سکتا ہے۔ اگر وہ خود سفر کرنا چاہے تو اسے یہاں آنے میں چند ساعتیں درکار ہوں۔ اس کے رابطے بہت دور تک ہیں۔ تیری کچھ سمجھ میں آیا کہ میں نے کیا کہا۔''

''ہاں' بابا میں کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا۔'' ساحل عمر نے جواب دیا۔

''تو جتنا سمجھ گیا اسے بہت سمجھ...... میں نے تو خیر اتنا بتا بھی دیا حافظ موسیٰ تو اس موضوع پر ایک لفظ نہ بولتا اور وہ ایسا کر کے ٹھیک کرتا۔ یہ دنیا ہی الگ ہے۔ مخفی باتوں کو مخفی ہی رہنا چاہئے۔'' بابا صاعق نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ تعویذ کو گلے میں ڈال لے۔''

یہ تعویذ رشا ملوک کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے فوراً ساحل عمر کی طرف بڑھا دیا۔ ساحل عمر نے وہ تعویذ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اس تعویذ کو گلے میں ڈالتے ہی اسے شدت کا پسینہ آیا۔ حالانکہ اس وقت وہ جہاں تھا وہاں سخت سردی تھی۔ اس کے باوجود اس کے کپڑے پسینے میں تر ہو گئے۔ پھر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

بابا صاعق اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو بغور دیکھ رہے تھے۔ جب اس کا جسم لرزنے لگا تو انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور بولے۔ ''ساحل عمر میرا ہاتھ پکڑ لے۔''

ساحل عمر نے فوراً ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ تھامتے ہی جسم پر طاری ہونے والی کپکپی فوراً ختم ہو گئی۔ پسینہ آنے کے بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا جسم ہلکا پھلکا ہو گیا ہو' طبیعت کا بوجھل پن دور ہو گیا ہو' سحر کے اثرات سے نکل گیا ہو۔

''اب ٹھیک ہے۔ کوئی پریشانی تو نہیں۔'' بابا صاعق اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولا۔

''نہیں بابا...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اس تعویذ کو پہن کر بڑا سکون ملا ہے۔'' ساحل عمر نے کہا۔

''اے لڑکی...... اب میں چلتا ہوں تو اپنے مور کی خاطر مدارات کر...... سورج ڈھلے تو اسے میری مختاری پر لے آنا' ضروری نہ ہوتا تو میں مشورہ دیتا کہ اسے یہیں چھپا کر رکھ......''

"بابا آپ فکر نہ کریں...... میں انہیں سب کی نظروں سے بچا کر آپ کے پاس لے آؤں گی۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔" رشا ملوک نے بڑے یقین سے کہا۔

"اے لڑکی...... میں جانتا ہوں کہ تو بڑی ذہین ہے۔ دیکھ ذرا ہوشیاری سے......" بابا صاعق نے چلتے چلتے ہدایت کی۔ پھر ساحل عمر کا ایک کان چھوا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

"اے لڑکی...... انہوں نے میرا کان کس خوشی میں پکڑا۔" ساحل عمر بابا صاعق کے جانے کے بعد رشا ملوک سے مخاطب ہوا۔

"یہ اسی بستی کی رسم ہے۔ ابھی تو دیکھیں کون کون آپ کے کان پکڑتا ہے۔" رشا ملوک ہنس کر بولی۔ "اچھا اب باتیں بہت ہو چکیں میں آپ کے کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔ آپ کچھ کھانے سے پہلے نہانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے۔"

"ایسی سردی میں نہاؤں گا میں؟" ساحل عمر نہانے کے تصور سے ہی کانپ اٹھا۔

"آیئے...... پہلے حمام ملاحظہ فرما لیجئے۔ ہو سکتا ہے اسے دیکھ کر آپ اپنے ارادے میں تبدیلی کر لیں۔" یہ کہہ کر رشا ملوک دروازے کی طرف بڑھی۔

وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

دروازہ کھلا تو اسے سامنے ایک لمبی سی راہداری نظر آئی۔ بالکل سامنے ایک اور دروازہ تھا۔ وہ شاید باہر جانے کا راستہ تھا۔ اس دروازے کے بائیں جانب دو دروازے اور نظر آ رہے تھے۔ رشا ملوک نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ حمام اور وہ بیت الخلا ہے۔ آپ نہانے دھونے کی تیاری کریں، میں آدھے گھنٹے تک آتی ہوں۔ امید ہے آپ اس وقت تک تروتازہ ہو جائیں گے۔"

رشا ملوک نے راہداری کے آخر میں بنا دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔ ساحل عمر کو دروازہ کھلنے کے بعد اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اس کے جانے کے بعد جب دروازہ بند ہو گیا تو اس دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ دروازہ نہ کھلا۔ شاید رشا ملوک جاتے ہوئے دروازہ باہر سے بند کر گئی تھی۔

وہ واپس لوٹ آیا۔ اب اس نے وہ دروازہ کھولا جسے رشا ملوک نے حمام کہا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی اندر سے مسحور کن خوشبو کا جھونکا آیا۔ وہ گہرا سانس لیتا ہوا حمام میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض حمام تھا۔ اس کے ذہن میں واش روم کا جو تصور تھا اس سے بالکل مختلف۔ درمیان میں ایک سفید پتھروں کا بنا حوض تھا۔ اس کے اندر جو پانی تھا وہ متحرک تھا۔ یہ بہتا ہوا پانی تھا۔ ایک طرف سے پانی اندر داخل ہو رہا تھا تو دوسری طرف سے باہر نکل رہا تھا۔

حمام کی دیواریں سرخ پتھروں کی تھیں۔ چھت وہی گنبد نما اور اطراف سے کھلی ہوئی۔ حمام گول تھا جبکہ حوض مستطیل تھا۔ حمام میں خوشگوار گرمی تھی اور یہ گرمی دیواروں کی وجہ سے تھی۔ حمام کی دیواریں گرم تھیں۔ پھر اس نے حوض کے پانی کو چھو کر دیکھا۔ وہ پانی مناسب حد تک گرم تھا۔ حمام میں داخل ہو کر اسے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ باہر اس قدر سردی ہے۔

حمام کے ایک طرف بڑا آئینہ فریم شدہ لکڑی کے سٹینڈ میں لگا ہوا تھا۔ اس فریم کو آگے

پیچھے اپنی مرضی کے مطابق کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سٹینڈ اور تھا جس پر بڑے سائز کا نرم ملائم تولیہ پڑا ہوا تھا۔ لکڑی کے ایک خانے میں چند جوڑے کپڑے موجود تھے۔

ساحل عمر جب اپنے گرم کپڑے اتار کر حوض میں داخل ہوا تو تب اسے پانی کی روانی کا اندازہ ہوا۔ یہ حوض کسی بہتے چشمے کی طرح تھا۔ حوض کی گہرائی کہیں کم اور کہیں زیادہ تھی۔ بندہ اپنی مرضی سے پانی کی گہرائی کا انتخاب کر سکتا تھا۔

ساحل عمر کے لئے اس طرح کے حمام میں غسل ایک نیا تجربہ تھا اور بہت خوشگوار...... رشا ملوک نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ حمام اس قدر خوبصورت اور خوشگوار تھا کہ یہاں سے نکلنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔

جب وہ حمام سے باہر آیا تو بے حد تروتازہ تھا۔ اسے زبردست بھوک لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں آ کر وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کمرے میں کسی قسم کا کوئی فرنیچر نہ تھا لہٰذا اس نے بستر پر بیٹھ کر کمبل اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔

وہ تعویذ اس کے گلے میں موجود تھا۔ پچھلا تعویذ جو عابد منجم نے دیا تھا اسے وہ نہاتے وقت اتار دیا کرتا تھا تاکہ بھیگ نہ جائے۔ وہ تعویذ کپڑے میں سلا ہوا تھا۔ اتارنے کی وجہ سے ایک دن وہ تعویذ رشا ملوک کی تصویر پر ٹنگا رہ گیا اور وہ برکھا کے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس تعویذ کو کسی قیمت پر گلے سے نہیں اتارے گا۔ ویسے بھی یہ تعویذ چاندی کے خول میں بند تھا۔

تعویذ کے حوالے سے اسے رشا ملوک کی تصویر یاد آئی جس کے بارے میں اماں نے بتایا تھا کہ اسے بازغر لے اڑا۔ وہ اس سلسلے میں بازغر سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن باوجود کوشش کے نہیں کر سکا تھا۔ پتہ نہیں اب بازغر سے اس کی ملاقات ہو گی یا نہیں۔ اگر وہ کہیں نظر آ گیا تو وہ اس مسئلے پر اس سے ضرور باز پرس کرے گا۔

ابھی وہ انہی خیالات میں غلطاں تھا کہ بڑی آہستگی سے دروازہ کھلا۔ سب سے پہلے ساحل عمر کی نظر ٹرے پر پڑی پھر ٹرے اٹھانے والی پر پڑی۔ ٹرے میں ناشتہ تھا لیکن ٹرے اٹھانے والی رشا ملوک نہ تھی۔ وہ کوئی اور لڑکی تھی۔ جو بھی تھی اچھی پیاری سی تھی۔ اس لڑکی کے پیچھے رشا ملوک تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھالی تھی۔

وہ دونوں ہنستی مسکراتی اندر آئیں۔ اس لڑکی نے بیضوی ٹرے اس کے سامنے رکھی اور پھر پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ تب رشا ملوک آگے بڑھی۔ وہ ٹرے کے نزدیک ہی بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھالی ٹرے کے برابر رکھ دی اور من موہنے انداز میں مسکرائی۔

''ناشتہ فرمائیے!'' اس نے شیریں لہجے میں کہا۔

ٹرے میں دو پلیٹوں میں پھل سجے تھے اور درمیان میں دودھ سے بھرا گلاس موجود تھا۔ تھالی میں کیک جیسی کوئی چیز تھی۔ اسی کے ساتھ ایک چمکتی چھری رکھی تھی۔

''تم نے ناشتہ کر لیا۔'' ساحل عمر نے ناشتے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''جی کب کا؟'' رشا ملوک نے بولی۔

"میرے ساتھ نہیں کرو گی۔"

"ناشتہ تو نہیں کروں گی لیکن اس ناشتے کی ابتداء مجھ سے ہو گی۔" اس نے عجیب بات کہی۔

"دانا یہ شگون کی روٹی ہے اسے کاٹ کر پہلے آپ کو اپنے ہاتھ سے رشا ملوک کو کھلانا ہو گی۔" اس مرتبہ وہ لڑکی بولی جو رشا ملوک کے ساتھ آئی تھی۔

یہ سن کر رشا ملوک نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے چہرے پر شرم چھا گئی تھی۔

"یہ کون ہیں؟" ساحل عمر نے رشا ملوک سے پوچھا۔

"یہ مویا ہے' میرے بچپن کی سہیلی...... آپ کو پسند آئی۔" رشا ملوک نے اپنی گھنیری پلکیں جھکائیں۔

"ہاں اچھی ہے۔" ساحل عمر نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔

تب رشا ملوک مویا سے مخاطب ہوئی۔ "اور مویا تجھے میرا مور پسند آیا؟"

"ہاں بہت...... واقعی یہ تو خوابوں کا شہزادہ ہے۔ کوئی خواب زادہ۔" مویا نے خوش ہو کر کہا۔

"ہے ناں......انوکھا۔" رشا ملوک اس کے منہ سے تعریف سن کر کھل اٹھی۔ "سب سے الگ' سب سے جدا' بستی میں ہے کسی کا ایسا مور؟"

"نہیں بالکل نہیں۔" مویا نے زور زور سے گردن ہلائی۔

"خدا کے واسطے رشا ملوک میرے پاؤں زمین پر ہی رہنے دو۔ مجھے اتنا اونچا نہ اڑاؤ کہ میں زمین پر پاؤں رکھنا ہی بھول جاؤں۔" ساحل عمر نے انکساری سے کہا۔

"دانا' زمین تو آپ کے پاؤں سے کب کی نکل چکی ہے۔ اب تو آپ کے پاؤں چاند پر پڑ رہے ہیں۔" رشا ملوک کے بجائے مویا نے جواب دیا۔

"مویا چل چپ ہو جا...... انہیں بھوک لگی ہو گی' ناشتہ کرنے دے۔" وہ راز کھولنے لگی تھی' اسے خاموش کرنا ضروری تھا۔

"میں نے دانا کا ہاتھ تو نہیں پکڑا ہوا...... یہ چھری اٹھا کر شگون کی روٹی کاٹتے کیوں نہیں۔" مویا نے یاد دلایا۔ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"اوہ اچھا!" ساحل عمر نے شگون کی روٹی کی تھالی اپنے آگے کھسکا لی اور چھری سے کیک کی طرح اس کا ایک چھوٹا سا پیس کاٹا اور اسے اپنے ہاتھ میں اٹھا کر بولا۔ "لو رشا ملوک اپنا نازک سا منہ کھولو۔"

رشا ملوک نے فوراً اپنا منہ کھول دیا اور تھوڑا سا جھک کر شگون کی روٹی کا پیس منہ میں لے لیا اور بڑی شائستگی سے منہ چلانے لگی۔ پھر بولی۔ "چل مویا۔"

مویا فوراً رشا ملوک کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

تب رشا ملوک ساحل عمر سے مخاطب ہوئی۔ "اسے بھی شگون کی روٹی کھلائیے۔"

"اسے بھی میں کھلاؤں؟" ساحل عمر حیران ہوا۔

''جی اسے بھی آپ کھلائیں گے۔ یہ میری بچپن کی سہیلی ہے آخر......''

''اچھا۔'' یہ کہہ کر ساحل عمر نے اس ''روٹی'' کا ایک ٹکڑا اور کاٹا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ مویا نے فوراً بڑا سا منہ پھاڑ دیا اور پھر وہ رشا ملوک اور ساحل عمر کی خوشگوار زندگی کی دعائیں دیتی مزے سے کھانے لگی۔

''اب آپ ناشتہ کیجئے۔ ہم چلتے ہیں۔'' رشا ملوک کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے ساتھ مویا بھی کھڑی ہو گئی اور پھر وہ دونوں خاموشی سے کمرے سے نکل گئیں۔ وہ بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ رشا ملوک بھی جواباً اسے ''شگون کی روٹی'' کھلائے گی......لیکن ایسا کچھ نہ ہوا' تب اس نے تھالی میں رکھی سنہری گول روٹی کا ایک پیس کاٹا اور منہ میں رکھ لیا۔ وہ بناوٹ کے اعتبار سے سادہ کیک جیسی تھی لیکن اس کا ذائقہ انوکھا تھا۔

اس نے سیر ہو کر ناشتہ کیا۔ پھلوں کی حلاوت اور شیرینی کا کوئی جواب نہ تھا۔ دودھ کی خوشبو اور ذائقہ بالکل جدا تھا۔ اس ناشتے نے اس کے دل کو فرحت بخش دی تھی۔

دوپہر کا کھانا بھی بڑا لذیذ تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد قہوہ دیا گیا تھا۔ اس قہوہ کی خوشبو دیر تک اس کے منہ میں بسی رہی۔

جب سورج پہاڑوں کی اوٹ میں چھپ گیا تو رشا ملوک اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اکیلی نہ تھی۔ اس کے ساتھ بازغر تھا۔ وہ بازغر کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس نے چاہا کہ اس سے پوچھے کہ وہ جھیل سیف الملوک پر اسے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا لیکن وہ باوجود کوشش کے سوال نہ کر پایا۔ بازغر نے اپنی موٹی اور غلافی آنکھوں سے بس ایک بار اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیا بات تھی کہ اس کے ذہن میں اٹھنے والے سارے سوال بھاپ کی طرح اڑ گئے تھے۔

''بابا صاعق کی مختاری پر چلنا ہے۔'' بازغر نے اسے اپنی تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلیں۔'' ساحل عمر بستر سے فوراً کھڑا ہو گیا۔

''یہ لیں۔'' رشا ملوک نے اس کی طرف ایک چھوٹا سا مخملی ڈبہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے؟''

''یہ بابا صاعق کی نذر ہے۔'' رشا ملوک بولی۔

''آپ بازغر کے ساتھ چلیں' یہ آپ کو بہت احتیاط سے بابا کی مختاری پہنچا دے گا۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میں آپ کو وہیں ملوں گی۔''

''آئیے' ساحل صاحب۔'' بازغر نے اسے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

ساحل عمر جب دروازے سے باہر نکلا تو اسے سیڑھیوں کے سامنے ایک گاڑی نظر آئی۔ وہ چھ سات سیڑھیاں اتر کر اس کے نزدیک پہنچا۔ یہ ایک بیل گاڑی جیسی چیز تھی لیکن اس میں بیل کے بجائے سفید گھوڑا جتا ہوا تھا۔ ساحل عمر کو بازغر نے گاڑی پر چڑھنے میں مدد کی پھر وہ خود گاڑی بان کی جگہ بیٹھ گیا اور اس نے اگلے پچھلے دونوں پردے گرا دیئے۔ ساحل عمر کسی پردے والی خاتون کی طرح

گاڑی میں بند ہو گیا۔
چند لمحوں بعد بازغر نے پردے کے باہر ہی سے پوچھا "چلوں جناب!"
"ہاں چلو۔" گاڑی کے اندر سے جواب آیا۔
تب بازغر نے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکالی۔ ساحل عمر کو ایک دم جھٹکا لگا۔ اس نے گاڑی کو مضبوطی سے تھام لیا۔ گاڑی نے دیکھتے ہی دیکھتے رفتار پکڑ لی۔ یہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس گاڑی میں گھوڑا جتا ہوا ہے۔ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی موٹر کار پر بیٹھا ہے۔ گاڑی میں گھوڑا جتا ہوا تھا لیکن اس کی ٹاپوں کی آواز قطعاً نہیں آ رہی تھی۔ اور یہ بات بہت حیرت میں ڈالنے والی تھی۔
ساحل عمر نے ذرا سا پردہ ہٹا کر باہر کا جائزہ لیا۔ باہر بالکل اندھیرا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گاڑی کسی سرنگ میں سے گزر رہی ہو۔
کچھ دیر کے بعد گاڑی کی رفتار کم ہوئی۔ ٹاپوں کی آواز بھی آنے لگی۔ پھر گاڑی دھیمی ہوتے ہوئے ایک دم رک گئی۔
"آیئے ساحل صاحب!" بازغر کی آواز آئی تو وہ پردہ ہٹا کر گاڑی سے نیچے کود آیا۔
نیچے اتر کر اس نے چاروں طرف دیکھا تو خود کو کسی عمارت کے احاطے میں پایا۔ سامنے ایک بڑی سی گنبد نما عمارت تھی۔ اس میں ایک بڑا سا دروازہ تھا اور ایک چھوٹی سڑک تھی جس کے دونوں طرف ستونوں میں روشنیاں لگی تھیں۔ یہ سڑک اس عمارت تک گئی تھی۔
بازغر اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس گنبد نما عمارت کے بڑے سے گیٹ میں داخل ہو گئے جو کھلا ہوا تھا۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی ساحل عمر کی نظر رشا ملوک پر پڑی۔ وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ آگے بڑھی۔ "آپ آ گئے۔" رشا ملوک قریب آ کر بولی۔
"جی۔" ساحل عمر بولا۔ وہ حیران تھا کہ رشا ملوک اس سے پہلے کس طرح مختاری پہنچ گئی۔
"اندر میری ضرورت تو نہیں۔" بازغر رشا ملوک سے مخاطب تھا۔
"نہیں...... تم باہر کٹاری میں بیٹھو۔" رشا ملوک نے جواب دیا۔ "اگر تمہاری کوئی ضرورت ہوئی تو تمہیں اشارہ مل جائے گا۔"
"ٹھیک ہے۔" بازغر نے مودبانہ انداز میں کہا اور پھر وہ واپس چلا گیا۔
"آیئے۔" رشا ملوک نے اپنی بڑی بڑی چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔
ساحل عمر خاموشی سے اس کے ساتھ ہو گیا۔ رشا ملوک مختلف راہداریوں سے گزرتی ہوئی بالآخر ایک دروازے پر ٹھہر گئی۔ دروازے پر لوہے کا ایک موٹا کڑا لگا ہوا تھا۔ اس نے چار مرتبہ اس کڑے کو دروازے پر مارا اور پھر ساحل عمر کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔
چند لمحوں بعد اس دروازے کے دونوں پٹ ایک ساتھ کھلے۔ دروازہ کھولنے والا نظر نہ آیا۔ شاید دروازہ کھولنے والے کواڑوں کے پیچھے چلے گئے تھے۔
دروازہ کھلتے ہی سامنے بابا صاعق نظر آئے۔ وہ ایک اونچی کرسی پر بیٹھے تھے۔ یہ ایک مرصع کرسی تھی۔ اس پر قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ یہ کرسی دو فٹ اونچے چبوترے پر رکھی ہوئی تھی۔ چبوترے

پر ایک بہت خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا اور اس چبوترے پر کرسی کے ساتھ لگا جھکال بیٹھا ہوا تھا۔ بابا صاعق کا ایک ہاتھ اس کے سر پر تھا اور وہ بار بار اپنی زبان باہر نکال کر اپنے منہ پر پھیر رہا تھا۔ بابا صاعق کی پشت پر ایک بڑا آتش دان تھا جس میں آگ روشن تھی۔ بابا صاعق ان دونوں کو آتا دیکھ کر مسکرائے۔

رشا ملوک کرسی کے ایک طرف بابا صاعق کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ بابا صاعق نے اپنا دوسرا ہاتھ رشا ملوک کے سر پر رکھ دیا۔ اب ساحل عمر آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں مخملی ڈبہ تھا۔ وہ ڈبہ اس نے چبوترے کے قریب ہو کر بابا صاعق کی طرف بڑھایا۔

"ساحل عمر اس ڈبے کو کھول۔" بابا صاعق نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

یہ ایک ایسا ڈبہ تھا جس میں عام طور پر زیورات رکھے جاتے ہیں۔" ساحل عمر نے اس کا ڈھکن اٹھایا تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ڈبہ کے درمیان میں ایک بڑا سا ہیرا رکھا تھا۔ اس ہیرے سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ساحل عمر نے ہیرا دیکھ کر ڈبے کا رخ بابا صاعق کی طرف کر دیا۔

بابا صاعق نے ڈبے کی طرف ایک نظر کی اور پھر شیریں لہجے میں بولے۔"نذر نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ۔"

ساحل عمر نے وہ ہیرا ڈبے سے نکال کر بابا صاعق کے پھیلے ہاتھ پر رکھ دیا اور خالی ڈبہ بند کر کے ان کے قدموں میں ڈالنے لگا تو رشا ملوک نے اس ڈبے کو تھام لیا۔

بابا صاعق نے اپنے ہاتھ پر رکھے ہیرے کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ کچھ ہی دیر میں ان کے ہاتھ پر رکھا ہوا ہیرا پگھل گیا۔ پانی ہو گیا۔ بابا صاعق نے دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی اس پانی میں بھگوئی اور رشا ملوک سے مخاطب ہو کر بولے۔"رشا ملوک سامنے آ۔"

رشا ملوک ان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی تھی فوراً اس نے رخ بدل لیا۔ اب اس کا چہرہ بابا صاعق کے سامنے تھا۔ انہوں نے اپنی بھیگی ہوئی انگلی اس کی مانگ میں پھیری۔ انہوں نے کئی مرتبہ ایسا کیا یہاں تک کہ رشا ملوک کی مانگ کے بال اچھی طرح اس ہیرے کے پانی میں بھیگ گئے۔

پھر انہوں نے ساحل کو آگے آنے کو کہا۔ رشا ملوک پھر ان کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"اپنا سینہ کھول۔" بابا صاعق ساحل عمر سے مخاطب ہوئے۔

ساحل عمر نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سینے کے سامنے سے لباس ہٹا دیا۔ گورے بدن پر گھنے سیاہ بال سامنے آگئے۔ پھر بابا صاعق نے اپنی ہتھیلی کا بقیہ پانی اپنی انگلی سے سینے کے بالوں پر لگا دیا۔ یہ پانی انہوں نے چھوٹے سے دائرے کی صورت میں لگایا۔ پانی لگاتے ہوئے وہ زیر لب کچھ پڑھتے جا رہے تھے۔

پھر یہ عمل ختم ہوا۔"

ان کے ہاتھ پر اب بھی تھوڑا سا پانی لگا ہوا تھا۔ ان کی ہتھیلی گیلی تھی۔ تب انہوں نے اپنا ہاتھ جھکال کے سامنے کر دیا۔ جھکال نے فوراً اپنی لمبی زبان نکال کر گیلی ہتھیلی کو چاٹ لیا۔ جھکال نے ان کی ہتھیلی مزید گیلی کر دی۔ تب انہوں نے اپنا ہاتھ جھکال کے بالوں سے صاف کیا۔ جھکال دوبارہ

ان کے قدموں میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
اس کے بعد وہ کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ رشا ملوک بھی فوراً ان کے قدموں سے اٹھ گئی۔
بابا صاعق ایک قدم آگے بڑھے۔ پھر انہوں نے رشا ملوک کو اشارہ کیا۔ وہ ساحل عمر کے برابر کھڑی ہو گئی۔ بابا صاعق نے اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلائے۔ رشا ملوک نے اپنا بایاں ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ساحل عمر نے اس کی دیکھا دیکھی اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور ان کے داہنے ہاتھ پر رکھ دیا۔
اتنے میں تہکال جو بڑے اطمینان سے اپنی ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا' ایک دم اٹھا اور پھر پلٹ کر واپس چلا۔ اس نے چبوترے سے چھلانگ لگائی۔ ساحل عمر نے اسے ذرا سا جھک کر دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ آتش دان کی دیوار سے ٹکرا کر پیچھے گرے گا لیکن ایسا نہ ہوا وہ بھڑکتی آگ اور پتھر کی دیوار دونوں سے گزر کر ایک ساعت میں غائب ہو گیا۔ تہکال واقعی کوئی انوکھی شے تھا۔
بابا صاعق کے ہاتھ پر دونوں کے ہاتھ رکھے تھے اور انہوں نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ساحل عمر ان کے ہونٹوں کو ہلتا ہوا بغور دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر پڑھنے کے بعد انہوں نے اچانک آنکھیں کھولیں اور دھیرے سے بولے۔ ''میرے ہاتھ پر جو آیا ہے اسے اٹھا کر مٹھیاں بند کر لو۔''
ساحل عمر اور رشا ملوک نے ایسا ہی کیا۔ بابا صاعق تب پیچھے ہٹے اور پھر سے کرسی پر براجمان ہو گئے اور بولے۔ ''چلو دونوں مٹھیاں کھولو۔''
دونوں نے اپنی اپنی مٹھیاں کھولیں تو دونوں کی ہتھیلی پر ایک چھوٹا سا سرخ رنگ کا بیضوی پتھر نظر آیا۔
رشا ملوک کے چہرے پر ایک دم مسرت کی لہر دوڑ گئی۔
''اے رشا تجھے مبارک ہو...... اے ساحل تجھے مبارک ہو...... وقت نے اپنا فیصلہ دے دیا۔ تم دونوں یک رنگ ہو گئے۔'' بابا صاعق کے لہجے میں خوشی تھی۔
''بابا صاعق...... یہ سب آپ کی دعاؤں کا اثر ہے۔'' رشا ملوک ممنون انداز میں بولی۔
''بابا' ہم آپ کے مشکور ہیں۔'' ساحل عمر نے احسان مندی سے کہا۔
''ساحل اس پتھر کو چاندی کی انگوٹھی میں جڑوا لینا اور رشا تجھے یہ پتھر گلے میں ڈالنا ہو گا۔'' بابا نے ہدایت کی۔
''ٹھیک ہے بابا۔'' دونوں نے بیک وقت اقرار کیا۔
''جب تک وقت تم دونوں کے ساتھ رہے گا ان پتھروں کا رنگ نہ بدلے گا۔ اور جب وقت بدلے گا تو وقت کے ساتھ ہی پتھروں کا رنگ بھی تبدیل ہو جائے گا۔ یہ لال سے کالے ہو جائیں گے۔'' بابا صاعق نے انکشاف کیا۔
''بابا آپ ہمارے لئے دعا کریں گے کہ وقت کبھی نہ بدلے۔'' رشا ملوک نے فکر مندی سے کہا۔
''میری دعا تم دونوں کے ساتھ ہے۔ اچھا رشا اب رخصت...... تجھے تیرا مور مبارک ہو۔''

بابا صاعق یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک وہ دونوں کمرے سے باہر نہ نکل گئے۔

رشا ملوک نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور مسکرا کر ساحل عمر کی طرف دیکھا۔

اس شرمیلی مسکراہٹ میں جانے کتنے دلوں کی جان تھی۔ کتنے موسموں کی بہار تھی، کتنے پھولوں کی خوشبو تھی، کتنی تتلیوں کے رنگ تھے۔ غرض اس ایک مسکراہٹ میں جانے کتنی عشقیہ داستانیں تھیں۔

ساحل بھی جواباً مسکرایا اور اس کی طرف بڑی محبت سے ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ اسے چھونا چاہتا تھا۔

رشا ملوک ایک دم گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ''نہیں۔''

''کیا ہوا؟'' ساحل عمر اس طرح گھبرا کر پیچھے ہٹتے دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا۔

''آپ پتھر کے ہو جائیں گے۔'' رشا ملوک نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''مذاق کرتی ہو۔'' وہ ہنسا۔

''نہیں سچ کہتی ہوں...... میں بالکل سنجیدہ ہوں اور یہ بات انتہائی توجہ طلب ہے۔'' رشا ملوک خوفزدہ تھی۔

''چلو میں نہیں چھوؤں گا...... لیکن آخر کب تک؟''

''اس وقت تک جب تک میں خود آپ کا ہاتھ نہ پکڑوں۔'' رشا ملوک نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھا۔ ''جشن کی رات میں خود آپ کا ہاتھ پکڑ کر گلن زار میں داخل ہوں گی۔ پھر اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہے لے جایئے گا۔''

''اچھا ہوا! تم نے بتا دیا ورنہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا۔''

پھر رشا ملوک اس عمارت کے گیٹ تک اس کے ساتھ آئی۔ گیٹ پر بازغر موجود تھا۔ اس نے ساحل عمر کو بازغر کے حوالے کیا اور خود واپس پلٹ گئی۔

بازغر اور ساحل عمر اس گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھے جس کا نام کٹاری تھا۔ راستے میں بازغر نے پوچھا۔ ''نذر ہو گئی۔''

''ہاں ہو گئی۔'' ساحل عمر نے بتایا۔

''مٹھی میں کیا نکلا۔'' اس نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

''لال پتھر۔'' ساحل عمر نے مختصر جواب دیا۔

''دونوں پتھروں کا رنگ ایک ہی تھا؟'' پھر سوال ہوا۔

''ہاں ایک ہی تھا۔'' جواب دیا گیا۔

''آپ خوش قسمت ہیں...... آپ کو مبارک ہو۔'' بازغر نے خوش ہو کر کہا۔

''بازغر ایک بات بتائیں۔'' کیا مختلف رنگوں کے پتھر بھی نکلتے ہیں؟'' ساحل عمر نے اپنی معلومات میں اضافہ چاہا۔

''جی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ آپ کو وقت نے بچالیا۔'' بازغر نے کہا۔
''ورنہ کیا ہوتا؟'' وہ پریشان ہوا۔
''آپ کے لئے برف میں قبر کھودی جاتی اور اس میں زندہ دفن کر دیا جاتا۔'' بازغر نے انکشاف کیا۔
''اور رشا ملوک پر کیا گزرتی؟'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔
''اسے بستی سے نکال دیا جاتا۔'' بازغر نے بتایا۔
''اس طرح تو وہ خود بخود اعور کے قبضے میں چلی جاتی۔''
''وہ اعور کے قبضے میں جاتی یا کوئی اور اس پر قبضہ کرتا...... بستی والوں کو اس کی فکر نہ ہوتی۔''
''بڑے ظالم ہو تم لوگ۔'' ساحل عمر نے اسے گھور کر دیکھا۔
''نہیں جناب ہم ظالم نہیں وقت کے فیصلے کے پابند ہیں۔ وقت سے کون لڑ سکتا ہے۔''
باتیں کرتے ہوئے وہ کٹاری کے نزدیک آ پہنچے۔ بازغر نے ساحل کو گھوڑا گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً پہیئے پر پاؤں رکھ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بازغر نے پردہ ڈال دیا اور خود بھی اچک کر کٹاری پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد کٹاری ہوا سے باتیں کرنے لگی۔
پھر وہ جلد ہی اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔
کوئی آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ اپنے گول کمرے میں ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا کرے اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ اس نے ٹہلتے ٹہلتے آواز لگائی۔
''دروازہ کھلا ہے۔ آ جاؤ بھائی۔''
فوراً ہی دروازہ کھلا تو مویا کی مسکراتی صورت نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھال تھا۔ اس تھال میں ابلے ہوئے چاول اور اس پر سالم مرغی رکھی ہوئی تھی۔ تھال کے کنارے پر پانچ کٹوریاں تھیں۔ جس میں مختلف اقسام کی چٹنیاں اور مرچ مصالحے بھرے ہوئے تھے۔
''رشا کے مور...... آپ کے لئے کھانا۔'' مویا ہنس کر بولی۔ ''کہاں رکھوں؟''
''رشا کی سہیلی...... جہاں چاہے رکھ دو...... کھانے کا شکریہ!''
''بے شک میں رشا کی سہیلی ہوں لیکن میرا بھی ایک نام ہے...... مجھے مویا کہو۔''
''بے شک میں رشا کا مور ہوں لیکن میرا بھی ایک نام ہے...... مجھے ساحل عمر کہو۔''
ساحل عمر کا ترکی بہ ترکی جواب سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ ''بڑے باتونی ہیں...... اچھا ہے رشا ملوک کا دل لگا رہے گا۔ وہ بہت کم گو ہے۔''
مویا نے وہ تھال ساحل عمر کے بستر پر ہی رکھ دیا۔ ساحل عمر نے ایک نظر تھال پر ڈالی۔ یہ عجیب وغریب ڈش تھی۔ اسے بڑی شدید بھوک لگی تھی۔ وہ ہاتھ دھو کر کھانے بیٹھا تو اندازہ ہوا کہ وہ ابلے ہوئے چاول انتہائی خوشبودار اور لذیذ تھے۔ مرغی اتنی خستہ کہ ہاتھ کے اشارے سے ٹوٹ رہی تھی۔ اس پر مرچ مصالحے اور چٹنیاں۔ اس نے خوب مزے لے کر اور خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ وہ پوری مرغی اور آدھے سے زیادہ چاول کھا گیا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا اس کی بھوک خوب کھل گئی تھی

لیکن اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ اس کی بھوک اتنی کھل گئی ہے کہ وہ پوری مرغی با آسانی چٹ کر جائے گا اور ڈکار بھی نہیں لے گا۔

مویا اسے بڑی دلچسپی سے کھاتا دیکھتی رہی۔ ایک چھوٹی بوتل جو شیشے کی تھی اس میں پانی تھا۔ اس نے پانی پیا۔ یہ پانی خوش ذائقہ اور خوشبودار تھا۔

''اب آپ یقیناً قہوہ پینا چاہیں گے۔'' مویا نے تھال اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یقیناً!'' ساحل عمر نے بڑے زور سے گردن ہلائی۔

''پھر میرے پیچھے پیچھے آ جائیے۔'' مویا یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

جب ساحل عمر اس کے پیچھے پیچھے دروازے سے باہر نکلا تو چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ سردی بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے اپنے سر پر جمی بالوں والی ٹوپی کو مزید جمایا' کوٹ کا کالر ٹھیک کیا اور اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈال لئے۔ تھوڑا آگے جانے پر ایک لڑکی کھڑی دکھائی دی۔ اس نے مویا سے وہ تھال لے لیا اور ایک طرف چلی گئی۔

ساحل عمر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ پھر ایک چھوٹا سا مینار نظر آیا۔ وہ اس کا دروازہ کھول کر داخل ہو گئی۔ ساحل عمر کا خیال تھا کہ مینار میں اوپر جانے کا زینہ ہو گا لیکن ایسا نہ تھا اس میں سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ یہ ایک کشادہ زینہ تھا۔ زینہ کے بعد ایک چوڑا راستہ دکھائی دیا۔ اس راستے میں اچھی خاصی روشنی تھی۔

کچھ دور چلنے کے بعد یہ راستہ آگے بند ہو گیا تھا۔ سامنے ایک بڑا سا لکڑی کا چمکدار محرابی دروازہ تھا۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔

''آیئے!'' مویا نے اس سے مڑ کر کہا۔

جب ساحل عمر اندر آ گیا تو مویا نے دروازہ بند کر دیا۔ ساحل عمر نے اس ہال نما کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر ایک مقام پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔ وہ حیران ہو کر دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

اس کے بالکل سامنے رشا ملوک کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ یہ پینٹنگ اس کی بنائی ہوئی تھی۔ یہ وہ تصویر تھی جسے بازغر اس کے گھر سے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اٹھالایا تھا۔

یہ کمرہ ساحل عمر کے کمرے جیسا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس سے چار گنا بڑا تھا۔ وہی طرز تعمیر پتھر کی دیواریں گنبد نما چھت جو اطراف سے کھلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کوئی نہ تھی۔ البتہ دروازے تین تھے۔ دیوار سے دیوار تک قالین دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی سات اونچی کرسیاں' ان کے سامنے ایک بیضوی میز ایک طرف دو فٹ اونچا بستر' سرہانے کی طرف سے گول اور آگے سے مستطیل۔ اس پر آسمانی رنگ کی چادر' گہرے نیلے گاؤ تکیے موجود تھے۔ دروازوں پر پردے نہ تھے لیکن دروازے اتنے چمکیلے تھے لگتا تھا آج ہی پالش کی گئی ہو۔

''آپ تشریف رکھئے...... چاہے کرسی پر' چاہے بستر پر۔ میں چلتی ہوں۔ رشا ملوک آ کر آپ کو قہوہ پلائے گی۔ وقت آپ کی نگہبانی کرے۔'' یہ کہہ کر وہ جس دروازے سے آئی تھی اسی دروازے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد وہ اپنی بنائی ہوئی تصویر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ رشا ملوک کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ وہ تصویر تھی جس نے ایک فسانے کو جنم دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا جس مثالی لڑکی کے وہ خواب دیکھ رہا ہے وہ واقعی کہیں موجود ہو گی۔ آئیڈیل کے بارے میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی نہیں ملتے۔ اگر وہ مل جائے تو پھر آئیڈیل نہیں رہتا لیکن اس کے خوابوں میں بسنے والی تو حقیقت کا روپ دھار گئی تھی۔ وہ مجسم ہو کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔ وہ اس قدر پیاری تھی کہ اس پر دیوان پر دیوان لکھے جا سکتے تھے۔ وہ شاعر نہیں تھا مصور تھا۔ اس لئے اس نے اسے رنگوں میں ڈھال لیا تھا لیکن یہ رنگ تو کچھ بھی نہ تھے۔ جو رنگ اصل میں تھے اوپر والے نے اسے جو روپ دیا تھا' اس کی نقل تو ممکن ہی نہ تھی۔

رشا ملوک کی تصویر کو وہ بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ کسی نے بڑی آہستگی اور شائستگی سے کہا۔ ''کیا دیکھتے ہیں؟''

وہ اس مانوس آواز پر پلٹا تو اس نے رشا ملوک کو اپنی پشت پر پایا۔ پھر وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں دیکھتا ہوں اور کسے دیکھوں گا۔''

''آیئے ادھر میز پر آ جائیے۔ آپ کیلئے قہوہ لائی ہوں۔'' رشا ملوک نے میز کی طرف اشارہ کیا۔

ساحل عمر خاموشی سے میز کی طرف چل دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا پھر بولا۔''رشا ملوک یہ تصویر تمہارے پاس کیسے آئی؟''

''میری تصویر تھی، میں نے اپنے بندے سے اسے منگوالی۔'' رشا ملوک نے بڑے فخریہ انداز میں اور بے نیازی سے کہا۔

''منگوالی یا چروالی...... منگوانے اور چرانے میں بڑا فرق ہے۔''

''ہو گا۔'' وہ شرارت سے ہنسی ''ہم تو ہیں ہی سدا کے چور...... دیکھیں ناں...... یہ تصویر ہی کیا ہم نے تو آپ کو بھی منگوالیا۔ ہمارا مطلب ہے چروالیا۔''

''یہ چوری تمہاری عادت ہے یا پیشہ ہے۔'' ساحل عمر نے قہوہ پیتے ہوئے کہا۔

''جو آپ سمجھ لیں...... ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ ہم آپ کے دیوانے ہیں اور محبت آدمی سے بہت کچھ کروا لیتی ہے۔'' رشا ملوک نے اپنی آنکھیں جھکا کر کہا۔ اس کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

''رشا ملوک یہ تمہارا کمرہ ہے؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''رشا ملوک کیا یہ تمہارا گھر ہے؟''

''ہاں۔''

''کیا تم اکیلی رہتی ہو؟ تمہارا کوئی نہیں...... میرا مطلب ہے تمہارے ماں باپ؟''

''ماں ہیں...... والد ہیں والد کا نام سمار ملوک ہے۔ وہ اس بستی کے رمز شناس ہیں۔ آپ انہیں سردار سمجھ لیں۔ وہ سچے خواب دیکھتے ہیں۔ ان خوابوں کی بنیاد پر وہ پیشگوئی کر گئے ہیں۔ وہ آج تک سیکڑوں پیشگوئیاں کر چکے ہیں جو سب کی سب سچ ثابت ہوئی ہیں۔'' رشا ملوک نے بتایا۔

''کیا ان سے میری ملاقات نہیں ہو سکتی؟''

''ہاں، کیوں نہیں...... یہاں آپ کو بلایا ہی اس لئے گیا ہے۔'' رشا ملوک نے انکشاف کیا۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ رشا ملوک دستک کی آواز سن کر فوراً کھڑی ہو گئی۔ ''لیجئے وہ آ گئے۔''

اس کمرے میں تین دروازے تھے اور تینوں برابر برابر تھے۔ رشا ملوک تیزی سے چلتی ہوئی درمیان کے دروازے کے پاس پہنچی پھر اس نے دروازے کو کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی جو شخص مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا اسے دیکھ کر ساحل عمر کو رشا ملوک کی بنائی ہوئی تصویر یاد آ گئی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا پرکشش مرد تھا۔ سر پر آسمانی رنگ کا صافہ...... بند گلے کا کوٹ، کوٹ کے کالر پر دو ہیرے جڑے ہوئے گلے میں ایک کالی ڈوری میں بندھی انگوٹھی۔ یہ چاندی کی انگوٹھی تھی جس میں سبز رنگ کا گول پتھر لگا ہوا تھا۔ کوٹ اور پینٹ کا رنگ گرے تھا۔ ساحل عمر کی سمجھ میں اب آیا کہ رشا ملوک نے اس کی تصویر کو کس

کا لباس پہنا دیا تھا۔
تو اس شخص کے ہاتھوں میں ننگی تلوار تھی۔ یہ تلوار اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھی۔ اس تلوار کا رخ چھت کی طرف تھا۔ کمرے کے اندر آ کر سمار ملوک نے تلوار ایک ہاتھ میں لے لی اور اس کا رخ زمین کی طرف کر لیا پھر وہ وہیں ٹھہر گیا۔ رشا ملوک تیزی سے آگے بڑھی۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکی اور اس نے اپنے باپ کا خالی ہاتھ بڑے احترام سے چوما اور پھر کھڑی ہو گئی۔

ساحل عمر، سمار ملوک کو اندر آتا دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب ساحل عمر اس کے نزدیک پہنچ گیا تو اس نے تلوار والا ہاتھ بڑی مستعدی سے آگے بڑھا دیا۔ تلوار کا رخ چھت کی طرف تھا۔

ساحل عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس بات کا کیا مطلب ہے۔ کیا وہ ہاتھ بڑھا کر تلوار لے لے۔ ساحل عمر کو تذبذب میں دیکھ کر رشا ملوک نے کہا۔ ''احترام دیجئے۔''

ساحل عمر کی سمجھ میں بات نہ آئی کہ وہ احترام کس طرح دے۔ اتنے میں رشا ملوک پھر بولی۔ ''ویسا احترام جیسا میں نے دیا۔''

''اچھا!'' ساحل عمر نے کہا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ کیا کرنا ہے۔ اس نے سمار ملوک کا ہاتھ چومنا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ کون سا ہاتھ چومے۔ وہ ہاتھ جس میں تلوار ہے یا وہ ہاتھ جو خالی ہے۔ سمار ملوک نے اسے دیکھ کر تلوار والا ہاتھ بڑھایا تھا لہٰذا اس نے سوچا کہ اسی ہاتھ کو بوسہ دینا ہے اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو رشا ملوک اشارہ کر دے گی۔

ساحل عمر نے جھک کر تلوار والے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے چوما اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ کو چومتے ہی ساحل عمر نے دیکھا کہ سمار ملوک نے تلوار کا رخ فرش کی طرف کر لیا ہے۔ پھر وہ تلوار نیچی کئے کرسیوں کی طرف بڑھا اور پہلی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تلوار اس نے میز پر رکھ دی۔

رشا ملوک اور ساحل عمر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ سمار ملوک نے بغور ساحل عمر کی طرف دیکھا۔ سمار ملوک کی آنکھوں میں ہیرے کی سی چمک تھی۔ اس سے آنکھیں ملانا مشکل تھا۔ ساحل عمر نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

''اپنی آنکھیں اٹھا...... مجھے دیکھ۔'' سمار ملوک کی بارعب آواز گونجی۔

''بابا! کیا آپ کی آنکھوں میں دیکھنا کوئی آسان کام ہے۔ ان آنکھوں میں صدیوں کی روشنی بھری ہے۔'' رشا ملوک نے ساحل عمر کی طرفداری کی۔

''تجھے خاموش رہنا ہو گا۔'' وہی بارعب آواز گونجی۔ پھر وہ ساحل عمر سے مخاطب ہوا۔ ''میری آنکھوں میں دیکھ۔''

ساحل عمر کے ذہن میں اچانک ایک خیال کوندا۔ اسے فوراً حافظ موسیٰ کا تعویذ یاد آیا جو اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے اس تعویذ کو اپنی آنکھیں بند کر کے باری باری دونوں آنکھوں پر رکھا پھر تعویذ ہاتھ سے چھوڑ کر ایک دم آنکھیں کھول دیں اور سمار ملوک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں میں اب اتنی سکت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ سمار ملوک کی آنکھوں سے آنکھیں ملا سکتا تھا۔

اسے آنکھیں ملاتے دیکھ کر سمار ملوک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''شاباش...... یہ ہوئی نا بات۔''

سمار ملوک کو خوش ہوتے دیکھ کر رشا ملوک فوراً چہکی۔ ''بابا آپ کو میرا مور پسند آیا۔''

''تیرا مور؟'' سمار ملوک نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں' میرا مور۔'' رشا ملوک نے بڑے یقین سے کہا۔

''رشا ملوک تیری اس سے شادی نہیں ہو سکتی۔'' فضا میں جیسے ایک زبردست دھماکہ ہوا۔

''بابا' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ صدیوں پرانے قانون کو توڑ رہے ہیں۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟'' رشا ملوک پریشان ہو کر بولی۔

''میں قانون نہیں توڑ رہا' اس کی پیشانی دیکھ رہا ہوں۔'' سمار ملوک نے عجب بات کی۔

''ان کی پیشانی پر کیا لکھا ہے؟'' رشا ملوک کو فکر ہوئی۔

''جو لکھا ہے وہ میں نے تجھے بتا دیا۔ تیری شادی نہیں ہو سکتی۔''

''لیکن بابا صاعق نے نذر لے کر جو پتھر دیا ہے وہ ہم رنگ ہے...... کیا بابا صاعق کی نذر جھوٹی ہے۔'' رشا ملوک کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ اس بری خبر کو سن کر پریشان ہو گئی تھی۔

''جو میں جانتا ہوں وہ بابا صاعق نہیں جانتا۔ میں اس بستی کا رمز شناس ہوں۔ ستاروں کی چال جانتا ہوں۔ اس لڑکے کے ستارے جو کچھ کہہ رہے ہیں اس بات نے مجھے چونکا دیا ہے۔ یہ لڑکا اس بستی میں ہمارا نجات دہندہ بن کر آیا ہے۔ تین دن سے جو میں خواب دیکھ رہا تھا' آج اس کی تعبیر کھل کر سامنے آ گئی۔ نہیں یہ شادی نہیں ہو سکتی۔'' سمار ملوک نے بس ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی۔

''بابا' آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ مجھ پر رحم کھائیں۔ اپنی اکلوتی اولاد کا مور تباہ نہ کریں۔''

''تیرا مور تباہ نہ کروں' اپنی بستی تباہ کروا لوں۔ میں اس بستی کا رمز شناس ہوں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اپنی بیٹی کی خاطر' میں پوری بستی کو تباہی کے دہانے پر نہیں پہنچا سکتا۔'' سمار ملوک نے لگا سا جواب دیا۔

''میری شادی سے بستی تباہ ہو جائے گی۔ آخر کیسے؟'' رشا ملوک کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ''بابا' آپ یہاں میرے مور سے ملنے آئے تھے لیکن جب سے آئے ہیں مسلسل پریشان کن پیشگوئیاں کئے جا رہے ہیں۔ بابا ایسا مت کریں۔ میں نے ہزار دقتوں کے بعد اپنے مور کو پایا ہے۔''

''تو نہیں جانتی۔ یہ وقت کا فیصلہ ہے۔ یہ لڑکا وقت کا انتخاب ہے۔ اسے وقت یہاں لایا ہے۔ یہ یہاں آ گیا ہے تو ہمیں وقت کا احترام کرنا ہو گا۔''

''میری شادی روک کر؟'' رشا ملوک تلخی سے بولی۔

''بابا اس بستی میں آج تک ایسا نہیں ہوا۔ بابا صاعق نے بھی ہمارے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ وہ میرے مور کو دیکھ کر بہت خوش ہیں۔''

"خوش تو میں بھی ہوں...... میں کون سا ناخوش ہوں۔ وقت نے اس بستی میں ایک ایسا نوجوان بھیج دیا ہے جس کی پیدائش ایک خاص وقت میں ہوئی ہے۔ ایسا وقت صدیوں میں آتا ہے۔ ایسے نوجوان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ نوجوان آج ہمارے درمیان موجود ہے میرا ایک خواب اور سچا ثابت ہو گیا ہے۔" سمار ملوک خوش ہو کر بولا۔

ساحل عمر کافی دیر سے خاموش کھڑا باپ بیٹی کی گفتگو سن رہا تھا۔ گفتگو اسی کے بارے میں ہو رہی تھی لیکن اس سے کوئی مخاطب نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سمار ملوک کو اچانک کیا ہو گیا۔ اس نے ایسا کیا خواب دیکھ لیا۔ وہ اس کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہے۔ شادی سے کیوں انکاری ہے جبکہ بقول رشا ملوک نذر کے پتھر بھی ہم رنگ نکل آئے ہیں۔ تب اس نے سوچا کہ اس گفتگو میں مداخلت کرنا چاہئے۔ سمار ملوک سے بارے میں آگاہی حاصل کرنا چاہئے۔ اگر وہ اس بستی یا بستی والوں کے کوئی کام آ سکتا ہے تو اسے وہ کام نجام دینا چاہئے۔ یہ فیصلہ کر کے اس نے لب کشائی کی۔ "بابا آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں۔"

"ہاں لڑکے بولو۔"

"بابا، میرا نام ساحل عمر ہے۔" ساحل عمر کو سمار ملوک کا بار بار لڑکا کہنا اچھا نہ لگا۔ "ابھی تک آپ دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا ہے کہ آپ نے میرے بارے میں کوئی خواب دیکھا ہے اور یہ کہ آپ سچے خواب دیکھتے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے میرے بارے میں کیا خواب دیکھا ہے۔"

"اے ساحل عمر خواب سے پہلے میں تجھے ایک کہانی سناتا ہوں، پہلے وہ سن...... تو کھڑا کیوں ہے...... آ میرے برابر آ کر بیٹھ جا اور اے رشا ملوک تو ذرا صبر سے کام لے...... آ تو بھی میرے پاس آ کر بیٹھ جا۔" سمار ملوک نے کہا۔

ساحل عمر خاموشی سے سمار ملوک کے برابر پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ رشا ملوک، ساحل عمر کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے حسین چہرے پر فکر کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

"جی بابا...... شروع کیجئے کہانی۔" ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ کہانی نہیں ایک اٹل حقیقت ہے۔ میرا علم مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ میرے خواب بھی جھوٹے نہیں ہوتے۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے ہزاروں برسوں پہلے کی بات ہے۔ فرعونوں کا زمانہ...... اپنے وقت کے سو بڑے ساحروں نے "ربطول" مرتب کی۔ یہ کتاب سحر دو حصوں میں تیار کی گئی۔ ایک حصے میں منتر تھے تو دوسرے حصے میں ان منتروں کو پڑھنے کی ترکیب تھی۔ یہ دونوں حصے فراعنہ کے پاس نسل در نسل چلے آ رہے تھے۔ شہنشاہ وقت ان دونوں حصوں کو الگ الگ مقامات پر رکھتا تھا کہ اگر کوئی ایک حصہ چوری بھی ہو جائے تو چور کتاب سے فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن ستاروں کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ کسی معبد کے پروہت نے جو اپنے وقت کا بڑا ساحر بھی تھا اور اس کا تعلق سو جادوگروں کے سالار سامری کی اولادوں میں سے تھا کسی طرح اس کتاب کا ایک حصہ چرا لیا۔ یہ پہلا حصہ تھا جس میں منتر درج تھے۔ پہلا حصہ چوری ہو جانے پر ربطول کا دوسرا حصہ بے اثر ہو گیا۔ چند سالوں بعد

شہنشاہ وقت کا انتقال ہوگیا۔ اس فرعون کی می کو ہرم میں منتقل کیا گیا تو اس کے ساتھ سحر ربطول کا دوسرا حصہ بھی رکھ دیا گیا۔ وہ ساحر جو فرعون کی موت کا منتظر تھا کہ کب فرعون مرے اور کب وہ کتاب کو اپنے قبضے میں کرے۔ فرعون کے ہرم میں مدفون ہوتے ہی اس ساحر نے راتوں رات اس کے ہرم میں داخل ہو کر کتاب کا دوسرا حصہ بھی اڑا لیا اور وہ ساحر جو سامری کی اولادوں میں سے تھا اور جس کا نام راعین تھا' فرعونوں کی سرزمین سے فرار ہوگیا۔ ربطول میں درج منتروں کے ذریعے اس نے زبردست قوتیں حاصل کرلیں۔ انہی شیطانی قوتوں میں سے ایک "مانا" کی قوت بھی تھی۔ پھر راعین گھومتا گھامتا ہمارے علاقے میں آ گیا۔ اسے یہ علاقہ بہت پسند آیا اور اس نے یہاں اپنا مستقل ٹھکانہ بنانے کی منصوبہ بندی کی۔ اس نے کتاب سحر میں درج سب سے مشکل منتر پر عمل کرنے کی ٹھانی۔ اس منتر کی تکمیل کیلئے ضروری تھا کہ راعین خود کو زندہ دفن کرے اور ہزاروں سال بعد مقررہ وقت پر جب وہ دوبارہ اپنے مدفن سے باہر آئے تو وہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہو۔ مانا کے ساتھ چار گھوڑے بھی اس کے قبضے میں آ جائیں اور پھر وہ جب چاہے جہاں چاہے تباہی پھیلا دے۔ راعین برائی کا علمبردار ہے۔ پکا شیطان ہے۔ ایک فتنہ ہے۔ ایک عفریت ہے۔ اگر وہ زندہ ہو کر اپنے مدفن سے باہر آ گیا تو پھر تباہی مقدر بن جائے گی۔ اس فتنے کے جاگنے سے پہلے اسے ہمیشہ کیلئے موت کی نیند سلانا ہے اور یہ کام اے ساحل عمر صرف تم کر سکتے ہو تم...... تم جوشنی ہو' وقت کے دھنی ہو' چاند اور سورج تمہارے راہبر ہیں۔ حمل کا تم پر سایہ ہے۔ مشتری تمہارا غلام ہے' عطارد تمہارے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا ہے۔ تمہاری پیدائش سات ستاروں کے اجتماع کی شبھ گھڑی میں عمل میں آئی۔" اتنا سنا کر سار ملوک خاموش ہوگیا۔ "تمہارا کوئی جواب نہیں۔"

ساحل عمر بڑی محویت کے عالم میں اس کی کہانی سن رہا تھا۔ جب اس نے اس کا ذکر کیا تو وہ ایک دم چونک اٹھا اور پریشان ہو کر بولا۔ "بابا آپ میرے بارے میں کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔"

"اے ساحل عمر تو وہ شخص ہے جو اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا پر ایسا بھی ہوتا ہے۔ تو پریشان مت ہو۔ جیسا میں کہوں ویسا کرتا جا۔ تو بھی خوش رہے گا اور ہم بھی خوش رہیں گے۔"

"اور میری شادی کا کیا ہوگا بابا۔" رشا ملوک نے درمیان میں ٹانگ اڑائی۔

"جب تک راعین کو ہمیشہ کی نیند سلا نہیں دیا جاتا اور کتاب سحر کو جلا نہیں دیا جاتا تب تک تو اپنے مور کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتی تو شادی کے جشن میں شریک نہیں ہو سکتی۔ سن لیا تو نے۔" سار ملوک نے تنبیہ کی۔

"بابا میری شادی تو ہو جائے گی نا' میرے مور سے۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولی۔

"ہاں' ہو جائے گی۔" سار ملوک نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔

"پھر میں انتظار کرلوں گی۔ بستی کی بھلائی کی خاطر میں انتظار کرلوں گی لیکن بابا میرے مور کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ کا علم کیا کہتا ہے۔"

"ہمیں اچھے وقت کی امید رکھنی چاہئے اور کامیابی کی دعا مانگنی چاہئے۔"

"بابا میں نے آپ کی کہانی تو سن لی لیکن اس کہانی میں اس خواب کا ذکر نہیں جس کے بارے میں آپ نے کہا تھا کہ وہ سچا ثابت ہوا اور جو میرے بارے میں تھا۔"

"اچھا ہاں...... میں وہ بتانے والا تھا کہ بیچ میں رشا ملوک بول پڑی۔ میں تین دن سے ایک خواب دیکھ رہا ہوں کہ ایک نوجوان سنہرے چست کپڑوں میں ہاتھ میں تلوار ہے ایک برف کی قبر پر اپنی تلوار سے وار کرتا ہے۔ تلوار برف میں گھس جاتی ہے۔ جب وہ تلوار نکالتا ہے تو وہ خون میں نہائی ہوئی ہوتی ہے۔ برف پر بھی خون ہوتا ہے پھر یہ تلوار ایک دم صاف ہو جاتی ہے۔ خون اچانک غائب ہو جاتا ہے تو وہ نوجوان دوبارہ برف کی قبر پر وار کرتا ہے پھر تلوار خون آلود ہو جاتی ہے اور چند لمحوں بعد صاف ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ نوجوان بار بار تلوار سے قبر پر وار کرتا ہے یہاں تک کہ وہ قبر اچانک سات حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ بس یہ خواب دیکھا میں نے۔ جب پہلی بار میں نے یہ خواب دیکھا تو میں نے علم نجوم کا سہارا لیا۔ ستاروں نے مجھے یہ کہانی سنائی۔ تین دن تک مسلسل یہ خواب دیکھنے کے بعد آج تمہیں دیکھا تو مجھے فوراً خواب والا نوجوان یاد آ گیا۔ وہ نوجوان تم تھے اور تمہارے ہاتھ میں یہ تلوار بھی میری تھی۔ یہ ایک مقدس تلوار ہے جو نسل در نسل ہم رمز شناسوں میں چلی آ رہی ہے۔ آج میں یہ تلوار تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ اسے قبول کرو۔" یہ کہہ کر سمار ملوک فوراً اٹھ گیا۔

اس نے میز سے تلوار اٹھائی اور اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر وہ ساحل عمر کے سامنے جھک گیا۔

ساحل عمر کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس تلوار کو قبول کر لے۔ رشا ملوک نے بھی آنکھ کے اشارے سے تلوار قبول کرنے کا سگنل دیا تھا۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو آج تک کسی مور کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ رشا ملوک کے چہرے پر ایک دم رونق آ گئی تھی۔

ساحل عمر نے اپنا ہاتھ بڑھا کر وہ تلوار سمار ملوک کے ہاتھوں پر سے اٹھالی۔ "شکریہ!"

پھر اس نے اس تلوار کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ یہ ایک خوبصورت تلوار تھی۔ اس کے دستے پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ ساحل عمر نے دستے میں ہاتھ ڈال کر تلوار کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ہاتھ اٹھا کر چمکتی تلوار کو چوم لیا اور پھر دل ہی دل میں دعا کی۔

"اے اللہ...... اس عفریت کو ختم کرنے میں میری مدد فرما۔"

دعا کر کے اسے سکون سا آ گیا۔ دعا دراصل ایک مستقل عبادت ہے۔ تمام مذاہب کی روح دعا ہے اور عبادت ہمیشہ سکون کا باعث ہوتی ہے۔

"اے ساحل عمر بس اب تو جا...... رشا ملوک تجھے تیرے ٹھکانے تک چھوڑ آئے گی تو آرام کر۔" سمار ملوک یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ رشا ملوک سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اے رشا ملوک جا تو اس کے ساتھ جا......"

"ٹھیک ہے بابا جاتی ہوں۔"

"سمار ملوک ساحل عمر کے قریب آیا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر ساحل کا کان چھوا اور بولا۔ "اے ساحل عمر ابھی کام شروع ہوا ہے۔ ابھی راستے میں بہت مشکلیں ہیں۔ ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں

ہے کہ راعین کہاں دفن ہے ہمیں اس کے برفانی ہرم کا کھوج لگانا ہوگا۔ میں بستی کے کچھ ہنرمندوں کو پکڑتا ہوں۔ بابا صاعق سے بھی مشورہ کرتا ہوں۔ مل بیٹھ کر ہی راستہ نکالنا ہوگا۔ اس فتنے کا قبر پھاڑ کر باہر آنے کا صحیح وقت بھی معلوم کرنا ہوگا۔ یہ کام تو میں ستاروں کے ذریعے کرلوں گا۔ میرا علم بڑا سچا ہے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیتا۔''

''ٹھیک ہے بابا۔ آپ اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ میں اللہ کی مخلوق کی بھلائی کیلئے جو کرسکتا ہوں اس کے لئے میں حاضر ہوں۔ مجھے اس عفریت کا خاتمہ کر کے بے پناہ خوشی میسر آئے گی۔'' ساحل عمر نے کہا اور رشا ملوک کے ساتھ چل دیا جو اس کی منتظر تھی۔

وہ دونوں جب سیڑھیاں چڑھ کر مینار سے باہر نکلے تو رشا ملوک بڑے بے تابانہ لہجے میں بولی۔ ''یہ کیا ہوگیا؟''

''کچھ نہیں ہوا...... تم پریشان کیوں ہو۔'' ساحل عمر نے اسے تسلی دی۔ ''یہ بتاؤ کہ اگلا جشن شادی کب ہے۔ ابھی کتنا وقت ہے؟''

''صرف ایک ماہ...... اگلے مہینے جشن شادی ہے۔ میں تو بہت خوش تھی کہ آپ بڑے صحیح وقت پر ہمارے علاقے میں آئے ہیں۔ سارے کام بھی بالکل ٹھیک انداز میں ہو رہے تھے کہ وہ منحوس راعین درمیان میں آ گیا۔''

''ابھی پورا ایک مہینہ ہے۔ ایک مہینہ بہت ہوتا ہے۔ تم جشن کی تیاری میں لگ جاؤ۔ اس دوران میں راعین سے نمٹ لیتا ہوں۔ تمہارے بابا کی مقدس تلوار تو میرے ہاتھ لگ ہی گئی پھر اب ڈرنا کیسا؟''

''یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

''موت اور زندگی تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اگر اسی طرح لکھی ہے تو پھر مجھے کون بچا سکتا ہے۔''

''اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔'' وہ بے قرار ہو کر بولی۔

''اب پاگل نہیں ہو گیا؟'' ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

''ہوں۔'' رشا ملوک نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کے لئے پاگل ہوں۔ آپ کی دیوانی ہوں۔ آپ کے بن رہنا اب محال ہے۔''

''رشا ملوک مجھ پر بھی کچھ ایسی ہی گزرتی ہے۔ میرے بس میں ہو تو تمہیں ابھی یہاں سے اڑا کر لے جاؤں لیکن میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔ مجھے تو اپنا احوال بھی معلوم نہیں ہے۔ بس ادھر ادھر سے اپنے بارے میں سنتا ہوں کہ میں یہ ہوں' میں وہ ہوں۔ کوئی بہت خاص چیز ہوں۔ اللہ جانے میں کیا ہوں؟''

''ہاں تو اس میں کیا شبہ ہے کہ آپ بہت خاص چیز ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات رشا نے جس کو اپنا مور منتخب کرلیا وہ تو کوئی عام چیز ہو ہی نہیں سکتا۔''

اسی طرح باتیں کرتے ساحل عمر اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ رشا ملوک اسے کمرے میں چھوڑ کر

واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔

☆......☆......☆

رشا ملوک ڈھونڈتی ہوئی بالآخر سمار ملوک کے ٹھکانے پر پہنچ گئی۔ سمار ملوک اپنے کتب خانے میں موجود تھا اور اس وقت وہ کتابوں کے ڈھیر میں دبا ہوا تھا۔ رشا ملوک کو دروازے پر دیکھ کر اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

رشا ملوک بہت خاموشی سے ایک کرسی کھینچ کر میز کے ایک کونے پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کو دیکھنے لگی۔

سمار ملوک کے سامنے بہت سی کتابیں کھلی پڑی تھیں۔ وہ مختلف کتابوں کو کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک چوڑا اور ڈیڑھ فٹ لمبا ایک شیشہ پڑا تھا۔ اس شیشے پر وہ ایک پر کے قلم سے لال روشنائی سے کچھ زائچے بنا رہا تھا۔ یہ شیشہ ان اعداد و شمار سے تقریباً بھرتا جا رہا تھا۔ سمار ملوک کتابیں پڑھ پڑھ کر لکیریں کھینچتا جا رہا تھا۔ وہ الجھن کا شکار تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا علم اس کا ساتھ نہیں دے رہا۔ وہ مایوس ہوتا جا رہا تھا۔

لیکن پھر جانے کیا ہوا؟ سمار ملوک ایک دم اچھل پڑا۔ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا اور خوش ہو کر رشا ملوک کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اے رشا ملوک تیرا آنا اس وقت بڑا نیک شگون ثابت ہوا۔ بالآخر میں نے معلوم کر لیا کہ راعین کب جاگے گا' دیکھا تو نے کہ میرا علم کتنا سچا ہے۔''

''بابا مبارک ہو۔'' رشا ملوک کے چہرے پر خوشی برسنے لگی۔ ''میں جانتی ہوں کہ آپ کا علم بڑا سچا ہے' آپ کو کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ کیا تاریخ نکلی ہے۔''

''ابھی پورا ایک ماہ ہے۔ ایک مہینے کے بعد رات کو بارہ بجے اس کا مدفن چٹخنا شروع ہو گا۔ بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ اٹھ کر بیٹھ جائے گا۔''

''اوہ بابا' یہ تو بڑی خطرناک تاریخ ہے۔'' رشا ملوک نے فوراً کہا۔

''کیوں؟'' سمار ملوک نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''بابا آپ کو یاد نہیں کہ شادی کے جشن کی بھی یہی تاریخ ہے۔ بابا' یہ منحوس راعین آخر میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ میری خوشیوں کا قاتل؟''

''اے رشا ملوک...... ذرا صبر سے کام لے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''اب کہاں جائیں گے...... یہ کون سا وقت ہے کہیں جانے کا۔'' رشا ملوک نے کہا۔

''بابا صاعق کی مختاری پر جانا ہے۔ وہ لوگ میرے منتظر ہوں گے۔'' پھر اس نے رشا ملوک کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا۔ وہ فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

پانچ گھوڑوں کی شاندار کناری بابا صاعق کی مختاری کے سامنے رکی تو بابا صاعق نے آگے بڑھ کر بستی کے رمز شناس سمار ملوک کا استقبال کیا۔ سمار ملوک نے بابا صاعق کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا

پھر اسی ہاتھ کو چوم لیا اور احترام کے ساتھ بولا۔ ''بابا کیسے ہیں؟''
''ٹھیک ہوں...... تم سناؤ...... اس وقت کیا مسئلہ درپیش آ گیا۔''
''ہنر مند آ گئے؟'' سمار ملوک نے سوال کیا۔
''ہاں، تینوں آ چکے ہیں۔ اندر بیٹھے ہیں۔''
''ٹھیک ہے بابا، پھر سب کے سامنے بیٹھ کر مسئلہ بیان کرتا ہوں۔ بابا بڑی خطرناک صورتحال پیدا ہو گئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا علم کتنا سچا ہے، وہ مجھے کبھی دھوکا نہیں دیتا۔''
''میں جانتا ہوں...... تمہیں بھی جانتا ہوں اور تمہارے علم کو بھی جانتا ہوں۔''
''پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ میرے خواب کتنے سچے ہوتے ہیں۔''
''ہاں، میں تمہارے خوابوں سے بھی واقف ہوں...... اب آگے کہو۔''
''بابا آگے تو سب کے سامنے کہوں گا؟'' سمار ملوک بولا۔
''ٹھیک ہے۔''
پھر بابا صاعق سمار ملوک کو لے کر اپنے کمرے میں داخل ہوا تو انہیں دیکھتے ہی تینوں ہنر مند احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تینوں ہنر مندوں نے سمار ملوک کے صافے کو باری باری چھوا اور پھر سب نے اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔
اس کے بعد بستی کے پانچ بڑوں کا اجلاس شروع ہوا۔ یہ ایک اہم اجلاس تھا۔ اس لحاظ سے کہ اس میں بستی کے بہترین دماغ شامل تھے۔ اہم شخصیات کی شرکت نے اس اجلاس کو چار چاند لگا دیئے تھے۔
اجلاس کا آغاز کرتے ہوئے سمار ملوک گویا ہوا۔ ''بابا صاعق اور اس بستی کے ہنر مندو! میں نے آپ لوگوں کو آج ایک خاص مسئلے پر بات کرنے کیلئے زحمت دی ہے۔ ہماری یہ بستی اور دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد ہماری پرامن بستی میں وہ تباہی مچے گی کہ اس تباہی کو کوئی دیکھنے والا نہ بچے گا۔''
''اے رمز شناس...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' ایک ہنر مند بزبران بولا جو موسموں کا ماہر تھا اور محض آسمان کو دیکھ کر بتا دیا کرتا تھا کہ کتنی دیر بعد بارش شروع ہو جائے گی۔ برف باری کتنی ہو گی۔ طوفان اگر آئے گا تو اس کی رفتار کیا ہو گی۔
''اے بزبران...... میں جو کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں تو جانتا ہے کہ میں کتنے سچے خواب دیکھتا ہوں۔ میں تین دن سے ایک خواب دیکھ رہا تھا لیکن یہ خواب کہانی کا انجام ہے۔ میں پہلے وہ کہانی سناؤں گا جو میرے علم نے مجھے بتائی۔ اس کہانی کے سلسلے میں، میں نے بہت تحقیق کی۔ بڑی پرانی تحریریں چھان ماریں پھر جو کہانی ابھر کر آئی وہ میں آپ لوگوں کو سناتا ہوں۔
یہ کہہ کر سمار ملوک نے سو جادوگروں کی تیار کردہ کتاب سحر ''ربطول'' کا ذکر کیا۔ راعین اس کتاب کو کیسے لے اڑا۔ اس نے اس کتاب میں درج منتروں سے کس طرح مانا کی قوت حاصل کی پھر اس کتاب میں درج آخری قوت یعنی چار گھوڑے حاصل کرنے کیلئے خود کو کس طرح دفن کر لیا۔ ایک

وقت مقررہ پر جب وہ اپنے مدفن سے باہر آئے گا تو کتنا طاقتور ہو گا۔
سارملوک سنا رہا تھا اور وہ چاروں حیرت زدہ منہ پھاڑے سن رہے تھے۔ جب اس نے پوری کہانی سنا دی اور ساتھ میں اپنا خواب بھی سنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس عفریت کو ختم کرنے والا بھی ہماری بستی میں آ پہنچا ہے تو ان کے چہرے پر سکون ہوئے۔
"اے رمز شناس...... اب یہ بات کہاں آ گئی ہے؟" دوسرے ہنر مند بکوزان نے سوال کیا۔ وہ تعمیرات کا ماہر تھا۔ پہاڑ، ندی، نالے اس کے سامنے کوئی چیز نہ تھے۔ وہ پہاڑوں کے سینے چیر کر ان میں چھپے خزانے باہر نکال لیا کرتا تھا۔ دریاؤں کے رخ پھیر دیتا تھا۔
"راعین کا مدفن معلوم کرنا ہے؟" سارملوک نے اصل مسئلہ پیش کیا۔
"اے رمز شناس، یہ کام تو آپ ہی بہتر طریقے پر کر سکتے ہیں یا پھر بابا صاعق سے اس معاملے میں مدد لی جا سکتی ہے۔" بزبران بولا۔
"اے بزبران...... میرے علم نے یہاں تک رہنمائی کر دی ہے کہ راعین ہمارے علاقے میں ہی کہیں دفن ہے۔ اس سے آگے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے مدفن کی نشاندہی کیلئے کوئی اور آگے بڑھے۔"
"اے زمز شناس...... میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ راعین اپنے مدفن سے باہر نکلے گا تو وہ ہمارے لئے تباہ کن کیوں کر ثابت ہو گا۔ یہ چار گھوڑے کیا چیز ہیں؟" اس مرتبہ تیسرا ہنر مند سناتن بولا۔ یہ چرند پرند کا شناسا تھا۔ پرندوں کا تو خیر کوئی مسئلہ نہ تھا درندے بھی اس کے سامنے کسی پالتو کتے کی طرح دم ہلاتے تھے۔
"اے سناتن تو نے اچھا سوال کیا۔ یہ سوال تو ہی کر سکتا تھا۔" سارملوک نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ چار گھوڑے تباہی کی علامت ہیں۔ تو یوں سمجھ کہ جس کے قبضے میں یہ چار گھوڑے آ جائیں اس کی طاقت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک گھوڑا طوفان بادوباراں لا سکتا ہے۔ ایک گھوڑا زلزلے لانے کی طاقت رکھتا ہے۔ ایک گھوڑا قحط پیدا کر سکتا ہے۔ ایک گھوڑا عیاشی اور فحاشی بستیوں میں کسی وبا کی طرح پھیلا سکتا ہے۔ اب تو خیال کر کہ مانا کی قوت کے علاوہ جب یہ چار گھوڑے کسی کے طابع ہو جائیں تو پھر وہ اس دنیا میں، اس بستی میں کس طرح کی تباہی نہیں پھیلا سکتا۔ ایسے عفریت کا جاگنے سے پہلے ہی خاتمہ کر دینا بہتر ہے۔ اس فتنے کو اٹھنے سے پہلے ہی ملیامیٹ کر دینا ہے۔"
"اے رمز شناس، یہ تو بہت مشکل مرحلہ آن پھنسا۔ اس فتنے کے اٹھنے میں تیس روز باقی ہیں۔ ان تیس دنوں میں ہمیں اس کے ٹھکانے کا پتہ لگانا ہے۔" اس مرتبہ بابا صاعق گویا ہوئے۔ "یہاں اس وقت سب کے سب دانائی والے جمع ہیں۔ میں خود بھی کوشش کرتا ہوں۔ آپ لوگ بھی کوشش کرو کل پھر میری مختاری پر جمع ہو اور اپنی اپنی کوششوں کا احوال سناؤ۔ میں تمہکال کو طلب کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ راعین کے مدفن کی نشاندہی کر دے۔
بس پھر یہ اجلاس کل تک کیلئے ملتوی کر دیا گیا اور بستی کے یہ پانچوں عقل والے اپنے طور پر راعین کی کھوج میں لگ گئے۔

اگلے دن یہ اجلاس نہیں ہو سکا۔ اس لئے کہ اجلاس میں بتانے کے لئے کسی کے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک دن میں بھلا راعین کے مدفن کی کھوج کس طرح ممکن تھی پانچوں دانا اپنی اپنی بساط کے مطابق کوششوں میں مصروف تھے۔ پھر یہ طے ہوا کہ ان پانچوں میں سے جو بھی پہلے راعین کے مدفن کا نشان پالے وہ بابا صاعق کی مختاری کا رخ کرے۔ پھر یہ بابا صاعق کی ذمے داری ہو گی کہ وہ کس طرح سب کو اکٹھا کرتے ہیں۔

دوسرے دن پانچوں داناؤں نے اپنے اپنے طور پر کھوج کا آغاز کر دیا۔ بابا صاعق نے تہکال کو طلب کر لیا۔ انہوں نے تہکال کو اس کی زبان میں راعین کی کھوج کے بارے میں ہدایات دیں۔ اسے سمجھایا کہ اس نے کہاں کہاں جانا ہے۔ تہکال سر جھکائے مگر آنکھیں اٹھائے پچھلی دو ٹانگوں پر بیٹھا بابا صاعق کی باتیں بغور سن رہا تھا۔ جب انہوں نے اندازہ کر لیا کہ تہکال کی سمجھ میں کچھ نہ کچھ بات آ گئی ہے تو پھر انہوں نے بازغر کو اشارہ کیا۔

بازغر کمرے سے باہر گیا اور پھر جب وہ کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں لکڑی کا ایک چوڑا سا تختہ تھا۔ اس نے یہ تختہ بابا صاعق کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس تختے پر برف کا ایک چھوٹا سا پہاڑ کھڑا تھا۔ یہ شفاف برف تھی لیکن سیمنٹ کی طرح سخت تھی۔ اس برف کے پہاڑ میں کافی نیچے ایک لکڑی کا گڈا دبا ہوا تھا یہ گڈا انسانی شکل سے مشابہ تھا۔ بابا صاعق نے اس پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تہکال کو سمجھایا پھر انہوں نے اشارہ کیا کہ وہ اس برف سے گڈے کو نکال لے۔ تہکال کیلئے کوئی ٹھوس چیز ٹھوس نہ تھی۔ جس طرح وہ میدانوں میں دوڑ سکتا تھا ویسے ہی ٹھوس پہاڑوں میں بلا تکلف چھلانگیں مار سکتا تھا۔

بابا صاعق کے اس مظاہرے سے وہ اتنا سمجھ گیا کہ کہیں پہاڑوں میں کوئی شخص دفن ہے اس کا کھوج لگانا ہے۔ تہکال فوراً اٹھا اور بابا صاعق کے قدموں میں کسی بلی کی طرح لوٹنے لگا۔ بابا صاعق کا ہاتھ چاٹا اور پھر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر اس نے آتش دان کی طرف چھلانگ لگائی اس کے بعد پتہ نہ چلا کہ وہ کدھر گیا۔

بابا صاعق کو امید تھی کہ تہکال دو تین گھنٹے میں پورا علاقہ چھان مارے گا اور کوئی نہ کوئی خبر لے کر لوٹے گا لیکن اس وقت تہکال کو گئے ہوئے چار گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے۔ بابا صاعق اپنے کمرے میں بہت بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے گہرے بادل چھائے تھے۔

پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک دم رک گئے۔ کوئی چیز ان کے قدموں میں اچانک آ گری تھی۔ اگر وہ ایک قدم بھی آگے بڑھاتے تو ان کا پیر اس چیز پر رکھا جاتا۔

اس چیز کو دیکھ کر بابا صاعق کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

☆......☆......☆

یہ تہکال کی کٹی ہوئی دم تھی جو فرش پر پڑی ہوئی بن جل مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ تہکال کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں تھا اور اس پر کیا بیتی تھی۔

بات اپنی جگہ۔ لے تھی کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔

بابا صاعق کو اب اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ انہیں جھکال کو راعین کی تلاش میں نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔ یہ اس کی سطح کا کام نہ تھا۔ وہ بے چارہ تو رسم وفا نبھانے ان کے حکم کے مطابق راعین کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ لیکن بابا صاعق کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ ایک خرگوش سے گینڈے کی تلاش کروا رہے ہیں۔

سردست تو اس تڑپتی ہوئی دم کا کچھ کرنا تھا۔ یہ جھکال کی پوری دم تھی جسے جڑ سے کاٹا گیا تھا یا اکھاڑا گیا تھا۔ اگر اس دم کو محفوظ نہ کیا گیا تو جھکال کے ملنے پر اسے نہیں لگایا جا سکے گا۔ جھکال دم کٹا رہ جائے گا۔

بابا صاعق نے فوراً بازغر کو اشارہ کیا۔ وہ اشارہ سمجھتے ہی فوراً باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بالٹی تھی۔ اس بالٹی میں سرخ رنگ کا تیل تھا۔ اس سرخ تیل سے چوتھائی بالٹی بھری ہوئی تھی۔ بازغر نے بالٹی بابا صاعق کے سامنے رکھ دی۔

بابا صاعق نے کچھ پڑھتے ہوئے جھکال کی دم اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ دم پکڑتے ہی وہ ایک دم ساکت ہو گئی۔ انہوں نے اس دم کو آہستہ سے بالٹی میں ڈال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا تیل دم نے پی لیا۔ تب بابا صاعق نے بازغر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”جھکال کی دم کو برف میں گڑھا کھود کر دبا دو۔“

”ٹھیک ہے بابا۔“ بازغر نے سعادت مندی سے کہا اور بالٹی لے کر باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

بستی کا رمز شناس سارملوک اس وقت کھانا کھانے کے لئے بیٹھ رہا تھا جب اسے بابا صاعق کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ فوراً کھانا چھوڑ کر نیلا گنبد کی طرف چلا۔ نیلا گنبد مہمان خانہ تھا۔ اس ملاقات کے کمرے میں خاص لوگوں کو بلایا جاتا تھا۔ سارملوک جب نیلا گنبد میں داخل ہوا تو بابا صاعق کو سر جھکائے بیٹھا دیکھا۔

بابا صاعق کو اس طرح بیٹھا دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ تیزی سے بابا صاعق کی طرف بڑھا۔ ان کے قریب بیٹھ کر سارملوک نے بابا صاعق کا ہاتھ اپنے سر پر رکھا اور پھر وہی ہاتھ چوم کر جلدی سے بولا۔ ”بابا خیر تو ہے۔“

”اے رمز شناس خیر نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اپنا سر اٹھایا تو سارملوک نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں اور چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔

”بابا کیا ہوا؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو۔“ سارملوک نے ایک مرتبہ پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

”اے رمز شناس...... میرا جھکال مجھ سے بچھڑ گیا۔“ یہ کہتے ہوئے ان کا گلا رندھ گیا۔

”اوہ میرے خدا...... یہ کیا ہوا؟“ سارملوک پر جیسے بجلی گری۔ ”وہ تو بستی کی رونق تھا۔ بچوں کا کھلونا۔ کوئی اس کی دم کھینچتا تھا تو کوئی اس کے کان مروڑتا تھا‘ کوئی بچہ اس کے اوپر چڑھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ تو کبھی کسی کو کچھ نہ کہتا تھا۔ اسے آخر ہوا کیا...... وہ ہم سے کیسے بچھڑ گیا؟“

''میں نے اسے راعین کی تلاش میں بھیجا تھا۔ وہ راعین کو تلاش کرتا کرتا خود گم ہو گیا۔ بس مجھ تک اس کی دم پہنچی ہے۔''

''اے رمز شناس مجھے بتاؤ میں کس طرح اپنے دل کو سمجھاؤں۔ میں کہاں جاؤں' کیا کروں؟'' بابا صاعق کی آواز بھرا گئی۔

''بابا آپ کہیں نہ جائیں' میرے پاس بیٹھیں۔ میرا دل اس سانحے کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔ آپ تھوڑی دیر یہاں بیٹھیں۔ میں اپنے کمرے سے ہو کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سمار ملوک نیلا گنبد سے نکل گیا۔

سمار ملوک نے یہ خبر رشا ملوک کو سنائی اور اسے نیلا گنبد جانے کی ہدایت کی۔ رشا ملوک کیلئے یہ خبر بہت تکلیف دہ تھی۔ تہکال اس کا بہت چہیتا تھا۔ وہ گھنٹوں اس کے کمرے میں اس کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔

رشا ملوک دوڑتی ہوئی نیلا گنبد میں داخل ہوئی اور دھم سے بابا صاعق کے قدموں میں جا گری۔ اس نے بابا کا ہاتھ چوما اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ''میرے بابا نے مجھے بڑی اندوہناک خبر سنائی ہے۔ آپ کہہ دیں کہ یہ جھوٹ ہے۔''

''اے کاش...... یہ جھوٹ ہوتا'' بابا صاعق نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔ ''میرا تہکال مجھ سے بچھڑ گیا۔ ہم سب کا تہکال ہم سے دور ہو گیا۔''

''میں اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ بابا گئے ہیں' اپنے کمرے میں زائچہ بنانے ابھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کہاں ہے' کس حال میں ہے۔'' رشا ملوک نے تسلی دی۔

''اے رشا ملوک...... مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے راعین کی تلاش میں اسے نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔'' لہجے میں پچھتاوا تھا۔

''بابا راعین تو ابھی خود مدفون ہے وہ کسی کو ابھی بھلا کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پھر ہمارا تہکال اس قدر آسانی سے مار کھانے والوں میں سے نہیں ہے۔'' رشا ملوک نے کہا۔

چند لمحوں بعد سمار ملوک نیلا گنبد میں داخل ہوا۔ رشا اور بابا صاعق نے بیک وقت اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

''بابا آپ کا علم کیا کہتا ہے۔ جلدی بتائیں۔'' رشا ملوک نے بیتابی سے کہا۔

''میرے علم نے اندھیرے کے سوا کچھ نہیں دیا۔''

''اوہ اس کا مطلب ہے کہ گڑبڑ ہے۔ کوئی خطرناک صورتحال ہے۔''

''کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' سمار ملوک دکھی لہجے میں بولا۔ ''میں ابھی ہنرمندوں کو طلب کرتا ہوں۔ ہمیں تہکال کو تلاش کرنا ہوگا۔''

تب سمار ملوک نے فوراً اپنے ہرکارے بستی میں دوڑائے۔ جب وہ واپس آئے تو ان کی زبانی معلوم ہوا کہ بزبران اور بکوزان دونوں صبح سے ایک ساتھ نکلے ہوئے ہیں البتہ سناتن اپنے گنبد میں موجود تھا۔ اسے ہرکارہ اپنے ساتھ لے آیا۔

جب سناتن کو تھکال کے بارے میں یہ خبر سنائی تو وہ پریشان ہو گیا۔ تھکال سب کو پیارا تھا۔ سناتن تو ویسے بھی چرند پرند کا دلدادہ تھا۔
"اے سناتن! اب تو بتا...... کیا کریں۔" سمارملوک نے اسے ساری بات بتا کر مشورہ طلب کیا۔
"میں اپنے گنبد واپس جاتا ہوں اور وہاں کچھ جانوروں کو اس کی تلاش میں بھیجتا ہوں۔ جیسے ہی مجھے کچھ پتہ چلے گا اے رمز شناس میں آپ کو اطلاع دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے بابا صاعق کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ "کیوں بابا ٹھیک ہے نا۔"
"ہاں سناتن ٹھیک ہے۔ ذرا یہ کام ہوشیاری سے کرنا' اپنے قیمتی جانور نہ گنوا دینا۔" بابا صاعق نے کہا۔
"صورتحال کی سنگینی کا مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ میں اب جدھر بھی بھیجوں گا جوڑے کی صورت میں روانہ کروں گا اور ہوشیار جانوروں کا انتخاب کروں گا۔ بابا...... آپ پریشان نہ ہوں میں تھکال کا کھوج نکال لوں گا۔ راعین کا بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر سناتن گنبد سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

بزبران اور بکوزان دونوں بستی کے بڑے ہنر مندوں میں سے تھے۔ ایک کا ہاتھ موسم کی نبض پر ہوتا تھا تو دوسرے کی نظریں پہاڑوں کی بلندی پر۔ وہ دونوں آپس میں بہت اچھے دوست بھی تھے۔ اس لئے وہ دونوں ایک ساتھ ہی راعین کی تلاش میں نکلے تھے۔
دو دن میں انہوں نے خاصا علاقہ کھنگال لیا تھا لیکن راعین کے مدفن کے ابھی کوئی آثار نہ ملے تھے۔ وہ دونوں صبح کو گھوڑوں پر نکلتے دشوار گزار پہاڑی راستوں پر سفر کرتے۔ مدفن کے آثار ڈھونڈتے اور شام ڈھلتے ہی بستی کا رخ اختیار کر لیتے۔ ویسے ان کے پاس ایک علیحدہ گھوڑے پر زاد راہ بھی ہوتا تھا کہ اگر کہیں رات گزارنی پڑ جائے تو وہ آرام سے خیمہ لگا کر رات گزار لیں۔
آج بھی یہی ہوا کہ وہ دن بھر کی تلاش بسیار کے بعد شام ڈھلتے ہی بستی کی طرف چل پڑے تھے۔ واپس آ رہے تھے تو ان کی نظر کوہ ویراں پر پڑی اور یہ بات دونوں نے بیک وقت نوٹ کی۔ انہوں نے کوہ ویراں سے ایک مخصوص برف کا ایک تودہ کھسکتے دیکھا۔
بزبران فوراً رک گیا اور اس تودے کو غور سے دیکھنے لگا۔ بکوزان بھی اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔
"بکوزان دیکھا تم نے؟" بزبران نے پوچھا۔
"ہاں دیکھ رہا ہوں۔"
"میرا علم یہ کہتا ہے کہ یہ تودے گرنے کا موسم نہیں ہے پھر یہ برف کا چھوٹا سا پہاڑ کس لئے لڑھک رہا ہے۔"
"ہاں بزبران تمہارا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ مجھے یہ مصنوعی تودہ دکھائی دے رہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ فطری تودہ ہرگز نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کہیں سے برف ہٹائی جا رہی ہو۔"

''اوہ بکوزان اس کا مطلب ہے، میں نے جو بات محسوس کی وہی تم نے بھی کی۔'' بزبزان نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میرے خیال میں ہمیں یہیں ڈیرے ڈال لینا چاہئیں۔ کسی مناسب جگہ سے ہمیں کوہ ویراں کے اس حصے کی نگرانی کرنی چاہئے۔''

''آؤ، پھر اس چٹانی چھجے کے نیچے اپنا خیمہ لگا دیتے ہیں۔ یہاں ہمیں سات دن رہنا ہو گا تب جا کر صحیح صورتحال کا اندازہ ہو گا۔''

پھر دونوں نے مل کر ایک خیمہ چٹانی چھجے کے نیچے نصب کر لیا۔ یہ اتنا بڑا خیمہ تھا کہ اس میں دونوں با آسانی سما سکتے تھے۔ اگرچہ ایک دو دن کا خوردنوش کا سامان ان کے پاس موجود تھا لیکن انہوں نے سات دن رہنا تھا۔ طے یہ ہوا کہ بکوزان اس وقت بستی چلا جائے اور علی الصبح کھانے پینے کا سامان اور چند مختی اور خچر لے کر آ جائے اگر کوہ ویراں کا سفر کرنا پڑے تو کیا جا سکے۔

تب بکوزان صبح آنے کا وعدہ کر کے بزبران کو خیمے میں چھوڑ کر بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے بستی میں قدم رکھ دیئے۔ سناتن کا گنبد راستے میں پڑتا تھا۔ وہ اس کے گنبد کے سامنے سے گزرا تو سناتن اپنے گنبد کے چبوترے پر جو گنبد سے باہر بنا ہوا تھا اور جو ایک طرح سے ملاقاتیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی بیٹھا ہوا تھا۔

اسے دیکھ کر اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔ سناتن نے اس کا کھڑے ہو کر استقبال کیا اور پھر کے چبوترے پر جس پر ایک سرخ رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

''اے سناتن کیسے ہو تم؟'' بکوزان نے پوچھا۔

''اے بکوزان تم دونوں کہا ہو؟''

''بھائی ہم دونوں اس فتنے کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ بزبران کو کوہ ویراں والے راستے پر ایک جگہ چھوڑ آیا ہوں۔ دونوں کی محنت بالآخر رنگ لے آئی۔''

''ہیں...... تم لوگوں کے پاس کیا خوشخبری ہے۔''

''ابھی تو نہیں...... ایک ہفتے کے بعد شاید ہم بستی والوں کو کوئی خوشخبری دے سکیں۔''

''آج دوپہر کو رمز شناس نے بلوا لیا تھا۔ تم دونوں کو بھی بلوایا تھا مگر تم دونوں نکلے ہوئے تھے۔ میں رمز شناس کے محل پر پہنچا تو نیلے گنبد میں بابا صاعق بھی موجود تھے۔ وہاں ایک کربناک خبر سننے کو ملی۔''

''اے سناتن کیا ہوا؟ جلدی بتا۔''

''ہماری بستی کا لاڈلا ہم سے بچھڑ گیا۔''

''کیا کہتے ہو......؟ تہکال کی بات کرتے ہو؟''

''ہاں...... اسی کی بات کرتا ہوں۔ اسے بابا صاعق نے راعین کی تلاش میں بھیج دیا تھا۔''

''اے سناتن...... یہ تم نے بڑی بری خبر سنائی۔''

بکوزان پریشان ہو کر بولا۔ ''پھر اس کی تلاش میں کسی کو بھیجا گیا یا نہیں۔''

''ہاں، میں نے اپنے کئی کھوجی روانہ کئے ہیں۔'' سناتن نے بتایا۔

"اے سناتن...... یہ معاملہ کچھ اور ہی لگتا ہے۔ تم نے ہوشیار کھوجیوں کو روانہ کیا نا؟"
"ہاں، دو باز بھیجے ہیں، دو لومڑیاں اور دو سانپ روانہ کیے ہیں۔"
"مگر دو دو کیوں؟"
"کہ اگر ایک کو نقصان پہنچ جائے تو دوسرا خبر لا سکے۔"
"یہ تم نے اچھا سوچا...... اچھا میں چلتا ہوں۔ علی الصبح مجھے بزبران کے پاس پہنچنا ہے۔ یہاں سے کچھ محنتی اور سامان خچروں پر لے جانا ہے۔ دعا کرنا ہم لوگ کامیاب ہو سکیں۔" بکوزان اٹھتا ہوا بولا۔
"ہاں بکوزان میں دعا کروں گا۔ تمہاری کامیابی بستی کی کامیابی ہے۔" سناتن نے پرخلوص لہجے میں کہا۔
بکوزان نے بستی کے دل میں پہنچ کر چار مضبوط محنتیوں، خچروں اور سامان خورد نوش کا انتظام کیا اور اطمینان سے اپنے گنبد چلا گیا۔
منہ اندھیرے وہ اپنے گنبد سے نکلا تو اپنے گنبد کے دروازے پر پورے قافلے کو اپنا منتظر پایا۔ وہ فوراً اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس کے پیچھے چار محنتی جو خچروں پر سوار تھے، دو خچر جن پر سامان لدا ہوا تھا۔ چلنے لگے۔
بکوزان وعدے کے مطابق بزبران کے پاس پہنچ گیا بلکہ کچھ جلدی ہی پہنچ گیا۔ ابھی سورج پہاڑوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ بکوزان محنتیوں کو سامان اتارنے اور خیمے لگانے کا اشارہ کر کے خود اپنا گھوڑا آگے بڑھاتا ہوا خیمے کے نزدیک آ گیا۔
بزبران ابھی تک بیدار نہیں ہوا تھا۔ شاید وہ رات دیر تک جاگتا رہا تھا۔ بکوزان گھوڑے سے اتر کر ایک نظر اس نے محنتیوں پر ڈالی۔ وہ اپنے کام پر لگ گئے تھے۔ بکوزان نے خیمے کے باہر ہی سے نعرہ لگایا۔
"اے بزبران...... تم تو سوئے پڑے ہو۔ اس طرح کوہ ویراں کی نگرانی کیا خاک ہو گی۔"
اندر سے اس کی بات کا کوئی جواب نہ آیا۔ پھر اس نے خیمے کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ اگرچہ خیمے میں اندھیرا تھا لیکن اتنا نہیں کہ اس کی تیز نظریں یہ نہ دیکھ سکیں کہ بزبران خیمے میں نہیں ہے۔ پھر بھی وہ جلدی سے خیمے میں گھس گیا اور اس کا بستر اچھی طرح دیکھ لیا۔ اب یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ بزبران سے خیمہ خالی ہے۔
اس یقین نے اس کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ یہ کیا ہوا؟ پھر اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ ضرورتاً ادھر ادھر گیا ہو۔ یہ سوچ کر وہ خیمے سے باہر آیا۔ محنتی اپنے کام میں مصروف تھے۔ بکوزان نے اس چٹانی چھجے سے نکل کر چاروں طرف دور تک نظر دوڑائی لیکن اسے بزبران کہیں نظر نہ آیا۔
سورج آہستہ آہستہ اپنا سر ابھار رہا تھا۔ روشنی تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی۔ اور جوں جوں روشنی پھیلتی جا رہی تھی اس کے دل میں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک انجانا سا خوف اس کے جسم پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔

اس نے میخیں گاڑتے مختیوں کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور انہیں بزبران کی تلاش میں چاروں طرف دوڑا دیا۔ مختی نچروں پر سوار ہو کر بزبران کی تلاش میں نکل گئے۔

بکوزان گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر ڈھلانوں پر نظریں دوڑانے لگا۔ اچانک اس کے سامنے سے ایک گدھ گزرا۔ اس گدھ کو دیکھ کر بکوزان کھٹک گیا۔ اس نے اڑتے گدھ کا اپنی نظروں سے تعاقب کیا۔ دور ایک پہاڑی پر وہ گدھ جا کر بیٹھ گیا۔ اسے اس پہاڑی پر اور کئی گدھ اڑتے ہوئے نظر آئے۔

اس پہاڑی کی طرف ابھی کوئی نہیں گیا تھا۔ بکوزان نے اپنا گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا۔ وہ آدھے گھنٹے کے اندر اس پہاڑی پر پہنچ گیا۔ گھوڑے کو ایک جگہ چھوڑ کر تیزی سے پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ جب وہ اوپر پہنچا تو ایک جان لیوا منظر اس کا منتظر تھا۔

ہاں وہ بزبران ہی تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور جسم پتھر کا ہو چکا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ بکوزان نے یہ جاننے کے لئے کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے اس کے جسم کا اچھی طرح معائنہ کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ کسی خونخوار جانور نے اس کا گلا چبا ڈالا تھا۔

بزبران کا یہ انجام دیکھ کر دکھ کی ایک لہر اوپر سے نیچے تک اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بزبران اپنا خیمہ چھوڑ کر یہاں اس پہاڑی پر کس طرح پہنچا۔ وہ یہاں کیا کرنے آیا تھا۔ اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ یہاں سے کوہ ویراں کا نظارہ کرنے آیا تھا تو یہ اندازہ بھی غلط تھا کیونکہ یہاں سے کوہ ویراں نظر نہیں آ رہا تھا۔ درمیان میں ایک پہاڑی حائل ہو گئی تھی۔

بزبران کے اس پہاڑی تک آنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ پھر یہی سوچا جا سکتا تھا کہ اسے خیمے سے اٹھا کر یہاں لایا گیا اور پھر کسی خونخوار جانور کے حوالے کر دیا گیا۔ علاقے میں ایسے خونخوار جانوروں کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس طرح کا واقعہ بستی کے کسی شخص کے ساتھ آج تک پیش نہیں آیا تھا۔

بکوزان کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ ایک تو دوست کی موت کا صدمہ تھا' پھر اس دوست کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ چکرا دینے کیلئے کافی تھا۔ بکوزان نے اپنے بکھرتے ہوئے اعصاب کو مجتمع کیا۔ اس کے پتھر جسم کو وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے نیچے آیا' گھوڑے پر بیٹھا اور اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔

ابھی وہ تھوڑا سا ہی آگے چلا تھا کہ اسے ایک مختی نظر آ گیا۔ اس نے اسے فوراً ہدایت دی۔ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے چاروں ساتھیوں کو اس پہاڑی پر لے آیا۔ سب نے مل کر بزبران کے پتھر جسم کو اتارا اور پھر اس جسم کو ایک نچر پر لاد کر واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

بکوزان جب بزبران کا جسم لے کر بستی میں داخل ہوا تو پوری بستی میں ایک کہرام مچ گیا۔ بزبران کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ وہ اس بستی کے ستونوں میں سے تھا۔ تین بڑے ہنر مندوں میں سے ایک تھا۔ موسم کی نبض پر ہر وقت اس کی انگلیاں رہتی تھیں۔ اب وہی انگلیاں پتھر کی ہو چکی تھیں۔ ریت کے مطابق یہ قافلہ رمز شناس سار ملوک کے محل کے دروازے پر پہنچا۔ سار ملوک کو جیسے ہی محل میں اطلاع ملی وہ فوراً باہر آ گیا۔ بابا صاعق کو بھی بلوا لیا گیا۔

بزبران کی لاش کو محل کے سامنے سرخ پتھر کے بنے چبوترے جس پر سبز قالین بچھا ہوا تھا رکھ دیا گیا۔ بابا صاعق اور سار ملوک نے اس کی لاش کا معائنہ کیا۔ بکوزان کی طرح ان کی سمجھ میں بھی نہ آیا

کہ بزبران کو کس جانور نے ہلاک کیا۔ اس بستی میں اس نوعیت کی یہ پہلی ہلاکت تھی۔
رسم کے مطابق بزبران کے پتھر جسم کو سولہ گھوڑوں کی کناری پر رکھا گیا اور یہ گاڑی دھیرے دھیرے میدان فنا کی طرف چلنا شروع ہوئی۔ اس گاڑی کے پیچھے بابا صاعق اور رمز شناس سمار ملوک چل رہے تھے۔ جب یہ گاڑی میدان فنا میں پہنچی تو اس بستی کی تمام عورتیں وہاں پہنچ چکی تھیں۔ اس ماتمی جلوس میں کوئی مرد شریک نہ تھا۔ علاوہ بابا صاعق اور رمز شناس کے۔

اجتماعی دعا کے بعد بابا صاعق نے دو بندوں کی مدد سے جو اسی کام کی غرض سے اس میدان میں موجود تھے بزبران کے پتھر جسم کو کھڑا کر دیا۔ پہلا پتھر بابا صاعق نے اس کے پیر کے پاس رکھا' پھر رمز شناس سمار ملوک نے دوسرا پتھر دوسرے پیر کے پاس رکھا اور وہ دونوں دور ہٹ گئے۔

اس کے بعد ایک ایک عورت آتی گئی اور اس کے جسم کے ساتھ پتھر رکھتی گئی۔ کچھ ہی دیر میں بزبران کا پتھر جسم سینے تک پتھروں میں چھپ گیا۔ پتھر رکھنے کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔

جب بستی کی تمام عورتوں نے اپنے اپنے حصے کا پتھر بزبران کی چٹان موت پر رکھ دیا تو بابا صاعق نے ان پتھروں پر مقدس پانی کا چھڑکاؤ کیا اور اس طرح یہ تدفین مکمل ہوئی۔ اس میدان فنا میں اس طرح کی بہت سی پتھر کی قبریں تھیں اور ان کے جسم اسی طرح سینے تک پتھروں سے ڈھکے کھڑے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ مردہ جسم سخت سے سخت ہوتے چلے جاتے تھے۔ ایک وقت آتا تھا کہ اگر ان کھڑی لاشوں پر بھاری ہتھوڑے برسائے جائیں تب بھی ان کا کچھ نہ بگڑے۔

میدان فنا بظاہر ایک قبرستان تھا لیکن اسے ہماری دنیا کا آدمی دیکھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی آرٹسٹ نے سینکڑوں مجسمے تراش دیئے ہوں۔ یہ بڑے انوکھے مجسمے تھے۔

خیر اس بستی کا ایک بڑا ہنر مند بزبران ابدی سفر پر روانہ ہو چکا تھا اور اس کی موت کے اسباب پر غور کرنے کیلئے بابا صاعق اور سمار ملوک سر جوڑے بیٹھے تھے لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں بار بار اپنا سر کھجا رہے تھے اور ایک دوسرے کو خالی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

ابھی تہکال کے بارے میں یہ طے نہیں ہو سکا تھا کہ اسے کس قسم کا حادثہ پیش آیا ہے۔ آیا وہ زندہ ہے یا زندگی کی بازی ہار چکا ہے۔ اگر اس کی موت واقع ہو چکی ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ کس کی مذموم حرکت ہے۔ اس بستی میں جرائم کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ سب بھلے مانس لوگ بستے تھے۔ جو ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھتے تھے۔ اور بستی کے قوانین پر سختی سے عمل کرتے تھے۔

رائین کی تلاش کے سلسلے میں دو کوششیں ناکام ہو چکی تھیں اور ان کوششوں کے نتائج انتہائی سنگین نکلے تھے۔ اب ساتن میدان میں تھا۔ اس نے اپنے کچھ شکاری میدان میں اتارے تھے۔ ان کا انتظار تھا کہ وہ کیا کر کے لوٹتے ہیں۔

بابا صاعق نے وہ پورا دن سمار ملوک کے نیلے گنبد میں گزارا۔ رشا ملوک دوپہر کا کھانا خود لے کر آئی۔ اس نے اپنی نگرانی میں ان دونوں کو کھانا کھلوایا۔

جب وہ دونوں کھانا کھا چکے تو سمار ملوک کو ساحل عمر کا خیال آیا۔ اس نے فوراً پوچھا۔ ''رشا

ملوک اپنے مور کو بھی کھانا کھلایا۔''

''جی بابا' میں نے مویا کو بھیج دیا تھا کھانا لے کر۔'' رشا ملوک نے بتایا۔''اب قہوہ لے کر میں خود جاؤں گی۔''

''اسے یہیں نہ بلوالیں۔'' سارملوک نے بابا صاعق سے پوچھا۔

''ہاں بلوالو...... ہوسکتا ہے وہ ہم سے بہتر کوئی بات سوچ لے۔'' بابا صاعق نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

''ٹھیک ہے...... میں جاؤں گی تو انہیں ساتھ لیتی آؤں گی۔ ویسے انہیں میں نے حالات سے باخبر رکھا ہوا ہے۔'' رشا ملوک نے اپنے باپ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اچھا کیا تم نے۔'' سارملوک نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ساحل عمر رشا ملوک کے ساتھ مہمان خانے میں آ پہنچا۔ اس نے باری باری دونوں داناؤں کا ہاتھ چوما اور بڑے ادب سے دوزانو ہو کر قالین پر بیٹھ گیا۔

تہکال کے اچانک غائب ہو جانے کا اسے بھی صدمہ تھا۔ اس نے اس کی تصویر بنائی تھی اور بہت دل لگا کر بنائی تھی۔ اس تصویر کے حوالے سے وہ اس کے بہت قریب تھا۔ پھر اس نے اسے چترو بھیل کے چنگل سے نکالا تھا۔ نہ صرف چترو بھیل کے شکنجے سے نکالا تھا بلکہ رشا ملوک سے ملاقات کا ذریعہ بھی بنا تھا۔ اس طرح تہکال کے بہت احسان تھے اس پر۔ وہ اس کا ایک طرح سے محسن تھا۔ اس کی گمشدگی اس کیلئے باعث تشویش تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی تلاش میں نکل جائے...... لیکن ابھی اسے بستی میں یا بستی سے باہر جانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔

ویسے بابا صاعق تہکال کی زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ اگر تہکال اس دنیا میں نہیں رہا تھا تو پھر دونوں میں یہ دو اموات ہوئی تھیں اور ان اموات کے پیچھے کوئی گہری سازش کام کر رہی تھی۔

سوال یہ تھا کہ وہ کون تھے جو ان معصوم لوگوں کے پیچھے لگ گئے تھے۔ راعین تو ابھی اپنے مدفن میں تھا۔

سہ پہر کو سناتن کے آنے کی اطلاع ملی۔ اسے فوراً اندر بلوالیا گیا۔ اور ساحل عمر سے کہا کہ وہ رشا ملوک کے ساتھ اندر چلا جائے۔ کسی مصلحت کی بنا پر ابھی وہ بستی والوں کے سامنے ساحل کی آمد ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ساحل عمر فوراً اٹھ کر رشا ملوک کے ساتھ اندر محل میں چلا گیا۔

سناتن کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے ان دونوں کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

''اے سناتن! اس بستی کے بڑے ہنر مند کیا تو بھی ناکام ہو گیا۔'' بابا صاعق نے اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ناکام تو خیر میں نہیں ہوا لیکن کوئی اچھی خبر میرے پاس نہیں ہے۔'' وہ اداس لہجے میں گویا ہوا۔

"جو کچھ کہنا ہے جلد کہہ اور صاف صاف کہہ۔" سمارملوک نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

"میں نے جہکال کی تلاش میں چھ شکاری روانہ کیے تھے۔ دو باز دو لومڑیاں اور دو سانپ...... ان میں سے صرف ایک باز واپس آیا ہے اور اس کا بھی ایک بازو زخمی ہے۔ شاید اس پر بھی کوئی افتاد پڑی ہے۔"

"اوہ...... یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہماری بستی کس طوفان کی لپیٹ میں ہے۔" بابا صاعق نے آہ بھری۔

"ضرور ہم سے کوئی گناہ ہوئے ہیں کہ اوپر والے نے ہم پر آفتیں نازل کرنا شروع کر دی ہیں۔" سمارملوک نے کہا۔

"جہکال کے بارے میں کوئی خبر لایا ہے تیرا شکاری؟" بابا صاعق نے سوال کیا۔

"ہاں بابا...... لایا ہے۔" سناتن بولا۔

"جلد بتا...... جہکال زندہ تو ہے۔"

"کچھ کہا نہیں جاسکتا...... اس باز کے ساتھ جا کر دیکھنا ہوگا کہ وہ کس حال میں ہے۔"

"تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ کہاں ہے؟"

"یہ بات میں نہیں جانتا کہ جہکال کہاں ہے؟ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ بستی کے باہر موجود ہے۔ میرا شکاری اس کے چند بال اپنی چونچ میں دبا کر لایا ہے۔"

"وہ بال کہاں ہیں کیا تو اپنے ساتھ لایا ہے۔"

"لایا ہوں۔" یہ کہہ کر سناتن نے جیب میں احتیاط سے رکھے ہوئے بال نکال کر بابا صاعق کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

بابا صاعق نے ان بالوں کو غور سے دیکھا۔ وہ واقعی جہکال کے بال تھے۔ ان بالوں کو دیکھ کر بابا صاعق کی آنکھوں میں امید کی کرن جاگی۔ وہ ان بالوں کو پہچانتے ہوئے بولے۔ "ہاں یہ بال میرے جہکال کے ہیں...... اے سناتن تو دیر نہ کر فوراً اپنے شکاری کو لے کر بستی سے نکل جا...... تجھے جو چاہئے وہ میں مہیا کر دیتا ہوں۔"

"بابا مجھے کچھ نہیں چاہئے...... جو مجھے چاہئے اس کا انتظام میں خود کر لوں گا۔" سناتن اٹھتے ہوئے بولا۔ "اچھا میں جاتا ہوں۔ دعا کریں کہ جہکال تک پہنچ جاؤں۔"

"ہاں تو جا...... میں دعا کروں گا۔"

سناتن دونوں داناؤں کے ہاتھ چوم کر نیلے گنبد سے نکل گیا پھر اس نے اپنے ساتھ دو محنتی لئے۔ اپنے باز کو کندھے پر بٹھایا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر سوچنے لگا کہ کدھر جائے۔ اتنے میں باز اس کے کندھے سے ایک سمت اڑا اور تھوڑا دور جا کر واپس اس کے کندھے پر آ بیٹھا۔

اس باز نے سمت کا تعین کر دیا تھا۔ سناتن اس کی بتائی ہوئی سمت کی طرف چل پڑا۔ یہ سمت کوہ ویراں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

کوہ ویراں کی اپنی کہانی تھی جو صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ کوہ ویراں کے اس طرف کیا ہے۔
اس بستی کے لوگوں نے ادھر جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب تو کہانیاں ہی رہ گئی تھیں۔ کہانیاں جو بستی والے اپنے بزرگوں سے سنتے چلے آئے تھے۔ یہ کہانیاں سینہ بہ سینہ چلی آ ہی تھیں۔ کبھی بہت سالوں پہلے اس بستی کے چند سر پھرے نوجوانوں کے دل میں کوہ ویراں کے اس پار جانے کی خواہش نے شدت اختیار کی۔ وہ نوجوان یہ دیکھنے کیلئے کہ اس پار کیا ہے کوہ ویراں کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ وہ پانچ نوجوان تھے۔ وہ گئے تو پھر ان میں سے چار نوجوان واپس نہ آ سکے۔ کافی عرصے کے بعد ایک نوجوان خستہ حالت میں اپنی بستی میں پہنچا تو وہ کوہ ویراں کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا کیونکہ اس کے منہ میں زبان موجود نہ تھی۔

یہ جاننے کیلئے کہ ان چاروں نوجوانوں کے ساتھ کیا ہوا وہ کہاں گم ہو گئے اور جو نوجوان واپس آیا اس کی زبان نکال کر کس نے اپنے پاس رکھ لی دو سر پھرے نوجوان اس مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔

بستی والے ان نوجوانوں کا انتظار کرتے ہی رہ گئے۔ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ان دونوں سے کوئی واپس نہ پلٹا۔ ان دونوں جوانوں کے دو بھائی اور بستی میں موجود تھے۔ وہ اپنے گمشدہ بھائیوں کی محبت کے جنون میں مبتلا ہو کر بستی والوں کے منع کرنے کے باوجود کوہ ویراں کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ بستی والے ان کا بھی انتظار کرتے رہ گئے۔

پھر بستی کے ایک ہنر مند نے اپنے کچھ جانور کوہ ویراں کی مہم پر روانہ کئے۔ ان مہم جو جانوروں میں سے صرف ایک باز واپس آیا۔ اس باز کے پنجوں میں ایک نوجوان کے لباس کا ٹکڑا تھا۔ لباس کے اس ٹکڑے کو دیکھ کر اندازہ کر لیا گیا کہ وہ دونوں نوجوان کوہ ویراں کی نذر ہو گئے۔

تب اس وقت کے بستی کے رمز شناس نے پوری بستی میں منادی کرا دی کہ آئندہ بستی کا کوئی شخص کوہ ویراں کا رخ نہ کرے۔ اگر کسی کو کوہ ویراں کی مہم پر جانے کا بہت شوق ہو تو وہ ضرور جائے لیکن کوہ ویراں کے ادھر ہی رہے اس کے پیچھے جانے کی کوشش نہ کرے۔ اتنے لوگوں کی گمشدگی کے بعد اب اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ کوئی نوجوان خواہ مخواہ اپنی جان گنوانے کوہ ویراں کی مہم پر چلا جائے۔

اس اعلان کے باوجود ایک دو متجسس نوجوانوں نے خفیہ طور پر کوہ ویراں کا راز معلوم کرنے کیلئے سفر اختیار کیا مگر وہ یہ بتانے کیلئے کہ وہاں کیا ہے بستی میں واپس نہ آ سکے۔

پھر کوہ ویراں کے بارے میں نت نئے افسانے تراش لئے گئے۔ خوفناک کہانیاں گھڑ لی گئیں اور یہ کہانیاں سینہ بہ سینہ آج بھی ایک دوسرے کو سنائی جاتی ہیں۔

کوہ ویراں آج بھی ایک سربستہ راز ہے۔ اس بستی کے لوگ نہیں جانتے کہ کوہ ویراں کے پیچھے کیا ہے۔ لوگ ادھر جاتے ہیں تو وہاں سے واپس کیوں نہیں آتے۔ ان پر کیا بیتتی ہے۔ وہ کہاں کھو جاتے ہیں۔

جہاں بہت سی کہانیاں مشہور تھیں ان میں ایک کہانی یہ بھی تھی کہ کوہ ویراں کے پیچھے کالے

لوگوں کی بستی ہے۔ ایسے لوگ جن کی رگوں میں شیطان خون بن کر دوڑتا ہے۔ جو اچھائی کے دشمن ہیں۔ انسانیت کی دھجیاں بکھیر کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔
یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ کوہ ویراں کے پیچھے شیطانوں کی بستی تھی۔ کالے اور برے لوگ آباد تھے۔ ایسے لوگ جو دوسروں کی زندگیوں میں زہر گھول کر خوش ہوتے تھے۔ یہ بستی اونچے اونچے پہاڑوں میں گھری تھی اور بہت گہرائی میں تھی۔ اتنی گہرائی میں کہ سورج محض ایک گھنٹے دکھائی دیتا تھا۔ یہ بستی دن میں بھی اندھیرے میں ڈوبی رہتی تھی۔ اندھیرے لوگ تھے اندھیرے میں رہ کر ہی خوش رہتے تھے۔ یہاں اتنی کثافت تھی کہ روشنی کا ایک گھنٹے میں بھی دم گھٹنے لگتا تھا۔ وہ اپنی جان چھڑا کر نکل جاتی تھی۔
سناتن اپنے باز کی رہنمائی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ باز جس کا ایک بازو زخمی تھا اور وہ اونچی اور لمبی اڑان بھرنے سے قاصر تھا۔ چھوٹی چھوٹی اڑانیں بھر کر سناتن کی رہنمائی کرتا اور پھر اس کے کندھے پر آ بیٹھتا تھا۔ جب سناتن اس کے بتائے ہوئے راستے پر سفر کر لیتا تو پھر وہ اڑ کر اسے آگے کا راستہ دکھاتا۔ اس طرح آگے بڑھتے بڑھتے اندھیرا جھکنے لگا مگر منزل نہ آئی۔
جب گہرا اندھیرا چھا گیا اور آگے سفر کرنا ممکن نہ رہا تو سناتن نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ وہ اپنے ساتھ دو مختی لایا تھا۔ ان ماہر مختیوں نے آناً فاناً اس کے لئے خیمہ لگا دیا۔ کھانا تیار کر کے اس کے سامنے رکھ دیا اور پھر وہ دونوں اپنے خیمے میں چلے گئے۔
صبح کا اجالا پھوٹتے ہی سفر شروع ہو گیا۔ سناتن کے سامنے اب یہ بات واضح ہو کر آ گئی تھی۔ کہ اس کا باز اسے کوہ ویراں کی طرف لئے جا رہا تھا۔ وہ اس کے اشارے پر چلتا رہا کہ یہاں تک کوہ ویراں کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ یہ پہاڑ زیادہ اونچا نہ تھا۔ پھر اس پر چڑھنا زیادہ مشکل نہ تھا۔ ڈھلائی راستے تھے۔ ان پر چل کر چوٹی پر پہنچا جا سکتا تھا لیکن یہ سفر گھوڑوں کے بس میں نہ تھا۔ لہٰذا گھوڑوں کو نیچے ایک مناسب جگہ پر چھوڑ دیا گیا اور سناتن دونوں مختیوں کے ساتھ اوپر چڑھنے لگا۔ باز اڑ اڑ کر ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔
دوپہر تک سناتن کوہ ویراں کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ باز اس کے کندھے پر موجود تھا۔ سناتن نے چوٹی پر کھڑے ہو کر جب نیچے نظر ڈالی تو اسے گہری کھائی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ نیچے اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سناتن نے بھی کوہ ویراں کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوا تھا لیکن اوپر پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ یہ محض کہانیاں ہیں۔ اسے وہاں کچھ نظر نہ آیا۔
کوہ ویراں پر سمندر کے جھاگ جیسی برف جمی ہوئی تھی۔ یہ گلیشیر نیچے تک گئے تھے۔ درخت برف کے درمیان سے سر ابھارے کھڑے تھے۔ ڈھلان خطرناک تھے لیکن ان ڈھلانوں پر قدم جما کر نیچے پہنچا جا سکتا تھا۔
سناتن نے دور تک نظر دوڑائی لیکن اسے کہیں تھکال نظر نہ آیا۔
سناتن نے اپنے کندھے پر بیٹھے باز کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ ”ہاں بھئی...... اب کدھر؟“
باز فوراً اس کے کندھے سے اڑ گیا اور اڑتا ہوا نیچے ڈھلائی راستے کی طرف جانے لگا۔ کافی نیچے جانے کے بعد وہ ایک درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ پھر وہاں سے واپس اڑ کر اوپر آ گیا اور

سناتن کے کندھے پر اپنے پاؤں جما لئے اور اپنی چونچ کھول کر سناتن کے کان کی لو کو دبایا۔

''اچھا بھائی...... چلتا ہوں۔'' اس نے باز کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

پھر سناتن نے سنبھل سنبھل کر نیچے اترنا شروع کیا۔ مختی بھی اس کے ساتھ نیچے اترنے لگے۔

دونوں مختی نیچے جانے سے ڈر رہے تھے لیکن سناتن کے سامنے انکار کی جرأت نہ تھی۔ وہ دونوں بہت دھیرے دھیرے نیچے اتر رہے تھے۔ سناتن اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

پھر ایک وقت آیا کہ سناتن فاصلہ طے کرتا ہوا ایک پہاڑی کی اوٹ میں چلا گیا۔ دونوں مختیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں طے کیا کہ واپس چلے جانا چاہئے کہ سناتن پہاڑی کی اوٹ سے نکل کر واپس آیا اور غصے سے بولا۔ ''کیا کرتے ہو' جلدی نیچے آؤ۔''

''آتے ہیں ہنر مند...... آتے ہیں۔'' وہ دونوں مختی بیک وقت بولے اور گھبرا کر جلدی جلدی نیچے اترنے لگے۔

گھبراہٹ میں ایک کا پاؤں پھسلا' اس نے خود کو پھسلنے سے بچانے کیلئے دوسرے مختی کا پاؤں پکڑنا چاہا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اب دونوں مختی ڈھلان پر لڑھکنے لگے۔

پھر نہ جانے کیسے ان کے ہاتھ درختوں سے لپٹ گئے۔ دونوں نے ان درختوں کو مضبوطی سے تھام لیا اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگے جب انہوں نے اوپر نظریں اٹھا کر دیکھا کہ وہ کس درخت سے لپٹے ہوئے ہیں تو وہ دونوں ان درختوں کی صورت دیکھ کر اپنے ہوش گنوا بیٹھے۔

☆......☆......☆

وہ درخت نہ تھے۔ برفانی ریچھ تھے۔ لحیم شحیم اور تناور...... وہ دونوں ریچھ برابر برابر کھڑے تھے۔ وہ سفید رنگ کے تھے جبکہ ان کے منہ کالے تھے۔ یہ گوشت خور ریچھ تھے۔ ان دونوں خونخوار ریچھوں نے چند لمحوں میں دونوں مختیوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ انہوں نے پیٹ پھاڑ کر دونوں کی آنتیں باہر نکال دیں۔ دونوں مختیوں نے آخری چیخ ماری پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

سناتن جو آگے جا چکا تھا۔ وہ ان کے لڑھکنے کے شور پر پہاڑی کی اوٹ سے دوبارہ واپس آیا تو اس نے ان دونوں کو تیزی سے نیچے جاتے دیکھا۔ وہ ان کے راستے میں آ کر انہیں روکنا چاہتا تھا لیکن جانتا تھا کہ وہ اتنی تیزی سے لڑھک رہے ہیں کہ وہ انہیں روکنے کی بجائے خود بھی ان کے ساتھ لڑھکنا شروع ہو جائے گا۔ اس لئے وہ ان کے سامنے آنے سے باز رہا۔

پھر سناتن نے ان دونوں کو کافی نیچے ریچھوں کے پیروں سے لپٹ کر رکتے دیکھا اور پھر چند لمحوں میں ہی ریچھوں نے دونوں مختیوں کا حشر کر کے رکھ دیا۔ سناتن نے ان کی آخری چیخیں سنیں۔ انہیں ادھڑتے دیکھا تو اسے اپنے ہوش اڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ آگے جانے کے بجائے پلٹ کر اوپر بھاگے۔

اس نے اپنے کندھے پر سوار باز کو اوپر واپس جانے کا اشارہ کیا۔ باز فوراً اڑ گیا۔ سناتن نے اس کے اڑتے ہی تیزی سے اوپر کی طرف چڑھنا شروع کیا۔ وہ پتھروں اور درختوں کی شاخوں کا سہارا لے کر چڑھنے لگا۔

تھوڑا سا اوپر چڑھ کر اس نے پلٹ کر نیچے دیکھا۔ وہ دونوں ریچھ اپنے اردگرد سے بے نیاز ان دونوں مختیوں کی لاشوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ ویسے بھی وہ دونوں ریچھ اتنے نیچے تھے کہ انہیں اوپر آنے میں وقت لگتا۔ اتنی دیر میں سناتن کو امید تھی کہ وہ ان کی پہنچ سے دور نکل جائے گا۔ تازہ صورت حال میں تو اسے اور مہلت مل گئی تھی۔ پھر بھی اس نے غفلت سے کام نہ لیا۔ وہ کسی بندر کی طرح اچھلتا' چھلانگیں لگاتا بڑی مستعدی اور پھرتی سے اوپر چلا آ رہا تھا۔ پھر وہ جلد ہی اوپر چوٹی پر پہنچ گیا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اس کی جان بچ گئی تھی۔ وہ موت کی وادی سے بخیریت اوپر پہنچ گیا تھا۔ وہ چوٹی پر ہاتھ پاؤں پھیلائے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس نے چوٹی سے نیچے دیکھا۔ اسے کچھ نہ دکھائی دیا۔ نیچے اندھیرا تھا۔ وہ دونوں ریچھ درختوں اور چٹانوں کے پیچھے کہیں چھپ گئے تھے۔

ایک دم اسے ایک چیخ سنائی دی۔ یہ اس کے باز کی چیخ تھی جو اسے خطرے سے آگاہ کر

رہی تھی۔ سناتن نے گردن گھما کر باز کو دیکھنا چاہا کہ وہ کہاں ہے اور کس قسم کا خطرہ لاحق ہے کہ پیچھے سے دو کالے ہاتھ اس کے گلے میں آئے اور پھر تیز دانتوں نے آناً فاناً اس کی گردن ادھیڑ دی۔ سناتن یہ بھی نہ دیکھ پایا کہ اس پر حملہ کرنے والا کون ہے۔ اب وہ تیزی سے برف پر پھسلتا جارہا تھا۔ اس کی گردن میں جیسے آگ لگی تھی۔ اس پر غشی طاری ہوتی جارہی تھی۔ پھر وہ پھسلتے پھسلتے جہاں رکا۔ وہاں اس کا گھوڑا موجود تھا۔ سناتن اپنے گھوڑے کی گردن سے جھول کر کسی طرح اس کی پیٹھ پر سوار ہوگیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے گھوڑے کی گردن پکڑ لی۔ چند لمحوں بعد باز بھی گھوڑے کی پیٹھ پر آ بیٹھا۔ تب وہ گھوڑا سنبھل سنبھل کر مگر تیزی سے نیچے اترنے لگا۔

☆......☆......☆

جب وہ گھوڑا سناتن کو اپنی پیٹھ پر لادے تھکن سے چور شام ڈھلے بستی میں داخل ہوا تو سب سے پہلے بکوزان کی اس پر نظر پڑی۔ وہ اپنی کٹاری میں کہیں باہر کا چکر لگا کر بستی میں داخل ہورہا تھا۔ جب وہ اس گھوڑے کے پاس سے گزرا اور اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر کسی کو بے سدھ لپٹا ہوا دیکھا تو وہ اپنی کٹاری روک کر گھوڑے کی طرف بھاگا۔ جب اس نے گھوڑے پر لدے شخص کی صورت دیکھی تو اس کے دل میں سناٹا اتر گیا۔

ایک اور موت!

ابھی تو بزبران کا غم ہلکا نہ ہوا تھا کہ بستی کے ایک اور اہم ستون کی لاش آ گئی۔ بکوزان نے سناتن کی لاش جو اب پتھر ہو چکی تھی، گھوڑے کی پیٹھ سے اٹھا کر اپنی کٹاری میں ڈالی اور رمز شناس کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

بستی ایک مرتبہ پھر غم کی لپیٹ میں آ گئی۔ جس جس کو خبر ہوتی گئی وہ بکوزان کی کٹاری کے ساتھ ہوتا گیا۔ بکوزان نے سناتن کی پتھر لاش کو دوسروں کی مدد سے رمز شناس کے محل کے سامنے بنے چبوترے پر رکھ دیا۔ رمز شناس سمارملوک فوراً ہی محل سے باہر نکل آیا۔ بابا صاعق کو بھی وہاں پہنچتے دیر نہ لگی۔

دونوں نے مل کر سناتن کی لاش کا معائنہ کیا۔ اس کی گردن کا بھی وہی حال تھا جو بزبران کی گردن کا تھا۔ کسی وحشی جانور نے اس کا نرخرہ چبا ڈالا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟...... ہماری بستی کے امن کو کس کی نظر کھا گئی۔" بابا صاعق کے لہجے میں اداسی تھی۔

"ابھی تو وہ بدبخت اپنے مدفن میں موجود ہے اس پر اس نے لاشوں کے انبار لگا دیئے ہیں۔ کہیں وہ اپنے مدفن سے نکل آیا تو جانے کیا ہو۔ کیسی تباہی پھیلے۔" سمارملوک نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"سناتن کے پانچ جانور ہلاک...... ہمارے دو ہنرمند بزبران اور سناتن اور دو محنتی...... ان سب کی زندگیاں چھین لی گئیں اور ہم کچھ نہیں کر سکے۔ ابھی تو اس کے مدفن کے علاقے کا تعین بھی نہیں ہوسکا، مدفن کا پتہ چلانا تو دور کی بات ہے۔" بابا صاعق فکر میں ڈوبے بول رہے تھے۔

"اے بابا...... تعین تو ہو گیا ہے۔ میں اب یقین سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ راعین کا مدفن کوہ ویراں پر کسی جگہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ مدفن کوہ ویراں کے اس طرف ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری طرف ہو لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ منحوس کوہ ویراں پر کسی جگہ دفن ہے۔" بکوزان نے بڑے یقین سے کہا۔

"اب کوہ ویراں پر کون جائے گا...... وہاں تو پہلے ہی جانا مشکل تھا۔ ان نئے واقعات کے بعد اب میں کس سے کہوں کہ کوہ ویراں کا سفر کر...... میں بستی کا رمز شناس ہوں۔ میں کسی کو جان بوجھ کر موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتا۔" سمارلوک نے افسردگی سے کہا۔

"اے رمز شناس آپ فکر نہ کریں...... بکوزان کوہ ویراں کا سفر کرے گا۔" بکوزان نے بڑے پر جوش انداز میں کہا۔

"نہیں بکوزان...... میں تجھے وہاں اکیلا جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"اے رمز شناس میں اکیلا نہیں جاؤں گا...... پوری تیاری سے جاؤں گا۔ میرے ساتھ کم از کم تیس نوجوانوں کا قافلہ ہوگا۔ اب تک تو یہ ہوا ہے کہ جو گیا ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس پر کیا بیتی لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ ہم میں سے کوئی تو زندہ بچے گا۔ وہ آ کر پوری روداد سنائے گا۔ اس طرح بستی کے رمز شناس آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہاں ہم پر کیا بیتی؟"

"ایسی بدفال منہ سے کیوں نکالتا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتا کہ تو جائے گا اس مرتبہ راعین کے مدفن کا کھوج لگا کر آئے گا۔" سمارلوک نے اسے ڈانٹ پلائی۔

"ہاں، رمز شناس! ایسا بھی ہو سکتا ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" اس مرتبہ بابا صاعق نے زور دے کر کہا۔

رات ہو چکی تھی اس لئے اس وقت فوری تدفین ممکن نہ تھی۔ یہ کام صبح کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

صبح تدفین کے بعد میدان فنا میں جمع ہونے والی خواتین سے بستی کے رمز شناس سمارلوک نے بڑا جذباتی خطاب کیا۔ اس نے راعین کے بارے میں پوری کہانی سنائی۔ اس نے پھر یہ بتایا کہ اس بدبخت کی تلاش میں ہمارا کتنا جانی نقصان ہو چکا ہے۔ نیز یہ کہ اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ آخر میں وہ بستی کی خواتین سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اس بستی کی معزز عورتو! اب کچھ قربانی دینے وقت آ گیا ہے۔ بکوزان کو اس مہم کو سر کرنے کے لئے بستی کے تیس نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ تم اپنے بیٹے یا بھائی بھتیجے کو اس مہم میں بھیجنا چاہو تو اسے زادِ راہ کے ساتھ بابا صاعق کی مختاری پر بھیج دو۔ بعد دوپہر یہ قافلہ اپنی مہم پر روانہ ہو جائے گا۔"

بستی کے رمز شناس کی بات سب عورتوں نے بڑی توجہ سے سنی۔ اس کی بات سنتے ہی بستی کی عورتوں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ سناتن کی قبر پر پتھر نچھاور کرتی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئیں۔

دوپہر کو بابا صاعق بکوزان کے ساتھ اپنی مختاری سے باہر آئے تو انہوں نے اپنی مختاری کے احاطے میں تیس کے بجائے سو نوجوانوں کو سفر کیلئے تیار پایا۔

اپنی بستی کے نوجوانوں کا جوش دیکھ کر بابا صاعق کی گردن فخر سے بلند ہو گئی۔ جس بستی میں ایسے جان نچھاور کرنے والے نوجوان ہوں' اس بستی کا بھلا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

بکوزان جس مہم پر جانے والا تھا اس کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہاں کس قدر خطرہ تھا۔ وہ تیس سے زائد نوجوانوں کو لے جا کر خواہ مخواہ ان کی ہلاکت کا باعث بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ان نوجوانوں میں سے تیس کو منتخب کر لیا۔ جن نوجوانوں کا انتخاب نہ ہو سکا وہ بڑے مایوسانہ انداز میں مختاری کے احاطے سے نکل گئے۔ بکوزان نے ان تیس منتخب نوجوانوں کو سفر کی مشکلات اور حالات کے خطرات سے اچھی طرح آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔ "اب کوئی نوجوان اس مہم سے دستبردار ہونا چاہے تو خوشی سے ہو سکتا ہے۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

لیکن کسی نوجوان نے جانے سے انکار نہ کیا۔

دوپہر کے بعد بستی کا رمز شناس' بابا صاعق کی مختاری آ پہنچا۔ اس کی آمد کے بعد مہم جوؤں کا یہ قافلہ کوہ ویراں کی طرف روانہ ہوا۔ بابا صاعق نے ان کی کامیابی کی دعا کی۔ رمز شناس سار ملوک نے رخصت ہوتے وقت ہر نوجوان کی پیٹھ تھپکی۔ "جاؤ اور خوشخبری لے کر آؤ۔"

بکوزان تیس نوجوانوں کو جو ہر طرح سے لیس تھے' جب اپنے ساتھ لے کر چلا تو اس کے دل میں متضاد قسم کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ کبھی وہ نا امیدی کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈوب جاتا' کبھی کامیابی کے چراغ اس کے دل کی فصیلیں روشن کر دیتے۔ بہر حال وہ تذبذب کے عالم میں بستی سے نکلا اور اس نے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکالی۔ پھر اس کا گھوڑا ہموار راستے پر سرپٹ دوڑنے لگا۔ اس کی تقلید میں تیس نوجوان گھڑسواروں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور پھر وہ چند ثانیوں کے بعد ہی ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

رشا ملوک بستی کے باہر اپنی شاہی کٹاری میں بیٹھی پردہ ہٹائے نوجوانوں کے قافلے کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ پورا قافلہ اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

جب نوجوانوں کو یہ معلوم ہوا کہ رمز شناس کی بیٹی رشا ملوک انہیں رخصت کرنے بستی کے باہر تک جا رہی ہے تو ان کا جوش دوچند ہو گیا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ رشا ملوک اپنی بند کٹاری میں تھوڑا سے پردہ ہٹائے ان نوجوانوں کو دیکھتی جا رہی تھی لیکن کسی نوجوان کا اسے دیکھ لینا ممکن نہ تھا۔

رشا ملوک کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ ابھی تک یہ طے نہیں کر پائی کہ اس نے جو کچھ کیا تھا ٹھیک کیا تھا یا اپنے ہاتھوں اپنی بدقسمتی کو دعوت دے دی تھی۔

لیکن وہ کیا کرتی۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی۔

ساحل عمر کو جب یہ معلوم ہوا کہ سناتن بھی لاش کی صورت میں بستی میں واپس آ گیا ہے تو اس نے رشا ملوک سے بات کی۔ "رشا اس مہم پر میں جانا چاہتا ہوں۔"

"آپ تو بستی میں نہیں جا سکتے' آپ مہم پر جانے کی بات کرتے ہیں؟" رشا ملوک نے سختی سے منع کر دیا۔

ساحل عمر اپنا من مار کر رہ گیا۔ وہ اصل میں بند کمرے میں رہتے رہتے پریشان ہو گیا تھا۔ اب باہر نکلنا چاہتا تھا۔ پھر اسے جانے یہ یقین سا کیوں تھا کہ اس بستی کا کوئی شخص راعین کا مدفن تلاش نہیں کر سکتا' وہ کر سکتا تھا۔

رشا ملوک کے منع کرنے پر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ پھر دوسرے دن مویا نے اسے اطلاع دی کہ بکوزان کی قیادت میں تیس نوجوانوں کا قافلہ راعین کی تلاش میں جا رہا ہے۔ یہ سن کر وہ مچل اٹھا۔ اس نے مویا سے کہا کہ اس قافلے میں شامل ہونے کی وہ کوئی ترکیب بتائے۔ تب مویا نے اس کا اصرار دیکھ کر ایک ترکیب بتا دی اور تاکید کر دی کہ وہ اس سلسلے میں اس کا نام نہ لے۔

مویا کے جانے کے بعد جب رشا ملوک اس کے لئے قہوہ لے کر آئی تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ رشا ملوک کے سر پر دھیرے سے ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ "اے رشا ملوک تجھے اپنے مور کی قسم...... اگر تو مجھے مہم پر نہ بھیجے تو میرا مرا منہ دیکھے۔"

یہ سن کر رشا ملوک ایک دم سناٹے میں آ گئی۔ یہ ساحل عمر نے کیا کر دیا تھا۔ اس نے کیا کہہ دیا تھا۔ کیسی قسم دے دی تھی۔ وہ اب مجبور ہو گئی تھی۔ اس بستی کی ریت کے مطابق اگر وہ ساحل عمر کو اس مہم پر نہ بھجواتی تو قسم پوری نہ کرنے کی پاداش میں ضرور اس کا مرا منہ دیکھتی۔

یہ ایک بہت خطرناک بات تھی۔ سنگین مسئلہ تھا۔ اس کا کوئی بھی خوفناک نتیجہ نکل سکتا تھا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے باپ سے بھی اجازت نہیں لے سکتی تھی کیونکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کسی قیمت پر اسے اس مہم پر جانے کی اجازت نہ دیں گے۔ اس طرح اس کی قسم ادھوری رہ جائے گی اور یوں وہ اپنے مور سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔

تب رشا ملوک نے بازغر کو اپنا ہم راز بنایا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ کر قسم دی کہ وہ اس راز کو کسی قیمت پر فاش نہیں کرے گا۔ اس قسم کے بعد وہ بھی مجبور ہو گیا اور اس نے وہ کر دیا جو رشا ملوک چاہتی تھی۔ بازغر نے ساحل عمر کو ہر وہ چیز مہیا کر دی جس کی سفر کے لئے ضرورت تھی۔

پھر تیس نوجوانوں کے قافلے میں اکتیسویں نوجوان کی شمولیت کوئی ایسا مشکل کام نہ تھا۔ جب یہ قافلہ بستی سے نکلا تو ساحل عمر ایک چٹان کی اوٹ سے نکل کر ان میں شامل ہو گیا۔ سارے نوجوانوں کے لباس یکساں تھے ان میں ساحل عمر کو الگ کرنا آسان نہ تھا۔ پھر چہرے پر ہر نوجوان نے ایک خاص قسم کا کنٹوپ پہنا ہوا تھا۔ اس اونی کنٹوپ کی وجہ سے سر' چہرہ اور گردن بھی چھپ گئی تھی۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

قافلہ روانہ ہوا تو ساحل عمر جو سب سے آخر میں تھا' اس نے مڑ کر رشا ملوک کی کٹاری کی طرف دیکھا۔ رشا ملوک نے اپنا نازک ہاتھ باہر نکال کر لہرایا اور پھر فوراً ہی اپنا ہاتھ اندر کر لیا اور وہ اس قافلے کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک ساحل عمر اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

قافلے کے جانے کے بعد بازغر اچھل کر کٹاری پر بیٹھا۔ اس نے پانچ گھوڑوں کی اس شاہی کٹاری کی باگیں سنبھالیں اور پیچھے مڑ کر بولا۔ "اے رشا ملوک ...... کیا اب چلیں؟"

"ہاں بازغر چلو...... دعا کرو کہ میرا مور بخیریت واپس آ جائے۔"

''میں دعا کروں گا لیکن یہ کام ہوا غلط ہے۔'' بازغر نے گاڑی بستی کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''جو ہونا تھا ہو گیا میں کیا کرتی مجبور تھی۔'' وہ پردے کے پیچھے سے بولی۔

''اب دعا کرو کہ ان لوگوں کے مہم سے واپس آنے تک رمز شناس یا بابا صاعق تیرے مور کو طلب نہ کریں۔ اگر ایسا ہوا تو غضب ہو جائے گا۔ جانے میرا کیا حشر ہو؟''

''بازغر کچھ نہیں ہو گا۔ میں سنبھال لوں گی۔'' رشا ملوک نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔''

☆......☆......☆

جانبازوں کا یہ قافلہ اندھیرا ہونے تک کوہ ویراں کے دامن میں جا پہنچا۔ بکوزان نے یہاں پہنچ کر نوجوانوں کو اپنے خیمے کھولنے کا حکم دیا۔ اس نے بتایا کہ اب صبح ہوتے ہی سفر کا آغاز کیا جائے گا۔

پھر اجالا ہوتے ہی خیمے سمیٹ لئے گئے۔ بکوزان نے پانچ پانچ نوجوانوں کی ٹولیاں بنا کر انہیں کوہ ویراں کے مختلف راستوں پر روانہ کیا۔ ان تمام ٹولیوں کو مختلف راستوں سے گزر کر کوہ ویراں کی چوٹی پر پہنچنا تھا۔ وہاں اکٹھا ہو کر پھر آگے کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ بکوزان نے ان نوجوانوں کی ٹولیوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کوہ ویراں پر چڑھتے ہوئے اگر کسی قسم کے کوئی آثار' کوئی نشانی یا کوئی غیر معمولی صورت حال دکھائی دے تو اس سے کس طرح نمٹا جائے۔

آخری ٹولی کو ہدایت دے کر بکوزان خود بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ ابھی چڑھائی ایسی تھی کہ گھوڑے ان راستوں پر چل سکتے تھے۔ بکوزان نے پورے تیس نوجوان آگے روانہ کئے تھے۔ پانچ پانچ کی چھ ٹولیاں بھیجی تھیں۔ اکتیسواں نوجوان غائب تھا۔

ساحل عمر ان لوگوں کے خیمے سمیٹنے سے پہلے ہی اپنا خیمہ سمیٹ کر کب کا اوپر جا چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کوہ ویراں پر پورا قافلہ ایک ساتھ نہ جا سکے گا اور ایسی صورت میں اس کا نظروں میں آ جانا عین ممکن تھا۔ لہٰذا اس نے اپنا راستہ الگ کر لیا تھا۔ وہ درختوں اور چٹانوں میں سے اپنا راستہ بناتا آگے بڑھ رہا تھا۔ جہاں تک اس کا گھوڑا اوپر جا سکا' وہ اس پر سوار رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ اب گھوڑے کے لئے راستہ خطرناک ہو گیا ہے تو اس نے اپنے گھوڑے کو وہیں چھوڑا اور پھر پیدل ہی اوپر چل دیا۔ یہ ایک دشوار گزار راستہ تھا۔ پہاڑ پر چڑھنا آسان کام نہ تھا۔ ہر قدم پر موت اپنا جال بچھائے بیٹھی تھی...... لیکن ساحل عمر پر ایک دھن سوار تھی۔ وہ ایک جوش اور ولولے کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اس انسانیت کے دشمن کو جاگنے سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہتا تھا۔

اس عفریت کو ختم کرنا ابھی دور کا مسئلہ تھا' سردست تو یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ خبیث دفن کہاں ہے۔ بکوزان کا خیال تھا کہ وہ کوہ ویراں پر ہی کہیں دفن ہے۔ یہ ممکن تھا کہ وہ کوہ ویراں کے دوسری طرف دفن ہو۔ وہ سوچتا ہوا بہت سنبھل سنبھل کر اوپر چڑھ رہا تھا کہ اچانک اسکا پاؤں پھسل گیا۔ اس نے خود کو بہت سنبھالنے کی کوشش کی لیکن نہیں سنبھال پایا۔ وہ بہت تیزی سے نیچے گرنے لگا۔

اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا بچنا محال ہے۔ ابھی اس کا سر کسی پتھر سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا اور پھر وہ آٹے کی بوری کی طرح کوہ ویراں کے دامن میں جا گرے گا۔

کبھی کبھی برائی میں بھی اچھائی کا پہلو ہوتا ہے۔ اوپر والے کی مصلحت اوپر والا ہی جانتا ہے۔ اسکا پاؤں پھسلا تو وہ نیچے جانے کی بجائے برف کے ڈھیر پر گرا۔ یہ نرم برف تھی۔ وہ تھوڑا سا اس میں دھنس گیا۔ اس کی جان بچ گئی تھی۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

پھر اس نے بیٹھے بیٹھے اپنے سامنے کا جائزہ لیا۔ اس کے سامنے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے برف اس سوراخ سے باہر نکالی گئی ہو یا یوں کہنا چاہئے کہ برف کھود کر یہ سوراخ کیا گیا ہو۔ اسے آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔ نہ برف پر کسی قسم کے نشانات تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ آگے بڑھ کر اس سوراخ میں جھانک کر دیکھے' پھر اسے خیال آیا کہ کہیں یہ برفانی ریچھوں کا بھٹ نہ ہو۔ وہ اس سوراخ میں گھسے اور وہ اندر سے نکل کر اس پر حملہ کر دیں۔

وہ سار ملوک کی بخشی ہوئی تلوار اپنے ساتھ لایا تھا لیکن وہ کمبل میں لپٹی گھوڑے کی پیٹھ پر بندھی تھی اور گھوڑا نیچے تھا۔ بازغر نے اسے ایک خنجر بھی دیا تھا جو اس کی پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے وہ خنجر اپنی پنڈلی سے کھینچ لیا اور اسے اپنے ہاتھ میں لے کر اس سوراخ میں جانے کی ٹھان لی۔ یہ برف کا ڈھیر اونچا تھا اور سوراخ نیچے تھا اس سوراخ تک ایک ڈھلانی راستہ بنا ہوا تھا۔ وہ کچی برف پر قدم جماتا ہوا اس سوراخ کی طرف بڑھا۔ جب وہ سوراخ کے سامنے پہنچا تو اسے سوراخ گہرائی میں نظر آیا۔ سامنے اندھیرا تھا لہٰذا وہ یہ اندازہ نہ کر پایا کہ سوراخ کتنا اندر تک گیا ہے۔ یہ ایک چار فٹ اونچا اور دو ڈھائی فٹ چوڑا سوراخ تھا۔ وہ اس سوراخ میں جھک کر داخل ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا کہ کیا کرے۔ وہ فوراً فیصلہ نہ کر پایا۔ تب اسے اپنے گلے میں پڑے تعویذ کا خیال آیا۔ اس نے اپنے کوٹ کا ایک بٹن کھول کر اندر ہاتھ ڈال کر تعویذ کو چھوا' تعویذ چھوتے ہی اس کے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے کسی نے کہا ہو۔ "جاؤ۔"

اس آواز کے ساتھ ہی اس کا دل مضبوط ہو گیا۔ وہ اب بے دھڑک اس برفانی غار میں داخل ہو گیا۔ وہ غار میں پاؤں جما کر اور جھک کر چل رہا تھا' لیکن جیسے جیسے وہ آگے قدم بڑھا رہا تھا یہ غار اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ دس پندرہ قدم اندر چلا گیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے پورے قد سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ پورے قد سے کھڑا ہو گیا۔ راستہ ابھی بند نہیں ہوا تھا۔ سامنے اندھیرا تھا' وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ آگے کیا ہے؟ باہر سے آنے والی روشنی دم توڑتی جا رہی تھی۔

وہ کم ہوتی روشنی میں دھیرے دھیرے ایک مرتبہ پھر آگے بڑھنے لگا۔ راستہ سیدھا اور ہموار تھا اسے آگے بڑھتے ہوئے کسی قسم کی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن اندھیرا برابر بڑھ رہا تھا۔ جب اندھیرا خاصا بڑھ گیا تو اس نے کھڑے ہو کر اپنی پیٹھ پر لٹکے ہوئے بیگ کو آگے کیا۔ اس کی زپ کھول کر اس میں سے ٹارچ نکالی۔ زپ بند کر کے بیگ پیچھے کیا اور ٹارچ روشن کر لی۔ اب اس کے بائیں ہاتھ میں ٹارچ اور دائیں ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ پھر محتاط انداز میں بڑھنے لگا۔ ابھی تک اندر سے کسی قسم کی آواز یا حرکت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اندر مکمل سناٹا ہے۔

چند قدم مزید آگے چلنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ غار آگے جا کر چھوٹا ہو گیا ہے۔ لیکن ایسا نہ تھا آگے اصل میں سیڑھیاں تھیں۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں سیڑھیاں اترنے لگا مگر غار کی اونچائی اتنی ہی رہی۔ آٹھ دس سیڑھیاں اتر کر وہ ایک گول چھت کے نیچے پہنچ گیا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ سامنے ایک پتھر کا چبوترہ تھا اور اس چبوترے کے چاروں کونوں پر پتھر سے تراشے گئے ستون تھے۔ ان ستونوں کے درمیان چبوترے پر ایک ایسی چیز تھی جسے دیکھ کر ساحل عمر کے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی۔

☆......☆......☆

وہ پانچ پانچ کی ٹولیاں مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی اوپر چوٹی پر پہنچ رہی تھیں۔ ابھی صرف دو ٹولیاں چوٹی پر تھیں۔ بکوزان سب سے پیچھے تھا۔

کوئی ایک گھنٹے کے اندر سارے نوجوان بخیریت و عافیت اوپر پہنچ گئے۔ جب بکوزان بھی اوپر پہنچ گیا تو اس نے ایک ایک نوجوان کو بلا کر نیچے سے اوپر آنے کا احوال پوچھا۔ جس پر جو بیتی تھی، وہ اس نے کہہ سنائی مگر ان کی کہانیوں میں اس کے مطلب کی کوئی کہانی نہ تھی۔

کوہ ویراں کے اس طرف تو کچھ ہاتھ نہ لگا تھا۔ اب بکوزان اپنے قافلے کو لے کر کوہ ویراں کے اس طرف اترنا چاہتا تھا۔

اس مرتبہ اس نے حکمت عملی میں تبدیلی کر دی۔ نیچے سے اوپر آتے ہوئے اس نے نوجوانوں کو پانچ پانچ کی ٹولیوں میں بانٹ دیا تھا لیکن اب اس نے نوجوانوں سے کہا کہ وہ دو دو کر کے نیچے اتریں گے اور ہر پارٹی کے درمیان پانچ قدم کا فاصلہ رہے گا تا کہ کسی خطرناک صورت میں اجتماعی طور پر نمٹا جا سکے۔

بکوزان نے کوہ ویراں کی پراسرار کہانیوں کے پیش نظر اور حالیہ اموات کے حوالے سے ہر بات سمجھا دی تھی اور ہر لحہ مستعد اور چوکس رہنے کی تاکید کی تھی۔

بکوزان کی ہدایت کے مطابق دو دو نوجوان پانچ قدم کا فاصلہ رکھ کر نیچے اترنے لگے۔ اس مرتبہ بکوزان سب سے آگے تھا۔

جب آخری دو نوجوان بھی نیچے اترنے لگے اور وہ اتنے نیچے پہنچ گئے کہ کسی ناگہانی آفت کے پیش نظر ان کا بچ نکلنا ممکن نہ ہو تو وہ ناگہانی آفت ان پر اچانک ٹوٹ پڑی۔

دیکھتے ہی دیکھتے طوفان بادوباراں نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہوا اور بارش اس قدر تیز تھی کہ درخت اکھڑ اکھڑ کر نیچے جا رہے تھے۔ ایسی طوفانی ہوا اور وہ بھی ڈھلانی راستے پر کسی کا قدم جما کر کھڑے رہنا ممکن نہ تھا۔ نوجوان لڑھکنے لگے۔

دس منٹ کے اندر آندھی طوفان اور بارش نے وہ تباہی مچائی کہ ایک نوجوان بھی زندہ سلامت نہ رہ سکا۔ وہ لڑھکتے ہوئے اتھاہ گہرائیوں میں جا گرے۔ کچھ درختوں کے نیچے دب کر اپنی جان گنوا بیٹھے۔ بکوزان کا کچھ پتہ نہ چلا کہ اس پر کیا بیتی؟

جب طوفان تھما تو ایک نوجوان جو دو درختوں کے درمیان دبا تھا اس نے اپنی آنکھیں کھول

دیں۔ وہ درختوں کے درمیان کچھ اس طرح پھنسا تھا کہ اس کے جسم پر ایک خراش بھی نہیں آئی تھی۔
موت اس کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ درخت ایک چٹان پر گرے تھے اور وہ نوجوان خلا میں ہونے کی
وجہ سے بچ گیا تھا۔ وہ خلا اتنا بڑا تھا کہ وہ نوجوان کوشش کر کے اس سے باہر نکل سکتا تھا۔
بالآخر وہ اپنی کوششوں سے باہر نکل آیا۔

اس نے سیدھا کھڑے ہو کر گہرا سانس لیا اور وہ نیچے اوپر جہاں تک دیکھ سکتا تھا اس نے
دیکھا۔ اسے دور تک کچھ نظر نہ آیا۔ اس کے ساتھی شاید لڑھکتے ہوئے بہت نیچے تک چلے گئے تھے۔ وہ
جانتا تھا کہ ایسے طوفان میں ایک بھی زندہ نہ بچا ہوگا۔ کوہ ویراں کے بارے میں اس نے جو کچھ سنا تھا'
وہ سب سچ تھا۔ واقعی ادھر آنے والا کبھی لوٹ کر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس طوفان کے دور تک کوئی
آثار نہ تھے بس اچانک ہی تیز ہوا چلنے لگی اور وہ منٹوں سیکنڈوں میں موت کی شکل اختیار کر گئی تھی۔
اس نوجوان نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ کوہ ویراں کی چوٹی زیادہ اوپر نہ تھی۔ اس نے طے کیا
کہ وہ فوراً اوپر پہنچے۔ اس کے بعد سوچے کہ اب کیا کرنا ہے۔

وہ نوجوان جلدی جلدی اوپر چڑھنے لگا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر بھی دیکھتا جاتا تھا۔ اسے بار بار
یہ احساس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے لیکن اسکے تعاقب میں کوئی نہ تھا یا اگر کوئی تھا تو
اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔

جب وہ نوجوان چوٹی پر پہنچ گیا تو اس نے بیٹھ کر اطمینان کا گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ وہ
یہاں کچھ دیر ستا کر نیچے اترنا چاہتا تھا۔ اب تو نیچے ہی جانا تھا۔ کوہ ویراں کا یہ حصہ محفوظ تھا۔ وہ آرام
سے جا سکتا تھا۔ اس نے سوچا تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر نیچے اترنا شروع کرے۔ ہو سکتا ہے اتنی دیر میں
کوئی اور ساتھی نظر آ جائے۔ فوراً ہی اس نے گردن گھما کر کوہ ویراں کے پراسرار حصے پر نظر ڈالی۔ اسے
دور تک تباہی کے سوا کچھ نہ دکھائی دیا۔ درخت جڑوں سے اکھڑے ہوئے ایک دوسرے پر گرے ہوئے
تھے اور نیچے اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔

اب وہ نوجوان گردن موڑ کر اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ دو کالے ہاتھ اس کے گلے میں آئے اور
پھر آناً فاناً اس کا گلا ادھڑ گیا۔ اس کی چیخ گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ اب وہ تیزی سے نیچے لڑھکتا جا رہا
تھا۔ اس کی گردن میں جیسے آگ لگی تھی۔ تھوڑا سا نیچے جا کر وہ ایک گرے ہوئے درخت میں اٹک گیا۔
پھر اسے پتھر ہوتے دیر نہ لگی۔

☆......☆......☆

''نہیں۔'' وہ بہت زور سے چیخا۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے اپنی چیخ کی آواز اجنبی
لگی۔ وہ اس سردی میں بھی پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں جب حواس بحال ہوئے تو اس نے خود
کو اپنے کتب خانے میں پایا۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ رات کو حساب کتاب لگاتا' کتب خانے میں لگے
ایک بستر پر ہی سو گیا تھا۔

اس نے جو خواب دیکھا تھا' وہ بہت بھیانک تھا۔ اس خواب نے اس کے ہوش اڑا دیے
تھے۔ کی لئے وہ چیخ مارے بنا نہ رہ سکا تھا۔

بستی کے رمز شناس سمار ملوک نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح ہونے والی تھی۔
سمار ملوک اپنے کتب خانے کی سیڑھیاں اتر کر اپنی خواب گاہ میں پہنچا۔ وہاں اس کی بیوی اطمینان سے سوئی ہوئی تھی۔ وہ وہاں سے نکل کر رشا ملوک کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے بند دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دی۔
دستک کی آواز سن کر رشا ملوک کسمسائی۔ وہ اپنے نرم بستر پر بڑے مزے کی نیند لے رہی تھی کہ اس مخصوص دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس کی آنکھیں فوراً پوری کھل گئیں اور وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔
وہ بھاگتی ہوئی دروازے پر پہنچی۔
دروازہ کھلتے ہی اسے باپ کی صورت نظر آئی۔ باپ کو پریشان دیکھ کر وہ ایک دم گھبرا گئی۔ وہ اپنے باپ کو احترام دینا بھول گئی۔ گھبرا کر بولی۔ ''بابا' خیر تو ہے۔''
''رشا ملوک پہلے باپ کو احترام دے پھر بات کر۔'' سمار ملوک نے خشک لہجے میں کہا۔
''اوہ' بابا معاف کیجئے گا۔ آپ کو اس وقت اور اس حالت میں دیکھ کر میں پریشان سی ہو گئی۔ آپ کو احترام دینا بھی بھول گئی۔'' یہ کہہ کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی۔ اس نے سمار ملوک کا ہاتھ تھام کر چوما اور پھر کھڑی ہو گئی۔ تب سمار ملوک تیزی سے اس کے کمرے میں آیا اور سات کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
''رشا ملوک میں نے بہت برا خواب دیکھا ہے اور تو جانتی ہے کہ میں کتنے سچے خواب دیکھتا ہوں۔''
''ہاں' بابا...... میں جانتی ہوں۔'' رشا ملوک کی اچانک دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ساحل عمر کوہ ویراں کی مہم پر نکلا ہوا تھا۔ خدانخواستہ بابا نے اس کے بارے میں تو کوئی خواب نہیں دیکھ لیا۔ ''بابا' جلدی بتائیں آپ نے کیا دیکھا ہے۔''
''اے رشا ملوک میں نے دیکھا کہ وہ سب کے سب مارے گئے۔ بکوزان بچا' نہ اس کے ساتھ گئے نوجوان بچے۔ انہیں موت کا طوفان لے اڑا' یہ دیکھا ہے میں نے۔'' سمار ملوک نے افسردگی سے کہا۔
''یہ تو آپ نے بہت برا دیکھا ہے...... اب کیا ہوگا؟'' رشا ملوک کو ساحل عمر کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔
''پہلے میرا خیال تھا کہ میں ساحل عمر کو اس وقت بھیجوں گا جب مجھے راعین کے ٹھکانے کا معلوم ہو جائے گا لیکن اب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ہماری بستی کے لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ ہمارے تین ہنرمند مارے گئے۔ تیس نوجوانوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ اب مجھے تیرے مور کو اس مہم پر روانہ کرنا پڑے گا۔ اب وہی اسے ڈھونڈے گا اور وہی اس سوئے فتنے کو نیست نابود کرے گا۔ میرا علم کہتا ہے کہ اسے اس بستی میں اسی کام کے لئے بھیجا گیا ہے۔ وہ اس بستی کا نجات دہندہ ہے۔ جا اسے اٹھا کر لا' وہ سو رہا ہوگا' اسے کہنا تجھے اس بستی کے رمز شناس سمار ملوک نے طلب کیا ہے۔'' سمار ملوک یہ کہہ کر بڑے

اطمینان سے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

''اچھا ٹھیک ہے بابا...... میں جاتی ہوں' اسے بلا کر لاتی ہوں۔ آپ یہاں آرام سے بیٹھیں۔'' رشا ملوک نے یہ بات اتنے آرام سے کہہ تو دی لیکن وہ اندر سے پریشان ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ساحل عمر کمرے میں نہیں ہے۔ وہ کوہ ویراں کی مہم پر گیا ہوا ہے۔ وہ اسے کہاں سے بلائے۔ بہر حال اس نے سوچا۔ اس کمرے سے تو باہر نکلے۔ وہ ایک دروازے سے باہر نکل کر ساحل عمر کے کمرے کی طرف چل دی۔ ساحل عمر کا کمرہ محل کے ایک گوشے میں تھا۔ وہ مینار سے نکل کر اس کے گنبد کی طرف بڑھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے۔ پھر ایک فکر نے اسے اور آن گھیرا۔ ساحل عمر ان تیس نوجوانوں کے ساتھ مہم پر نکلا تھا اور انہی جیسا بن کر گیا تھا۔ بابا نے ان نوجوانوں کو مرتے دیکھا ہے کہیں ایسا تو نہیں...... آگے وہ سوچ نہ سکی۔ اس کا کلیجہ ایک دم منہ کو آ گیا۔ کہیں اس کا مور ان نوجوانوں کے ساتھ طوفان کی نذر تو نہیں ہو گیا۔ اگر ایسا ہو گیا تو وہ کہیں کی نہ رہے گی۔ زندہ درگور ہو جائے گی۔

سر دست تو یہ مسئلہ تھا کہ وہ سمار ملوک کو کیا جواب دے۔ کیا وہ انہیں سچ سچ بتا دے کہ وہ ان کی خواہش سے پہلے ہی مہم پر جا چکا ہے۔ کہیں یہ جواب انہیں غضبناک نہ کر دے۔ کہیں وہ غصہ ہو جائیں کہ ان کی اجازت کے بغیر خطرناک کام کیوں کیا گیا۔ بازغر بے چارہ مفت میں لپیٹ میں آ جائے گا۔ بابا جانے اس کا کیا حشر کریں۔ پھر اس کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک ہی ایک ترکیب اس کے ذہن میں آ گئی اور وہ اس کے دروازے سے واپس پلٹ آئی۔

جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو اس بستی کا رمز شناس سمار ملوک بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اپنی بیٹی کے چہرے پر ڈالی اور پھر پوچھا۔ ''ہاں کیا ہوا......؟ کہاں ہے ساحل عمر؟''

''بابا غضب ہو گیا۔'' رشا ملوک نے گھبرا کر کہا۔

''کیا ہوا؟'' سمار ملوک نے پوچھا۔

''میرا مور اپنے گنبد میں نہیں ہے۔''

''کیا تو نے اچھی طرح گنبد دیکھ لیا؟''

''ہاں' بابا...... میں نے اچھی طرح گنبد دیکھ لیا۔ وہ وہاں نہیں ہے۔'' رشا ملوک نے بڑے یقین سے کہا۔

''وہ آخر کہاں جا سکتا ہے۔'' سمار ملوک سوچ میں پڑ گیا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں بابا...... میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آ رہا۔''

''یہ بہت برا ہوا...... اچھا تو پریشان مت ہو...... میں بابا صاعق سے مشورہ کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سمار ملوک اس کے کمرے سے نکل گیا اور رشا ملوک کمرے کے درمیان پریشان کھڑی رہ گئی۔

☆......☆......☆

راستے کٹھن ہوں اور منزل کا دور تک کہیں پتہ نہ ہو کہ منزل پلک جھپکتے ہی

سامنے آجائے تو بندے پر خوشگوار حیرت کی کیفیت طاری ہونا لازمی امر ہے۔ ساحل عمر کا اس وقت یہی حال تھا۔ اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔

سامنے چبوترے پر برف کا ڈھیر تھا اور اس برف میں ایک تابوت نظر آ رہا تھا۔ اس تابوت کا اوپر کا کچھ حصہ شیشے کا تھا۔ اس شیشے سے ایک مخص کی صورت نظر آ رہی تھی۔

یہ یقیناً راعین تھا۔ وہ ایک خبیث صورت مخص تھا۔ طوطے جیسی ناک، بھاری بھنویں، گنجا سر، بند آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، دہانہ باہر کو نکلا ہوا۔ اس کے چہرے کے سہارے دائیں بائیں دو کتابیں کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ کتاب سحر کی دونوں جلدیں تھیں۔ اس کتاب نے کیسی کیسی قیامتیں ڈھائی تھیں۔

ساحل عمر نے چبوترے پر چڑھ کر اس برف میں دبے تابوت کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ یہ تابوت دو تین فٹ برف کے اندر تھا۔ برف شفاف تھی۔ ساحل عمر نے اپنے ہاتھ میں دبے تیز دھار کے خنجر سے برف کی نرمی کا جائزہ لینے کے لئے برف پر خنجر مارا۔

خنجر کی نوک جیسے ہی برف سے ٹکرائی تو ایک دم نیلا سا شعلہ لپکا۔ یہ شعلہ ویسا ہی تھا جیسے ویلڈنگ کرتے ہوئے سولڈر سے نکلتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ یہ جھٹکا بجلی کے کرنٹ جیسا تھا۔ ساحل عمر چبوترے سے گرتے گرتے بچا۔ ساحل عمر نے اس جگہ غور سے دیکھا جہاں اس نے خنجر مارا تھا، وہاں کوئی اثر نہ تھا برف پر خراش تک نہ پڑی تھی۔ اسے لگا یہ برف نہ ہو کرسٹل ہو۔

ساحل عمر نے خنجر جیب میں ڈال کر ڈرتے ڈرتے اپنی ایک انگلی سے اس برف کو چھوا۔ انگلی برف پر لگتے ہی شعلہ تو نہ لپکا لیکن اسے احساس ہو جیسے جلتے توے پر انگلی رکھ دی ہو۔

وہ دہکتی برف تھی۔

اب وہ پیچھے ہٹ آیا اور پیچھے پلٹ کر ستون کا جائزہ لینے لگا۔ ان ستونوں کا مقصد سمجھ میں نہ آیا۔ یہ آخر چبوترے کے ساتھ کیوں بنائے گئے تھے۔ ان چاروں ستونوں میں ساحل عمر نے ایک خاص بات محسوس کی کہ ہر ستون میں، ایک ہی جگہ ایک مختلف رنگ کا چوکور پتھر لگا تھا۔ یہ پتھر کچھ اس انداز سے لگا ہوا تھا کہ اگر چاقو کی نوک سے اس پتھر کو ہلایا جائے تو وہ تھوڑی سی محنت کے بعد نکل سکتا تھا۔ ساحل عمر نے اہرام مصر کے بارے میں خاصا پڑھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب کوئی فرعون مرتا تو اس کی ممی کے ساتھ بہت سا خزانہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ ساحل عمر نے سوچا کہ کہیں ان ستونوں میں خزانہ ہی تو بھرا ہوا نہیں ہے، کیا حرج ہے اگر ایک ستون سے پتھر نکال کر دیکھ لیا جائے۔

ایک مرتبہ پھر اس نے مختلف رنگ کے اس چوکور پتھر کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب سے خنجر نکال لیا۔

اسی وقت پیچھے سے دو کالے ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔

☆......☆......☆

یہ قیامت کے ہاتھ تھے۔

یہ وہ ہاتھ تھے جو کسی کی گردن میں حمائل ہو جاتے تو پھر اس کا زخرہ ادھڑنا چند لمحوں کی بات ہوتی۔ اسی وقت اس کی زندگی کی شام ہو جاتی۔ وہ چل بستا۔

اب بھی ہاتھ ساحل عمر کی طرف بڑھے تھے۔ ساحل عمر اپنے خنجر سے پتھر کے اس چوکور ٹکڑے کو ڈھیلا کر کے نکالنا چاہتا تھا جو اس ستون میں نصب تھا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ پتھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اس بات سے قطعاً بے خبر تھا کہ اس کی موت کالے ہاتھوں کی صورت میں اس کے پیچھے کھڑی ہوئی ہے اور قیامت کے آنے میں بس چند ساعتوں کی دیر ہے۔

وہ کالے ہاتھ جیسے ہی اس کی گردن میں حمائل ہوئے اور اس نے اس کی گردن جکڑ کر اپنے نوکیلے دانتوں سے اس کا نرخرہ ادھیڑنا چاہا تھا تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی گرفت ایک دم ڈھیلی ہو گئی۔ وہ قیامت بے اختیار پیچھے ہٹ گئی۔

اس قیامت کا ہاتھ چاندی کے تعویذ پر پڑ گیا تھا جسے ابھی کچھ دیر پہلے ساحل عمر نے چھو کر کپڑوں سے باہر نکال لیا تھا۔ ساحل عمر کو جیسے ہی کسی کی گرفت میں آنے کا احساس ہوا۔ وہ بہت تیزی سے پلٹ کر پیچھے ہٹا۔ ٹارچ کی روشنی ایک دم اس کے چہرے پر پڑی۔ اس کی شکل دیکھ کر ساحل عمر کانپ گیا۔

وہ کالے رنگ کی کوئی چیز تھی۔ چھ فٹ قد' جسم پر ریچھ جیسے بال' سرخ انگارہ آنکھیں' دو چمکتے نوکیلے دانت باہر کو نکلے ہوئے۔ وہ نہ انسان تھا' نہ جانور۔ جانے وہ کیا تھا۔ وہ جو بھی تھا اتنا بھیانک تھا کہ اگر نرخرہ ادھیڑنے کے بجائے وہ ویسے ہی کسی کے سامنے آ جاتا تو اسے دیکھ کر ہارٹ فیل ہو جانا یقینی تھا۔

ایک لمحے کو ساحل عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون ہے اور اچانک کہاں سے نمودار ہو گیا ہے۔ اپنے چہرے پر روشنی پڑتے دیکھ کر اس نے اپنے دہشت ناک منہ پر ہاتھ پھیر کر روشنی ہٹانے کی کوشش کی۔ اس کے منہ سے غراہٹیں برآمد ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنا بھاڑ سا منہ پھاڑ دیا۔

ساحل عمر کے پاس وقت کم تھا۔ وہ کسی لمحے اس پر حملہ کر سکتا تھا۔ ساحل عمر کے پاس محض ایک خنجر تھا۔ یہ چھوٹا سا خنجر بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ اسے اچانک تلوار یاد آئی کہ اگر وہ اس وقت اس کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ بآسانی اسکا کام تمام کر دیتا۔

پھر ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے دماغ میں کوندا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے خنجر کی نوک تیزی سے چاندی کے تعویذ پر رکھ دی۔ پھر اس نے جلدی جلدی خنجر کی نوک کو تعویذ پر رگڑا۔ اسی وقت اسے یوں لگا جیسے کسی نے کہا ہو۔ ''اس خنجر کو اس کے پیٹ میں گھونپ دو۔''

اسی وقت وہ عفریت ساحل عمر کی طرف بڑھا اس نے اپنے ہاتھ بڑھا کر اسے گرفت میں لینا چاہا۔ ساحل عمر اس کے ہاتھوں کی گرفت سے بچنے کے لئے نیچے جھکا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر وہ خنجر اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ خنجر گھونپتے ہی وہ کسی غبارے کی طرح پھٹ گیا۔ جس طرح ایک بڑے غبارے کو کسی سوئی کی نوک چبھو کر پھاڑ دیا جائے تو اس کے نتیجے میں جو آواز آتی ہے بالکل ویسی ہی آواز خنجر گھونپتے ہوئے ہوئی اور پھر وہاں کچھ نہیں رہا۔

ساحل عمر نے ٹارچ کی روشنی میں اچھی طرح چبوترے پر دیکھ لیا۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ فرش پر کوئی نشان تک نہیں تھا۔ اس عفریت سے نجات پا کر اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ اپنے

گلے میں پڑے ہوئے تعویذ کو ہلکی سے تھپکی دی۔ اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مشکل وقت میں اس تعویذ کے ذریعے اس کی کس طرح مدد ہو جاتی تھی۔ فوراً ہی کوئی خیال اس کے دماغ میں آتا تھا جس پر عمل کر کے اس کے دماغ میں کوئی آواز گونجتی تھی اور اس طرح اس مصیبت سے نجات مل جاتی تھی۔ تعویذ کے استعمال کا ایک طریقہ کار اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔

اب وہ پھر ستون کی طرف متوجہ ہوا۔ ستون میں لگا یہ مختلف رنگ کا پتھر بار بار اسے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ اس نے خنجر کی نوک پتھر کی درز میں ڈالی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے خنجر اٹھا لیا۔ اس نے سوچا پتھر نکالنے کی وجہ سے وہ کسی نئی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس ستون میں خزانہ ہی بھرا ہو۔ فرض کرو اگر اس میں خزانہ بھی موجود ہے تو وہ اس کا کیا کرے گا۔ اس کا مسئلہ تو راعین تھا' جو اس وقت برف میں دفن تھا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے برف میں خنجر مارا۔ نتیجہ وہی برآمد ہوا۔ ایک نیلا شعلہ نکلا اور اس کے ہاتھ کو بجلی کا سا جھٹکا لگا۔ اسے اندازہ ہوا کہ یہ خنجر اس برف کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ برف کے اس تودے کو توڑنے کے لئے کچھ سوچنا پڑے گا۔ بستی واپس جا کر ان لوگوں سے مدد لینا ہو گی۔ ایک بڑا مسئلہ تو حل ہو ہی گیا تھا۔ اسے راعین کا مدفن معلوم ہو گیا تھا اور ابھی اس عفریت کے جاگنے میں کئی ہفتے باقی تھے۔ پھر کسی قسم کی جلد بازی کا شکار ہو کر کوئی اقدام اٹھانے سے کہیں بہتر تھا کہ بستی واپس چلا جائے۔

پھر واپسی کا خیال اس کے دل میں جڑ پکڑتا گیا اور وہ فوراً ہی اس غار سے نکل آیا۔

☆......☆......☆

بستی کے رمز شناس سار ملوک کا خواب سن کر بابا صاعق پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ وہ جانتے تھے کہ سار ملوک سچے خواب دیکھتا ہے لیکن یہ اس نے کیا دیکھ لیا تھا۔ ایسے بھیانک خواب کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اتنا بڑا حادثہ بستی کے تیس خوبرو نوجوان...... اور ایک ہنرمند۔ اس خواب کی اندوہناکی کا دھیرے دھیرے اثر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ان کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"اے سار ملوک صبح صبح تم نے کیا خواب سنا دیا۔" وہ گلوگیر آواز میں بولے۔

"بابا...... میں کیا کروں۔ آپ کو نہ سناؤں تو پھر کس سے کہوں۔ اس خواب نے خود میری حالت بگاڑ دی ہے۔" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "میں بستی والوں کو کیا جواب دوں گا۔ انہیں کیا بتاؤں گا کہ ان کے نوجوان کہاں گئے؟"

"بستی والوں کو سمجھانا ہو گا۔ یہ کام میں کروں گا۔ تم پریشان مت ہو۔" انہوں نے تسلی دی۔

"بابا' پریشان کیسے نہ ہوں۔ کوئی ایک پریشانی ہو تو برداشت کر جاؤں۔ یہاں تو پریشانیوں کی زنجیر ہے۔ میرے علم نے مجھے بتایا تھا کہ راعین کے مدفن کا پتہ چلانا ہم بستی کے لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام بس ساحل عمر کر سکتا ہے۔ سوچا اس سے بات کروں' اسے کوہ ویراں کی طرف روانہ کروں......" اتنا کہہ کر سار ملوک رک گیا۔ اس نے اداس نظروں سے بابا صاعق کی طرف دیکھا۔

"پھر کیا ہوا......؟ اسے تم نے کیوں نہیں بھیجا۔" بابا صاعق نے پوچھا۔

"بابا کسے بھیجوں۔" سمار ملوک نے سرد آہ بھری۔ "وہ اپنے گنبد میں نہیں...... غائب ہے۔"
"ہیں یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" بابا صاعق پریشان ہو کر سمار ملوک کی طرف دیکھنے لگے۔
"بابا' جو کہہ رہا ہوں...... سچ کہہ رہا ہوں۔" سمار ملوک نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔
ابھی بابا صاعق کچھ کہنے کے لئے لب کھولنے والے تھے کہ راہداری میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی کوئی پکار رہا تھا۔ "بابا' بابا۔"
"ارے' یہ تو رشا ملوک کی آواز ہے؟" سمار ملوک چونک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پلٹ کر دروازے کی طرف جانے ہی والا تھا کہ رشا ملوک ہانپتی ہانپتی کمرے میں داخل ہوئی۔
اس نے جلدی جلدی دونوں کو احترام دیا اور پھر چڑھتی ہوئی سانسوں کے دوران بولی۔ "بابا برا مور آ گیا۔ اس کے پاس بہت بڑی خوشخبری ہے۔"
"وہ چلا کہاں گیا تھا؟" بابا صاعق نے پوچھا۔
"بابا' مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔" رشا ملوک اپنے باپ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ "میں نے آپ کی اجازت کے بغیر اپنے مور کو تیس نوجوانوں کے ساتھ مہم پر بھیج دیا تھا۔ بابا میں مجبور ہو گئی تھی اس نے مجھے قسم دے دی تھی۔ اب وہ اس مہم سے واپس آ گیا ہے اور اپنے ساتھ ایک ایسی خوشخبری لایا ہے کہ آپ سن کر جھوم جائیں گے۔"
"پہلے خوشخبری سنا تاکہ تیری معافی کے بارے میں سوچوں۔" سمار ملوک نے سنجیدگی سے کہا۔ "تو نے جو غلطی کی ہے اس کی سزا تو اچھی طرح جانتی ہو گی۔ اب اس سزا کا انحصار خوشخبری پر ہے۔ چل جلدی کر...... سنا۔"
"بابا...... میرے مور نے' میرے بہادر مور نے' میرے انوکھے مور نے راعین کا مدفن معلوم کر لیا ہے۔" رشا ملوک نے بڑے فخریہ انداز میں اعلان کیا۔
"کیا؟" بابا صاعق اور رمز شناس سمار ملوک دونوں ہی بیک وقت چیخ اٹھے۔
"ہاں بابا...... یہ کارنامہ انجام دیا ہے میرے مور نے۔" اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔
"کہاں ہے وہ؟" بابا صاعق نے پوچھا۔
"اپنے گنبد میں۔" رشا ملوک نے جواب دیا۔
"چلو سمار ملوک اٹھو...... آؤ اس کے پاس چلیں...... اس سے مل کر احوال پوچھیں۔" بابا صاعق کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔
پھر وہ تینوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ رشا ملوک ان دونوں کے آگے آگے چل رہی تھی خوشی سے جھومتی ہوئی۔

☆......☆......☆

سمار ملوک نے مدفن کا کھوج لگتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہاں مستعد اور مسلح نوجوانوں کا پہرہ بٹھا دیا۔ پھر اس نے اپنے علم کو آزمایا۔ مختلف زائچے تیار کیے۔ ستاروں کی چال

دیکھی۔ تب وہ ساعت نکلی۔ یہ ساعت اس فتنے راعین کے جاگنے سے تین دن پہلے کی تھی۔

راعین کو نیست و نابود کرنے کی ساعت نکالنے کے بعد اس نے بستی کے ایک ایک نوجوان' بوڑھے اور بچے کو کوہ ویراں کے سفر پر روانہ کر دیا۔ ابھی اس فتنے کے جاگنے میں اکیس دن باقی تھے۔ ان اکیس دنوں میں اس کے مدفن سے لے کر کوہ ویراں کے دامن تک جہاں تک ممکن ہو سکا' راستہ ہموار کیا گیا۔

یہ راستہ ہموار کرنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ بابا صاعق مور سار ملوک دونوں نے مدفن تک جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ سار ملوک کا وہاں تک جانا اتنا مشکل نہ تھا' اس کی صحت بہت اچھی تھی اور بابا صاعق کے مقابلے میں عمر خاصی کم تھی لیکن بابا صاعق کا پہنچنا واقعی دشوار تھا۔ اس مشکل کام کو آسان بنایا گیا ان کے لئے۔

پھر وہ گھڑی آئی جب کوہ ویراں کی طرف کوچ کا ارادہ کیا گیا۔ بازغر نے ایک سونے کے تھال میں رکھا بندھا ہوا صافہ سار ملوک کے سامنے پیش کیا۔ سار ملوک نے اس صافے کو اٹھا کر ساحل عمر کے سر پر رکھا۔ اپنی خاندانی تلوار جو وہ پہلے ہی اسے تحفہ میں دے چکا تھا' دوبارہ اس کے ہاتھ میں پکڑائی۔ پھر سار ملوک نے خود اسے ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار کیا اور کوچ کا اعلان کیا۔

رات ہوتے ہوتے یہ قافلہ کوہ ویراں کے دامن میں پہنچ گیا۔ رات گزارنے کے لئے خیمے لگائے گئے۔ سار ملوک نے ساحل عمر کو اپنے ساتھ خیمے میں رکھا۔ اس خیمے کی حفاظت کے لئے ایک خصوصی دستہ متعین کیا گیا تھا۔ ویسے بھی بستی کے لوگوں سے ساحل عمر کو دور رکھا گیا تھا تاکہ وہ کم سے کم بستی والوں کی نظروں میں آئے۔

صبح ہوتے ہی خیمے اکھاڑ لیے گئے اور جہاں تک گھوڑے جا سکتے تھے' وہاں گھوڑوں پر سفر کیا' راستہ ہموار کئے جانے کی وجہ سے گھوڑے خاصے اونچائی تک چلے گئے تھے۔ پھر جب گھوڑوں کا کوہ ویراں پر چڑھنا ناگزیر ہو گیا۔ گھوڑے پھسلنے شروع ہو گئے تو گھوڑے روک دیئے گئے۔

پھر ان لوگوں نے پیدل سفر شروع کیا۔ سب سے آگے ساحل عمر تھا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ وہ اس تلوار کی نوک کو جگہ جگہ برف میں گاڑتا چل رہا تھا۔ ساحل عمر کے پیچھے بابا صاعق تھے۔ ان کے ہونٹ مستقل ہل رہے تھے۔ وہ زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے رمز شناس سار ملوک تھا۔ اس کا دماغ حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا۔

ان تینوں کے بعد بستی کے مستعد اور مسلح نوجوان تھے۔ ایک دستہ پہلے ہی مدفن پر متعین تھا۔ جب یہ لوگ مدفن کے دہانے پر پہنچے تو سار ملوک نے وہاں موجود نوجوان سے مدفن کا احوال پوچھا۔

''کہو کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔''

''نہیں رمز شناس' سب خیر ہے۔'' مستعد نوجوان نے جواب دیا۔

''اچھا'' پھر سامنے سے ہٹو...... ہمیں اندر جانے دو۔'' سار ملوک نے حکم دیا۔

وہ مستعد نوجوان فوراً ایک طرف ہو گیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو ہم تینوں اندر جا رہے ہیں' ہمارے بعد کوئی اندر نہ آئے۔ اس وقت تک جب تک

میں اندر آنے کا نہ کہوں۔'' سمار ملوک نے وہاں موجود نوجوانوں کو مخاطب ہو کر کہا۔
''ٹھیک ہے رمز شناس ایسا ہی ہو گا۔'' ایک نوجوان نے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔
ساحل عمر جو سب سے آگے تھا' جھک کر اس غار میں داخل ہونے لگا تو سمار ملوک بولا۔
''ایک منٹ ساحل عمر۔''
ساحل عمر اندر جاتے جاتے رک گیا۔ پھر وہ واپس نکل کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔
''ذرا تلوار مجھے دو۔'' سمار ملوک نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔
ساحل عمر نے اس کے ہاتھ میں تلوار تھما دی۔
سمار ملوک نے تلوار پکڑ کر اس کی نوک سے زمین پر کچھ آڑی ترچھی لکیریں بنائیں۔ اس کے بعد ان لکیروں کو ایک دائرے میں بند کر دیا۔ اس کے بعد تلوار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اے ساحل عمر! اس دائرے پر پیر رکھ کر اندر جاؤ۔''
ساحل عمر نے تلوار تھام کر پیر دائرے پر رکھا اور جھک کر غار میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے سمار ملوک اور پھر بابا صاعق تھے۔ بابا صاعق کچھ اجنبی لفظوں کا ورد کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔
ساحل عمر کے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں تلوار تھی۔ جب وہ سیڑھیاں اتر کر چبوترے کے سامنے پہنچا اور ٹارچ کی روشنی ڈال کر اس نے تابوت کا جائزہ لیا تو اسے اندازہ ہوا کہ تابوت پر سے برف خاصی کم ہو چکی ہے۔ اب تابوت پر صرف ایک فٹ اونچی تہہ تھی۔ اس فتنے کے اٹھنے میں ابھی تین دن باقی تھے۔ ان تین دنوں میں شاید یہ برف تابوت سے بالکل ختم ہو جاتی۔
ساحل عمر کے ساتھ وہ دونوں بھی چبوترے پر چڑھ آئے۔ بابا صاعق اور سمار ملوک نے بغور رائین کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر نحوست برس رہی تھی۔
''اے رمز شناس...... پہلے جب میں یہاں آیا تھا تو اس تابوت پر خاصی برف جمی تھی۔ اگرچہ اب یہ برف کم ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود اس کا توڑنا آسان کام نہیں۔ یہ برف کسی پتھر کی طرح سخت ہے اور خنجر مارنے پر نیلا شعلہ نکلتا ہے اور ہاتھ میں بجلی کا سا جھٹکا لگتا ہے۔'' ساحل عمر نے بتایا۔
''اے ساحل...... وہ خنجر تھا' یہ مقدس تلوار ہے۔ ذرا اس کو آزماؤ۔'' سمار ملوک نے ہدایت کی۔
ساحل عمر نے تھوڑا پیچھے ہٹ کر تلوار کی نوک اس برف میں چبھوئی...... تلوار کی نوک ٹکرانے سے نہ کوئی شعلہ برآمد ہوا اور نہ کوئی جھٹکا لگا۔ اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ پھر اس نے تلوار کی نوک پر دباؤ ڈالا تو آہستہ آہستہ برف میں دھنسنے لگی۔ ساحل عمر نے فوراً تلوار ہٹالی تو برف پر تلوار کا نشان واضح ہو گیا۔ چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا' اب اس تلوار کے ذریعے تابوت کی برف ہٹائی جا سکتی تھی۔
ساحل عمر تابوت کے پاس سے ہٹ کر ایک ستون کے پاس آیا اور اس نے مختلف رنگ کا وہ پتھر سمار ملوک اور بابا صاعق کو دکھایا۔ اس پتھر کو نکالنے کے لئے ساحل عمر کا دل بے چین تھا۔ اس دن تو اکیلا تھا' اس لئے اس نے اس پتھر کو نکالنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا لیکن آج وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کے ساتھ دو طاقتور بندے موجود تھے۔ پھر کسی ایمرجنسی کی صورت میں غار کے باہر مستعد اور مسلح نوجوان

ایک اشارے کے منتظر تھے۔ آج خطرہ مول لینے میں کوئی حرج نہ تھا۔ اسے جانے یہ یقین کیوں تھا کہ ان ستونوں میں خزانہ بھرا ہوا ہے۔

بابا صاعق اور سمار ملوک دونوں نے چاروں ستونوں کا اور ان ستونوں میں لگے اس مختلف رنگ کے پتھروں کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ پھر وہ دونوں اپنا اپنا علم آزما کر اس بات پر متفق ہو گئے کہ واقعی ان ستونوں میں خزانہ ہے جو اس پتھر کو نکالتے ہی باہر آنا شروع ہو جائے گا۔

''بابا صاعق...... کیا خیال ہے ایک ذرا سا پتھر نکال کر دیکھ نہ لوں۔'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''کیوں رمز شناس کیا کہتے ہو۔'' بابا صاعق نے خود فیصلہ دینے کے بجائے فیصلہ سمار ملوک پر چھوڑ دیا۔

''میرا خیال ہے کہ پہلے وہ کام کیا جائے جس کے لئے ہم یہاں آئے ہیں۔ پھر اس خزانے کو دیکھیں گے۔'' سمار ملوک نے کہا۔

''پھر شاید دیر ہو جائے۔'' بابا صاعق نے دھیرے سے کہا۔

یہ بات ساحل عمر نے سنی نہ سمار ملوک نے...... وہ دونوں فوراً ہی تابوت کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''اے رمز شناس اب کیا کروں......؟ کیا اس تلوار سے برف کو توڑنا شروع کروں۔'' ساحل عمر نے تابوت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں تلوار سے توڑنا نہیں ہے...... لاؤ یہ روشنی مجھے دو۔ میں روشنی دکھاتا ہوں۔ تم دونوں ہاتھ میں تلوار لے کر اس برف کی قبر پر زور سے وار کرو۔'' یہ کہہ کر سمار ملوک نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی۔

ساحل عمر نے دونوں ہاتھ سے تلوار پکڑنے سے پہلے اپنے گلے میں پڑا تعویذ کپڑوں سے باہر نکالا۔ پھر اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں اسے لے لیا۔ تعویذ کو زور سے دبایا۔ اسے قوت کی ایک لہر پورے بدن میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر اس نے اس تعویذ کو بائیں ہاتھ کی مٹھی میں تھام کر زور سے بھینچا۔ فوراً ہی طاقت کا دریا اس اپنے بدن میں موجزن محسوس ہوا' پھر جیسے کسی نے کہا۔ ''وار کر فتح تیری ہوگی۔''

اس اشارے کے بعد اب ساحل کو کسی مزید اشارے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اللہ کا نام لے کر برف کی قبر پر دونوں ہاتھوں سے وار کیا۔ تلوار برف میں دھنس گئی اور برف کا شیشہ چٹخ گیا۔ جب اس نے تلوار کھینچی تو پوری تلوار خون آلود تھی۔ برف پر بھی خون دکھائی دے رہا تھا۔

اس خون کو دیکھ کر سمار ملوک کے چہرے پر خوشی دوڑ گئی۔ اس کا ایک اور خواب سچا ہو گیا تھا۔ اس نے فخر سے بابا صاعق کی طرف دیکھا۔ بابا صاعق نے مسکرا کر گردن اثبات میں ہلائی جیسے کہہ رہے ہوں' میں جانتا ہوں کہ تم سچے خواب دیکھتے ہو۔

چند لمحوں بعد وہ خون اچانک تلوار سے غائب ہو گیا۔ برف پر بھی خون کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔ اب ساحل عمر نے ذرا سا فاصلہ دے کر دوسرا وار کیا' تلوار باہر نکالی تو وہ خون آلود تھی۔ برف پر بھی

تازہ تازہ خون دکھائی دے رہا تھا۔ چند لمحوں بعد تلوار پھر صاف ہو گئی۔
اس طرح ساحل عمر نے فاصلہ دے کر سات وار کئے۔ جب اس نے ساتواں وار کر کے تلوار اوپر اٹھائی تو وہ برف کی قبر سات حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ برف کی سلیں پھسل پھسل کر چبوترے سے نیچے جا گریں۔ چبوترے پر صرف تابوت رکھا رہ گیا۔
ساحل عمر نے پھر تلوار اٹھائی اور شیشے والے حصے پر ایک زوردار ضرب لگانا چاہی تو سار ملوک نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اے ساحل عمر نہیں۔"
"کیوں آخر؟"
"ہم اسے مع تابوت اپنی بستی میں لے جائیں گے۔ وہاں جا کر بستی والوں کے سامنے اس کا حساب کتاب کریں گے۔" سار ملوک نے یہ فیصلہ اچانک ہی کیا تھا۔ اس فیصلے کی تائید کے لئے اس نے بابا صاعق کی طرف دیکھا۔ "کیوں بابا کیا کہتے ہو؟"
"ہاں تم نے ٹھیک سوچا۔"
"بابا صاعق آپ ساحل عمر کو لے کر نیچے پہنچیں، میں تابوت اٹھوا کر آپ کے پیچھے آتا ہوں۔"
"اور اے رمز شناس...... اس خزانے کو کب نکالیں گے۔" ساحل عمر نے سوال کیا۔
"ساحل عمر...... یہ خزانہ نکالنے کا مناسب وقت نہیں۔ خزانہ یہاں سے کہیں نہیں جائے گا۔ خزانے کو راعین کے خاتمے کے بعد نکالیں گے۔" پھر وہ بابا صاعق سے مخاطب ہوا۔ "کیوں بابا ٹھیک ہے نا۔"
"ہاں ٹھیک ہے۔" بابا صاعق نے گردن ہلائی۔ "تو پھر چلیں آپ۔" سار ملوک نے کہا۔
بابا صاعق ساحل عمر کو ساتھ لے کر غار سے باہر نکل آئے اور دھیرے دھیرے قدم جماتے ہوئے کوہ ویراں سے نیچے اترنے لگے۔
ان کے جانے کے بعد رمز شناس سار ملوک نے بستی کے نوجوانوں کی مدد سے راعین کے تابوت کو غار سے باہر نکالا اور پھر وہ اس تابوت کو لے کر بہت احتیاط سے نیچے اترنے لگا۔

☆......☆......☆

جب یہ تابوت بستی میں پہنچا تو ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ کیا بچے، کیا عورتیں، کیا بوڑھے...... سب اپنے اپنے گنبدوں سے نکل کر اس تابوت کے ساتھ لئے۔
راعین کے تابوت کو چھ نوجوانوں نے اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ بہت بھاری تابوت تھا۔ اتنا بھاری کہ ان نوجوانوں کے کندھے بھاری بوجھ سے جلدی ٹوٹنے سے تھے۔ پچاس قدم چلنا بھی دوبھر ہو جاتا تھا۔ فوراً ہی چھ نوجوانوں کی دوسری ٹولی ان کی جگہ لے لیتی تھی۔
تابوت کے آگے بابا صاعق، سار ملوک اور ان کے درمیان ساحل عمر گھوڑوں پر سوار چل رہے تھے۔ ساحل عمر کے ہاتھ میں ننگی تلوار موجود تھی۔ بستی کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ یہ تلوار کس کی ہے۔ سب کو اس بات پر حیرت تھی کہ بستی کے رمز شناس سار ملوک کی شاہی تلوار اس شخص کے ہاتھ میں کیسے

آئی...... یہ کون ہے؟

ساحل عمر کا چہرہ کنٹوپ میں چھپا ہوا تھا' صرف آنکھیں نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آیا یہ کوئی بستی کا نوجوان ہے یا کسی اور دنیا کی مخلوق ہے۔ کہیں اور سے آیا ہے۔

بابا صاعق کا خیال تھا کہ اس تابوت کو میدان فنا میں لے جایا جائے۔ لیکن سار ملوک نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہمیں اپنی بستی کا قبرستان اس خبیث کے وجود سے گندا نہیں کروانا۔ پھر یہ طے ہوا کہ اس تابوت کو ایسی جگہ لے جا کر رکھا جائے جہاں بستی کا ہر بچہ بآسانی اس کی موت کا نظارہ کر سکے اور اس کے وجود سے اس جگہ کا تقدس بھی خراب نہ ہو...... ایسی جگہ بستی کے مغرب میں ہی ہو سکتی تھی اور وہ مقام تھا کالا پہاڑ...... کالا پہاڑ کے بارے میں روایت مشہور تھی کہ اس کے آس پاس کبھی ایک بستی آباد تھی جو اپنی نافرمانی کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی۔ اس پہاڑ پر آسمانی بجلی گری جس سے پہاڑ جل کر کالا ہو گیا۔ آس پاس کی آبادی بھی جل کر راکھ ہو گئی۔ اس کے بعد سے یہ علاقہ کبھی آباد نہ ہو سکا۔ یہ ایک بہت وسیع و عریض میدان تھا جس کے درمیان میں کالا پہاڑ کھڑا تھا۔ یہ پہاڑ زیادہ اونچا نہ تھا اس پر چڑھنا بھی مشکل نہ تھا۔ پھر یہی طے ہوا کہ اس تابوت کو اس پہاڑ کی چٹان پر رکھ دیا جائے۔

جس بستی والوں کو یہ معلوم ہوا کہ اس تابوت کو کالے پہاڑ کی طرف لے جایا جا رہا ہے تو بستی کے بچوں نے فوراً ادھر کا رخ کیا۔ نوجوان لڑکیاں بھی اس طرف دوڑیں تا کہ انہیں سب سے آگے جگہ مل سکے۔

جب یہ تابوت کالے پہاڑ کے دامن میں پہنچا تو بستی کا ایک ایک بچہ یہاں پہلے سے موجود تھا۔ ایک اونچی چٹان پر اس تابوت کو رکھا گیا۔

پھر اس تابوت کو کھول کو راعین کی ''زندہ لاش'' اور کتاب سحر باہر نکالی گئی اور پھر تابوت بند کر کے اس پر ''زندہ لاش'' کو رکھ دیا گیا اور یہ کتاب اس کے سینے پر رکھ دی گئی۔

اس کے بعد اعلان ہوا کہ بستی کا جو بھی آدمی اس ''زندہ لاش'' کا قریب سے نظارہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ اوپر آ جائے۔ اس اعلان سے بستی والوں میں ایک جوش و ولولہ پیدا ہو گیا۔ بھلا کون ایسا تھا جو اس منحوس کا چہرہ دیکھنا نہ چاہتا ہو۔ فوراً ایک لائن لگ گئی۔ لوگ آتے گئے' دیکھتے گئے۔

اب اس عفریت کے جاگنے میں صرف چوبیس گھنٹے باقی تھے۔ اسکے چہرے پر زندگی کے آثار پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ غور سے دیکھنے پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی پلکیں لرز رہی ہوں۔

پھر اس بستی کا رمز شناس سار ملوک باوقار چال چلتا اس چٹان پر آیا جہاں تابوت پر راعین کی لاش رکھی تھی۔ اس کے اوپر آتے ہی بستی کا کوئی بھی فرد بستی پر کھڑا نہ رہ سکا۔ سب نیچے چلے گئے۔ تب سار ملوک نے بابا صاعق کو اشارہ کیا تو وہ دھیرے دھیرے چلتا چٹان پر پہنچ گیا۔

پھر سار ملوک نے راعین کے بارے میں بستی والوں کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کون ہے؟ جب وہ اس کا مکمل تعارف کروا چکا تو پھر اس نے بتایا۔ ''بستی والو! اس عفریت کے جاگنے میں صرف چوبیس گھنٹے باقی ہیں۔ اسے جاگنے سے پہلے ہی ابدی نیند سلانا ہو گا اور یہ کام کرے گا ایک بہادر نوجوان

ساحل عمر۔"

"یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟" چاروں طرف سے ایک شور اٹھا۔

"بستی والو...... بس اتنا جان لو کہ یہ ہماری بستی کا نہیں ہے۔ ہم سا نہیں ہے۔ ہم میں سے نہیں ہے۔ کہیں اور سے آیا ہے لیکن یہ ہمارا نجات دہندہ ہے۔ ہمارے لئے قابل احترام ہے۔ تمہیں جان کر خوشی ہو گی کہ اس نوجوان نے اس عفریت کا مدفن تلاش کیا اور اب یہ عفریت اس نوجوان کے ہاتھوں ابدی نیند سوئے گا۔"

اتنی دیر میں ساحل عمر چٹان پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار موجود تھی اور اس کا چہرہ ابھی تک ڈھکا ہوا تھا۔ تب مجمعے سے ایک دم شور اٹھا۔

"اے رمز شناس...... ہمیں اپنے نجات دہندہ کا چہرہ دکھا۔"

تب سار ملوک، ساحل عمر کی طرف بڑھا اور اس نے کنٹوپ کا پھندا پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ ایک دم کنٹوپ اسکے سر، چہرے اور گردن سے سرک کر سار ملوک کے ہاتھ میں آ گیا۔

ساحل عمر کا چہرہ سامنے آیا تو بستی کے لوگ دم بخود تھے۔ ایسا حسین نوجوان انہوں نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھتے رہ گئے۔ اس بستی کی لڑکیوں کا تو سانس رک گیا۔ کئی لڑکیوں کے دل میں ہوک اٹھی۔ کاش وہ اس کا ہاتھ پکڑ سکیں، وہ اس کا مور بن سکتا۔ جشن شادی میں صرف چوبیس گھنٹے باقی تھے۔ سب لڑکیاں اپنے اپنے مور منتخب کر چکی تھیں۔

تابوت کے قریب ہی الاؤ تیار کیا جا رہا تھا کہ کتاب سحر کو جلایا جا سکے۔ جب الاؤ بھڑک اٹھا تو سار ملوک نے ساحل عمر کو اشارہ کیا کہ وہ کتاب اٹھا کر الاؤ میں جھونک دے۔ ساحل عمر اشارہ پا کر "ربطول" کی طرف بڑھا۔ پھر وہ راعین کی لاش کے سامنے ٹھہر گیا۔ ربطول کو ہاتھ لگانے سے پہلے اس نے تعویذ کو اپنے کپڑوں سے باہر نکالا اور اسے اپنی مٹھی میں لے لیا۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے کہا ہو۔ "اس تعویذ کو اپنی پیشانی پر رکھ کر آہستہ سے دباؤ۔"

ساحل عمر نے وہ تعویذ فوراً اپنی پیشانی پر رکھ لیا اور اسے دھیرے سے دبایا۔ دباتے ہی اس کے جسم کے اندر بجلیاں سے کوند گئیں۔ اسے اپنے اندر بے پناہ طاقت اور تحفظ کا احساس ہوا۔

پھر اس نے تعویذ چھوڑ کر کتاب سحر "ربطول" اٹھائی۔ اس کتاب کو چمڑے کے باریک ورقوں پر سفید رنگ سے کسی نامانوس زبان میں لکھا گیا تھا۔ کتاب کے صفحات کا رنگ گہرا بھورا تھا۔ اس نے اس کتاب کا ایک ورق جھٹکے سے الگ کیا اور اس ورق کو بابا صاعق کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ "بابا! شروع کیجئے۔"

بابا صاعق نے اس ورق کو آگے بڑھ کر الاؤ میں ڈال دیا۔ اس ورق کو الاؤ میں ڈالتے ہی بابا صاعق کو گرمی سی لگی اور پھر یہ تپش آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔

دوسرا ورق پھاڑ کر اس نے سار ملوک کو دیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس ورق کو الاؤ میں جھونک دیا۔ اس ورق کو الاؤ میں ڈالتے ہی سار ملوک کو گرمی سی لگی اور پھر یہ تپش آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔

تیسرا ورق پھاڑ کر اس نے پھر بابا صاعق کے حوالے کیا۔
بابا صاعق نے کتاب سحر کا تیسرا ورق پکڑ کر الاؤ میں ڈال دیا۔ ان کے اندر کی گرمی میں مزید اضافہ ہو گیا۔
ساحل عمر ایک ایک کر کے کتاب کے ورق پھاڑ پھاڑ کر باری باری دونوں کو دیتا گیا۔ جب سات سات ورق دونوں آگ میں جھونک چکے تو ان کے اندر کی گرمی ناقابل برداشت ہو گئی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں خود الاؤ میں کھڑے ہوں اور آگ انہیں جلا رہی ہو۔ یہ ایک ایسی آگ تھی جو لگی ہوئی تو تھی لیکن دکھائی نہیں دے رہی تھی جب پندرہواں ورق ساحل عمر نے سار ملوک کی طرف بڑھایا تو وہ خوف سے پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔ ''نہیں۔'' ''کیا ہوا؟'' ساحل عمر نے اسے پریشان ہو کر دیکھا۔
''میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ مجھ پر پانی ڈالو۔'' سار ملوک اپنے دونوں ہاتھوں سے پنکھا جھلتا ہوا بولا۔
''میرا بھی یہی حال ہے۔'' بابا صاعق بھی فوراً گھبرا کر بولے۔ ''ہم کس مصیبت میں پھنس گئے۔''
ابھی ساحل عمر سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے۔ اتنے میں مجمع سے آواز آئی۔ ''آگ' آگ۔''
ساحل عمر نے سامنے کھڑے لوگوں پر نظر ڈالی۔ وہ سارے کے سارے اذیت میں تھے اور دردناک انداز میں چیخ رہے تھے۔ ''آگ' آگ۔''
لیکن آگ کہیں نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ آخر یہ کیسی آگ تھی جو لگی ہوئی تو تھی لیکن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید وہ جسموں کے اندر لگی ہوئی تھی۔ ساحل عمر اس آگ سے محفوظ تھا۔ وہ پورے اطمینان سے کھڑا تھا۔ پھر اسے تعویذ کو چھونے کا خیال آیا۔ اس نے فوراً تعویذ پر اپنا انگوٹھا رکھ دیا۔ اسی وقت کہیں سے آواز آئی۔ ''اس منحوس کتاب کو فوراً الاؤ میں پھینک دو۔''
ساحل عمر اس ہدایت کو سنتے ہی تیزی سے آگے بڑھا اور کتاب سحر کی دونوں جلدیں الاؤ میں اچھال دیں۔ ادھر وہ کتاب آگ میں گری ادھر سار ملوک اور بابا صاعق کے چہروں پر سکون چھا گیا۔ مجمع سے بھی آگ' آگ کی آواز آنا بند ہو گئی۔
یہاں سے وہاں تک ہر شخص کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے جسم میں لگی ہوئی آگ پر جیسے پانی پڑ گیا۔
لوگوں کے اندر کی آگ بجھی تو اچانک چیخوں کی آواز آنے لگی۔ یہ بہت بھیانک چیخیں تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سینکڑوں مرد اور عورتیں مل کر زور زور سے رو رہے ہوں' کراہ رہے ہوں' چیخ رہے ہوں۔
ساحل عمر نے گھبرا کر مجمع کی طرف نظر ڈالی لیکن مجمع بڑے اطمینان سے کھڑا ہوا تھا۔ سار ملوک اور بابا صاعق کے چہرے بھی پرسکون تھے لیکن وہ چیخیں اب بھی بلند ہو رہی تھیں۔ پھر ان چیخوں میں بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی کڑک بھی شامل ہو گئی۔ چند ساعتوں کو گھپ اندھیرا چھا گیا جیسے پورا

سورج اچانک گرہن میں آ گیا ہو۔ کتاب سحر دھڑ دھڑ جل رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا آخری ورق بھی جل کر خاک ہو گیا۔

پوری کتاب کے جلتے ہی نہ چیخوں کی آواز رہی، نہ بجلی کی کڑک اور نہ ہی اندھیرا۔ ہر چیز اپنے معمول پر آ گئی۔ بابا صاعق اور سمار ملوک نے ساحل عمر کو بڑے فخر سے دیکھا۔ اس نے اس دنیا کو اس شیطانی کتاب سے نجات دلا دی تھی جو انسانیت کی دشمن تھی جس کے شر سے کوئی بھی مخلوق محفوظ نہ تھی۔

کتاب شر جو اللہ کی مخلوق کے لئے باعث اذیت تھی، وہ نیست و نابود ہو چکی تھی لیکن ابھی وہ فتنہ باقی تھا جسکے جگنے سے قیامت سے پہلے قیامت آ سکتی تھی۔ ابھی اس عفریت کا خاتمہ باقی تھا۔

اب ساحل عمر راعین کی لاش کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اپنی تلوار کی نوک سے اس کا جسم چھوا تو وہ پتھر کی طرح سخت محسوس ہوا۔ اس نے تلوار اس کے سینے پر دوبارہ ماری۔ یوں محسوس ہوا جیسے تلوار کسی پتھر سے ٹکرائی ہو۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں آئیں۔ تب ساحل عمر نے راعین کے جسم کا ایک ایک حصہ تلوار سے بجا ڈالا، ہر حصہ پتھر کی طرح سخت تھا۔

ساحل عمر نے بابا صاعق اور سمار ملوک کی طرف باری باری دیکھا اور بولا۔ ”یہ تو چٹان کی طرح سخت ہے۔ اس پر تلوار کا وار کارگر نہ ہو گا۔“

”وار کر کے تو دیکھو۔“ سمار ملوک نے ہدایت کی۔

”اچھا!“ ساحل عمر نے یہ کہہ کر تلوار اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامی اور ذرا سا پیچھے ہٹ کر راعین کے پیٹ پر ایک بھرپور وار کیا۔

لاش کا کچھ نہ بگڑا، البتہ ساحل کے ہاتھ ضرور جھنجھنا گئے۔ تلوار جیسے کسی پتھر پر پڑی تھی۔ کھٹ کی زوردار آواز آئی تھی۔ یہ دیکھ کر سمار ملوک پریشان ہو گیا۔ اس نے ساحل عمر کے نزدیک آ کر کہا۔ ”ذرا اس کی گردن پر وار کر کے دیکھو۔“

ساحل عمر نے گردن اثبات میں ہلائی اور اس کی گردن کے سامنے کھڑے ہو کر ایک بھرپور وار کیا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات...... لاش کا کچھ نہ بگڑا، پتھر سے ٹکرانے جیسی آواز پیدا ہوئی۔

وار کی ناکامی نے بابا صاعق اور سمار ملوک کے چہرے ایک دم سفید کر دیئے۔ وہ دونوں گھبرا گئے۔ اب کیا ہو گا۔ اگر اسکو نیست و نابود نہ کیا گیا تو یہ جاگ کر وہ فتنے اٹھائے گا کہ اس بستی کا نام و نشان تک نہیں رہے گا۔

”اسے جلتے الاؤ میں ڈال کر دیکھا جائے۔“ بابا صاعق نے سمار ملوک کی طرف دیکھا۔

”یہ پتھر کی طرح سخت ہے...... بھلا پتھر کا آگ کیا بگاڑے گی۔“ سمار ملوک فکر مند ہو کر بولا۔

تب ساحل عمر کے دل میں تعویذ پکڑنے کا خیال آیا۔ اس نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پریشان نہ ہوں، میں کرتا ہوں کچھ۔“

یہ سن کر دونوں کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ”ہاں تم ہی کچھ کر سکتے ہو۔“

ساحل عمر نے اپنے گلے میں پڑے چاندی کے تعویذ کو مٹھی میں لے لیا۔ اسی وقت اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے کہا ہو۔ ''اس منحوس کی آنکھوں پر وار کرو۔''

''اوہ!'' اس آواز کو سن کر ساحل عمر کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ''یہ ہوئی نہ بات۔''

وہ راعین کی لاش کے قریب ہوا۔ اس نے جھک کر اس کی آنکھوں میں بغور دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پلکوں میں ہلکی سی لرزش ہو۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی آنکھوں کے ذریعے ہی اسے مارا جاسکتا ہے۔ اس نے اللہ کا نام لے کر تلوار اونچی کی اور پوری طاقت سے اس کی دائیں آنکھ پر وار کیا۔ تلوار کی نوک بہت آسانی سے آنکھ کے اندر گھستی چلی گئی۔

اس نے جلدی سے دائیں آنکھ سے تلوار نکال کر بائیں آنکھ میں گھسیڑ دی۔

بائیں آنکھ سے تلوار نکلتے ہی خون ابل کر باہر آیا' یہ کالے رنگ کا خون تھا اور کسی فوارے کی طرح نکلا تھا۔ ساحل عمر نے جلدی سے اس کی دائیں آنکھ سے بھی تلوار کھینچ لی اور فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ دائیں آنکھ سے بھی کالا خون کسی فوارے کی مانند باہر نکلا۔

اس کی دونوں آنکھوں سے یہ کالا خون بہت تیزی سے نکل رہا تھا۔ یہ خون چٹان پر بہتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ جیسے جیسے اس کی آنکھوں سے خون نکلتا جا رہا تھا' ویسے ویسے اس کی لاش پچکتی جا رہی تھی۔

کہیں دور سے زبردست دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کسی محاذ پر جنگ ہو رہی ہو۔ توپ کے گولے پھٹ رہے ہوں۔ بم گرائے جا رہے ہوں۔ ان دھماکوں کی دھمک سے کالا پہاڑ بھی لرز رہا تھا۔

پھر جب تک اس کی آنکھوں سے خون فواروں کی مانند نکلتا رہا' دھماکوں کی آوازیں آتی رہیں جیسے ہی خون بند ہوا' دھماکوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

اب تابوت پر جو ڈھانچہ رہ گیا تھا اس کی ہڈیاں بھی پگھل کر بہہ رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد یہ ہڈیاں بھی نہ رہیں۔ اس کی پوری لاش پانی بن کر بہہ گئی۔ البتہ اس کی کھوپڑی کو کچھ نہ ہوا۔ کھوپڑی کا ڈھانچہ سلامت رہا۔

ساحل عمر نے اس کی کھوپڑی کو اپنی تلوار کی نوک پر اٹھا لیا اور اپنا ہاتھ اونچا کر کے چٹان سے نیچے اترنے لگا۔

اسی وقت پیچھے سے آواز آئی۔ ''ٹھہرو!''

ساحل عمر کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

☆......☆......☆

وہ اصل میں جوش میں آ گیا تھا۔ راعین کی موت کی خوشی میں اسے اس بات کا خیال نہیں رہا تھا کہ وہ کسی اور کی بستی میں ہے اور اس بستی کا مالک و مختار رمز شناس سمار ملوک ہے' اس کی اجازت کے بغیر اسے راعین کا سر لے کر نیچے نہیں جانا چاہیے تھا۔

''ٹھہرو۔'' کی آواز پر اس کے بڑھتے قدم فوڑا رک گئے اور پھر وہ فوڑا واپس آ کر سمار ملوک کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''اے ساحل عمر! ہمیں بھی اپنی خوشی میں شامل کر۔'' سمار ملوک خوشدلی سے بولا۔ ''تم اکیلے ہی نیچے بھاگے جا رہے ہو۔ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے کر چلو۔''

''اے رمز شناس ضرور...... مجھ سے غلطی ہوئی' معافی کا طلب گار ہوں۔''

''ایسا نہ کہو...... تم ہمارے نجات دہندہ ہو' ہمارے محسن ہو' ہمارے لیے قابل احترام ہو۔'' یہ کہہ کر سمار ملوک نے ساحل عمر کا اٹھا ہوا ہاتھ جس میں تلوار تھی اور تلوار کی نوک پر کھوپڑی تھی پکڑ لیا۔ پھر بابا صاعق نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد وہ تینوں آہستہ آہستہ چٹان سے نیچے اترنے لگے۔

ان کو نیچے اترتا دیکھ کر مجمع میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس عفریت کی موت نے بستی کے ہر شخص میں ایک جوش بھر دیا تھا۔ وہ اس کھوپڑی کو قریب سے دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔

مجمع ان کو اپنے قریب دیکھ کر کائی کی طرح چھٹ گیا۔ وہ تینوں لوگوں کے درمیان سے گزرنے لگے۔ رمز شناس کا چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا۔ بابا صاعق کے چہرے پر بھی چمک تھی۔ ساحل عمر تو خوش تھا ہی کہ یہ سارا کارنامہ ہی اس کا تھا۔ وہ مجمع میں کسی کو ڈھونڈ رہا تھا مگر اس کی نظریں تلاش میں ناکام ہو کر بار بار پلٹ رہی تھیں' بھٹک رہی تھیں۔

ساحل عمر کو بڑی حیرت تھی۔ بستی کا بچہ بچہ یہاں موجود تھا لیکن نہیں تھی تو وہ نہیں تھی۔ لیکن یہ بات قرین قیاس نہ تھی۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ یہاں نہ ہو۔ وہ یہاں ضرور ہو گی۔ اتنے رش میں اسے دیکھ لینا بھی تو آسان نہ تھا۔ اگر وہ یہاں ہو گی تو خود ہی سامنے آئے گی۔ یہ سوچ کر وہ پورے اطمینان سے مجمع کے درمیان سے گزرنے لگا۔

پھر یہ جلوس بستی کے چوک پر پہنچ کر رک گیا۔

اس کھوپڑی کو جائے عبرت بنا دینا چاہیے۔ لہٰذا فوڑا ہی اس کا انتظام کیا گیا۔ ایک مضبوط نیزے پر اس کھوپڑی کو منتقل کر دیا گیا اور یہ نیزہ چوک کے درمیان میں گاڑ دیا گیا۔

اس کے بعد بستی کے رمز شناس سمار ملوک نے ایک خاص اعلان کیا۔ کل رات کو شادی کا جشن منایا جانا تھا۔ سمار ملوک چاہتا تھا کہ اس جشن کو سات دن کے لئے ٹال دیا جائے لیکن اس التواء کے لئے اسے ان لڑکیوں سے اجازت لینا ضروری تھی جن کی کل شادی ہونے والی تھی۔

تب سمار ملوک نے ان لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اپنے اپنے موروں کو منتخب کرنے والی لڑکیو! میں چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی کا جشن سات دن کے لئے آگے بڑھا دوں...... کیا تم اس بات کے لئے راضی ہو۔''

''اے رمز شناس...... آخر ایسا کیوں؟'' ایک امیدوار دوشیزہ نے سوال اٹھایا۔

''میں اس جشن کو یادگار بنانا چاہتا ہوں۔'' سمار ملوک نے پرجوش انداز میں کہا۔

''وہ کیسے؟'' کئی دوشیزاؤں نے بیک وقت پوچھا۔

''اگر اس جشن میں رشا ملوک بھی شامل ہو جائے تو کیا یہ جشن یادگار نہیں ہو جائے گا۔'' سمار ملوک نے اطلاع دی۔

''ہو جائے گا' ضرور ہو جائے گا۔'' کئی لڑکیوں نے بیک وقت کہا۔ ''کیا رشا ملوک نے اپنا مور منتخب کر لیا۔''

''یہ بات تو ہمیشہ راز رہتی ہے۔ یہ بات تو اسی رات ظاہر ہو گی۔'' سمار ملوک نے اس کا راز نہ کھولا۔

''ٹھیک ہے۔''

''بس تو پھر طے ہوا کہ شادی کا جشن سات دن بعد منایا جائے گا۔''

''طے ہوا؟'' بہت سی لڑکیوں نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا۔

''بس پھر اپنے اپنے گنبدوں کو جاؤ اور جشن کی رات کا انتظار کرو۔'' سمار ملوک نے اعلان ختم کیا۔

یہ سنتے ہی بستی کے مرد' عورتیں' بچے اور لڑکیاں چھٹنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے چوک خالی ہو گیا۔

اب جو ساحل عمر نے نظر گھمائی تو اس کے دل میں انار پھوٹنے لگے۔ رشا ملوک اور مویا اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

رشا ملوک نے ایک نظر ساحل عمر کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی پلکوں کی چلمن گرالی۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ وہ سر جھکا کر شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ مویا کا ہاتھ پکڑ کر نزدیک کھڑی شاہی کٹاری کی طرف بھاگی۔ پھر وہ پردے میں چھپ کر بیٹھ گئی اور کٹاری فوراً ہی محل کی جانب روانہ ہو گئی۔

☆......☆......☆

راعین جہنم واصل ہو چکا تھا۔ کتاب سحر جل کر خاک ہو چکی تھی۔ دو بڑے اور اہم کام ہو گئے تھے لیکن ابھی ایک کام اور باقی تھا اور یہ کام بھی چھوٹا نہ تھا' غیر اہم نہ تھا۔

اسے ایک مرتبہ اور راعین کے مدفن جانا ہوگا۔ ان چار ستونوں میں جو خزانہ بھرا ہے اسے نکالنا ہوگا۔ اگرچہ یہ بات یقینی نہ تھی کہ ان ستونوں میں خزانہ ہی بھرا ہے لیکن غالب امکان یہی تھا کہ ستون خالی نہیں ہیں۔ ان میں ضرور ہیرے جواہرات بھرے ہیں۔ اچھا یہ ہوتا کہ وہ ایک پتھر نکال کر اس بات کی تصدیق کر لیتا لیکن بابا صاعق اور سمار ملوک نے ایسا نہ کرنے دیا۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ستونوں میں خزانے کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے انہوں نے وقت کے ضیاع سے بچنے کے لئے اس طرف توجہ نہ دی۔ اصل مسئلہ تو راعین اور کتاب سحر کا خاتمہ تھا۔ اس کام میں دیر نہیں ہونا چاہیے تھی۔ اگر ستونوں میں خزانہ تھا تو وہ کہیں نہیں بھاگا جا رہا تھا۔

اب وہ دونوں کام بخیر و خوبی ہو چکے تھے۔ اب خزانہ نکال لینے کا فریضہ بھی انجام دے لینا چاہیے تھا۔ ابھی سات دن باقی تھے۔ یہ کام تین چار دن میں بآسانی انجام دیا جا سکتا تھا۔

اس کام کے لئے اس کو خود ہی جانا ہوگا۔ ممکن ہے سمار ملوک بھی اس کے ساتھ جانا چاہے۔ اس سلسلے میں اس سے بات کرنا ہو گی۔

ساحل عمر کے اصرار پر سمار ملوک نے اسے اس مہم پر جانے کی اجازت تو دے دی لیکن خود نہیں گیا۔ اس نے اس کے ساتھ بازغر کو بھیج دیا۔ بازغر سمار ملوک اور بابا صاعق کا اک بااعتماد شخص تھا۔ پھر ساحل عمر بھی اسے اچھی طرح جانتا تھا اس کے ساتھ وہ سفر بھی کر چکا تھا۔ اب بازغر پھر اس کے ساتھ مہم پر جا رہا تھا' یہ بات ساحل عمر کیلئے خوشی کی تھی۔ بازغر ایک بہت سمجھدار شخص تھا۔ وہ بہت اچھی باتیں کیا کرتا تھا۔

بازغر نے اس مہم کے لئے چالیس نوجوانوں کا انتخاب کیا' اس حساب سے خچر اور گھوڑوں کا انتظام کیا گیا۔ خزانہ لانے کی صورت میں کن کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی' وہ اکٹھا کی گئیں اور پھر یہ قافلہ چل پڑا۔

رات کو اس قافلے نے کوہ ویراں کے دامن میں پڑاؤ ڈالا۔ پھر صبح ہوتے ہی یہ لوگ کوہ ویراں کی بلندی کو ناپنے لگے۔ پھر ایک وقت آیا کہ انہیں اپنے گھوڑے' خچر چھوڑنے پڑے۔ اب پیدل سفر شروع ہوا۔

بالآخر ساحل عمر اور بازغر نے راعین کے مدفن کو پالیا۔ ان کے پیچھے پیچھے نوجوان بھی پہنچ گئے۔ ساحل عمر نے ان میں سے چار نوجوانوں کو اپنے ساتھ لیا' باقی نوجوانوں کو باہر کھڑے ہو کر انتظار کرنے کا حکم دیا۔ پھر وہ بازغر اور ان چار نوجوانوں کے ساتھ برف کے غار میں داخل ہوا۔

جب وہ سیڑھیاں اتر کر چبوترے کے نزدیک پہنچا اور اس نے ٹارچ کی روشنی میں غار کا جائزہ لیا تو سب کچھ ویسا ہی پایا جیسا چھوڑ کر گیا تھا۔ البتہ اس غار کی ویرانی مزید بڑھ گئی تھی۔ ایک دہشت اور خوف کی سی فضا تھی۔

ساحل عمر نے ان چاروں نوجوانوں میں سے دو کو چبوترے پر چڑھنے کو کہا' جب وہ نوجوان اوپر چڑھ گئے تو اس نے ٹارچ کی روشنی ستون کے اس چوکور پتھر پر ڈالی جو مختلف رنگ کا تھا۔

"اس پتھر کو خنجر کے ذریعے ڈھیلا کر کے بہت احتیاط سے باہر نکالو۔" ساحل نے چبوترے

کے نیچے سے ہدایت دی۔ بازغر اس کے برابر کھڑا تھا۔

اس نوجوان نے ساحل عمر کا حکم سن کر اپنی کمر سے بندھا خنجر نکالا اور بہت احتیاط سے پتھروں کے درمیان درز خنجر ڈال کر اس پتھر کو ڈھیلا کرنے لگا۔

چند منٹ کی محنت کے بعد وہ پتھر اتنا ڈھیلا ہو گیا کہ اسے انگلی کی گرفت میں لے کر کھینچا جا سکتا تھا۔ اس نوجوان نے پتھر کھینچنے سے پہلے ساحل عمر کی طرف دیکھا۔

''نکالو۔'' ساحل عمر نے کہہ کر ٹارچ کا دائرہ اس پر مرکوز کر دیا اور بازغر کا ہاتھ پکڑ کر خود سیڑھیوں کے نزدیک ہو گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ پتھر نکلتے منظر کو قریب ہو کر دیکھتا لیکن جانے کیا ہوا کہ وہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹ گیا اور بازغر کو بھی اپنے ساتھ پیچھے ہٹا لیا۔

بعض اوقات غیر ارادی حرکتوں کے پیچھے قسمت کا فیصلہ چھپا ہوتا ہے۔

اس نوجوان نے ساحل عمر کا حکم سنتے ہی پتھر باہر کھینچ لیا۔ پتھر کا باہر کھینچنا تھا کہ ایک قیامت کا ظہور ہوا۔

پتھر باہر نکالتے ہی وہ ستون دو ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم ہو گیا جیسے اسی پتھر کے سہارے کھڑا تھا۔ ستون کا ایک حصہ نوجوان پر گرا۔ دوسرا نوجوان جو اس کے پیچھے کھڑا تھا اس نے ستون کو گرتے دیکھا تو چبوترے سے چھلانگ لگا دی۔ اس ستون کے ساتھ ہی وہ غار بیٹھنے لگا۔ اندر ایک زلزلہ سا آ گیا۔

ساحل عمر سیڑھیوں کے نزدیک تھا۔ اس نے جیسے ہی صورت حال سنگین ہوتے دیکھی۔ وقت ضائع کئے بغیر سیڑھیوں پر چڑھ گیا اور زور سے چیخا۔ ''بازغر بھاگو!''

بازغر نے بھی ستون گرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ فوراً ہی اس کے پیچھے لپکا۔

ایک ستون کے گرتے ہی دوسرا' تیسرا ستون ہلا اور پھر چاروں ستون زمین پر آ گرے۔ ستونوں کے گرتے ہی غار کی چھت بیٹھ گئی۔ پتھر نکالنے والے نوجوان کو تو بھاگنے کی مہلت نہ ملی لیکن دوسرا نوجوان جس نے چبوترے سے چھلانگ لگا دی تھی' وہ بھی اس غار سے زندہ نہ نکل سکا۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہی غار کا دہانہ بند ہو گیا۔

وہ تو خیر ہوئی کہ ساحل عمر اور بازغر باہر نکل گئے تھے ورنہ چند لمحوں کی دیر ان کی زندگی چھن جانے کا باعث بن جاتی۔

ساحل عمر نے اوپر والے کا شکر ادا کیا کہ ان کی زندگیاں چھن جانے سے بچ گئیں تھیں۔

اب یہاں رکنا بیکار تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔

ساحل عمر کے ساتھ بابا صاعق اور سمار ملوک کو بھی قوی امید تھی کہ ان ستونوں میں خزانہ بھرا ہوا ہے۔ ان ستونوں میں وہ مختلف رنگ کے پتھر کچھ اس طرح لگائے گئے تھے کہ یہ شبہ یقین میں بدل جاتا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ساحل عمر نے اس دن پتھر کھینچ کر نہیں دیکھا ورنہ سمار ملوک اور بابا صاعق کے ساتھ وہ بھی مدفون ہو جاتا۔ وہ اس بات کو سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ اس دن اس نے پتھر نہ نکال کر کس قدر زبردست کام کیا تھا۔

"بازغر یہاں سے جلد نکل چلو۔" ساحل عمر نے تیز قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم خطرے میں ہیں۔"

بازغر نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور وہ ساحل عمر کے ساتھ تیزی سے نیچے اترنے لگا۔

☆......☆......☆

تیسرے دن صبح کو جب یہ قافلہ واپس بستی میں داخل ہوا تو فوراً ہی یہ خبر سار ملوک کو پہنچائی گئی۔ سار ملوک اطلاع ملتے ہی اپنی شاہی کٹاری پر سوار ہو کر اس قافلے کے استقبال کے لئے نکل کھڑا ہوا...... اس وقت تک یہ قافلہ چوک تک پہنچ چکا تھا۔ اس چوک تک جہاں ایک اونچے نیزے پر راعین کی کھوپڑی لٹکی ہوئی تھی جو سب کے لئے درس عبرت تھی۔

ساحل عمر اور بازغر نے چوک میں کھڑی شاہی کٹاری دیکھی تو دونوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑی لگائی اور آناً فاناً شاہی کٹاری کے نزدیک پہنچ گئے۔

اس بستی کے رمز شناس سار ملوک نے کٹاری سے اتر کر ساحل عمر کے چہرے پر نظر ڈالی تو اسے وہاں خوشی محسوس نہ ہوئی۔ یہی حال بازغر کا تھا۔ وہ دونوں گھوڑوں سے اتر کر خاموشی سے سار ملوک کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

کیا ہوا؟" سار ملوک کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"ہم اس بستی کے دو نوجوان گنوا بیٹھے۔"

"کیا کہتے ہو۔" سار ملوک کی پیشانی پر بل پڑ گیا۔ "یہ کیسے ہوا......؟ اور خزانہ......"

"اے رمز شناس...... ہم سے غلطی ہوئی...... ہم نے غلط اندازہ لگایا۔ وہاں کوئی خزانہ نہ تھا...... وہ دراصل موت کا شکنجہ تھا۔ اس شکنجے سے ہم تو بچ گئے مگر ہم اپنے دو نوجوانوں کو نہیں بچا سکے۔"

یہ کہہ کر ساحل عمر نے مختصر الفاظ میں وہاں جو بیتی تھی، وہ کہہ سنائی۔

"چلو جو ہوا سو ہوا...... بستی کے دو نوجوانوں کا غار میں دب جانے کا دکھ ہے۔ یہ منحوس......" سار ملوک نے راعین کی کھوپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک ہماری بستی کے لوگوں کو نقصان پہنچائے جا رہا ہے۔"

"بس یہ اس کا آخری داؤ تھا...... اب یہ قصہ ختم ہوا۔ یہ کھوپڑی ہمیشہ کیلئے درس عبرت بنی رہے گی۔"

ساحل عمر نے بڑے یقین سے کہا۔

"بازغر...... تم ساحل عمر کو لیکر اس کی رہائش گاہ جاؤ...... میں جانے والے نوجوانوں کے گنبد ہو کر آتا ہوں۔" سار ملوک نے کہا اور اپنی کٹاری پر چڑھ گیا۔

ساحل عمر اور بازغر گھوڑوں پر سوار ہو کر محل کی طرف چل دیئے۔

☆......☆......☆

جشن کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ میدان جشن کو نت نئی چیزوں سے سجایا جا رہا تھا۔

اس جشن کو یادگار بنانے کے لئے ہر سطح پر کوششیں جاری تھیں۔ اس جشن کو آخری یادگار کیوں نہ بنایا جاتا' اس مرتبہ اس بستی کے رمز شناس کی اکلوتی بیٹی کی شادی تھی۔

اس جشن کے ہر طرف چرچے تھے۔ بستی کی لڑکیاں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں۔۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ رشا ملوک نے آخر کس کو اپنا مور منتخب کیا ہے' محض اندازے تھے اور قیاس آرائیاں تھیں۔

جشن شادی میں ابھی دو دو راتیں باقی تھیں۔ اس رات مویا اسے کھانا کھلا کر گئی تو وہ اس کول کمرے میں کچھ دیر چہل قدمی کرتا رہا۔ جیسے جیسے شادی کا وقت نزدیک آ رہا تھا' اسے اپنے لوگ یاد آتے جا رہے تھے۔ کاش! وہ اس شادی میں اپنے دوستوں کو شریک کر سکتا۔ اپنی ماں کو اس خوشی میں شامل کر سکتا۔ انہیں کتنی آرزو تھی اس کی شادی کی۔ جب انہیں معلوم ہو گا کہ وہ شادی کر لایا ہے تو وہ لوگ کس قدر ناراض ہوں گے۔ پھر وہ کیا کرے۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی شمولیت کسی طور ممکن نہیں۔

پھر وہ سونے کے لئے لیٹا تو اس کی آنکھوں میں بڑی دیر تک یادوں کی شمعیں جھلملاتی رہیں۔ وہ یادوں کی برات میں گھرا جانے کب سو گیا۔

جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں ہلکی روشنی موجود تھی۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ اسکے کمرے کا دروازہ خوف میں مبتلا کر دینے والی چرچراہٹ کے ساتھ کھل رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سردی کی ایک تیز لہر اندر داخل ہو رہی ہے۔

یہ بات اسے اچھی طرح یاد تھی کہ وہ رات کو سونے سے پہلے دروازہ اچھی طرح بند کر کے سویا تھا۔ پھر یہ دروازہ کیسے کھلا یہ اتنی برفانی ہوا اندر کس طرح آ رہی ہے۔ کیا باہر کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔

وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے سرہانے رکھی تلوار فوراً اپنے ہاتھ میں اٹھالی۔ اسے دروازے میں کوئی دکھائی نہ دیا لیکن وہ دروازہ اب بھی آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔

جب وہ پورا دروازہ کھل گیا تو ساحل عمر نے اسے دہلیز پر دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کا رخ سیدھا بستر کی طرف تھا۔ جوں جوں وہ بستر کی طرف بڑھتا آ رہا تھا' رفتہ رفتہ اس کا سائز بڑا ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک بڑے کچھوے کے برابر ہو گیا...... وہ بچھو تھا' اعور تھا۔

اس سے پہلے کہ اعور بستر پر چڑھ کر اس پر حملہ آور ہو جاتا' ساحل عمر بہت تیزی سے بستر سے نکل کر ایک طرف ہوا اور اس نے تلوار کا ایک بھرپور وار کیا۔

اس وار کا اعور پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تلوار جیسے کسی پتھر کے ٹکڑے سے ٹکرائی۔ اس وار پر بس وہ ایک لمحے کے لئے رکا اس کے بعد وہ بستر پر سے گزرتا آگے بڑھ گیا۔ اس نے ساحل عمر کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ساحل عمر اسے حیرت زدہ ہو کر دیکھنے لگا۔

اعور پورے اطمینان سے چلتا ہوا ساحل عمر کی تصویر کے پاس پہنچا جو دیوار پر بنی ہوئی تھی۔

وہ بچھو تصویر پر چڑھ کر اس کی پیشانی تک پہنچا اور پھر ساحل عمر نے اعور کو صافے کے نیچے گھستے ہوئے دیکھا۔ ساحل عمر نے یہ یقین کرنے کے لئے کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے صحیح دیکھ رہا ہے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ اتنی دیر میں وہ بچھو اس کے صافے میں داخل ہو چکا تھا۔ اب تصویر پر کوئی چیز نہ تھی۔

اس منظر نے ساحل عمر پر گھبراہٹ طاری کردی۔ اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر فرش پر گری۔

اسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دل زورزور سے دھڑک رہا تھا۔ اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔ جب اس نے سامنے دروازے پر نظر ڈالی تو اسے بند پایا۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ اس نے پلٹ کر تصویر کی طرف دیکھا۔ تصویر اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔ اس کی تلوار بھی سرہانے رکھی تھی۔

اس نے اٹھ کر دروازہ چیک کیا۔ دروازہ اچھی طرح بند تھا۔ پھر اس نے نزدیک سے اپنی تصویر دیکھی۔ صافے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ تصویر میں کوئی فرق موجود نہ تھا۔

اب اسے یقین ہو گیا کہ اس نے جو کچھ دیکھا خواب میں دیکھا تھا...... لیکن یہ خواب تھا کتنا خطرناک...... کتنا بھیانک...... وہ خواب کو دیکھ کر فکر مند ہو گیا تھا۔ جانے کتنی دیر وہ یونہی بستر پر گم صم بیٹھا رہا تھا۔

☆......☆......☆

آج جشن کی رات تھی۔

آج کی رات تیرہ لڑکیوں کی شادی ہونا قرار پائی تھی۔ چودھویں رشا ملوک تھی۔

جشن کا میدان بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ بستی کے تمام لوگ اکٹھا ہو چکے تھے اور اپنی اپنی نشست سنبھال چکے تھے اب سب کی نظریں انتخابی محراب پر لگی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے رشا ملوک نے اپنے مور کے ساتھ اس محراب سے نکل کر میدان میں آنا تھا۔

سب رشا ملوک کے لئے بے چین تھے۔ وہ رشا ملوک کے مور کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھے۔ آخر بستی کا وہ کون سا نوجوان ہے جو رشا ملوک کا انتخاب بن گیا ہے۔

پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ موسیقی کی آواز بلند ہوتے ہی رشا ملوک محراب میں نظر آئی۔ اس کے پیچھے اس کا مور تھا جس کا اس نے ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور وہ اسے تیزی سے کھینچتی ہوئی محراب سے نکل کر میدان میں داخل ہوئی۔

رشا ملوک کے مور کو دیکھ کر چند لمحوں کے لئے ہجوم پر سکتہ طاری ہو گیا۔ سب خوشگوار حیرت میں ڈوب گئے۔ پھر اچانک سب کو ہوش آیا تو ایک دم شور اٹھا۔ تالیاں' سیٹیاں' ہاؤ ہو...... موسیقی کے دھماکے۔

رشا ملوک' ساحل عمر کو تیزی سے دوڑاتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اس گھومنے والے سجے ہوئے تخت پر بیٹھ گئی جو اونچائی پر میدان کے درمیان نصب تھا۔

تخت گھومتا رہا اور لوگ شور مچا مچا کر داد تحسین دیتے رہے اور رشا ملوک فخر سے گردن

اکڑائے دادِ تحسین وصول کرتی رہی۔ وہ بہت خوش تھی۔ آج اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ مل گیا تھا۔
جب تخت نے تین چکر لگا لئے اور ساری بستی نے اسے اور اس کے مور کو دیکھ لیا وہ تخت سے اتر آئی۔ رشا ملوک نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور دوڑتی ہوئی سمار ملوک کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
تب سمار ملوک اور اس کی بیوی عروہ اپنی کرسیاں چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے کھڑے ہوتے ہی میدان میں موجود ہر شخص کھڑا ہو گیا۔ اب یہ وقت تھا شادی کے بندھن کا۔
سمار ملوک نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور با آواز بلند بولا۔ ''اے رشا ملوک کیا تو اپنے مور کے ساتھ خوش ہے۔''
''ہاں، بابا میں خوش ہوں۔'' رشا ملوک نے فوراً جواب دیا۔ پھر اس جملے کو اس نے تین بار دہرایا۔
''اور تیرا مور کیا کہتا ہے۔ کیا یہ بھی خوش ہے۔'' یہ کہہ کر سمار ملوک نے ساحل عمر کی طرف دیکھا۔
رشا ملوک نے اس کا ہاتھ دبا کر اشارہ کیا۔ ''بولو!'' تب ساحل عمر فوراً بولا۔ ''ہاں بہت خوش ہوں۔''
پھر یہ بات اس نے تین مرتبہ دہرائی۔ اس ایجاب و قبول کے بعد بستی کا ہر شخص بیٹھ گیا۔ پھر کوئی کچھ نہ بولا۔ ایک منٹ کے لئے میدان میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔ جیسے دل میں ہر شخص اس نوبیاہتا جوڑے کے لئے دعا کر رہا ہو۔ اس لمحے سمار ملوک نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور با آواز بلند بولا۔
''وقت تمہاری حفاظت کرے۔ قسمت تم پر مہربان ہو۔ ستارے تمہیں اپنا بنائیں۔''
سمار ملوک خاموش ہوا تو پوری فضا بیک وقت مبارکباد سے گونج اٹھی۔ موسیقی نے انگڑائی لی۔ فضا پر ایک خوشگوار تاثر چھا گیا۔ ماحول مہک اٹھا۔ میدان جگمگا اٹھا۔
''مبارک ہو...... اے رشا تجھے تیرا مور مبارک ہو۔'' پوری بستی بیک وقت پکار اٹھی۔
جب آخری لڑکی کی بھی شادی پایہ تکمیل کو پہنچی تو پھر شربت کی دیگ کھل گئی۔ بستی کے لوگ بڑے اطمینان اور سکون سے اس دیگ کے سامنے سے گزرتے گئے اور شربت کا گلاس لے کر آگے بڑھتے گئے۔
جو شربت پی لیتا، نوبیاہتا جوڑوں کی کرسیوں کے سامنے سے گزرتا ہوا، انہیں مبارکباد دے کر محراب سے باہر چلا جاتا۔ بالآخر جشن کا میدان بستی والوں سے خالی ہو گیا۔ اب میدان میں نوبیاہتا جوڑے اپنے لواحقین کے ساتھ رہ گئے۔
پھر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ساحل عمر کا ہاتھ رشا ملوک کی ماں عروہ نے تھاما اور رشا ملوک کا ہاتھ اس کے باپ سمار ملوک نے پکڑا۔ اس طرح وہ اس محراب سے نکل کر باہر آ گئے۔
باہر دو سفید گھوڑوں کی ایک چھوٹی سی کٹاری موجود تھی...... ساحل عمر اور رشا ملوک کو اس پر سوار کرا دیا گیا۔ اس کے بعد کٹاری کا پردہ گرا دیا گیا۔ بازغر نے کٹاری پر چڑھ کر آواز لگائی۔ ''رشا

ملوک چلوں۔"
"ہاں، چلو بازغر۔" رشا ملوک نے پردے کے پیچھے سے جواب دیا۔
اس جواب کے فوراً بعد کٹاری ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

☆......☆......☆

کٹاری کے رکتے ہی ساحل عمر کے کان میں نقرئی قہقہوں کی آوازیں پڑیں۔ اس نے پردہ ہٹایا تو کٹاری کے سامنے رشا ملوک کی سہیلیوں کو پایا۔ مویا سب سے آگے تھی اس کے ہاتھ میں سونے کی چمکتی ہوئی تھالی تھی۔ اس تھالی میں سات مختلف رنگوں کی موم بتیاں روشن تھیں۔

ساحل عمر کو کٹاری سے اتار کر مویا نے اپنی سات سہیلیوں کے ساتھ ساحل عمر کے گرد سات چکر لگائے۔ پھر یہی عمل رشا ملوک کے ساتھ دہرایا گیا۔ اس کے بعد مویا نے تھالی بائیں ہاتھ پر رکھ کر دائیں ہاتھ سے ساحل عمر کا ہاتھ پکڑ لیا اور دراوازے کی طرف بڑھنے لگی۔

یہ اسی کا گنبد تھا لیکن جب وہ دروازے سے اندر داخل ہوا تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی نئے کمرے میں آگیا ہے۔ وہ کمرہ جس میں ایک بستر کے سوا کچھ نہ تھا' اب ایک خوبصورت بیڈ روم میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اگر اس کمرے میں دیوار پر بنی تصویر نہ ہوتی تو وہ یہی سمجھتا کہ کسی اور کمرے میں آگیا ہے۔

مویا نے اس کمرے میں دو اونچی مرصع کرسیوں میں سے ایک پر ساحل عمر کو بٹھایا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ رشا ملوک تھی۔ اس نے رشا ملوک کو اس کے برابر بٹھایا۔

پھر اس نے اس روشن تھالی کو ساحل عمر کے قدموں میں رکھا۔ پھر خود بھی بیٹھ گئی۔ اس نے سات موم بتیوں کو ایک ایک کر کے اٹھایا۔ اس کے چہرے کے نزدیک کیا اور پھر تھالی میں جما دیا۔ ساتوں موم بتیوں کی روشنی دکھا کر اس نے تھالی اٹھائی اور خود بھی کھڑی ہوگئی۔

اس کے بعد وہ سات قدم پیچھے ہٹی۔ مسکرا کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور پھر میٹھے لہجے میں بولی۔ "رشا ملوک تجھے یہ شادی مبارک ہو۔ اب میں چلتی ہوں۔ وقت تجھ پر مہربان ہو۔"

"شکریہ مویا۔" رشا ملوک نے مسکرا کر کہا۔

مویا نے دروازہ کھولا اور بغیر پیچھے دیکھے دروازہ آہستہ سے بند کیا اور باہر چلی گئی۔

اب وہ کمرے میں اکیلے رہ گئے تو ساحل عمر نے برابر بیٹھی رشا ملوک کی طرف ذرا سا جھک کر دیکھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر رشا ملوک نے اپنا چہرہ جلدی سے دوسری طرف گھما لیا۔

"اے رشا کیا اب بھی کوئی رسم باقی ہے۔ آج تو مجھے رسموں نے مار ڈالا۔"

"ہاں ایک رسم اور باقی ہے۔" رشا ملوک نے منہ پھیرے پھیرے کہا۔

ساحل عمر نے اس کی تھوڑی پکڑ کر چہرہ اپنی طرف گھمایا اور گہری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"کون سی رسم؟"

"آخری رسم!" رشا ملوک نے دھیرے سے اپنی جھکی پلکیں اٹھائیں۔ اپنی نیم باز آنکھوں

سے اسے دیکھا اور پھر فوراً ہی اپنی آنکھوں پر پلکوں کا شامیانہ ڈال لیا۔ اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہونے لگا۔

''وہ کیا؟'' ساحل عمر نے شرارت سے پوچھا۔

''میں کیا جانوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا سر اس کے بازو پر رکھ دیا۔

ساحل عمر نے اس کا چہرہ اس کی تھوڑی پر اپنی انگلی رکھ کر اٹھایا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ رشا ملوک ایک بے حد حسین لڑکی تھی۔ ایک ایسی لڑکی جسے دیکھ کر فوراً اس کے خالق کی یاد آتی تھی۔ اس کا حسن بے مثال تھا۔ بے نظیر تھا...... ایسا حسن کہ آدمی دیکھے تو پلکیں جھپکانا بھول جائے۔ اسے کچھ یاد نہ رہ، بس وہ یاد رہ جائے۔

اس کا چہرہ دیکھتے دیکھتے ساحل کی کمر کو اچانک ایک جھٹکا لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اس کے چہرے پر موجود ہے اور اسی جگہ موجود ہے جہاں اس نے اسے کبھی بنایا تھا۔

اس نے فوراً اپنی پلکیں جھپکائیں۔ سوچا یہ اس کا وہم ہے۔ جو کچھ دیکھ رہا ہے فریب نظر ہے۔

رشا ملوک کو فوراً ہی خطرے کا احساس ہو گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ساحل عمر کی طرف دیکھا۔

''اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

دیکھ تو خیر میں تمہیں رہا تھا لیکن اس وقت تمہاری پیشانی پر مجھے وہ منحوس نظر آ رہا ہے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' یہ کہہ کر رشا ملوک نے فوراً اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

اس کے ہاتھ رکھتے ہی وہ غائب ہو گیا۔

''یہاں تو کچھ نہیں۔'' رشا ملوک نے اپنی پیشانی پر اچھی طرح ہاتھ پھیر کر دکھایا۔

جب اس نے اپنا ہاتھ نیچے کیا تو وہ ساحل عمر کو وہیں بیٹھا نظر آیا۔ وہ اس کی پیشانی کا جھومر بنا ہوا تھا۔

رشا ملوک نے ساحل عمر کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے وہاں پریشانی نظر آئی۔ رشا ملوک نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا۔ ساحل عمر نے اپنی آنکھیں بند کر کے دھیرے سے گردن ہلائی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اب بھی اسے دیکھ رہا ہے۔

رشا ملوک نے پھر اپنی پیشانی پر ہاتھ لے جانا چاہا تو ساحل عمر نے اس کا ہاتھ روک دیا۔ تعویذ چھونے کا خیال اس کے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے کوٹ کے بٹن کھول کر تعویذ کو اندر ہی اپنے ہاتھ میں تھاما تو فوراً ہی آواز سنائی دی۔ ''لاحول پڑھو۔''

یہ سنتے ہی ساحل عمر نے فوراً لاحول پڑھی تو وہ بچھو رشا ملوک کی پیشانی سے اس طرح غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ...... ساحل عمر یہ اندازہ نہ کر پایا کہ بچھو کی موجودگی اس کا وہم تھا یا حقیقت...... جو بھی تھا...... تھا ضرور کچھ نہ کچھ...... اگر کچھ نہ ہوتا تو اسے لاحول پڑھنے کو نہ کہا جاتا۔ اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شیطانی قوتیں مسلسل اس کے پیچھے لگی ہوئی تھیں۔ ان طاغوتی قوتوں نے

اسے فریب کے جال میں پھنسایا ہوا تھا۔ وہ چاہتی تھیں ساحل عمر کسی طرح چین نہ پائے۔
اور دوسری طرف اس بستی کے رمز شناس اس بستی کے مالک سمار ملوک کی کوشش تھی کہ وہ قرار پائے۔ اسے یہاں ہر طرح کا آرام اور سکون میسر آئے۔ ایک چین رشا ملوک کی صورت میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب کچھ وقت کے لئے سب کچھ بھول جائے' سب کو بھول جائے بس رشا ملوک کو یاد رکھے۔ رشا ملوک کا ہو جائے۔ اسے قرار دے کر خود بھی قرار پائے۔
تب وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا' اس نے بڑی نرمی سے رشا ملوک کا ہاتھ تھاما اور مخمور نگاہوں سے سجی ہوئی سیج کو دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

پھر وہ وقت آیا جو ہر بیٹی کے باپ پر آتا ہے۔ اس کی ماں پر آتا ہے۔ رشا ملوک کی ماں عروہ صبح سے روئے جاتی تھی۔ اس کی آنکھ کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ اس بستی کا رمز شناس' رشا ملوک کا باپ اپنی بیوی کو روتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ وہ کیا کہتا' وہ کیا کرتا...... وہ خود رو رہا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کے آنسو کسی کو دکھائی نہ دے رہے تھے۔ وہ آنسو اندر ہی اندر کہیں دل پر گر رہے تھے۔
رشا ملوک کی رخصتی مکمل ہو چکی تھی۔ اب وہ چند الفاظ باقی تھے جو رخصتی سے پہلے سمار ملوک نے رشا ملوک سے کہنے تھے۔ اس کے بعد چاند کے پیالے میں بھرا وہ مشروب رشا ملوک کو پلا دیا جانا تھا۔
تب سمار ملوک نے عروہ کو اشارہ کیا۔ اشارہ پا کر عروہ نے میز پر رکھا چاندی کا پیالہ اٹھایا اور اپنے شوہر کے برابر آ کر کھڑی ہو گئی۔ رشا ملوک سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اور سر جھکا ہوا تھا۔
تب رشا ملوک کا باپ سمار ملوک گویا ہوا۔
"اے رشا ملوک...... اب وقت رخصت ہے تو اچھی طرح جانتی ہے کہ ہماری حالت کیا ہوگی۔ ہمارے دل پر کیا گزرتی ہو گی۔ تیری ماں اور میں نے یہ سب اس لئے قبول کرلیا کہ تیری خوشی اسی میں تھی۔ ہم تیری خوشی پر قربان ہو گئے ہم نے تیری خوشی کو احترام بخشا۔ ساحل عمر تیرا خواب تھا۔ اس خواب کو تو نے حقیقت کرلیا۔ وہ حقیقت کا روپ دھار کر تیرے سامنے آ گیا۔ تو نے اسے اپنے لئے منتخب کرلیا۔ تیرا انتخاب لاجواب ہے لیکن تو جانتی ہے کہ وہ کون ہے......؟ کہاں سے آیا ہے۔ خیر جب تو نے اسے اہم جانا تو وہ ہمارے لئے بھی قابل احترام ہوا' ویسے بھی وہ اس بستی کا نجات دہندہ ہے۔ اس بستی کا محسن ہے۔ اے رشا ملوک' اب تو جان لے کہ تجھے ساحل عمر کی دنیا میں جانا ہے۔ تیرے پاس کتنا وقت ہے تو جانتی ہے یہ بات بھی تو اچھی طرح جانتی ہے کہ تیرے لئے یہ وقت' وقت کے خالق سے لیا گیا ہے اور یہ کام بابا صاعق نے کیا ہے۔ جب وقت پتھر ہونے لگے تو سمجھ لینا کہ اب تیرا وقت پورا ہوا' پھر تو جانتی ہے کہ تجھے کیا کرنا ہوگا۔ تو جانتی ہے ناں۔"
"ہاں بابا...... جانتی ہوں' اچھی طرح جانتی ہوں۔" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''بس پھر رشا ملوک ...... تو ہم سے رخصت ہو۔ وقت تیرا حامی و ناصر ہو۔'' سمار ملوک نے چاندی کا پیالہ اپنی بیوی عروہ سے لے لیا اور اسے رشا ملوک کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لے یہ پی لے...... الوداع اے رشا ملوک۔''

''الوداع...... میرے باپ۔'' رشا ملوک نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سمار ملوک کو دیکھا۔

''الوداع...... میری ماں۔'' اس کے آنسو اب آنکھوں میں ٹھہر نہ سکے۔ روتے روتے اس نے وہ مشروب پیا اور پھر اٹھ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

بازغر نے رات ہی کو آگاہ کر دیا تھا کہ کل صبح ہی صبح آپ کا سفر شروع ہو جائے گا۔ ساحل عمر تیار ہو کر بیٹھا تھا اور بازغر کا انتظار کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''کون ہے آ جاؤ۔''

جب دروازہ کھلا تو اسے دروازے پر عروہ نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چاندی کا ایک پیالہ تھا۔ عروہ کے پیچھے سمار ملوک تھا۔ اور سمار ملوک کے بعد بازغر نظر آیا۔

ساحل عمر عروہ کو دیکھ کر فوراً احتراماً کھڑا ہو گیا۔ سمار ملوک نے نزدیک آ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ساحل عمر کرسی پر دوبارہ بیٹھ گیا۔ سمار ملوک اور عروہ برابر برابر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے جبکہ بازغر ان دونوں کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

''اے ساحل عمر...... تمہارے جانے کی تیاریاں مکمل ہیں۔ رشا ملوک تمہاری منتظر ہے۔ مجھے تم سے زیادہ کچھ نہیں کہنا بس اتنا کہوں گا کہ رشا ملوک کا خیال رکھنا...... وہ دور دیس جا رہی ہے اور وہاں تمہارے سوا اس کا کوئی اور نہیں۔ اس بستی کا بچہ بچہ تمہارا احسان مند ہے۔ یہاں کے لوگ تمہیں کبھی نہ بھول پائیں گے۔ ہمارا تو ذکر ہی کیا' تم تو ہمارے دل میں بس گئے ہو اور ہمیشہ بسے رہو گے۔'' پھر سمار ملوک عروہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''لاؤ' یہ پیالہ مجھے دو۔''

عروہ نے مشروب سے بھرا پیالہ سمار ملوک کے ہاتھ میں دے دیا اور رخصتی نگاہوں سے ساحل عمر کو دیکھنے لگی۔

''لو ساحل عمر' یہ مشروب پی لو اور ہم سے رخصت ہو جاؤ۔ وقت تمہاری نگہبانی کرے۔''

ساحل عمر نے ہاتھ بڑھا کر وہ پیالہ سمار ملوک سے لے لیا اور پیالے میں بھرے مشروب کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ سرخ رنگ کا نہایت خوشبودار مشروب تھا۔ اس نے خاموشی سے اس پیالے کو ہونٹوں سے لگا لیا اور پھر تیزی سے مشروب اپنے حلق سے اتارنے لگا۔

''الوداع اے ساحل عمر...... الوداع!'' سمار ملوک نے بڑے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

ساحل عمر نے اس الوداع کا جواب دینا چاہا لیکن وہ باوجود کوشش کے کچھ بول نہ سکا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ چند لمحوں بعد وہ اپنے ہوش سے بیگانہ ہو گیا اور اس سے پہلے کہ وہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر گرتا بازغر نے بہت تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

پھر بازغر نے اسکے بازو میں اپنی گردن ڈال کر اسے کرسی سے اٹھالیا۔ سار ملوک آگے بڑھا۔ دونوں نے مل کر اسے بآسانی بستر پر لٹا دیا۔ ساحل عراب مکمل بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

پھر جب ساحل عمر کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک خیمے میں پایا۔ اس نے اچھی طرح آنکھیں کھول کر خیمے کا جائزہ لیا۔ یہ وہی خیمہ تھا جس میں جھیل سیف الملوک کے کنارے اس نے رات گزاری تھی۔ خوبصورت چاندنی رات، جھیل پر رشا ملوک کی آمد...... اسے سب کچھ یاد آگیا۔

اس رات جب وہ چاندنی رات میں ٹہل ٹہل کر تھک گیا اور چاندنی بے نور ہونے لگی تو وہ خیمے میں آکر لیٹ گیا تھا۔ دو کمبل اوڑھ کر جب اس نے آسودگی سے پاؤں پھیلائے تو پھر نیند نے اسے آغوش میں لینے دیر نہ کی۔

اس وقت وہ اسی خیمے مین تھا۔ اس نے دو کمبل اوڑھے ہوئے تھے اور اسی طرح لیٹا تھا جس طرح وہ سونے سے پہلے لیٹا تھا۔

یہ کیا ہوا؟

اس کے دل میں سناٹا اترنے لگا۔

کیا اس نے یہ سب خواب میں دیکھا ہے۔ اتنا حسین اور طویل خواب۔ اس کی تو رشا ملوک سے شادی ہو گئی تھی۔ پھر وہ کہاں گئی۔ کیا ان لوگوں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ یہ شادی فراڈ تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

پھر اس نے اپنے اوپر سے کمبل اتار پھینکا۔ اپنے لباس پر نظر ڈالی یہ تو وہی لباس تھا جو اس نے شادی کی رات پہنا تھا۔ اگر یہ سب خواب تھا تو پھر لیٹے لیٹے لباس کس رح تبدیل ہو گیا۔ تب اس کی نظر گلے میں پڑی اس انگوٹھی پر پڑی جو سار ملوک نے شادی کی رات اسے بخشی تھی۔ اس نے تو اسے اپنی خاندانی تلوار بھی دی جسے وہ مقدس تلوار کہتا تھا اور اس تلوار سے اس نے راعین کا خاتمہ کیا تھا۔

تب اسے فوراً ہی تلوار کا دستہ نظر آیا۔ اس نے کمبل ہٹایا۔ تلوار بستر پر اس کے پہلو میں موجود تھی۔ اب اس نے سوچا کہ تلوار موجود ہے۔ گلے میں انگوٹھی پڑی ہے، جسم پر شادی والا لباس موجود ہے۔ تو پھر یہ خواب نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ خواب نہیں ہے تو پھر رشا ملوک کہاں ہے۔

کیا سار ملوک نے رشا کو روک کر اسے دھکا دلوا دیا۔ اسے خیمے میں لا ڈالا گیا لیکن یہ تو بدعہدی ہے۔ وہ لوگ ایسے نہ تھے۔ اسے خیمے سے باہر نکل کر دیکھنا چاہئے کہ باہر کیا جگہ ہے۔ اس کا خیمہ کہاں نصب ہے۔

اس خیال کے آتے ہی وہ گھٹنوں کے بل چلتا خیمے کے پردے کے نزدیک آگیا۔ اس نے جوتے پہن کر خیمے کی ڈوریاں کھولیں اور پھر تیزی سے باہر آگیا۔

یہ وہی مقام تھا جہاں اس نے رات گزاری تھی۔ اب صبح ہو رہی تھی۔ جھیل پر اب بھی سناٹا تھا۔

پھر جب اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا تو اپنے خیمے کے پیچھے ایک اور خیمے کو

پایا۔ اس کا اپنا خیمہ سرخ رنگ کا تھا جبکہ اس کے پیچھے والا خیمہ سبز رنگ کا تھا۔
اس خیمے میں کون ہے؟ اس کے دل میں خوشی سی جاگی۔ وہ دوڑ کر اپنے خیمے کے پیچھے گیا۔
اس نے جلدی جلدی خیمے کی ڈوریاں کھولیں اور پھر فوڑا ہی پردے کے دونوں پٹ الٹ دیئے۔
سامنے جو کچھ تھا اسے دیکھ کر ساحل عمر حیران رہ گیا۔

☆......☆......☆

حیرت سے زیادہ اسے خوشی ہوئی۔ خوشی کیوں نہ ہوتی سامنے رشا ملوک جو بیٹھی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر بے اختیار مسکرائی اور گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہوا؟''
''کچھ نہیں ہوا...... اگر تم نہ ملتیں تو پھر ضرور کچھ ہو جاتا۔'' وہ گردن ہلا کر بولا۔
''کیا ہو جاتا؟'' وہ خیمے سے باہر نکلتے ہوئے بولی
''میں پاگل ہو جاتا۔'' ساحل عمر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔
''واقعی...... آپ میرے لئے پاگل ہو جاتے۔'' رشا ملوک خوشگوار حیرت سے بولی۔ جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔
''ہاں واقعی...... اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے۔''
''اتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے۔'' اس نے جیسے تصدیق چاہی۔
''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' اس نے کہا۔
''ہاں' کیوں نہیں...... یہ پوچھنے کی بات بھی ہے اور کہنے کی بات بھی ہے۔''
''گویا میں یہ کہوں کہ مجھے تم سے پیار ہے۔''
''ہاں کہیں...... ایسا سننا اچھا لگتا ہے۔''
''اور کہنا؟'' اس نے پوچھا۔
''کہنے سے زیادہ سننا اچھا لگتا ہے۔'' اسکی آنکھوں میں شرم اترنے لگی۔ اس کی آنکھیں جھکنے لگیں۔
''اور اگر سامنے والا بھی یہی چاہے۔''
''تو میں اسے ایسا سناؤں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔''
اس کے لہجے میں شرارت تھی۔
''اچھا۔'' ساحل عمر اس کی ذومعنی بات سن کر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔
وہ باتیں کرتے جھیل کے کنارے آ گئے۔
صبح ہو رہی تھی۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ پہاڑوں پر بادل دھویں کی صورت نظر آ رہے تھے۔ چاند ماند پڑ چکا تھا۔ مشرق سے اجالا پھوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی اور تازہ ہوا۔ ہوا کے زور پر لہریں لیتا جھیل کا پانی۔ اس وقت ایسا حسین منظر تھا۔ ایسا دلکش سماں تھا کہ ساحل عمر کے دل پر سکون کی شبنم سی گرنے لگی تھی۔
''اے رشا ملوک ذرا یہ بتاؤ کہ یہ جھیل کتنی گہری ہے؟'' ساحل عمر نے سوال کیا۔

"مجھے کیا معلوم۔"

"تمہاری آنکھوں جتنی گہری تو ہوگی۔" وہ یہ کہہ کر مسکرایا۔

"مجھے کیا پتہ؟"

"تمہیں نہیں معلوم...... حیرت ہے۔ کیا تم اس رات جھیل میں نہائی نہیں تھیں۔"

"کیا آپ نے دیکھا تھا۔" وہ چونک کر بولی۔

"ضرور دیکھتا' لیکن تمہاری سہیلیوں نے اتنا ڈرایا تھا کہ اندھا ہونے کی ہمت نہ کر پایا۔"

"بہت اچھا کیا ورنہ تمہاری آنکھوں کو نقصان پہنچ جاتا۔"

"رشا ملوک...... ایک بات بتاؤ...... تمہاری بستی کہاں ہے؟" ساحل عمر نے پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا ان پہاڑوں کے پیچھے؟"

"میں نہیں جانتی کہ میری بستی کہاں ہے؟" وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔

"اب اگر ہم وہاں جانا چاہیں تو کیا نہیں جاسکتے؟" ساحل عمر نے سوال کیا۔

"نہیں...... ہرگز نہیں۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

"کیوں آخر؟" سوال ہوا۔

"میری بستی گم ہوگئی۔ میرا اس سے رابطہ منقطع ہوگیا...... وہ ماضی کا حصہ بن گئی۔"

"میں تمہاری بستی میں زیادہ دن نہیں رہا...... لیکن جتنے دن بھی رہا' وہاں کی یادیں میرے دل پر نقش ہیں۔ میں تمہارے والدین کو' تمہاری سہیلی مویا کو' بابا صاعق اور بازغر کو...... کسی کو نہیں بھول سکوں گا۔ بہت اچھے لوگ تھے۔ بہت پیارے لوگ تھے۔"

"وہ بستی بادل تھی اور وہ لوگ پانی تھے۔ بارش برس چکی۔ بادل چھٹ چکے۔ اب آسمان پر کچھ نہیں۔ سب وقت کی دھند میں گم ہو گئے۔" وہ بہت سنجیدگی سے بول رہی تھی۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ پھر اس نے ساحل عمر کی طرف دیکھا اور اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ "اب میں آپ کی دنیا میں ہوں اور آپ جیسی ہوں۔"

"آؤ' پھر سامان سمیٹو...... چلو یہاں سے...... تمہاری دنیا' تمہارا گھر تمہیں آواز دے رہا ہے۔"

"ہاں چلیں۔" رشا ملوک نے خوشی بھرے لہجے میں کہا۔

☆......☆......☆

جھیل سیف الملوک سے انہوں نے ناران تک سفر کیا۔ ایک رات ناران میں رہے۔ دوسرے دن کاغان پہنچے۔ ایک رات وہاں قیام کیا۔ پھر راستے میں جو قابل دید مقامات آتے گئے' ان کی سیر کرتے ہوئے مری کا رخ کیا۔ ناران اور جھیل سیف الملوک دیکھنے کے بعد مری آنکھوں میں بالکل نہ جچی۔ یوں لگا جیسے کسی سرسبز وادی سے نکل کر اجاڑ جگہ پر آگئے ہوں۔ وہاں ایک رات سے زیادہ قیام نہ کیا اور دوسرے دن مری سے اسلام آباد پہنچے پورا دن گھوم پھر کر رات پنڈی کے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور دوسرے دن ٹرین میں سوار ہو کر کراچی کی طرف روانہ ہو گئے۔

جوں جوں کراچی نزدیک آتا جا رہا تھا ساحل عمر کا دل جوش اور ولولے سے بھرتا جا رہا تھا۔ اپنے شہر سے نکلے ہوئے اسے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔

جانے اماں کا کیا حال ہوگا۔ وہ اس کی شدت سے منتظر ہوں گی۔ واپسی کے سفر میں اس نے کئی بار سوچا بھی کہ گھر فون کر کے اماں کو مطلع کر دے کہ وہ کراچی پہنچ رہا ہے لیکن پھر کچھ سوچ کر رہ جاتا۔ اچانک پہنچنے میں جو بات ہے وہ مطلع کر کے پہنچنے میں کہاں؟

اماں کے لیے تو وہ دہری خوشی لے کر جا رہا تھا۔ ایک تو وہ خود جا رہا تھا۔ دوسرے اپنے ساتھ ایک ایسی ہستی کو لے جا رہا تھا جس کی آس میں وہ زندگی کی سانسیں گن رہی تھیں۔ وہ رشا ملوک کو دلہن کے روپ میں دیکھیں گی تو کس قدر خوش ہوں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خوشی سے مر ہی جائیں۔

ساحل عمر انہیں خوش تو دیکھنا چاہتا تھا لیکن مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اماں رشا ملوک کے ساتھ ایک طویل عرصے تک رہیں۔

بالآخر ٹرین دھیمی ہونے لگی۔ کراچی آ گیا تھا۔ ساحل عمر جلدی سے برتھ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تیزی سے سامان سمیٹنے لگا۔ رشا ملوک اسے حیرت سے دیکھنے لگی تو وہ بولا۔ ''رشا ملوک شہر آ گیا۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ خوشی تھی۔

''اچھا۔'' یہ سن کر وہ بھی خوش ہو گئی۔

گاڑی کے پلیٹ فارم پر رکتے ہی دھڑا دھڑ قلی اندر آنے لگے۔ ساحل عمر کے پاس زیادہ سامان نہ تھا لیکن اتنا کم بھی نہ تھا کہ وہ خود اٹھا کر اسٹیشن سے باہر نکل آتا۔ راستے میں اس نے خاصی شاپنگ کی تھی۔ اسکے پاس دو بڑے سوٹ کیس تھے اور ایک بڑا بیگ تھا۔

اس نے ایک قلی کر لیا۔ قلی سامان اٹھا کر چلنے لگا تو ساحل عمر رشا ملوک کا ہاتھ پکڑ کر ڈبے سے نکل آیا۔ پہلے وہ خود پلیٹ فارم پر اترا' پھر اس نے سہارا دے کر رشا ملوک کو نیچے اتار لیا۔ پھر وہ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

جب وہ کراچی کینٹ کے گیٹ کی سیڑھیاں اتر رہے تھے تو سامنے ذرا فاصلے پر واسم ایک ٹیکسی میں ابھی ابھی سوار ہوا تھا۔ ٹیکسی چلنے ہی والی تھی کہ اچانک اس کی نظر ساحل عمر پر پڑی۔ وہ بری طرح چونک گیا۔ اس کے جسم میں زبردست بجلی کا سا جھٹکا لگا۔ اس نے ٹیکسی والے کا ہاتھ پکڑ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

اس کی نظریں سامنے جمی ہوئی تھیں۔ وہ بہت غور سے ساحل عمر کو دیکھ رہا تھا۔ ساحل عمر اکیلا نہ تھا اس کے ساتھ ایک بے حد حسین لڑکی بھی تھی۔ صاف پتہ لگ رہا تھا کہ وہ ساحل عمر کی بیوی ہے۔ اس نے شادی کر لی تھی اور اس وقت شاید وہ ہنی مون منا کر واپس آ رہے تھے۔ ساحل عمر کو دیکھ کر واسم جیسے جی اٹھا تھا۔ اس کا رواں رواں خوشی سے سرشار تھا۔ آج صبح ہی صبح اس کے ہاتھ زبردست خبر لگ گئی تھی۔ وہ برکھا کو یہ خبر سنا کر اسے خوش کر دے گا۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھا' اس وقت تک ساحل عمر اور رشا ملوک کو دیکھتا رہا جب تک وہ ٹیکسی میں

پنچ کر اس کے سامنے سے گزر نہیں گئے۔
ان کے جانے کے بعد واسم اپنے ٹیکسی والے سے بولا۔ "چلو استاد۔"
"صاحب جی...... کیا اس ٹیکسی کے پیچھے جانا ہے۔" ٹیکسی والے نے واسم کو مسکرا کر دیکھا۔
"اوہ...... بڑے استاد ہو...... تم نے اندازہ لگا لیا کہ میں نے تمہیں کیوں روکا۔" واسم نے کہا۔
"سر جی! ہم بھی اسی شہر میں رہتے ہیں۔ دن رات ہر طرح کے بندوں سے واسطہ پڑتا ہے۔" وہ بڑے فخریہ انداز میں بولا۔
"اچھا اب جلدی نکلو تم یہاں سے...... گارڈن ایسٹ چلو۔"
"سر جی! ابھی تو آپ رام سوامی جا رہے تھے۔"
"اب نہیں جا رہا۔" واسم نے بات ختم کرنے کے انداز میں اس کی طرف فیصلہ کن نگاہوں سے دیکھا۔
"ٹھیک ہے...... جیسی آپ کی مرضی...... ہمارے لئے دونوں جگہ ایک سی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی اور پھر انگلش گانوں کا کیسٹ لگا کر مزے سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔
وہ ٹیکسی والا اپنے حلیے، اپنے چہرے مہرے سے قطعاً پڑھا لکھا نہ لگتا تھا لیکن گانے وہ انگلش سن رہا تھا۔ واسم کی سمجھ میں یہ راز نہ آیا۔ اس نے سوچا۔ اس سے پوچھے کہ کیا وہ اس گانے کے بول سمجھ رہا ہے۔ پھر وہ یہ سوچ کر سوال کرنے سے باز رہا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ جو مرضی آئے سنے، وہ اس پر اعتراض کرنے والا کون؟
برکھا کے بنگلے پر گاڑی رکوا کر اس نے کرایہ کی ادائیگی کی تو ٹیکسی والے نے پیسے لے کر کھڑکی سے باہر منہ نکالا اور بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "سر جی! آپ کو یہ کیسٹ کیسا لگا۔"
"یار! میں انگلش تھوڑی بہت جانتا ہوں...... یہ انگلش گانے تو میری بالکل سمجھ میں نہیں آتے۔"
"تو سر جی مجھے کون سی انگریزی آتی ہے۔ مجھے ان گانوں کا میوزک پسند ہے...... بس اس لئے سنتا ہوں۔" وہ ہنس کر بولا۔ پھر اس نے اپنی گردن اندر کی۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔
واسم اس کی گاڑی کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ عجیب شخص تھا۔
پھر وہ برکھا کے بنگلے کی طرف متوجہ ہوا۔ گیٹ حسب معمول بند تھا۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور دھوپ میں زیادہ تیزی نہ تھی۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا۔ واسم نے گیٹ کے نزدیک پہنچ کر اس کے درمیانی خلا سے اندر دیکھا، جہاں تک وہ دیکھ سکتا تھا، وہاں تک اسے کوئی نظر نہ آیا۔

تب اس نے کال بیل کے بٹن پر ہاتھ رکھا۔ اسے تین مرتبہ وقفے وقفے سے بجایا۔
برکھا اپنے بیڈ پر براجمان تھی اور کسی سے ٹیلی فون پر محو گفتگو تھی۔ گھنٹی کی آواز سن کر اس نے ٹیلی فون ہولڈ کرایا اور پھر گیٹ کی طرف جانے کی بجائے ورشا کے کمرے کی طرف گئی۔ ورشا کے

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ آرام سے لیٹی رسالہ پڑھ رہی تھی۔

''ورشا...... ذرا دیکھو گیٹ پر کون ہے؟'' وہ دروازے پر کھڑے ہو کر بولی۔ ''میں ٹیلی فون پر بات کر رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے ممی...... آپ بات کیجئے۔ میں دیکھتی ہوں۔'' یہ کہہ کر ورشا فوراً کھڑی ہو گئی۔

ابھی ورشا گیٹ کے نزدیک نہ پہنچی تھی کہ ایک مرتبہ پھر بیل بجی۔ اس نے جلدی جلدی قدم بڑھائے اور پھر گیٹ کے نزدیک پہنچ کر گیٹ کے درمیانی خلاء سے باہر جھانکا۔ سامنے ہی واسم کھڑا تھا۔

ورشا نے واسم کو دیکھ کر فوراً ہی گیٹ کھول دیا۔ گیٹ پر ورشا کو دیکھ کر اس نے ادب سے سلام کیا اور پھر پوچھا۔ ''برکھا جی ہیں؟''

''ہاں ہیں...... اپنے کمرے میں ہیں۔'' ورشا نے گیٹ بند کرتے ہوئے کہا۔

''کیا میں وہاں چلا جاؤں۔''

''ہاں چلے جاؤ...... وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں...... اب کر چکی ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر واسم برکھا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور ورشا اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

واسم نے برکھا کے کمرے میں قدم رکھا تو وہ اس وقت ریسیور رکھ چکی تھی۔ واسم کو دیکھ کر چونکی۔ اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ واسم کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔

''واسم تو بہت خوش نظر آ رہا ہے...... خیر تو ہے۔'' برکھا نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''برکھا جی بالکل خیر ہے...... میں آپ کے لئے ایک زبردست خبر لے کر آیا ہوں۔''

''خبر سنا...... خبر سنائے گا تو پتہ چلے گا کہ کیسی خبر ہے۔''

''برکھا جی...... ایسی خبر ہے کہ آپ سن کر مجھے انعام دیئے بنا نہ رہیں گی۔''

''اچھا خبر سنا...... کہیں ایسا نہ ہو کہ الٹا تجھ کو جرمانہ پڑ جائے۔'' برکھا نے ہنس کر کہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' برکھا جی۔'' وہ بڑے یقین سے بولا۔ ''میں [illegible]ں وقت کینٹ اسٹیشن سے آ رہا ہوں۔

ایک دوست کے لئے سیٹ ریزرو کروانے گیا تھا۔ جب میں واپسی کے لئے ٹیکسی میں بیٹھ چکا اور ٹیکسی چلنے ہی والی تھی کہ میری ان پر نظر پڑ گئی۔ برکھا جی بس چند لمحوں کا فرق تھا۔ اگر میری ٹیکسی آگے بڑھ گئی ہوتی تو میں کتنی بڑی خبر سے محروم ہو جاتا...... جانتی ہیں برکھا جی' میں نے اسٹیشن پر کس کو دیکھا؟''

''واسم بس اب بہت ہو گئی...... اب تو راہ راست پر آ جا...... سیدھی طرح خبر سنا...... کون تھا وہ؟''

''ساحل عمر۔'' واسم نے بڑی آہستگی سے اس کا نام لیا۔
''کون......؟ کیا کہا۔'' برکھا کے جسم میں جیسے بجلی سے بھر گئی۔ وہ بستر پر فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ''واسم تو نے کس کو دیکھا؟''
''ساحل عمر صاحب کو۔'' واسم نے پر زور لہجے میں ساحل کا نام دہرایا۔
تب برکھا بیڈ سے اتر کر اس کے نزدیک آ گئی اور اپنے زور زور سے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''واسم کیا تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تجھے کوئی دھوکا تو نہیں ہوا؟''
''نہیں...... برکھا جی...... میری آنکھوں نے جو دیکھا' وہ صحیح دیکھا...... وہ ساحل عمر ہی تھے اور وہ اکیلے نہ تھے۔''
''کون تھا...... اس کے ساتھ؟''
''ان کے ساتھ ایک بے حد حسین لڑکی تھی جیسے کوئی ابلا پری...... جس انداز سے وہ ان کے ساتھ چل رہی تھی' اس سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ان کی بیوی ہے۔''
''اوہ......ساحل عمر نے شادی کر لی۔'' برکھا پر جیسے بجلی گر پڑی۔ ''واسم یہ تو بہت برا ہوا۔ جتنی خوشی ساحل عمر کی آمد کی خبر سن کر ہوئی تھی' اتنی ہی تکلیف اس کی شادی کی خبر سن کر ہوئی ہے۔ واسم تو نہیں جانتا کہ یہ کتنی بری خبر ہے۔ اس خبر نے میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔''
''برکھا جی' یہ تو بہت برا ہوا۔'' واسم کا منہ لٹک گیا۔
''اس میں تیرا کیا دوش...... اچھا بتا کیا تیری ورشا سے کوئی بات ہوئی؟''
''نہی برکھا جی...... میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔''
''بس پھر اب تو جا...... اور میری کال کا انتظار کر......''
''ٹھیک ہے' برکھا جی...... میں جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور بوجھل قدموں سے دروازے سے نکل گیا۔
اسکے جانے کے بعد بھی وہ گم صم کھڑی رہی۔ اس خبر نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے سوچا ممکن ہے یہ خبر غلط ہو...... یہ ضروری تو نہیں کہ اس کے ساتھ آنے والی لڑکی اس کی بیوی ہی ہو' یہ اچانک وہ شادی کہاں سے کر لایا۔ پھر وہ ورشا کے کمرے کی طرف چل دی اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

☆......☆......☆

ساحل عمر نے اپنے گھر کے سامنے پہنچ کر ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی سے اترتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی۔ وہ رشا ملوک سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آؤ' رشا ملوک اترو' تمہارا گھر آ گیا۔''
''آ گیا...... میرا گھر۔'' وہ بے اختیار خوش ہو کر بولی اور پھر فوراً ہی ٹیکسی سے اتر آئی۔
ساحل عمر نے ٹیکسی سے سامان اتار کر گیٹ پر رکھا۔ ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے ٹیکسی والے کا شکریہ ادا کیا۔

ٹیکسی کے اسٹارٹ ہوتے ہی اس نے کال بیل کے بٹن کو اپنے مخصوص انداز میں دبایا اور ذرا سا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ گھر میں مرجینا موجود تھی۔ وہ اس وقت کچن کی صفائی میں مصروف تھی۔ گھر کی گھنٹی ایک مخصوص انداز میں بجتے سن کر وہ ایک دم چونک اٹھی۔ برتن چھوڑ کر اس نے فوراً اپنے ہاتھ دھوئے اور دوپٹے سے پونچھتی گھر سے باہر نکل آئی۔ اتنی دیر میں گھنٹی ایک بار اور بج اٹھی۔ مرجینا دوڑتی ہوئی گیٹ تک پہنچی۔

اس نے جلدی جلدی گیٹ کھولا اور پھر وہ گیٹ پر ساحل کو کھڑا دیکھ کر مسرت سے چیخ اٹھی۔ ساحل عمر اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"صاحب جی آپ؟"

"ہاں میں۔" ساحل عمر نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر وہ مڑ کر رشا ملوک سے مخاطب ہوا۔ "رشا ملوک یہ مرجینا ہے۔ میں تمہیں اسکے بارے میں بتا چکا ہوں۔ اس نے ہمارا گھر سنبھالا ہوا ہے۔"

رشا ملوک نے بڑی دلچسپی سے مرجینا کو دیکھا اور اسے دیکھ کر نرمی سے مسکرائی۔

اب مرجینا نے رشا ملوک کی طرف توجہ کی اور جھجکتے ہوئے انگلی سے اشارہ کر کے بولی۔

"صاحب جی' یہ......"

"مرجینا پہچانو...... یہ کون ہیں؟"

"میں نے پہچان لیا۔"

"پہچان لیا تو اچھا کیا...... ہمیں اندر آنے کا راستہ تو دو۔" ساحل عمر گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے سامان اٹھا کر گیٹ کے اندر رکھا۔ مرجینا نے گیٹ اندر سے بند کر دیا اور ساحل عمر سے مخاطب ہو کر بولی۔ "صاحب جی آپ اندر چلیں' میں سامان اٹھا کر لاتی ہوں۔"

نہیں' تم ہمارے ساتھ آؤ' سامان یہیں رہنے دو۔ خاصا وزنی ہے۔ میں آ کر لے جاؤں گا۔ اچھا یہ بتاؤ اماں کہاں ہیں؟" ساحل عمر نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا انہوں نے میری گھنٹی کی آواز نہیں سنی۔"

"نہیں صاحب جی...... وہ سو رہی ہیں۔ جب سے آپ گئے ہیں ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ خاصی دبلی ہو گئی ہیں۔ آج بھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر سو گئیں۔" مرجینا نے بتایا۔

"کوئی بات نہیں...... اب میں آ گیا ہوں۔ ان کی طبیعت منٹوں میں ٹھیک کر دوں گا۔" ساحل نے چٹکی بجا کر کہا۔ "اچھا مرجینا' یہ تو بتاؤ' یہ کون ہیں؟"

"بتاؤں صاحب جی......؟ یہ ہماری مالکن ہیں۔" مرجینا نے رشا ملوک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اللہ کتنی پیاری ہیں۔" پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ "ارے' یہ یہ تو تصویر والی ہیں۔"

"تصویر والی؟" ساحل عمر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"آپ نے ان کی تصویر نہیں بنائی تھی کیا......؟ صاحب جی وہ تصویر جو آپ کے بیڈ روم میں لگی ہوئی تھی۔" مرجینا نے بتایا۔

"ہاں مرجینا...... تم نے ٹھیک پہچانا...... میں وہی ہوں۔" ساحل عمر کی بجائے رشا ملوک نے جواب دیا۔

"اوہ...... کتنی اچھی آواز ہے ہماری مالکن کی۔"

مرجینا خوش ہو کر بولی۔

"اچھا مرجینا تم انہیں میرے کمرے میں لے کر چلو۔ انہیں دلہن بنا کر بیڈ پر بٹھاؤ۔ میں اماں کو اٹھا کر لاتا ہوں۔" ساحل عمر گھر میں داخل ہو کر بولا۔

"جی صاحب...... ٹھیک ہے۔" مرجینا نے رشا ملوک کو فوراً دلہنوں کی طرح تھام لیا اور دھیرے دھیرے بیڈ روم کی طرف بڑھی۔

ساحل عمر نے اماں کے کمرے کی طرف رخ کیا۔

اماں کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا' اماں بیڈ پر ایک ہلکا سا کمبل اوڑھے لیٹی تھیں۔ ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ مرجینا نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ واقعی دبلی ہو گئی تھیں۔ ان کا چہرہ ذرا سا نکل آیا تھا۔ وہ چند لمحوں تک اماں کا چہرہ غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دھیرے سے ان کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ جما دیا۔ تب اماں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر ہٹانے کے لئے زور لگایا۔ پھر اچانک ہی انہیں احساس ہوا کہ یہ تو ساحل عمر کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس کی ہاتھ پر اپنا ہاتھ پھیرا اور گلو گیر آواز میں بولیں۔ "میرے بچے میرے ساحل۔"

ساحل عمر نے فوراً اپنا ہاتھ ان کی آنکھوں سے ہٹا لیا اور ان کے پاس ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ اماں اسے دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئیں جیسے تن مردہ میں جان پڑ گئی ہو۔ انہوں نے اسے لپٹا لیا اور رو پڑیں۔ "میرے ساحل تم کہاں چلے گئے تھے۔"

"اماں' رونے کی نہیں ہو رہی ہے۔" ساحل عمر نے ان کی آنکھوں کے آنسو اپنی انگلی سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے لئے زبردست خوشخبری لے کر آیا ہوں۔"

"ہیں جلدی بتاؤ ا" اماں کے چہرے پر ایک دم رونق آ گئی۔

"بتاؤں نہیں دکھاؤں۔" ساحل عمر اٹھتا ہوا بولا۔ "آیئے' میرے کمرے میں چلیں۔"

ساحل عمر نے اماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر وہ دھیرے دھیرے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ اتنی دیر میں مرجینا' رشا ملوک کو بیڈ پر بٹھا کر دوپٹہ اڑھا چکی تھی۔ اس نے رشا ملوک کا چہرہ گھونگھٹ میں چھپا دیا تھا۔

ساحل عمر اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رکا۔ دروازے پر مرجینا کھڑی تھی۔ اس نے اماں کو دیکھ کر خوشی سے نعرہ لگایا۔ "اماں جی' آپ کو مبارک ہو۔" یہ کہہ کر وہ سامنے سے ہٹ گئی۔

اب ان کی نظر بیڈ پر پڑی۔ انہوں نے بیڈ پر کسی کو گھونگھٹ نکالے بیٹھے دیکھا۔ یہ منظر دیکھنے کے لئے تو وہ ایک عرصے سے آرزو مند تھیں۔ وہ ساحل عمر سے ہاتھ چھڑا کر بیڈ کی طرف لپکیں اور پھر

بیڈ پر بیٹھ کر رشا ملوک کا گھونگٹ الٹنے لگیں۔ پھر وہ گھونگٹ الٹتے الٹتے رک گئیں۔

''ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئیں۔ پھر وہ فوراً ہی واپس آئیں۔ تو ان کی آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا اور ہاتھ میں زیور کا ایک ڈبہ تھا۔

اماں نے دوبارہ بیڈ پر بیٹھ کر رشا ملوک کا گھونگٹ اٹھایا اور دھیرے دھیرے الٹ دیا۔ وہ اس کی شکل دیکھتے ہی ''سبحان اللہ'' پکار اٹھیں۔

پھر جب انہوں نے اس کے چہرے پر غور کیا تو ایک دم پکار اٹھی.. ''ارے یہ تو تصویر والی دلہن ہے۔''

رشا ملوک نے آنکھیں کھول کر اماں کو دیکھا۔ پھر بڑی مترنم آواز میں بولی۔ ''ہاں اماں میں وہی ہوں۔''

''ماشاءاللہ' خوب ہو...... اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے۔'' اماں نہال ہوتے ہوئے بولیں۔

انہوں نے جانے کب سے ایک سونے کا سیٹ بنوا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ سیٹ انہوں نے بڑے چاؤ سے ساحل عمر کی دلہن کو پہنا دیا اور پھر چٹ چٹ اس کی بلائیں لیں۔

اور جب یہ اطلاع ناصر مرزا اور مسعود آفاقی تک پہنچی تو وہ دونوں بے قرار ہو کر اسی وقت اس کے گھر پہنچ گئے۔ وہ دونوں سخت غصے میں تھے۔

ایک تو غصہ یہ تھا کہ وہ ایسا غائب ہوا کہ اس نے پلٹ کر اپنے بارے میں اطلاع بھی نہیں دی کہ کہاں ہے۔ بس ایک فون اماں کو کیا اور بس...... دوسرے خاموشی سے دلہن لے آیا۔ کسی کو کانوں کان ہوا بھی نہ لگنے دی۔ ان دونوں کو غصہ کرتے دیکھ کر اماں بھی ان کی ہم نوا بن گئیں۔

''ہاں' بھیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

پھر جب ساحل عمر نے ان دونوں کو گھر سے نکل کر گھر واپس آنے تک کی روداد تو سنائی تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا...... لیکن شادی کے معاملات سے دستبردار ہونے کے لئے وہ پھر بھی تیار نہ تھے۔ ان دونوں نے مل کر منصوبہ بنایا اور اس معاملے میں اماں نے بھرپور ساتھ دیا۔

''ہم اس شادی کو نہیں مانتے...... یہ شادی دوبارہ ہو گی۔'' مسعود آفاقی نے فیصلہ سنایا۔

''ہاں اور کیا بھیا...... ایسی شادی کا کیا فائدہ...... جس میں اپنے شریک ہی نہیں ہوئے۔'' اماں نے ان کے فیصلے سے اتفاق کیا۔

''اچھا بھائی ٹھیک ہے جیسے تم لوگوں کی مرضی۔'' بالآخر ساحل عمر نے ہتھیار ڈال دیئے۔

بس پھر کیا تھا دونوں دوستوں نے شادی کے انتظامات سنبھال لئے۔ کسی نے ہال بک کرایا' کسی نے کھانے کا انتظام کیا۔ کسی نے شادی کے جوڑے سلوائے۔ کسی نے زیورات بنوائے۔

ان دنوں اماں کی حالت تو دیکھنے والی تھی ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ہر کام میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ ادھر سے ادھر بھاگی پھرتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پھر سے جوان ہو گئی ہوں۔

ایک ہفتے کے اندر شادی ہونا طے پائی تھی۔ سارے انتظامات بہت تیزی سے جاری تھے۔

ساحل عمر کو واپس آئے تین دن ہو چکے تھے کہ اس دن عجیب واقعہ پیش آیا۔
تیسرے دن کی شام...... اس وقت ناصر مرزا اور مسعود آفاقی بھی اتفاق سے گھر پر موجود تھے۔ وہ اس سے کچھ بات کرنے آئے تھے۔ چائے چل رہی تھی کہ کسی نے کال بیل بجائی۔
بیل کی آواز سن کر مرجینا دروازے پر جانے لگی تو ساحل عمر نے اسے اشارے سے روک دیا۔ پھر وہ خود اٹھ کر گیٹ پر چلا گیا۔
گیٹ کھولا تو ساحل عمر سامنے کھڑے شخص کو دیکھتا رہ گیا۔ تہبند اور کرتہ پہنے ہاتھ میں لاٹھی لئے سرخ سفید چہرہ، لمبی سفید داڑھی، آنکھیں کھلی ہوئی مگر بے نور۔ آنکھوں کی پتلیاں نہ تھیں۔ اس کے باوجود ان کے چہرے پر اتنا نور تھا۔ ان کی شخصیت میں اتنی کشش تھی کہ آدمی انہیں دیکھتا تھا تو پھر نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔
ساحل عمر کی بھی انہیں دیکھ کر عجیب حالت ہو گئی۔ زبان گنگ ہو گئی۔
"بھائی کیا یہ ساحل عمر کا گھر ہے۔" آنے والے نے انتہائی نرم لہجے میں پوچھا۔
ان کی آواز سن کر ساحل عمر ایک دم چونک اٹھا۔ یہ آواز مانوس سی لگی لیکن فوراً اسے یاد نہ آیا کہ یہ آواز اس نے کہاں سنی ہے۔ اس نے بڑے مئودبانہ لہجے میں کہا۔ "جی یہ میرا گھر ہے۔ میں ساحل عمر ہوں۔"
"بھائی میں موسیٰ خان ہوں لوگ مجھے حافظ موسیٰ کہتے ہیں۔" انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔
ان کا نام سن کر ساحل عمر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ناصر مرزا کے توسط سے وہ حافظ موسیٰ کا خاصا ذکر سن چکا تھا۔ پھر رشا ملوک کی بستی تک اس نام نے اس کا پیچھا کیا۔ اس نام نے اسے تحفظ فراہم کیا، بابا صاعق کے ذریعے حافظ موسیٰ کا بھجوایا ہوا تعویذ ملا۔ اس تعویذ نے کہاں کہاں اس کی مدد نہیں کی۔ اس کے دل میں تعویذ چھونے کا خیال پیدا ہوتا، وہ تعویذ پکڑتا تو ایک آواز سنائی دیتی جو مسئلے کا حل بتاتی...... اوہ، ہاں، اسے یاد آیا یہ آواز تو حافظ موسیٰ کی ہی ہوتی تھی۔
ساحل عمر نے جلدی سے آگے بڑھ کر حافظ موسیٰ کے دونوں ہاتھ چوم لئے اور بڑی عقیدت سے بولا۔ "اعلیٰ حضرت آپ کی آمد میرے لئے کسی عید سے کم نہیں۔ آیئے اندر تشریف لایئے۔"
حافظ موسیٰ نے پیچھے مڑ کر کسی سے کہا۔ "اچھا بیٹا آپ جائیں...... ہم صحیح ٹھکانے پر پہنچ گئے ہیں۔"
ساحل عمر نے بڑی حیرت سے سامنے دیکھا۔ ادھر ادھر، دائیں بائیں...... سب طرف دیکھا مگر اسے وہاں آدم نہ آدم کی زاد...... کچھ نظر نہ آیا۔ پھر حافظ موسیٰ کس سے مخاطب تھے یہ بات اس کی کچھ میں نہ آئی۔
چند لمحے وہ سڑک کی جانب دیکھتے رہے جیسے نظروں نظروں میں کسی کو رخصت کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے اپنی گردن سیدھی کی اور لاٹھی بجاتے ہوئے گیٹ میں داخل ہو گئے۔
ساحل عمر نے جلدی سے گیٹ بند کیا اور آگے بڑھتے ہوئے حافظ موسیٰ کا ہاتھ تھام لیا۔
حافظ موسیٰ نے بڑی نرمی سے کہا۔ "شکریہ بھائی اس کی ضرورت نہیں...... تم بس میرے

آگے آگے چلو!" یہ کہہ کر انہوں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے اس انداز میں چلنے لگے جیسے سب دکھائی دے رہا ہو۔

ساحل عمر نے گھر کے دروازے کے نزدیک پہنچ کر دو چار تیزی سے قدم اٹھا کر جلدی سے گھر میں جانا چاہا تا کہ ناصر مرزا کو ان کی آمد کی اطلاع دے دے۔ اس کی تیزی سے قدم اٹھاتے ہی پیچھے سے آواز آئی۔

"بھائی' آخر ایسی جلدی کیا ہے...... اب ہم گھر میں تو جا ہی رہے ہیں۔"

"جی اعلیٰ حضرت...... آپ نے صحیح فرمایا۔"

"بھائی میں اعلیٰ ہوں نا ادنیٰ ہوں...... میں بس موسیٰ خان ہوں۔" انہوں نے ملائم لہجے میں کہا۔ "تم مجھے حافظ موسیٰ کہہ لو...... حافظ موسیٰ کہہ لو۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔"

"جی بہتر...... حافظ صاحب!"

جب ساحل عمران کو لئے لاؤنج میں پہنچا تو ناصر مرزا حافظ موسیٰ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا اور لپک کر ان کے نزدیک پہنچا۔

"حافظ صاحب آپ!"

"اچھا' یہاں ناصر مرزا بھی براجمان ہیں!" انہوں نے ناصر مرزا کی آواز پہچان کر کہا۔

ناصر مرزا نے ان کا لاٹھی والا ہاتھ پکڑ کر ایک صوفے پر بٹھایا اور خود قالین پر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا تو حافظ موسیٰ گویا ہوئے۔

"ناصر مرزا کیا یہاں صوفوں کی کمی ہے۔"

"نہیں...... حافظ صاحب' یہاں بیٹھنے کی بہت جگہ ہے۔" پھر وہ ان کا مطلب سمجھ کر ان کے نزدیک ہی دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مسعود آفاقی انہیں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے بارے میں اس نے ناصر مرزا کی زبانی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو وہ اسے کسی اور دنیا کی مخلوق محسوس ہوئے۔

"بھائی ہم یہاں اپنی امانت واپس لینے آئے ہیں۔" حافظ موسیٰ نے کہا۔

ان کی بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ ساحل عمر نے ناصر مرزا کو دیکھا۔ ناصر مرزا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ساحل عمر سے سوال کیا۔ مسعود آفاقی نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا...... ہر ایک نظر میں سوال تھا' جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

"ساحل عمر۔" حافظ موسیٰ براہ راست ساحل عمر سے مخاطب ہوئے۔ "بابا صاعق نے ہمارے نام سے تمہیں کچھ دیا تھا؟"

"جی' حافظ صاحب دیا تھا۔" ساحل عمر کو فوراً وہ تعویذ یاد آ گیا جواب بھی اس کے گلے میں پڑا تھا۔

"بس بھائی...... ہم وہی لینے آئے ہیں۔" حافظ موسیٰ بولے۔ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد ناصر مرزا کو مخاطب کیا۔ "ناصر مرزا تم ساحل عمر کے گلے سے وہ تعویذ اتار کر ہمارے گلے میں ڈال

''جی بہت بہتر۔'' ناصر مرزا فوراً اٹھا۔ ساحل عمر کے نزدیک پہنچا۔ اس کے گلے سے تعویذ نکال کر حافظ موسیٰ کے گلے میں ڈال دیا۔ انہوں نے اس تعویذ کو چھو کر دیکھا اور پھر بے اختیار مسکرائے۔ ناصر مرزا کو احساس ہوا کہ جیسے وہ کچھ بولیں گے لیکن وہ کچھ نہ بولے۔ چند لمحوں بعد ان کے ہونٹوں سے وہ مسکراہٹ بھی غائب ہوگئی۔

''بھئی وہ لڑکی کہاں ہے؟'' حافظ موسیٰ اچانک گویا ہوئے۔ ''ساحل عمر تم نے کمال کیا۔ اس بستی کا قیمتی ہیرا نکال لائے۔ وہ بڑے دل گردے کے لوگ ہیں۔ انہوں نے بھی تردد نہ کیا۔ راضی بہ رضا اس لڑکی کو تمہارے ساتھ کر دیا۔ ساحل عمر تمہیں وہ لڑکی مبارک ہو...... کیا نام ہے اس کا۔''

''جی رشا ملوک۔'' ساحل عمر نے بتایا۔

''اچھا ہاں۔'' جیسے انہیں اس کا نام یاد آ گیا۔ ''رشا ملوک...... بھئی رشا ملوک کو عذرا ملوک بناؤ...... ہمیں نکاح کے چھوہارے کھلاؤ۔ بھئی شادی کرو...... ہم نکاح پڑھائیں گے اور نکاح سے پہلے ہم اسے عذرا ملوک بنائیں گے۔''

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ اس سے بڑا اعزاز ہمارے لئے اور کیا ہو سکتا ہے۔'' ساحل عمر نے خوش ہو کر کہا۔

''حافظ صاحب' چار دن بعد ساحل عمر کی شادی ہے۔ میں آپ کو خود لینے آؤں گا۔'' ناصر مرزا مئودبانہ انداز میں بولا۔

''بھائی' ہمیں ڈھول ڈھمکوں سے کیا لینا...... ہم تو ابھی آ گئے ہیں۔ اسے عذرا بنائیں گے۔ دونوں کا نکاح پڑھائیں گے چھوہارے کھائیں گے اور اپنے گھر کا رستہ لیں گے۔'' حافظ موسیٰ نے اپنا سارا پروگرام بتا دیا۔

''حافظ صاحب' اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں ابھی چھوہاروں کا انتظام کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ناصر مرزا اٹھنے لگا۔

''ارے بھائی ناصر اتنا وقت ہمارے پاس کہاں......؟ اب تم کہاں چھوہارے لینے جاؤ گے...... ہماری جیب میں چھوہارے پڑے ہیں...... لو ذرا آؤ یہاں سے نکال لو۔'' حافظ موسیٰ نے اپنے کرتے کی جیب کو ہاتھ سے کھولتے ہوئے کہا۔

ناصر فوراً اٹھا۔ ان کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو چھوہاروں سے مٹھی بھر گئی۔ اس نے مٹھی باہر نکال کر مسعود آفاقی کو اشارہ کیا۔ وہ اسکے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی قمیض کا دامن پھیلا دیا۔

ناصر مرزا نے اپنی بھری ہوئی مٹھی اس کے پھیلے ہوئے دامن میں کھول دی۔

''اب دامن پھیلایا ہے تو ہمیں شرمندگی سے بچاؤ اور نکال لو چھوہارے۔'' حافظ موسیٰ نے بدستور اپنی جیب چوڑی کئے ہوئے کہا۔

ناصر مرزا کے ہاتھ موقع آ گیا۔ وہ مٹھی بھر بھر کر چھوہارے نکال کر مسعود آفاقی کے دامن میں ڈالنے لگا۔ یہاں تک کہ اسکا دامن چھوہاروں سے بھر گیا۔ اتنی دیر میں ساحل عمر ایک ٹرے کچن سے

لے آیا۔ اس طرح وہ چھوہارے ٹرے میں منتقل کر دیئے گئے۔ سب حیران تھے کہ اتنی سی جیب سے اتنے ڈھیر سارے چھوہارے کیسے نکل آئے۔

پھر حافظ موسیٰ نے ایک سفید چادر قالین پر بچھانے کے لئے کہا' ساحل عمر نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ جب سفید چادر قالین پر بچھ گئی تو حافظ موسیٰ صوفے سے نیچے اتر آئے۔ وہ آلتی پالتی مار کر اطمینان سے چادر پر بیٹھ گئے۔ پھر بولے۔ ''لاؤ بھئی لڑکی کو بلاؤ...... وہ کہاں ہے۔ اسے کلمہ پڑھائیں۔ نکاح پڑھائیں اور اپنے گھر کو جائیں۔''

''جی اچھا۔'' ساحل عمر یہ کہہ کر بیڈ روم کی جانب بڑھا کہ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز سن کر حافظ موسیٰ کے کان کھڑے ہو گئے۔ ان کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ ساحل عمر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھانے ہی والا تھا کہ حافظ موسیٰ چیخ اٹھے۔ ''نہیں...... ریسیور نہ اٹھانا۔''

☆......☆......☆

حافظ موسیٰ کی آواز اس قدر گرجدار تھی کہ ساحل عمر کا ہاتھ ریسیور پر جما رہ گیا۔ اس نے بڑی حیرت سے حافظ موسیٰ کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ ابھی تک غصے سے سرخ تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی اب بھی بج رہی تھی لیکن ساحل عمر ٹیلی فون سے دور ہو چکا تھا۔

چھ سات گھنٹیوں کے بعد ٹیلی فون خاموش ہو گیا۔ پورے گھر پر ایک سناٹا سا طاری تھا۔ چند لمحوں بعد حافظ موسیٰ کے چہرے میں تبدیلی آئی۔ وہ تھوڑا سا مسکرائے' پھر بولے۔ "ہاں بھئی' جلدی کرو' لڑکی کو لے کر آؤ۔ اسے وضو کروا کر لانا۔"

"جی بہتر۔" ساحل عمر نے کہا۔ اس کے دل میں سوال مچل رہا تھا۔ وہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کس کا فون تھا اور انہوں نے ریسیور اٹھانے سے کیوں منع کر دیا...... لیکن اس میں ہمت نہ ہوئی' یہ سوال کرنے کی۔ وہ بیڈ روم کی طرف بڑھا۔

"ساحل عمر۔" تب حافظ موسیٰ نے آواز دی۔ ساحل عمر جاتے جاتے رک گیا اور دھیرے سے بولا۔ "جی۔"

"بھائی اس قدر بے قراری کیا ہے۔ اس کا فون دوبارہ آ جائے گا' میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کے رابطے سے پہلے تمہارا بندھن مضبوط کر دوں۔" حافظ موسیٰ نے کہا۔ "اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" ساحل عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ بہر حال اس نے اس مسئلے کو پس پشت ڈالا اور کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اماں کو ہدایت کی۔ "اماں' رشا ملوک کو وضو کروا کر لاؤنج میں لے آئیں۔"

چند منٹ کے بعد اماں' رشا ملوک کو لے کر لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ اماں اور رشا ملوک دونوں نے حافظ موسیٰ کو سلام کیا۔ سلام کا جواب دے کر حافظ موسیٰ نے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

رشا ملوک ان کے سامنے ادب سے بیٹھ گئی۔ سر پر دوپٹہ تھا اور سر جھکا ہوا تھا۔ حافظ موسیٰ نے اچانک ادھر ادھر گردن گھمائی جیسے کسی کی آمد کا احساس ہوا ہو۔ پھر وہ گویا ہوئے۔ "ساحل عمر گھر کا دروازہ کھول دو۔ ہوا آنے دو بھائی۔"

"حافظ صاحب...... دروازہ باہر کا کھولوں یا اندر کا......" ساحل عمر نے وضاحت چاہی۔

"بھائی اندر کا دروازہ کھلنا زیادہ بہتر ہو گا۔" حافظ موسیٰ نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

ساحل عمر نے اپنے گھر کا مین دروازہ کھول دیا اور پھر ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔
"ہاں' رشا ملوک۔" اب وہ رشا ملوک سے مخاطب ہوئے۔ اپنا نام سن کر رشا ملوک نے اپنی پلکیں اٹھائیں۔ ایک لمحے کو حافظ موسیٰ کو دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔
"رشا ملوک جو پوچھوں اس کا جواب دیتی جاؤ...... سوال کا جواب دینے میں تم مکمل طور پر آزاد ہو۔" حافظ موسیٰ نے کہا۔ "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں' کیا تم اپنی مرضی سے ساحل عمر کے ساتھ آئی ہو۔"
"جی بالکل۔" رشا ملوک نے بلا جھجک جواب دیا۔
"تم جانتی ہو کہ ساحل عمر کا مذہب کچھ اور ہے' تم لوگوں کا عقیدہ کچھ اور...... میں جانتا ہوں کہ تم لوگ وقت کے ماننے والے ہو۔ ہمارے ہاں موت اور زندگی کا وقت مقرر ہے' نہ ایک لمحہ پہلے نہ ایک لمحہ بعد...... وقت پر اللہ کی حکمرانی ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہلتا۔ اس بستی میں جو ہوا' سو ہوا۔ وہاں کا قانون کچھ اور ہے یہاں کا قانون کچھ اور ہے۔ یہاں تمہاری شادی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک تم اپنے شوہر کا مذہب اختیار نہ کرلو۔ میں تم سے سوال کرتا ہوں' کیا تم اپنے شوہر کا مذہب اختیار کرنے پر خوشی سے راضی ہو۔"
"جی بہت خوشی سے۔" رشا ملوک نے اس مرتبہ بھی جواب دینے میں ایک لمحہ نہ لگایا۔
"تمہارا نام بھی تبدیل ہو گا...... تمہارا نیا نام عذرا ہوگا...... چاہے عذرا ملوک' چاہے عذرا ساحل...... جو تمہیں پسند ہو۔" حافظ موسیٰ نے کہا۔
"عذرا ساحل۔" رشا ملوک نے اپنا نام منتخب کرنے میں ذرا دیر نہ کی۔
"ماشاء اللہ۔" حافظ موسیٰ نے خوشی کا اظہار کیا۔ "چلو بس' اب پڑھو بسم اللہ۔"
تب حافظ موسیٰ نے اسے اللہ کے آخری مذہب کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کیں اور پھر کلمہ پڑھا کر اسے دائرہ اسلام میں لے آئے۔ حافظ موسیٰ سمیت سب نے عذرا ساحل کو مبارک باد دی...... اس کے بعد حافظ موسیٰ نے نکاح پڑھا کر انہیں ازدواجی بندھن میں باندھ دیا۔ اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو چھوہارے نکالے۔ ایک ساحل عمر کو دیا' دوسرا عذرا ساحل کے ہاتھ پر رکھا ساحل عمر نے چھوہاروں سے بھری ٹرے ان کے سامنے رکھی حافظ موسیٰ نے ایک چھوہارا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔
پھر سب نے ساحل عمر کو مبارکباد دی۔ اس مبارک سلامت کے شور میں ساحل عمر اور عذرا پر اچانک پھولوں کی پتیاں برسنے لگیں۔ لاؤنج ایک دم خوشبو سے مہک اٹھا۔ سب حیران رہ گئے کہ یہ گلاب کے پھولوں کی ڈھیروں پتیاں اور خوشبو کہاں سے آئی۔
"تم آخر باز نہیں آئے۔ اسی لئے تم لوگوں کو اندر نہیں بلا رہا تھا۔ اچھا چلو اب جاؤ۔" حافظ موسیٰ جانے کن لوگوں سے مخاطب تھے۔ نظر کوئی نہ آیا۔ نہ آتے ہوئے نہ جاتے ہوئے۔
کچھ دیر کے بعد موسیٰ خود بھی کھڑے ہو گئے اور ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر بولے۔ "چلو بھائی' ناصر مرزا ہمیں ہمارے ٹھکانے پر چھوڑ آؤ۔"

”حافظ موسیٰ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ہم آپ کو کھانا کھلائے بغیر نہیں جانے دیں گے۔“ ناصر مرزا نے فوراً کہا۔

”ارے نہیں بھائی...... اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس...... میری جان کو سو بکھیڑے ہیں۔ اب میں چلوں گا۔ اچھا بھئی ساحل عمر اللہ حافظ...... تم ناصر مرزا کو لے کر میرے پاس آنا اور ہاں سار ملوک کی اس تلوار کا خاص خیال رکھنا۔ اس کے پیچھے چور لگیں گے۔ اس کی حفاظت تم پر لازم ہے۔ ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔“

اتنی دیر میں عذرا ساحل بھی کھڑی ہو چکی تھی۔ اس نے دھیرے سے کہا۔”حافظ صاحب‘ اللہ حافظ۔“

”اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے عذرا کے سر پر دھیرے سے ہاتھ رکھا اور دروازے کی طرف بڑھے۔”چلو بھائی ناصر مرزا۔“

☆......☆......☆

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو ساحل عمر کی نظر دیوار کی گھڑی پر پڑی۔

گیارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔

وہ لوگ رات کا کھانا کھا کر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان دونوں کے ساتھ اماں بھی ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھیں۔ اماں کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ عذرا ساحل کو تین دن سے بار بار اس طرح دیکھتی تھیں جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ ان میں جان پڑ گئی تھی۔ وہ اس پر نہال ہوئی جاتی تھیں۔ ان کی ساری بیماری کافور ہو گئی تھی۔ اب وہ گھر میں اس طرح دوڑی پھر رہی تھیں جیسے ان کے اندر کوئی ”پاور ہاؤس“ اسٹارٹ ہو گیا ہو۔

عذرا بھی ان کی اس نچھاور ہونے والی محبت سے خاصی متاثر ہوئی تھی۔ وہ اماں کو اپنے پاس ہی بٹھائے رکھتی تھی۔ اماں اسے دن بھر نت نئے قصے سناتی رہتی تھیں۔ کبھی وہ ساحل عمر کے بچپن کے قصے سناتی رہتی تھیں۔ کبھی وہ اسے ساحل کے والدین کے بارے میں بتاتیں۔ غرض عذرا کے لئے اس وقت اماں معلومات کا خزانہ ثابت ہو رہی تھیں۔

اور آج تو اماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ انہیں رشا ملوک کے بارے میں زیادہ معلومات نہ تھیں کہ وہ کون تھی‘ کہاں سے آئی تھی‘ نہ ہی اس سلسلے میں ان کے ذہن میں کوئی تجسس تھا۔ انہیں تو ساحل عمر کی دلہن درکار تھی سو وہ انہیں میسر آ گئی تھی۔ حافظ موسیٰ نے اسے دائرہ اسلام میں لا کر اور نکاح پڑھا کر اضافی خوشیاں بخش دی تھیں۔ وہ کافی دیر سے ان دونوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ اب وہ کافی کنگ سمیٹ کر اٹھنے کا سوچ رہی تھیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

اور یہ وہ وقت تھا جس پر کبھی ساحل عمر کی دھڑکن تیز ہو جایا کرتی تھی۔

دھڑکن تو خیر اس وقت بھی اس کی تیز ہو گئی کیونکہ حافظ موسیٰ کے جانے کے بعد یہ پہلا فون تھا۔ پہلے انہوں نے اسے ٹیلی فون کا ریسیور نہیں اٹھانے دیا تھا۔ وہ پورے استحکام کے ساتھ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور اپنے مخصوص انداز میں بولا۔”جی۔“

''بے مروت انسان۔'' ادھر سے کوئی بولا' لہجے میں بڑی کاٹ تھی' بڑا جلا کٹا تھا۔
''کون ہیں آپ؟'' ساحل عمر نے آواز تو پہچان لی تھی لیکن اس آواز نے کبھی اس لہجے میں بات نہ کی تھی اسے لئے اس نے تصدیق کر لینا بہتر جانا۔
''کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔''
''اچھا تو یہ آپ ہیں۔'' ساحل عمر کو اب یقین ہو گیا کہ فون پر بات کرنے والی ورشا ہی ہے۔
''شکر ہے پہچانا تو ورنہ رانگ نمبر کہہ کر رکھ دیتے تو میں کیا کر لیتی۔'' ورشا نے بڑی چاہت سے کہا۔ ''سنو میں نے شام کو بھی فون کیا تھا۔ کیا تم گھر پر نہ تھے۔''
''شام کو کس وقت؟'' ساحل عمر نے سوال کیا۔
''یہی کوئی پانچ بجے۔'' اس نے بتایا۔
اچھا تو وہ فون اس کا تھا۔ جس کے بارے میں حافظ موسیٰ نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا کہا تھا کہ اس کے رابطے سے پہلے میں تمہارا بندھن مضبوط کر دینا چاہتا ہوں اور پھر انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ ورشا کے دوبارہ فون آنے سے پہلے عذرا اور ساحل عمر کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا تھا۔ شاید اس میں کوئی حکمت تھی ہو سکتا ہے نکاح سے پہلے دونوں کے درمیان ٹیلی فونی رابطہ کوئی گل کھلا دیتا۔ خیر جو بھی تھا' اب تو وہ وقت گزر چکا تھا۔ اس کا بندھن مضبوط ہو چکا تھا' اب اسے کوئی خطرہ نہ تھا۔
''ہاں' اس وقت میں باہر گیا تھا۔'' ساحل عمر نے کہا۔
''کیا گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔''
''گھر میں سب تھے۔''
''میں نے کافی دیر ریسیور اٹھائے رکھا لیکن کسی نے اٹھایا نہیں۔''
''ہو سکتا ہے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز کسی نے بند کر دی ہو۔ صفائی کرتے ہوئے اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔'' ساحل عمر نے بڑے سلیقے کا عذر تراشا۔
''کیا کر رہے تھے۔''
''میں بیٹھا ہوا تھا...... کافی پی رہا تھا اور اماں سے باتیں کر رہا تھا۔'' اس نے عذرا کا ذکر قصداً گول کر دیا۔
''اماں سے باتیں کر رہے تھے؟'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی۔ یہ وہ ہنسی تھی جو اس کا چین لوٹ لیا کرتی تھی۔
''ہنس کیوں رہی ہو۔ میں نے ایسی کیا غلط بات کہہ دی۔''
''نہیں تم نے کوئی غلط بات نہیں کہی مجھے بس ایسے ہی ہنسی آ گئی تھی۔ اچھا سنو...... ایک عرصہ ہو گیا ہمیں ملے...... کیا ملاقات ممکن ہے۔'' ورشا نے پوچھا۔
''میں سوچ کر بتاؤں گا۔'' ساحل عمر نے صاف جواب نہ دیا۔
''ایک ہفتے کے بعد۔'' وہ بولا۔

''ایک ہفتے کے بعد کیوں......؟ آخر ابھی کیوں نہیں...... ایک ہفتے کے بعد کوئی انقلاب آ جائے گا۔''

''ہاں یہی سمجھ لو۔'' ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

اتنے میں عذرا ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر لاؤنج میں داخل ہوگئی۔ اس نے مسکرا کر اشارے سے پوچھا کس کا فون ہے۔ ساحل عمر نے جواب دینے کے بجائے اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عذرا اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔

''تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو......؟ صاف کہو جو کہنا ہے۔'' ورشا نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''نہیں میں کچھ نہیں چھپا رہا...... شادی بھی بھلا کوئی چھپانے کی چیز ہے۔ وہ بھی پہلی شادی۔'' وہ بولا

''شادی!'' اس کی آواز میں ناگن کی سی پھنکار تھی۔

''چار دن کے بعد میری شادی ہے۔'' ساحل عمر نے بڑے مزے سے جواب دیا۔

''تمہیں شادی مبارک ہو...... ساحل عمر مجھے اپنی شادی کا کارڈ ضرور بھیجنا میں تمہاری شادی میں ہر قیمت پر آؤں گی۔'' ورشا نے بڑے صاف انداز میں یہ بات کہی۔

''مجھے خوشی ہوگی......ضرور آنا...... میں تمہیں کارڈ بھجوا دوں گا۔''

ساحل عمر کا خیال تھا کہ وہ شادی کے ذکر پر گلے شکوے کرے گی۔ اپنی دوستی کے حوالے دے گی پچھلی یادیں دہرائے گی لیکن اس نے ایسا کچھ نہ کیا۔ بس خاموشی سے ریسیور رکھ دیا۔ البتہ اس نے ٹھنڈی آہ ضرور بھری۔

پھر اس نے ٹیلی فون اپنی گود سے اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر پٹخا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ برکھا بیڈ پر اس کے برابر ہی بیٹھی تھی اس نے ورشا کو اپنی گود میں لٹا لیا اور فکر مند انداز میں بولی۔ ''کیا ہوا''

''ممی اس نے شادی کر لی۔'' ورشا نے بڑی اداسی سے کہا۔

''تجھے تو میری بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اب بتا میں نے ٹھیک کہا تھا ناں...... میری اطلاع کبھی غلط نہیں ہوتی۔'' برکھا نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تجھے اس کی شادی کا رنج ہوا؟''

''نہیں ممی...... میرا بھلا وہ کیا لگتا تھا۔ میں کیوں رنجیدہ ہوتی۔'' ورشا نے اپنی آواز میں استحکام پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن ہو نہیں سکا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی اور اس لرزش کا صاف پتہ لگ رہا تھا۔

''لیکن مجھے بہت دکھ پہنچا ہے۔'' برکھا نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔''

''ممی کیا تم اس سے محبت کرنے لگی تھیں' اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' برکھا جلدی سے بولی۔ وہ ورشا کا سوال سن کر پریشان ہوگئی

تھی۔ ''میں تو اس کی بلی دینا چاہتی تھی اور بلی کے بدلے مانا کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے تجھے اس کے پیچھے لگایا تھا تاکہ تو گھیر کر اسے میرے پاس لے آئے اور میرے اس مقصد کو تو اچھی طرح جانتی ہے۔''

''پھر ممی...... اس کی شادی سے آپ کو کیا فرق پڑا...... آپکو نقصان کیسے ہوا؟''

''میری بلی اب اشدھ ہو گئی' ناپاک ہو گئی۔ شادی کے بعد وہ اس قابل نہیں رہا کہ اسے قربان کیا جاسکے۔ یہ سب اتنا اچانک ہو گیا کہ میں اس اطلاع پر افسوس کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ خیر چھوڑوں گی تو میں اسے اب بھی نہیں۔ اس نے میری پوری زندگی کی تپسیا بھنگ کی ہے۔ میری آرزوؤں کا خون کیا ہے۔ میں اس خون کا بدلا لے کر رہوں گی۔'' برکھا نے دانت پیس کر کہا۔

''ممی اب کیا کرو گی؟'' ورشا نے سوال کیا۔

''میں اسے سسکا سسکا کر ماروں گی۔ اب تو دیکھتی جا' میں کیا کرتی ہوں۔'' برکھا نے اسے گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

ورشا فوراً اس سے دور ہو کر بیٹھ گئی کیونکہ برکھا کے وجود سے پھوٹنے والی بدبو اب ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

ساحل عمر کی شادی میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پورا شہر اُمڈ آیا ہو۔ بے شمار لوگ تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ یہ صرف ساحل عمر کی تقریب نہ تھی۔ ناصر مرزا اور مسعود آفاقی بھی اس میں برابر کے شریک تھے۔ مسعود آفاقی نے پریس کے بہترین لوگوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ ناصر مرزا نے بزنس مینوں اور شوبز کے لوگوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ ساحل عمر نے آرٹ کی دنیا کے لوگوں کو بلا لیا تھا۔ اس طرح اس تقریب میں شہر کی کریم نظر آ رہی تھی۔

مسعود آفاقی لڑکے والا بن گیا تھا اور ناصر مرزا نے لڑکی والوں کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس شادی کی سب سے اہم مہمان تھیں اماں...... انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔

شہر کا ایک بہترین ہال بک کیا گیا تھا۔ یہ ہال بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر صرف تین مرصع کرسیاں تھیں۔ ایک کرسی پر ساحل عمر' دوسری پر عذرا اور عذرا کے برابر اماں تھیں۔ ان کرسیوں کے علاوہ اسٹیج پر صوفے رکھے ہوئے تھے۔ نکاح پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لئے لوگ قاضی کی آمد اور نکاح کے انتظار کی زحمت سے بچ گئے تھے۔

لڑکی والوں نے بارات کا شاندار استقبال کیا۔ بارات کی آمد کے بعد اسٹیج پر عذرا کو لایا گیا۔ وہ سبز رنگ کے کپڑوں میں تھی اور یہ سبز رنگ کا جوڑا خود ساحل عمر نے اس کے لئے پسند کیا تھا۔ سبز رنگ کے اس انتہائی قیمتی جوڑے میں وہ بالکل سبز پری لگ رہی تھی۔ اس کا حسن ملکوتی تھا' اس رنگ نے اس کے حسن کو مزید نکھار دیا تھا۔ جو ساحل عمر کی دلہن کو دیکھتا تھا اس کی نظر اس پر جم کر رہ جاتی تھی۔ سب پریشان تھے کہ ایسی حسین لڑکی' ساحل عمر نے کہاں سے ڈھونڈ نکالی۔ لڑکوں کی مائیں بار بار اماں سے پوچھ رہی تھیں۔ ''اے کیا اس کی کوئی اور بہن بھی ہے۔''

اماں کچھ جل کر اور کچھ ہنس کر جواب دیتیں۔ "نہیں اللہ نے بس یہی ایک پیس بنایا تھا۔"
اماں کا یہ جواب کچھ غلط بھی نہ تھا۔ اللہ نے واقعی اسے یکتا اور اکلوتا بنایا تھا۔
اسٹیج پر دھڑا دھڑ تصویریں بن رہی تھیں۔ وڈیو فلم شوٹ کی جا رہی تھی۔ مسعود آفاقی بھی فوٹو گرافی میں لگا ہوا تھا۔ وہ اس جوڑے کی اچھی سے اچھی تصویر اتار لینا چاہتا تھا۔
اماں بہت خوش تھیں۔ بات بے بات ہنس رہی تھیں۔ جو لوگ یہ جانتے تھے کہ ساحل عمر کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان لوگوں نے جب اماں کے بارے میں استفسار کیا کہ یہ کون ہیں؟ اور جب انہیں یہ جواب ملا کہ یہ ساحل عمر کے گھر کی پرانی ملازمہ ہیں اور ساحل عمر کو انہوں نے گودوں کھلایا ہے تو یہ سن کر وہ حیران رہ جاتے تھے کہ ایک ملازمہ کی اتنی اہمیت...... اتنا احترام۔
کھانے کا وقت قریب تھا۔ ڈشوں کے نیچے چراغ جلائے جا رہے تھے کہ کھانا ٹھنڈا نہ ہونے پائے۔ اتنے میں ہال میں ایک ہلچل سی مچی۔ جس نے بھی اسے دیکھا' وہ چونکے بنا نہ رہ سکا۔
وہ بڑے پروقار انداز میں میزوں کے درمیان بنے راستے پر چلی آ رہی تھی۔ اس کا رخ اسٹیج کی طرف تھا۔ وہ کالی ساڑھی جس پر ستاروں کا کام تھا' باندھے تھی۔ بغیر آستین کا چھوٹا سا بلاؤز پہنے شاخ گل کی طرح لچکتی۔ شانوں پر زلفیں بکھیرے۔ شہر کے کسی بڑے بیوٹی پارلر سے میک اپ کروائے۔ لوگوں کے درمیان سے لوگوں پر بجلیاں گراتی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس پر جس کی بھی نظر پڑ رہی تھی چاہے وہ مرد ہو یا عورت...... اس کو دیکھے بغیر نہیں رہ پا رہا تھا۔ اس کے بارے میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ یہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے' طرح طرح کے سوال ذہنوں میں اٹھ رہے تھے لیکن وہ جو بھی تھی خوب تھی۔ قابل توجہ تھی...... وہ ورشا تھی!
ساحل عمر نے جب اسے اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تو وہ دم بخود رہ گیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس کے حسن سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ورشا آگ تھی لیکن جو حسن اس کے پہلو میں تھا وہ بھی کسی سے کم نہ تھا' وہ شبنم تھا۔ ٹھنڈا آنکھوں کی روشنی بڑھانے والا۔ وہ اس لئے دم بخود رہ گیا کہ اسے ورشا کے شادی میں شریک ہونے کی امید نہ تھی۔ اس نے اسے کارڈ ضرور بھجوایا تھا محض رسمی طور پر' وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ چلی آئے گی۔
خیر اب تو وہ کسی قیامت کی صورت برپا ہو ہی گئی تھی۔ اب جو ہو سو ہو۔
وہ سیدھی ساحل عمر کی طرف بڑھی۔ ساحل عمر اسے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ورشا نے بے تکلفی سے اس سے ہاتھ ملانے کے لئے اپنا نرم و نازک ہاتھ آگے بڑھایا۔ ساحل عمر مخمصے میں پھنس گیا۔ پھیلے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دے یا ہاتھ ملا کر عذرا کے دل میں سوئی چبھو دے۔
ابھی وہ کچھ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اماں نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔ وہ بڑی برق رفتاری سے اپنی کرسی سے اٹھیں اور بڑے پیار سے بولتے ہوئے ورشا کا ہاتھ تھام لیا۔ "اوہ ورشا آئی ہیں۔"
"جی اماں' آپ کیسی ہیں؟" اس نے اپنی سیاہ زلفوں کو جھٹک کر پوچھا۔
"میں بہت اچھی ہوں...... آؤ' ورشا ادھر صوفے پر آ جاؤ۔" اماں اسے بڑے پیار سے پکڑ کر صوفے کی طرف لے گئیں۔

''کون ہے یہ؟'' عذرا نے ساحل کو ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔
''ایسی نگاہوں سے مجھے مت دیکھو...... یہ ورشا ہے۔'' ساحل عمر نے بتایا۔ ''اماں اس وقت میرے لئے فرشتہ ثابت ہوئی ہیں۔ میں ابھی دو چار منٹ میں اسے چلتا کر کے آتا ہوں' تم پورے اطمینان سے بیٹھو۔''

پھر وہ اماں کے پیچھے پیچھے صوفے پر جا بیٹھا۔ اماں فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر عذرا کے پاس آ گئیں اور اسے بڑے پیار سے مسکرا کر دیکھنے لگیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ پریشان مت ہونا' اس کی حیثیت پانی کے بلبلے سے زیادہ نہیں۔

''شادی مبارک ہو۔'' ورشا نے مسکرا کر کہا لیکن اندر ہی اندر اس کے دل پر آنسو گرے۔
''شکریہ۔''
''اچھا انتخاب ہے۔ کہاں سے لائے اسے۔'' ورشا نے اسے اداس نگاہوں سے دیکھا۔
''یہ تمہاری ماں کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔''
''میری ماں تم پر مہربان ضرور ہے لیکن وہ تمہیں کچھ دے نہیں سکتی لے ضرور سکتی ہے۔''
''پھر تم اپنی ماں کو اچھی طرح جانتی ہو۔''
''ہاں' کیوں نہیں...... میں اپنی ماں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔''
''کیا تم جانتی ہو کہ اس نے مجھے کوئی نشہ آور دوا پلا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔''
''میں نہیں جانتی۔''

''تمہاری ماں نے مجھ پر بہت ظلم کئے ہیں۔ وہ مجھے قربان کر کے کوئی پراسرار قوت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ خیر یہ لمبی داستان ہے پھر کبھی سناؤں گا' فی الحال اس کا موقع نہیں۔ بس تم اتنا جان لو کہ تمہاری ماں نے میری جان لینے کی پوری تیاری کر لی تھی لیکن اوپر والے نے مجھے بچا لیا۔ نہ صرف بچا لیا بلکہ انعام میں ایسی حسین لڑکی بھی بخش دی۔ اب تم واپس جا کر اپنی ماں کو سارا حال بتا دینا اور اس سے کہنا کہ اب وہ میرا پیچھا چھوڑ دے...... مجھے بھول جائے۔'' ساحل عمر نے بہت دھیمے لہجے میں یہ بات کہی۔

''میں تمہارا پیغام اپنی ماں تک پہنچا دوں گی لیکن اتنا یاد رکھو کہ وہ تمہیں بھولنے والی نہیں۔''
''پھر وہ نقصان اٹھائے گی۔''
''نقصان کون اٹھائے گا یہ مجھے نہیں معلوم لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں' وہ بڑی خطرناک عورت ہے۔ اس کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔''

''چلو دیکھا جائے گا۔'' ساحل عمر نے بات ختم کرنا چاہی' کیونکہ عذرا اس کی طرف دیکھ کر بار بار پہلو بدل رہی تھی۔

ورشا نے اپنے کندھے سے بیگ اتار کر اسے کھولا اور پھر اس میں سے ایک مخملی ڈبیہ نکال کر بیگ بند کر کے کندھے پر ڈالا اور اسے مسکرا کر دیکھا۔ ''میری طرف سے تمہاری بیوی کے لئے حقیر سا تحفہ......''

"ارے اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ تم آ گئیں یہی تحفہ میرے لئے بہت ہے۔"

"دیکھو میرا دل نہ توڑنا...... اسے رسم دنیا سمجھ کر قبول کر لو۔"

"نہیں، میں تمہارا دل نہیں توڑوں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔ تم خود ہی عذرا کو یہ تحفہ دے دو۔"

یہ کہہ کر ساحل عمر فوراً اٹھ گیا۔ اس نے قریب پہنچ کر ورشا سے خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور عذرا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "عذرا' یہ ورشا ہیں...... تمہارے لئے تحفہ لائی ہیں' قبول کرو۔"

اب عذرا نے گردن گھما کر ورشا کو دیکھا۔ ورشا نے بھی اس پر نظر ڈالی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ ایک کی نظر میں فتح رچی ہوئی تھی اور ایک کی نظر میں شکست بسی ہوئی تھی لیکن دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں اپنے اپنے انداز میں۔

ورشا نے پھر وہ ڈبیہ کھولی۔ اس میں ایک قیمتی ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

"ساحل آپ اجازت دیں تو میں یہ انگوٹھی اپنے ہاتھوں سے انہیں پہنا دوں۔"

ساحل عمر نے ایک نظر عذرا کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں انکار نہ تھا۔ ساحل عمر فوراً بولا۔ "بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"تھینک یو۔" ورشا نے ایک ادا سے کہا اور اس نے بائیں ہاتھ کی ایک خالی انگلی میں وہ ہیرے کی انگوٹھی پہنا دی۔

"آپ کا شکریہ۔" عذرا نے انگوٹھی پہننے کے بعد دھیرے سے کہا۔

تب ورشا فوراً کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی کلائی کی گھڑی میں ٹائم دیکھا اور بولی۔ "اچھا ساحل صاحب میں چلتی ہوں۔"

"ارے کیوں...... کھانا کھا کر جانا۔"

"نہیں' مجھے ایک ضروری کام ہے۔ جاؤں گی۔"

"اچھا جیسے تمہاری مرضی۔" ساحل عمر نے اسے روکنے کے لئے زیادہ اصرار نہ کیا۔

اور وہ چلی گئی...... جاتے ہوئے اس نے اماں سے سلام دعا کی نہ عذرا کی طرف دیکھا۔ اس نے یہ انتظار بھی نہ کیا کہ ساحل عمر اسے رخصت کرنے اسٹیج کی سیڑھیوں تک آئے۔ بس وہ تیزی سے پلٹی اور اسٹیج کی سیڑھیاں کھٹ کھٹ اترتی جس طرح آئی تھی ویسے ہی لوگوں کے دلوں پر بجلیاں گراتی شادی ہال سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

بارہ بجے کے بعد رخصتی کا وقت آیا۔

عذرا ساحل کو قرآن شریف کے سائے میں رخصت کیا گیا۔ پھر اسے سجی سجائی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ ساحل عمر آگے بیٹھا۔ عذرا کے ساتھ ناصر مرزا کی بیوی اور اماں کو بٹھایا گیا اور پھر تین چار گاڑیوں پر مشتمل یہ قافلہ ساحل عمر کے گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر پہنچ کر رسمیں ادا کی گئیں۔ گھر میں ایک ہنگامہ تھا۔ ہر طرف قہقہے اور خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مسرت سے کھلے ہوئے چہرے...... ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق اس شادی کو انجوائے کر رہا

تھا۔ سب خوش تھے۔ اس شادی میں ہر شخص کو بہت مزہ آیا تھا۔

رات کے ایک بجے کے قریب ناصر مرزا اور مسعود اپنی اپنی فیملیوں کو لے کر نکلنے کی تیاری کر رہے تھے ادھر دلہن کو بھی تیار کیا جا رہا تھا۔ وہ زیور سے لدی ہوئی تھی اور پریشان تھی۔ اس نے اماں سے زیور اتارنے کو کہا۔ اماں اس کی پریشانی دیکھ کر اس کے پاس بیٹھ گئیں تو سب سے پہلے اس نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کر کے کہا۔ ''اماں' سب سے پہلے اسے اتاریں' یہ میری انگلی میں چبھ رہی ہے۔''

''ہاں لاؤ...... اسے اتار دوں پتہ نہیں کیسی نیت سے دی ہے یہ انگوٹھی۔'' اماں نے جب ورشا کی دی ہوئی انگوٹھی اس کی انگلی سے نکالنا چاہی تو وہ نہیں اتری۔ وہ انگلی کی ہڈی پر اٹک رہی تھی۔

جب وہ زور لگانے کے باوجود نہ اتری تو اماں کریم لے آئیں۔ انہوں نے اس کی انگلی چکنی کر کے وہ انگوٹھی اتارنا چاہی لیکن وہ پھر بھی نہ اتری۔ وہ تنگ سے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

پھر اماں نے واش روم میں لے جا کر صابن لگا کر اس انگوٹھی کو اتارنے کی کوشش کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

ابتداء میں تو یہ خیال تھا کہ انگوٹھی چھوٹی ہے اس لئے نہیں اتر رہی کسی چکنی چیز سے اتر آئے گی لیکن وہ انگوٹھی چھوٹی نہ تھی بلکہ انگلی نے پھولنا شروع کر دیا تھا۔ عذرا کی انگلی آہستہ آہستہ موٹی ہوتی جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ سرسوں کے تیل سے لے کر صابن کے جھاگ تک ہر چیز استعمال کر لی تھی لیکن انگوٹھی تنگ سے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

اب انگلی اتنی پھول گئی تھی کہ انگوٹھی گوشت میں گھسنی شروع ہو گئی تھی۔ پھولتی انگلی میں شدت کی تکلیف تھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ انگوٹھی پھولتی ہوئی انگلی کا گوشت کاٹ کر اندر اتر جائے گی۔ تکلیف بڑھ گئی تھی کہ عذرا انگوٹھی چھونے کی صورت میں بھی کراہ اٹھتی تھی۔

ذرا سی دیر میں ہنستا بستا ماحول فکر میں ڈوب گیا تھا۔ انگلی کی سوجن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اب سارے کے سارے ساحل عمر کو لعن طعن کر رہے تھے کہ اس نے اس شیطان کی بچی کی انگوٹھی قبول ہی کیوں کی۔ وہ بے چارہ شرمندہ شرمندہ سا عذرا کو دیکھ رہا تھا۔

جب تکلیف شدت اختیار کر گئی تو ناصر مرزا نے کہا۔ ''ساحل' عذرا کو لے کر فوراً ہسپتال چلو' اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس وقت کسی دولہا کا بیڈروم میں جانے کے بجائے کسی ہسپتال کے روم میں جانا اس کے ساتھ سنگین مذاق تھا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا' ہسپتال جائے بغیر اس تکلیف سے نجات ممکن نہ تھی۔ سو ساحل عمر کو ہسپتال کا رخ کرنا پڑا۔

ہسپتال کی ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے اس انوکھے کیس کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ پھر اس نے بڑی احتیاط اور محنت سے اس انگوٹھی کو کاٹ کر انگلی سے نکال لیا۔

انگلی سے انگوٹھی نکلتے ہی عذرا کو قرار آ گیا اور گھر پہنچتے پہنچتے انگلی کی سوجن برائے نام رہ گئی۔ گھر پہنچ کر ساحل عمر نے اس انگوٹھی کو ڈسٹ بن میں پھینکنا چاہا تو ناصر مرزا نے اسے روک دیا۔

''کیا کرتے ہو؟''

"اس نحوست کو اس کی صحیح جگہ پر پھینک رہا ہوں۔" ساحل عمر نے غصے سے کہا۔
"ہرگز نہیں...... یہ انگوٹھی مجھے دو۔" یہ کہہ کر ناصر مرزا نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی لے کر اپنی جیب میں ڈال لی۔ ناصر مرزا کی بیوی نے ناصر مرزا کو گھور کر دیکھا مگر اس میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ شوہر کو اس منحوس انگوٹھی کو جیب میں رکھنے سے منع کردے۔

☆......☆......☆

ساحل عمر کی صبح خاصی دیر سے ہوئی۔ مہمان سارے رات کو رخصت ہو چکے تھے۔ اس لئے صبح جلد اٹھنے کی فکر نہ تھی۔ اماں البتہ اپنے وقت پر اٹھ گئی تھیں۔ وہ مرجینا کے ساتھ کچن میں لگی ہوئی تھیں۔ مرجینا نے منع بھی کیا کہ وہ خود ناشتہ تیار کرے گی لیکن وہ نہیں مانیں۔ ناشتے کے ساتھ انہوں نے دوپہر کے کھانے کا بھی ڈول ڈال دیا۔ وہ جانتی تھیں کہ ساحل عمر کو کیا چیزیں پسند ہیں۔ وہ کھانے کس طرح کے پسند کرتا ہے' کتنا نمک اور کتنی مرچ اسے درکار ہوتی ہے۔ اس کے کھانے کا بندوبست وہ خود ہی بہتر طریقے پر کر سکتی تھیں۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ساحل عمر کے کمرے کا دروازہ ابھی تک بند تھا۔ خاصا انتظار کر کے بالآخر اماں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلنے میں دیر نہ لگی۔ دروازہ عذرا نے کھولا۔ ساحل عمر تو ابھی اوندھا پڑا ہوا بے خبر سو رہا تھا۔ اماں نے عذرا سے کہا۔ "اے دلہن' ساحل کو اٹھاؤ...... اب دوپہر ہونے کو آ گئی۔"

"اچھا اماں' اٹھاتی ہوں۔" عذرا نے سادگی سے کہا۔
"ہاں' دلہن جلدی اٹھاؤ...... ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر اماں نے پھر کچن کا رخ کر لیا۔

ساحل عمر کو اٹھتے اٹھتے پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ پھر وہ نہا دھو کر ڈائننگ ٹیبل پر آیا تو بارہ کا عمل تھا۔ دونوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ ناشتہ کرتے ہوئے ساحل عمر کی نظر عذرا کے ہاتھ پر پڑی تو اسے ورشا کی دی ہوئی انگوٹھی یاد آ گئی۔ اس نے عذرا کا ہاتھ پکڑ کر اس انگلی کا معائنہ کیا جس نے یکایک غبارے کی طرح پھولنا شروع کر دیا تھا۔ اب اس کی انگلی بالکل نارمل تھی۔ یہ احساس تک نہ ہوتا تھا کہ اس انگلی نے رات کو کس قدر پریشان کیا تھا۔

اسے ورشا پر بہت غصہ تھا۔ وہ جانے کس طرح کی انگوٹھی' کس نیت سے دے گئی تھی۔ یقیناً اس انگوٹھی پر کچھ پڑھ کر پھونکا گیا تھا۔ سحر کیا گیا تھا اور سحر کا نشانہ عذرا تھی۔

اس نے سوچا ذرا ورشا سے بات تو کر کے دیکھے۔ آخر وہ کیا سوچ کر عذرا کے لئے تحفہ لائی تھی۔ اس نے لاؤنج میں موجود فون کا ریسیور اٹھایا اور ورشا کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

"ہیلو۔" ادھر سے نسوانی آواز آئی۔
"کون؟ ورشا؟" ساحل عمر نے تصدیق چاہی۔
"نہیں برکھا بول رہی ہوں...... آپ کون؟" ادھر سے برکھا نے پوچھا۔

برکھا کی آواز سن کر ساحل عمر کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ اس عورت نے اسے قتل کرنے کی پلاننگ مکمل کر لی تھی۔ وہ تو درمیان میں چڑ دبیل آ گیا ورنہ اس کی زندگی کا خاتمہ کب کا ہو چکا ہوتا۔ غصے

میں اس نے سوچا کہ ٹیلی فون بند کر دے۔ اتنے میں برکھا نے دوبارہ پوچھ لیا۔ ''کون ہو بھئی...... بولتے کیوں نہیں۔''

''میں ورشا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' ساحل عمر نے بہت خشک لہجے میں کہا۔

''میں ورشا کو بلاتی ہوں...... آپ کون ہیں؟''

''میں ساحل عمر بات کر رہا ہوں۔'' اس نے غصیلے انداز میں کہا۔

''اوہ۔'' برکھا نے بڑے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''ہاں ساحل جی...... آپ نے ورشا سے کیا بات کرنی ہے۔''

''مجھے اس سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''مجھ سے پوچھ لو ساحل جی...... وہ بچی ہے' وہ تمہیں کیا جواب دے گی۔ انگوٹھی سے متعلق تو کوئی سوال نہیں کرنا۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی۔ ''کیسا لگا میرا تحفہ۔''

''تمہارا تحفہ؟'' ساحل عمر نے حیرت سے کہا۔ ''وہ انگوٹھی تم نے بھیجی تھی۔''

''تم نے اتنی خاموشی سے شادی کرلی...... میں تمہیں تحفہ بھی نہ بھیجتی...... کہو رات کیسی گزری۔'' برکھا نے طنزاً پوچھا۔

''بہت اچھی۔'' ساحل عمر نے بہت خوش ہو کر کہا۔

''اچھا...... پھر ایسی ہی راتوں کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اب تمہاری ہر رات ایسی ہی گزرے گی۔ میں تمہاری راتوں کا چین چھین لوں گی۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اب تمہیں کسی کروٹ چین نہ آئے گا۔ تمہاری ہر سانس پر منہ سے آہ نکلے گی۔ میں تمہیں سسکا سسکا کر ماروں گی۔ تم مجھے نہیں جانتے کہ میں کتنی پراسرار قوتوں کی مالک ہوں۔ وہ تو منحوس چترو بھیل تجھے نکال لے گیا ورنہ تو اب تک پرلوک سدھار چکا ہوتا' چترو بھیل کا تو میں نے حساب کتاب کر دیا۔ اس کی روح کو آگ کی دیواروں میں چن دیا اب تیرا کریا کرم باقی ہے۔ میں تجھے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گی یاد رکھ۔'' برکھا نے غصے سے کہا۔

''اچھا ہوا...... میں نے یہ سب کچھ تیرے منہ سے سن لیا۔ تو کھل کر میرے سامنے آگئی۔ اب تک میں دوسرے لوگوں کی زبانی تیرے عزائم کے بارے میں سنتا رہا ہوں۔ اب تو نے خود ہی سب اقرار کر لیا۔ اب تو میری بات سن اور غور سے سن...... تو اگر پراسرار قوتوں کی مالک ہے تو میں بھی لاوارث نہیں۔ میرے پیچھے بھی کچھ طاقتیں موجود ہیں۔ اب تیری میری کھلی جنگ ہے۔ اب تو نہیں یا میں نہیں۔'' ساحل عمر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''نادان لڑکے میں تیری اس بات پر صرف ہنس سکتی ہوں۔'' برکھا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ آنے والا کل بتائے کون کس پر ہنستا ہے۔'' ساحل عمر نے سخت لہجے میں کہا۔

''چل ٹھیک ہے۔ کل تو ابھی دور ہے تو آج کی رات میرا انتظار کر۔'' یہ کہہ کر برکھا نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ ''اور دیکھ تماشا۔'' ٹیلی فون رکھ کر جب وہ پلٹی تو اسے دروازے پر دیکھ کر چونک گئی۔

☆......☆......☆

ورشا آہستہ آہستہ بڑے ڈرامائی انداز میں اس کی طرف بڑھی اور نزدیک پہنچ کر بولی۔ ''ممی کس کا فون تھا۔''

برکھا نے ایک نظر ورشا کو دیکھا۔ اس کا انداز اس کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا جیسے اس نے برکھا کی کوئی چوری پکڑ لی ہو۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ورشا کے انداز پر اسے ضرور ڈانٹ دیتی لیکن یہ وقت ڈانٹنے کا نہ تھا۔ ورشا سے اس نے ابھی بہت کام لینا تھا۔ وہ اسے ڈانٹ کر ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''تمہارے دوست کا فون تھا۔'' برکھا مسکرا کر بولی۔

میرا دوست۔'' ورشا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''ممی میرا تو کوئی دوست نہیں۔''

''پھر یوں سمجھو...... میرے دشمن کا تھا۔ ورشا اس نے مجھے دھمکی دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تو نہیں یا میں نہیں۔ ورشا اب چیونٹی کے پر نکل آئے ہیں...... تو جانتی ہے ناں...... جب چیونٹی کے پر نکل آتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔'' برکھا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

''ہاں جانتی ہوں...... اس کی موت نزدیک آ جاتی ہے۔'' ورشا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''بس ورشا سمجھ لو کہ ساحل عمر کی موت بھی زیادہ دور نہیں ہے۔''

''ممی آپ اسے مار دیں گی...... ساحل عمر کی جان لے لیں گی۔ محض اس لئے کہ اس نے شادی کر لی ہے۔ ممی شادی کرنا کیا گناہ ہے؟'' ورشا نے عجیب انداز اختیار کیا۔

''ارے!'' برکھا نے اسے غور سے دیکھا۔ ''یہ تو کیا بکواس کر رہی ہے۔''

''ہاں ممی...... میں واقعی بکواس کر رہی ہوں۔ ممی سچی بات میں ہمیشہ زہر بھرا ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ برکھا کے کمرے میں رکی نہیں۔

برکھا اسے کہتی رہ گئی۔ ''ورشا...... ارے ورشا...... میری بات تو سنو۔''

اس کے جانے کے بعد وہ کھلے دروازے کو خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ایک دم ورشا کو کیا ہوا اس کے موڈ میں یہ تبدیلی کیوں آئی۔ خیر وہ ورشا کو بعد میں دیکھ لے گی؛ سردست جو مسئلہ سامنے تھا اس سے نمٹنا تھا۔ وہ ساحل عمر کو آج رات تماشا دکھانے کا کہہ چکی تھی۔ فی الحال تو اس سلسلے میں کچھ کرنا تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے اپنے کمرے کا دراوازہ بند کیا اور پھر بیڈ پر بیٹھ کر فون کا نمبر ملانے لگی۔ دوسری گھنٹی پر ادھر سے ٹیلی فون اٹھالیا گیا۔

''واسم۔'' برکھا نے اس کی آواز پہچان کر کہا۔

''جی برکھا جی۔'' واسم ہمیشہ کی طرح فرماں برداری سے بولا۔ ''کیا حکم ہے۔''

''مجھے آج ڈھائی بجے سے پہلے بکرے کا سر چاہئے۔'' برکھا نے حکم سنایا۔ عجیب حکم تھا۔

''اس وقت کیا بجا ہے۔'' واسم نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''پون بجا ہے۔'' برکھا نے اسے بتایا۔
''ٹھیک ہے۔ برکھا جی' میں فوراً ہی نکلتا ہوں۔ ڈھائی بجے تک بلکہ اس سے پہلے آپ کے پاس ہوں گا۔''
''اور سنو۔'' برکھا نے کہا۔
''جی برکھا جی۔'' وہ بولا۔
''بکرے کا سر بالکل کالا ہو۔'' برکھا نے اسے ہدایت کی۔
''برکھا جی...... اگر مارکیٹ میں کالے بکرے کی سری نہ ملی تب......؟'' اس نے سوال کیا۔
''تب تم ایسا کرنا کہ ایک کالا بکرا خرید لانا...... یہاں اس بکرے کا سر اتار لیں گے۔ ایسی صورت میں تم تین بجے تک پہنچ جانا...... اس سے زیادہ دیر نہ ہو۔ پھر عمل کا وقت نہیں رہے گا۔'' برکھا نے اسے سمجھایا۔
''بس آپ بے فکر ہو جائیں۔ آپ کا کام وقت سے پہلے ہو جائے گا۔''
''واسم تم ایسا کرو کہ مارکیٹ کے چکر میں مت پڑو۔ سیدھے بکرا منڈی جاؤ۔ وہاں سے ایک کالا بکرا خریدو بے شک پورا بکرا کالا نہ ہو لیکن اس کا سر ضرور کالا ہو اور اسے لے کر بنگلے پر آ جاؤ' میں تمہیں آج ایک اور جادو سکھا دوں گی۔'' برکھا نے اس پر مہربان ہوتے ہوئے کہا۔
''برکھا جی...... زندہ باد۔'' یہ سن کر واسم خوش ہو گیا۔ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا اور پھر یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ ''اچھا برکھا جی آپ میرا انتظار کریں۔ میں آتا ہوں۔''
برکھا نے اس کے فون رکھنے کے بعد خود بھی ریسیور رکھ دیا اور مسکرانے لگی۔ واسم بہت کام کا بندہ تھا۔ اس نے آج تک حکم عدولی نہیں کی تھی۔ اس نے جو کام بھی اور جب بھی بتایا تھا' حتی المقدور پورا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر اس نے اسے رات کے دو بجے بھی فون کر دیا ہے تو وہ کسی معمول کی طرح اس کے بنگلے پر حاضر ہو جاتا تھا۔
برکھا جب بھی خوش ہوتی اسے کوئی عمل سکھا دیتی۔ وہ اس سحر کے ذریعے لوگوں سے پیسے بٹورتا اور انسانوں کو دکھ پہنچاتا۔ کالا علم ہوتا ہی کسی کو دکھ پہنچانے کے لئے ہے۔
واسم حکم کے مطابق ایک کالا بکرا خرید کر اس کے بنگلے پر مقررہ وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ اس وقت ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ اس وقت برکھا اپنے عمل کے کمرے میں تھی۔ وہ وہاں بیٹھی ہوئی منتروں کا جاپ کر رہی تھی۔ اس نے ورشا سے کہہ دیا تھا کہ واسم آئے تو اسے وہ عمل کے کمرے میں پہنچا دے۔
واسم کے بیل دینے پر ورشا نے گیٹ کھولا' وہ گاڑی میں تھا۔ ورشا ایک طرف ہوئی تو وہ گاڑی اندر لے آیا' ورشا جب گیٹ بند کر کے واپس پلٹی تو واسم گاڑی کی ڈگی سے کالا بکرا نکال رہا تھا۔ جب ورشا اس کے نزدیک پہنچی تو واسم نے پوچھا۔ ''برکھا جی کہاں ہیں؟''
''وہ جاپ والے کمرے میں ہیں۔ تم وہیں چلے جاؤ۔'' ورشا نے کہا اور وہ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔
واسم نے کالے بکرے کا بڑا سا کان پکڑا اور اسے بیدردی سے گھسیٹتا ہوا منتر والے کمرے

کی طرف بڑھا۔ بکرا بری طرح چیخ رہا تھا۔
جاپ والا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اندر مکمل اندھیرا تھا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ واسم دروازے پر کھڑے ہو کر برکھا کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔
"واسم اندر آ جاؤ۔" برکھا کی اندر سے آواز آئی۔
"برکھا جی کیا بکرے کو بھی اندر لے آؤں۔"
"اچھاہاں...... یاد آیا تمہیں بھی تو سحر سکھانا ہے۔ یوں کرو اس بکرے کو بنگلے کے پیچھے لے کر چلو میں چھری لے کر آتی ہوں۔"
"جی اچھا۔" یہ کہہ کر واسم نے بکرے کا بڑا سا کان جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا' اسے کھینچتا ہوا آگے بڑھا اور پھر وہ گھوم کر بنگلے کے پیچھے چلا گیا۔
اس کے پیچھے پیچھے برکھا بھی پہنچ گئی۔ اس نے پیلی ساڑھی اور بغیر آستین کا بلاؤزر پہن رکھا تھا۔ ساڑھی کا پلو بھی اس نے کمر میں اڑسا ہوا تھا۔ وہ ایک ڈھلتی عمر کی عورت تھی۔ اس کے باوجود اس میں اب تک کشش موجود تھی۔ واسم نے اسے ایک نظر دیکھا اور پھر نظریں گھما لیں۔
برکھا نے ایک جگہ منتخب کر کے واسم کو بکرا پچھاڑنے کو کہا۔ واسم نے اس کی دو ٹانگیں پکڑ کر اسے الٹا دیا اور پھر اس پر اس طرح چڑھ کر بیٹھ گیا کہ وہ ہل بھی نہ سکے۔ برکھا نے اس کے ہاتھ میں ایک تیز چھری دی اور ساتھ ہی ایک چینی کا پیالہ بڑھایا۔ پھر اس نے واسم کو بتایا کہ کیا کرنا اور کس طرح کرنا ہے۔
برکھا کی ہدایت کی مطابق اس نے پیالے کو اس طرح بکرے کی گردن کے نیچے رکھا کہ پہلے خون کے قطرے پیالے میں گریں۔ یہاں تک کہ پیالہ بھر جائے۔
واسم نے بکرے کو قابو میں لے کر تیز چھری' منتر پڑھتے ہوئے بہت تیزی سے اس کی گردن پر پھیری۔ سرخ خون ایک فوارے کی صورت اس کی گردن سے نکلا۔ چند لمحوں میں پیالہ بھر گیا۔ بھرا ہوا پیالہ برکھا نے اس کی گردن کے نیچے سے نکال لیا۔ اتنے میں واسم نے بکرے کی گردن اس کے تن سے جدا کر دی اور اس کا تڑپتا ہوا جسم کسی کھلونے کی طرح دور پھینک دیا۔ بکرے کی جان ابھی پوری طرح نہیں نکلی تھی۔ اس کی گردن سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا اور جسم بری طرح تڑپ رہا تھا۔
"آؤ واسم ادھر آ کر بیٹھو۔" برکھا خون بھرا پیالہ لئے کھڑی تھی۔ واسم اسکے سامنے زمین پر بے تکلفی سے بیٹھ گیا اور گردن اٹھا کر برکھا کی جانب دیکھنے لگا۔
"تمہیں جو بتایا ہے' وہ پڑھو اور اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلا کر ملا لو۔" برکھا نے ہدایت کی۔
واسم نے اپنے دونوں ہاتھ کچھ پڑھتے ہوئے پھیلا کر ملا لئے۔ تب برکھا نے خون کا پیالہ اس کے ہاتھوں پر آہستہ آہستہ انڈیلنا شروع کیا جیسے ہی خون کی دھار اس کے ہاتھوں پر گری۔ چھن چھن کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کا ہاتھ چاندی کے کھنکھناتے روپوں سے بھر گئے۔
"کہو واسم۔" برکھا نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔
"برکھا جی' جواب نہیں۔" واسم نے تعریف کی۔

پھر برکھا نے وہ پیالہ زمین پر رکھ دیا اور واسم سے کہا۔ ''اب یہ روپے پیالے میں ڈالنا شروع کرو۔''

واسم نے اپنے ہاتھ تھوڑے سے نیچے کر کے روپے پیالے میں پھینکنا شروع کئے۔ جیسے جیسے روپے پیالے میں گرتے جا رہے تھے پیالہ خون سے بھرتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ آخری روپیہ بھی خون میں تبدیل ہو گیا۔

اب برکھا نے پھر فخریہ انداز میں واسم کو دیکھا۔ ''کہو واسم۔''

''برکھا جی آپ جادو کی دیوی ہیں۔ آپ کا کوئی توڑ نہیں۔''

''شعبدہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے کافی ہے؟'' اس نے ہنس کر سوال کیا۔

''بہت کافی ہے۔'' واسم خوش ہو کر بولا۔ ''جب میں لوگوں کو یہ جادو دکھاؤں گا تو وہ میرے پاؤں پکڑ لیں گے۔ پھر میں ان حیرت زدہ لوگوں سے جو چاہوں گا کروا لوں گا۔''

''چلو اب تم جاؤ...... میں اب اپنا کام شروع کروں گی۔'' برکھا نے ایک دم اپنے تیور بدل لئے۔

''جو حکم برکھا جی۔'' واسم نے بڑی فرمانبرداری سے سر جھکایا اور واپس جانے کے لئے مڑ گیا۔

برکھا نے بکرے کی سری اٹھا کر اپنے منتر والے کمرے میں رکھی اور پھر گیٹ کی طرف چل دی۔ جب وہ گیٹ کے نزدیک پہنچی تو واسم گاڑی نکال چکا تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے برکھا کو سلام کیا اور پھر تیزی سے گاڑی نکال لے گیا۔ برکھا گیٹ بند کر کے واپس منتر والے کمرے کے سامنے پہنچی۔ اس نے اندر جانے سے پہلے ساڑھی اور بلاؤز اتار کر دروازے کی دہلیز پر پھینکا اور دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔ پھر اس نے فرش پر رکھی ہوئی بکرے کی سری اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھائی اور کمرے میں چکر لگاتے ہوئے زور زور سے منتر پڑھنے لگی۔

☆......☆......☆

ناصر مرزا دوپہر کو ساحل عمر کے گھر پہنچا۔ وہ انگوٹھی ابھی تک اس کی جیب میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر گپ شپ لگا کر حافظ موسیٰ کی طرف نکل جائے گا۔ ان سے اس انگوٹھی کے بارے میں دریافت کرے گا۔ اگر اس انگوٹھی پر جادو کیا گیا ہے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی۔ دوسرے حافظ موسیٰ کے علم میں یہ بات آ جائے گی کہ برکھا نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہے۔ اس کے ان شعبدوں سے نمٹنا ہو گا۔

ساحل عمر نے اپنی روداد سنائی۔ اس نے بتایا کہ برکھا سے اس کی کیا بات ہوئی۔ ناصر مرزا نے ساحل عمر کی گفتگو توجہ سے سنی۔

برکھا اب کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس نے اپنے عزائم کا بھرپور اظہار کر دیا تھا اور ساتھ میں یہ بھی انکشاف کر دیا تھا کہ وہ انگوٹھی اس کی بھجوائی ہوئی تھی اور وہ کوئی سادہ انگوٹھی نہ تھی۔ اس پر باقاعدہ عمل کیا گیا تھا۔

ساری روداد سن کر ناصر مرزا نے کہا۔ ''پھر اب کیا چھپا رہ گیا۔ اس نے تو انگوٹھی کے بارے میں بتا دیا کہ وہ اس نے پڑھ کر بھیجی تھی۔ میرا خیال تھا کہ حافظ صاحب کو جا کر دکھاؤں گا' اب دکھانے کا کیا فائدہ۔''

ناصر مرزا نے اپنی جیب سے وہ انگوٹھی نکالی اور سامنے میز پر رکھی ایش ٹرے میں اچھال ڈی۔

''حافظ موسیٰ کو اس کی دھمکی کے بارے میں تو بتانا چاہئے۔ کیا خیال ہے تمہارے ساتھ کسی دن میں بھی نہ چلوں۔''

''ہاں چلو...... وہ تو تمہیں ایک عرصے سے بلا رہے ہیں۔ نکاح والے دن بھی بلاوہ دے کر گئے ہیں۔ کب چلو گے؟''

''ایک دو روز میں چلنے کا پروگرام بناتے ہیں۔'' ساحل عمر نہ کچھ سوچ کر کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ پھر میں چلتا ہوں۔ آج ذرا دفتر کا چکر لگا لوں۔ کئی دن سے دفتر کی صورت نہیں دیکھی۔'' ناصر مرزا اٹھتا ہوا بولا۔

اس سے پہلے کہ ساحل عمر اسے جانے سے روکتا' اماں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ناصر مرزا کی بات سن لی تھی۔ وہ فوراً بولیں۔ ''لو اب کھانا نکلنے والا ہے تو تم جا رہے ہو۔ اب کھانا کھا کر جانا۔ آؤ' میں تم دونوں کو بلانے آئی تھی۔''

''اچھا اماں۔'' ناصر مرزا نے ہنس کر کہا۔ ''آپ کا کہا بھلا کون ٹل سکتا ہے۔''

''جیتے رہو بیٹا...... اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔'' اماں نے خوش ہو کر دعا دی۔

''تمہاری چاند سی دلہن آئے۔'' ساحل عمر نے اٹھتے ہوئے ٹکڑا لگایا۔

''اللہ نہ کرے۔'' اماں نے ساحل عمر کو گھور کر دیکھا۔ ''ناصر مرزا کی بہو کسی چاند سے کم ہے کیا؟''

''ہاں اماں چاند تو ہے لیکن گرہن لگا۔'' ناصر مرزا نے ہنس کر کہا۔

''چلو ہٹو...... اتنی پیاری تو ہے۔'' اماں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

پھر وہ تینوں ڈرائنگ روم سے نکل گئے۔

☆......☆......☆

ورشا کے دل پر ایک بے نام سی اداسی چھائی تھی۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ شعری مجموعہ پڑھتے پڑھتے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ سے کھڑی ہو گئی۔ پھر وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ چہرہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ آج اس نے اپنے بال بھی نہیں باندھے تھے۔ منہ بھی ایسا ہی چلتا پھرتا دھویا تھا۔ آج اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کئے۔ کپڑے شکن آلود تھے۔ وہ آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر مسکرائی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ میں جان نہیں۔ مسکراہٹ بڑی پھیکی اور اداس سی ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر مسکرائی اور اپنی مسکراہٹ میں جان ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہی' اس کی مسکراہٹ مزید پھیکی' مزید بے جان ہو گئی۔

تب وہ آئینے والی ورشا سے مخاطب ہوئی۔ ''ورشا میری جان' تجھے کیا ہو گیا؟''

ورشا کو اپنی ہی آواز بڑی اجنبی محسوس ہوئی۔ "آئینے کے باہر والی ورشا نے آئینے کے اندر والی ورشا کو غور سے دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر آئینے والی ورشا آپ ہی آپ بولنے لگی۔ "میں کیاں جانوں' مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اتنا ضرور جانتی ہوں کچھ ہو ضرور گیا ہے۔ میرے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ میں خالی خالی سی ہو گئی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میرا کچھ گم ہو گیا ہے۔ کیا گم ہو گیا ہے' یہ خود مجھے بھی معلوم نہیں۔ کبھی تو میں بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتی ہوں' کھو جاتی ہوں۔ ہوش آتا ہے تو کافی دیر تک یہی نہیں معلوم ہوتا میں کہاں ہوں۔ ورشا یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے کیا غم لگ گیا ہے۔ کوئی غم ضرور ہے۔ جو اندر ہی اندر میری روح کو کھا رہا ہے۔ مجھے کیا غم ہے۔ یہ جب میں اپنے آپ سے پوچھتی ہوں تو کوئی جواب نہیں ملتا۔

کون جواب دے گا۔ کس سے پوچھوں۔ یہاں تو کوئی ہم راز بھی نہیں۔ ایک ماں ہے' اسے اپنے دھندوں سے فرصت نہیں' وہ پراسرار طاقتوں کے چکر میں پڑی ہے۔ پتہ نہیں کیا بننا چاہتی ہے۔ طاقت کی خواہش' اقتدار کی ہوس جانے اسے کہاں لے جائے گی۔

آج اس نے ایک نیا چکر چلایا ہوا ہے۔ وہ واسم بکرا جانے کیوں لایا تھا۔ باہر نکل کر دیکھوں تو آخر کیا ہو رہا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے سامنے والی ورشا پر نظر ڈالی اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "اچھا' میری جان ہم چلتے ہیں تم خوش رہنے کی کوشش کرو۔"

پھر وہ آئینے کے سامنے سے ہٹی اور سوچتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ یہ اس کی کیا حالت ہو گئی ہے۔

آئینے سے باتیں کرنے لگی ہے۔ کیا جانتی نہیں کہ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہونے لگی۔

وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی تو شام ہو رہی تھی۔ اس بنگلے پر پہلے کیا کم اداسی کے ڈیرے تھے کہ سردیوں کی اداس شاموں نے اس پر مزید ویرانی کی چادر ڈال دی تھی۔

ایک کمرہ چھوڑ کر برکھا کا کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے چلتے ہوئے برکھا کے بیڈ پر نظر ڈالی۔ بیڈ خالی تھا۔ پھر اس نے رک کر کمرے میں جھانکا۔ کمرہ بھی خالی تھا۔ ورشا گھومتی ہوئی پھر برکھا کے عمل والے کمرے کے سامنے پہنچ گئی۔

اس نے دروازے پر برکھا جی کی ساڑھی دیکھی تو اسے بڑی حیرت ہوئی' پھر برکھا جو زور زور سے منتر پڑھتی ہوئی کمرے کے چکر کاٹ رہی تھی' دروازے کے نزدیک سے گزری تو ورشا اس کو ایک نظر دیکھتے ہی خوف سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں بکرے کا سر تھا اور وہ کپڑوں سے بے نیاز کچھ اس طرح اپنے عمل میں مصروف تھی کہ اچھے بھلے دل گردے کا آدمی اسے اس حالت میں دیکھ لیتا تو خوف کے مارے بے ہوش ہو جاتا۔ اس سے پہلے کہ برکھا دوبارہ چکر کاٹ کر دروازے کے سامنے سے گزرتی وہ' فوراً وہاں سے ہٹ آئی۔ بنگلے کے اندر گاڑی نہ تھی اس کا مطلب ہے کہ واسم جا چکا ہے پھر وہ گھومتی ہوئی بنگلے کے پیچھے پہنچی وہاں اس نے سر کٹا بکرے کا دھڑ ریت میں اٹا دیکھا۔ ایک جگہ ریت پر خون پڑا ہوا تھا جو اب جم کر کالا ہو گیا تھا۔

اس کے دل پر پہلے ہی وحشت برس رہی تھی۔ اس طرح کے منظر دیکھ کر اسے ابکائیاں آنے لگیں۔

☆......☆......☆

شام ڈھل رہی تھی۔

اندھیرا پھیلنے کو تھا۔ اس گھر پہ یہ شام کسی اور انداز میں اتری تھی۔ یہاں اداسی نہ تھی۔ ہر طرف قہقہے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک سرخوشی تھی' جوش تھا۔

مسعود آفاقی اپنی فیملی کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ مسعود آفاقی کی بیوی ایک ہنسوڑ عورت تھی۔ بات بات پر ہنسنا' قہقہے لگانا' نت نئے چٹکلے چھوڑنا' بات سے بات پیدا کرنا' یہ اس عورت کا کمال تھا۔ وہ جس محفل میں ہوتی' وہاں سے خاموشی اور اداسی اپنے اپنے بستر گول کر جاتیں۔

مسعود آفاقی کی بیوی صائمہ' عذرا کو لطیفے سنا سنا کر بے حال کر رہی تھی۔ اس کی گفتگو سے سبھی محظوظ ہو رہے تھے کہ اچانک محفل کا رنگ بدل گیا۔

سب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ جس کو جو جگہ پسند تھی' وہ وہاں بیٹھا تھا۔ ساحل عمر صوفے سے ٹیک لگائے قالین پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ عذرا اور صائمہ ایک صوفے پر بیٹھی تھیں۔ مسعود آفاقی' ساحل عمر کے سامنے مگر کچھ فاصلے سے گاؤ تکیہ لگائے نیم دراز تھا۔ اماں واش روم میں تھیں اور مرجینا کچن میں۔

صائمہ کے کسی لطیفے پر سب لوگ لوٹ پوٹ ہو رہے تھے کہ وہ ایک دم کہیں سے آ کر اس کی ٹانگ پر گرا۔ ساحل عمر نے گھبرا کر اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں' وہ کوئی ایک کلو وزن کا گوشت کا ٹکڑا تھا۔ بالکل تازہ گوشت تھا۔

صائمہ اور عذرا کی گوشت کے ٹکڑے پر نظر پڑی تو وہ دونوں ایک دم چیخ اٹھیں۔ مسعود آفاقی پریشان ہو کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''ساحل یہ کیا ہے؟''

ساحل کی خود اپنی سٹی گم تھی۔ وہ کیا بتاتا کہ کیا ہے؟ وہ حیران ہو کر اس گوشت کے ٹکڑے کو دیکھ رہا تھا کہ وہ آخر آیا کہاں سے؟

یہ گوشت کا ٹکڑا آیا کہاں سے کس نے پھینکا؟ یہ سوالات تو اپنی جگہ اہم تھے اور توجہ طلب...... لیکن اس گوشت کے ٹکڑے کے گرتے ہی ساحل عمر کی ٹانگوں میں جو درد شروع ہوا اس نے سوالات کو پس پشت ڈال دیا۔

اس کی دونوں ٹانگوں میں اچانک اس قدر شدید تکلیف شروع ہوئی کہ وہ بے حال ہو گیا۔ وہ اپنی دونوں ٹانگوں کو دھاڑ دھاڑ قالین پر مار رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

اماں واش روم سے وضو کر کے لاؤنج میں آئیں تو انہوں نے یہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا دیکھا۔ ہر ایک کے چہرے پر خوف منڈلا رہا تھا۔

''کیا ہوا بھئی...... یہ سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا۔'' اماں نے پوچھا۔

''اماں' یہ!'' مسعود آفاقی نے اس گوشت کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کیا ہے؟'' اماں جلدی سے آگے بڑھیں۔ انہوں نے جھک کر اس گوشت کا معائنہ کیا۔

''میرے خدایا' یہ کہاں سے آیا...... اے اللہ تو رحم فرما۔''

''اماں کچھ پتہ نہیں' یہ کہاں سے آیا۔ بس اچانک کہیں سے گرا اور اس کے گرتے ہی ساحل کی ٹانگوں میں درد شروع ہو گیا۔''

''ہیں۔'' اماں اب صحیح معنی میں پریشان ہوئیں۔ انہوں نے گھبرا کر ساحل عمر کو دیکھا جو اماں کو دیکھ کر اپنا درد ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک ٹانگ پکڑی ہوئی تھی۔ کبھی وہ ایک ٹانگ پکڑتا اور کبھی دوسری...... پھر وہ زور زور سے اپنی دونوں ٹانگیں قالین پر مارنا شروع کر دیتا۔

''اے اللہ...... میرے بچے کو کیا ہوا؟'' انہوں نے اس کے نزدیک بیٹھ کر فوراً اس کی ایک ٹانگ پکڑی اور جلدی جلدی کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا۔ اس پھونک مارنے سے درد کچھ کم ہوا لیکن صرف چند لمحوں کے لئے۔ اس کے بعد پھر وہ وہیں پہنچ گیا۔

اماں نے آواز دے کر مرجینا سے اس گوشت کے ٹکڑے کو اٹھانے کو کہا۔ اس نے اس گوشت کے ٹکڑے کو دیکھا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ پھر وہ کچھ اس طرح خوفزدہ ہو گئی کہ اس ٹکڑے کو اٹھانے کی ہمت نہ رہی۔ تب اماں نے اس کے ہاتھ سے شاپر لے کر وہ گوشت کا ٹکڑا اس میں ڈالا اور پھر مرجینا سے بولیں۔ ''اسے کوڑے کے ڈبے کے پاس ڈال دو۔'' پھر فوراً ہی بولیں۔ ''نہیں اسے گھر کے باہر پھینک آؤ۔''

''جی اچھا اماں جی۔'' مرجینا نے ڈرتے ڈرتے وہ شاپر ان کے ہاتھ سے اٹھا لیا اور پھر لاؤنج سے باہر چلی گئی۔

ساحل عمر کی تکلیف کم نہیں ہو رہی تھی۔

وہ اب قالین پر ہی لیٹ گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بند تھیں۔ کبھی وہ آنکھیں کھولتا کبھی بند کر لیتا تھا کبھی وہ اپنی دونوں ٹانگیں سکیڑ لیتا تھا اور کبھی ایک دم پھیلا کر چیخنے لگتا تھا۔

''ساحل میرے بچے کیا ہو رہا ہے؟'' اماں روہانسی ہو رہی تھیں۔

''اماں' مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی میری پنڈلیوں کی رگیں کسی چاقو سے کاٹ رہا ہو۔'' ساحل عمر نے رک رک کر بتایا۔

''مسعود' جلدی سے ناصر کو فون کرو...... اس فوراً بلاؤ۔'' اماں نے بے تاب ہو کر کہا۔

''جی اچھا اماں۔'' مسعود آفاقی فوراً اٹھ کر ٹیلی فون کے نزدیک پہنچا۔ اس نے پہلے گھر ملایا لیکن وہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ ابھی آفس سے واپس نہیں آیا۔ تب اس نے اس کے دفتر فون کیا۔ وہ دفتر سے نکلنے ہی والا تھا کہ مسعود آفاقی کا فون آ گیا۔

''کیا ہوا مسعود خیر تو ہے۔؟'' اس نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

''بھائی تم جلدی ادھر آ جاؤ ساحل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کہیں سے اچانک گوشت کا ٹکڑا آ کر گرا اور پھر اس کی ٹانگوں میں شدید درد شروع ہو گیا یا وہ تڑپ رہا ہے۔ تم جانتے ہو کہ چھوٹی موٹی تکلیفوں کو تو وہ گردانتا ہی نہیں۔ یہ تکلیف اتنی زیادہ ہے کہ باوجود ضبط کے اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی ہیں۔'' مسعود آفاقی نے جلدی جلدی ساری بات بتا دی۔

''میں فوراً آ رہا ہوں۔ یہ سب اس کتے کی بچی کی کارروائی ہے۔'' یہ کہہ کر ناصر مرزا نے ریسیور رکھ دیا اور غصے میں کھولتا ہوا اپنے دفتر سے باہر نکل آیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے ساحل عمر کے گھر کا رخ کیا۔ وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس منحوس عورت نے ساحل کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ یہ اس کا تیسرا حملہ تھا۔ پہلے اس نے اسے اغواء کیا' اس کے بعد اس نے انگوٹھی بھیجی اور اب یہ سفلی کا عمل کر دیا۔ اس عورت کی جرات روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ عابد منجم کا خون اس کی گردن پر تھا۔ اس کی بھتیجی کے قتل کی ذمہ دار وہ تھی۔ اس کے علاوہ نہ جانے کتنے معصوم لوگوں کی زندگی تباہ کی ہو گی اس شیطان کی بچی نے۔

اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ کھلے بندوں دھمکیاں دے رہی تھی اور بے خوف کارروائیاں کر رہی تھی۔ اب اس کا کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔ اتنے جرائم کے بعد تو وہ سزا کی مستحق ہو گئی تھی۔ اس کا قتل واجب ہو گیا تھا۔

انہی خیالات میں غلطاں وہ ساحل عمر کے گھر پہنچ گیا۔ گاڑی دیوار کے سائے میں کھڑی کر کے اس نے بیل دی۔ جلدی ہی گیٹ کھل گیا۔ گیٹ پر مسعود آفاقی تھا۔

''اب کیا حال ہے؟'' ناصر مرزا نے تیز تیز گھر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''اس کی بہت بری حالت ہے۔ درد سے تڑپ رہا ہے۔ اتنا سا چہرہ نکل آیا ہے۔ برسوں کا مریض لگ رہا ہے۔'' مسعود آفاقی نے اسے بتایا۔

ناصر مرزا لاؤنج میں داخل ہوا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی کے سوم میں آ گیا ہو۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چہرے فکر مند تھے۔ ساحل عمر اپنی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر قالین پر مار رہا تھا۔

''کیا ہوا ساحل؟'' ناصر مرزا نے قالین پر بیٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''پتہ نہیں۔'' وہ بڑی مشکل سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''پریشان مت ہو...... ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' پھر اس نے مرجینا سے کہا۔ ''ایک گہری پلیٹ میں پانی لے کر آؤ۔''

مرجینا بھاگ کر پلیٹ میں پانی لے آئی اور ناصر مرزا کے سامنے رکھ دیا۔

ناصر مرزا نے اپنی جیب سے چاقو نکالا' اسے کھول کر چاقو کی نوک اپنے ہونٹوں کے نزدیک کر لی اور کچھ پڑھنے لگا۔

چند لمحے پڑھنے کے بعد اس نے چاقو کی نوک پر ایک پھونک ماری اور پھر چاقو کی نوک

سے پلیٹ میں ضرب کا نشان بنایا۔ اس کے بعد پھر اس نے چاقو کی نوک پر کچھ پڑھا اور پلیٹ میں ضرب کا نشان بنایا۔ اس طرح اس نے تین مرتبہ کیا۔ اس کے بعد اس نے چاقو جیب میں رکھ لیا اور پلیٹ اٹھا کر سیدھے ہاتھ میں پانی لے کر اس نے اس کی پوری ٹانگ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پانی کے چھینٹے مارتے ہی اس کی ٹانگ میں تکلیف ایک دم کم ہوگئی۔ ناصر مرزا نے باری باری دونوں ٹانگوں پر چھینٹے مارے یہاں تک کہ پانی ختم ہوگیا۔ اس عمل سے اتنا ہوا کہ ساحل عمر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ٹانگوں کا درد بالکل تو ختم نہیں ہوا تھا لیکن قابل برداشت تھا۔ ساحل عمر نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے۔ اس کا چہرہ ایک دم زرد ہوگیا تھا۔

''ناصر یہ سب کیا ہے؟'' ساحل عمر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''برکھا کی دھمکی بھول گئے۔ اس نے تماشا دکھانے کو کہا تھا...... دکھا دیا تماشا۔''

''اچھا' یہ اس کی کارروائی ہے؟''

''سو فی صد۔'' ناصر مرزا نے بڑے یقین سے کہا۔ ''وہ گوشت کا ٹکڑا کہاں ہے؟''

''وہ تو میں نے اسی وقت گھر سے باہر پھنکوا دیا تھا۔'' اماں فوراً بولیں۔

''اچھا کیا اماں۔'' ناصر مرزا نے تعریفی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''اور وہ انگوٹھی کہاں ہے؟''

''وہ تمہارے پاس ہی تو تھی!'' ساحل عمر نے کہا۔

''کل میں نے تمہارے اس انکشاف کے بعد کہ برکھا نے پڑھی ہوئی انگوٹھی بھیجی تھی' اس انگوٹھی کو ایش ٹرے میں پھینک دیا تھا۔ ناصر مرزا نے ایش ٹرے کی طرف اچکتے ہوئے کہا۔

''اوہ' ہاں یاد آ گیا...... پھر وہ ایش ٹرے میں ہی پڑی ہوگی۔''

وہ ایک خوبصورت کرسٹل ایش ٹرے تھی۔ جو لاؤنج میں ایک میز پر رکھی تھی۔ اس وقت وہ میز ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ مسعود آفاقی نے اٹھ کر ایش ٹرے کو دیکھا۔ ایش ٹرے خالی تھی اس میں کوئی انگوٹھی نہ تھی۔

''اس میں تو کچھ نہیں۔'' مسعود آفاقی نے ایش ٹرے اٹھا کر دکھاتے ہوئے کہا۔

''ارے' پھر کہاں گئی...... اماں کیا آپ نے دیکھی تھی انگوٹھی۔''

''میں نے کل رات کو اس میں پڑی دیکھی تھی۔''

''پھر وہ ایش ٹرے میں سے کہاں گئی!''

پھر اس انگوٹھی کو پورے گھر میں تلاش کر لیا گیا لیکن اس انگوٹھی کا سراغ نہ لگا۔

''چھوڑیں اماں...... اب وہ نہیں ملے گی...... وہ اڑ گئی۔'' ناصر مرزا نے کہا۔ پھر وہ ساحل عمر سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں بھئی۔ اب کیا حال ہے؟''

''درد کافی کم ہے...... لیکن بالکل ختم نہیں ہوا۔''

''ہو جائے گا...... تم اپنے ذہن سے پریشانی نکال دو۔''

''نہیں...... میں پریشان نہیں ہوں بلکہ غصے میں ہوں۔''

"غصے سے کام نہیں چلے گا۔" ناصر مرزا نے مسکرا کر کہا۔ "ہمیں بڑے تدبر سے کام لینا ہو گا۔ بقول حافظ موسیٰ سفلی والی بڑی عیار ہے۔"

"ناصر...... حافظ موسیٰ سے ملنے جانا چاہئے۔"

"ہاں چلو...... بولو کب چلو گے۔"

"کل چلتے ہیں...... تم شام کو میرے پاس آ جاؤ۔"

درد اگرچہ خاصا کم تھا۔ ناصر مرزا کو امید تھی کہ وہ آہستہ آہستہ بالکل ختم ہو جائے گا۔ پھر بھی اس نے عمل دہرا کر ایک پلیٹ پانی اور تیار کر کے دے دیا تھا تاکہ اگر کسی وقت درد میں اضافہ ہو تو اس پانی کو ٹانگوں پر چھڑک دیا جائے۔

پھر ناصر مرزا اور مسعود آفاقی رات کا کھانا کھا کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔

عذرا ساحل گھر میں ہونے والے اس تماشے کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ شیطان کی چیلی برکھا اور اس کی بیٹی ورشا سے بہت پہلے سے واقف تھی۔ ایک وقت تھا کہ وہ ساحل عمر کے خوابوں میں آ کر ان لوگوں سے دور رہنے کی تنبیہ کرتی تھی۔ ساحل کا ورشا سے تعلق اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ جب اس کی دوستی گہری ہونے لگی تو وہ ایک دن خاصی افسردہ ہو گئی تھی اور اس کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ یہ وہی آنسو تھے جو اس کی تصویر پر برف کی مانند جم گئے تھے...... برف کے آنسو۔

اب وہ ساحل کی دنیا میں آئی تھی تو پھر انہی دونوں ماں بیٹیوں کے قصے تھے۔ وہ ساحل کی جان کے درپے ہو گئی تھی۔ وہ اس کے شوہر کو مار دینا چاہتی تھی لیکن عذرا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنا سب کچھ اپنی دنیا میں چھوڑ آئی تھی۔ یہاں وہ تہی دامن تھی۔ اس کے ہاتھ خالی تھے۔

رات کو ٹھیک گیارہ بج کر پانچ منٹ پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

گھنٹی کی آواز سن کر ساحل عمر ایک دم چونک گیا۔ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی جو ٹائم بتا رہی تھی وہ ایک خاص وقت تھا اور اب یہ وقت بہت برا ہو گیا تھا۔

چار گھنٹیاں بج چکی تھیں۔ ساحل عمر ٹیلی فون اٹھانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ تب اماں آگے بڑھیں اور انہوں نے ریسیور اٹھا کر بڑے کرخت لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

ادھر سے جواب میں ایک قہقہہ سنائی دیا۔

"اماں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر ساحل عمر کو بتایا۔ "کوئی ہنس رہی ہے۔"

پھر انہوں نے ریسیور سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔ "اوہ خبیث ہنستی کیوں ہے؟"

"اوہ بڑھیا...... ساحل کہاں ہے۔ ساحل کو فون دے۔" ادھر سے انتہائی ہتک آمیز لہجے میں کہا گیا۔

"کیا کام ہے...... تجھے ساحل سے...... مجھ سے بات کر۔" اماں کو غصہ آ گیا۔

"اوہ بڑھیا تجھ سے کیا بات کروں...... تو میری ایک پھونک کی ہے۔ ایک پھونک ماروں گی تو اڑ جائے گی۔ کیوں مجھ سے الجھتی ہے...... کیوں اپنی جان کی دشمن ہوئی ہے۔" ادھر سے تنبیہ کی گئی۔

"تو ہے کون؟"

"میں برکھا ہوں...... میں تم سب کی موت ہوں۔"

برکھا نے انتہائی پراسرار لہجے میں کہا۔ ایسے انداز میں کہ اماں کے جسم میں ایک خوف کی لہر آ کر گزر گئی۔ انہوں نے جواب دیئے بغیر ریسیور ٹیلی فون پر پٹخ دیا۔

"بدذات کہیں کی۔" وہ غصے سے بڑبڑائیں۔ پھر جب انہوں نے ساحل کی طرف نظر اٹھائی تو ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔

☆......☆......☆

ساحل عمر کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ خون بہہ کر اس کے ہونٹوں پر آ گیا تھا لیکن ساحل عمر کو مطلق احساس نہ تھا۔ وہ اماں کو حواس باختہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"اماں فون پر کون تھا؟" اس نے پوچھا۔

اماں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تیزی سے اس کے نزدیک آ گئیں اور گھبرا کر بولیں۔ "یہ تمہیں کیا ہوا؟"

ساحل عمر نے عجیب سی نظروں سے اماں کو دیکھا۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں' یہ کچھ جواب دے رہی ہیں۔ مجھے تو کچھ نہیں ہوا' پر اماں کو ضرور کچھ ہوا ہے۔ اس بات کی تصدیق کیلئے اس نے عذرا کی طرف منہ موڑا۔

ساحل عمر کا چہرہ دیکھتے ہی عذرا کی رنگت سفید پڑ گئی۔ "ارے...... خون؟" وہ گھبراہٹ میں اتنا ہی بول پائی۔ اب خون بہتا ہوا اس کے ہونٹوں پر پھیل چکا تھا۔ عذرا کی گھبراہٹ نے اسے اپنے ہونٹوں پر انگلی پھیرنے پر مجبور کر دیا۔ اسے اپنی انگلی پر چپچپاہٹ محسوس ہوئی تو اس نے اپنی انگلی کو دیکھا۔ انگلی کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ "ارے' یہ کیا ہوا؟"

"یہی تو میں پوچھ رہی تھی۔ تمہاری ناک سے خون نکل رہا ہے اور تمہیں احساس تک نہیں...... حیرت ہے۔" اماں نے کہا۔ "شاید تمہاری نکسیر پھوٹ گئی ہے۔ واش روم میں جا کر ناک میں ٹھنڈا پانی ڈال لو۔"

ساحل عمر فوراً اٹھ گیا۔ واش روم میں جا کر آئینے میں اس نے اپنی صورت دیکھی تو صورتحال کو سنگین پایا۔ اس کی ناک کے ایک نتھنے سے دھیرے دھیرے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی اپنی ناک دھوئی۔ اس میں پانی چڑھایا۔ اتنے میں اماں جگ میں ٹھنڈا پانی لے آئیں۔ اس نے جگ لے کر ٹھنڈا پانی اپنی ناک میں ڈالا پھر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔ عذرا اور اماں بھی وہیں بیٹھی تھیں۔

"خون رک گیا۔" اماں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا؟

"ہاں' اماں رک تو گیا ہے؟" ساحل عمر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اماں' ٹیلی فون پر کون تھی؟"

"ارے وہی بدذات بر کھا تھی۔" اماں نے غصے سے جواب دیا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" اس نے پوچھا۔

"بکواس کر رہی تھی۔" اماں نے سرسری سے انداز میں کہا پھر اچانک بولیں۔ "ارے یہ

خون تو پھر نکلنے لگا۔"

یہ سنتے ہی ساحل عمر نے فوراً واش روم کا رخ کیا۔ اس نے ناک اچھی طرح دھوئی کئی مرتبہ ٹھنڈا پانی ناک میں چڑھایا۔ خون ایک مرتبہ پھر رک گیا...... لیکن کچھ ہی دیر گزری تھی کہ پھر ناک سے خون نکلنے لگا۔

اس طرح خون بند ہوتے نکلتے پوری رات آنکھوں میں نکل گئی۔ وہ اگر سیدھا لیٹ جاتا تو خون ناک سے بہنا شروع ہو جاتا لیکن کچھ ہی دیر بعد ایسا محسوس ہوتا جیسے خون حلق میں جمع ہو رہا ہو۔ وہ واش روم میں جا کر تھوکتا تو واش بیسن خون سے سرخ ہو جاتا۔ اگر وہ کروٹ سے لیٹتا تو خون فوراً باہر نکلنے لگتا۔ یہی حالت بیٹھنے پر تھی۔ کئی تولیے خون میں بھر گئے تھے لیکن خون تھا کہ بند ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

اماں نے کئی مرتبہ اسے ہسپتال چلنے کو کہا تھا۔ ناصر مرزا سے بات کرنے کو کہا تھا لیکن نہ وہ ہسپتال گیا تھا اور نہ ہی اماں کو ناصر مرزا کو خبر دینے دی تھی۔ وہ اسے اتنی رات گئے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہسپتال اس لئے نہیں گیا تھا کہ وہ اس بات کو نکسیر پھوٹنے کا عمل سمجھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی وقت یہ خون خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔

صبح ہوتے ہوتے اس کا خاصا خون بہہ گیا۔ وہ نڈھال ہو کر پڑ گیا۔ اس نے کروٹ لے کر تولیہ ناک کے نیچے رکھ لیا۔ خون بہہ بہہ کر جذب ہوتا رہا۔ اب اماں کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ انہوں نے ناصر مرزا کو فون کر کے رات کی ساری روداد اس کے گوش گزار کر دی۔

ساری بات سن کر اس نے خفگی کا اظہار کیا۔ "یہ ساحل عمر آخر کب مجھے اپنا دوست سمجھے گا۔"

"تمہارے آرام میں خلل کی وجہ سے ساحل عمر نے تمہیں فون نہیں کرنے دیا۔" اماں نے بات نبھانے کی کوشش کی۔

آدھے گھنٹے کے اندر ناصر مرزا ساحل عمر کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے گھر میں گھستے ہی چٹکی بجا کر کہا۔ "ساحل فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔"

"ہسپتال جانا ہے؟" ساحل عمر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" ناصر مرزا نے انکار میں گردن ہلائی۔ "یہ ہسپتال کا کیس نہیں۔"

"تو پھر؟" اس نے سوال کیا۔

"ہم حافظ موسیٰ کے پاس چلیں گے۔" ناصر مرزا بولا۔ "وہ سفلی والی اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔"

"ہاں، ناصر تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر یہ نکسیر پھوٹنے کا معاملہ ہوتا تو خون کب کا بند ہو چکا ہوتا۔" اماں نے بھی ناصر مرزا کے فیصلے کی تائید کی۔

عذرا کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ پوری رات اس نے بھی جاگ کر گزار دی تھی۔ خون دیکھ کر اس کا دل کانپ رہا تھا۔ چہرے سے افسردگی ظاہر ہو رہی تھی۔

ناصر مرزا نے ایک نظر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی صورت دیکھ کر اس نے اسے

دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ ''عذرا' پریشان مت ہو۔ ساحل عمر ٹھیک ہو جائے گا۔''
''جی۔'' اس نے بہت دھیرے سے کہا اور ساحل عمر کی طرف پر امید نظروں سے دیکھا۔
''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''
''عذرا میں حافظ موسیٰ کی طرف جا رہا ہوں۔'' ساحل عمر نے روئی رکھ کر ناک پر پٹی باندھ لی تھی۔ اس طرح اس کی صورت مزید خوفناک ہو گئی تھی لیکن بہتے خون کا اس سے بہتر کوئی علاج نہ تھا۔ عذرا انہیں دروازے تک چھوڑ آئی۔

جب وہ حافظ موسیٰ کے گھر کے دروازے پر پہنچے تو سورج اچھی طرح نکل آیا تھا۔ ناصر مرزا گھنٹی بجانے لگا تو اس نے دیکھا کہ گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا ہے۔ اس نے سوچا گھنٹی بجائے بغیر گھر میں داخل ہو جائے۔ حافظ موسیٰ تک پہنچنے کیلئے گھر کے اندر تو جانا نہیں پڑتا تھا لیکن پھر وہ یہ سوچ کر رک گیا کہ اس طرح گھر میں داخل ہو جانا کسی طور مناسب نہیں۔ اسے گھنٹی بجانا چاہئے۔

ابھی وہ بیل بجانے کیلئے بٹن پر ہاتھ رکھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک گیٹ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ گیٹ سے دس بارہ سال کا بچہ نکلا۔ اس نے طائرانہ نظر ناصر مرزا پر ڈالی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''جی فرمائیے۔''

''حافظ موسیٰ سے ملنا ہے۔''

''اندر آ جائیے۔'' اس لڑکے نے بلا تامل کہا اور پھر فوراً ہی گیٹ کے اندر چلا گیا۔ وہ دونوں گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو انہیں وہ لڑکا کہیں نظر نہ آیا۔ ناصر مرزا حافظ موسیٰ کے ٹھکانے سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے ساحل عمر کا ہاتھ پکڑا اور مکان کے پچھواڑے کی طرف بڑھنے لگا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ حافظ موسیٰ درخت کے نیچے کھرے پلنگ پر اپنی لاٹھی دونوں ہاتھوں میں تھامے مخصوص انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ موسم تھوڑا سا ٹھنڈا تھا۔ اس لئے ان کے کندھے پر ایک چادر پڑی تھی۔

ناصر مرزا نے کھلے دروازے پر کھڑے ہو کر کواڑ تھپتھپایا۔ دروازے کی آواز سن کر حافظ موسیٰ نے اپنا چہرہ اٹھایا اور پوچھا۔ ''کون ہے بھائی؟''

''ناصر مرزا اور ساحل عمر۔'' ناصر مرزا نے جواب دیا۔

''اچھا اچھا۔'' حافظ موسیٰ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''آ جاؤ بھئی' دروازے پر کیوں کھڑے ہو؟''

''چلو۔'' ناصر مرزا ساحل عمر سے مخاطب ہو کر بولا۔

ساحل عمر دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے ناصر مرزا...... دونوں نزدیک پہنچ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔

''آؤ بھئی بیٹھ جاؤ...... کھڑے کیوں ہو؟'' حافظ موسیٰ نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

ناصر مرزا نے ساحل عمر کو اس کے نزدیک بٹھایا اور خود ذرا پیچھے پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔

''بہت خاموشی ہے...... خیر تو ہے؟'' حافظ موسیٰ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''حافظ صاحب خیر نہیں ہے۔'' ناصر مرزا بولا۔ ''برکھا نے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔''
'اچھا' وہ سفلی والی۔'' حافظ موسیٰ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''وہ کیا کہتی ہے؟''
''وہ تماشے دکھا رہی ہے...... اس نے ساحل کا راتوں کا چین چھین لیا ہے۔'' ناصر مرزا نے فکر مند ہو کر کہا۔

''وہ تماشے والی عورت ہے ...... اس نے تماشا ہی دکھانا ہے۔ اور کیا کرنا ہے۔ آخر ہوا کیا؟''

حافظ موسیٰ کے سوال کے جواب میں شادی کی رات سے اب تک اس نے جو کارروائی کی تھی وہ حافظ موسیٰ کے گوش گزار کر دی۔ ساری بات سن کر حافظ موسیٰ گویا ہوئے۔ ''خون ابھی تک جاری ہے۔''

''جی۔'' اس مرتبہ جواب ساحل عمر نے دیا۔

حافظ موسیٰ نے لاٹھی دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس میں بنی آنکھ پر اپنی بے نور آنکھ رکھ دی۔ چند لمحے وہ اسی طرح بیٹھے رہے۔ پھر لاٹھی ہٹا کر اپنی گردن اونچی کر لی اور ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔
''اچھا۔''

ساحل عمر نے ناصر مرزا کی طرف دیکھا۔ دونوں اس اچھا کا مطلب نہ سمجھ سکے۔
''خیر کوئی بات نہیں۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے ہم کلام تھے۔ انداز کچھ تنبیہی تھا۔
''کیا ہوا حافظ صاحب۔'' ناصر مرزا نے آہستگی سے پوچھا۔
''ناصر مرزا وہ چاقو کہاں ہے؟''
''میرے پاس ہے حافظ صاحب۔'' ناصر مرزا بولا۔
''اس چاقو کی نوک سے اس درخت کی جڑ سے تھوڑی سی مٹی کھود کر میرے پاس لاؤ۔'' حافظ موسیٰ نے ہدایت کی۔

''جی اچھا۔'' یہ کہہ کر ناصر مرزا نے اپنی پینٹ کی جیب سے چاقو نکالا اور پھر نیم کے درخت کی جڑ میں بیٹھ کر تھوڑی سی مٹی کھود کر اپنی ہتھیلی پر رکھی اور ان کے نزدیک آ کر ہاتھ پھیلا دیا۔ ''یہ لیجیے۔''

حافظ موسیٰ نے ہاتھ بڑھایا۔ ناصر مرزا نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے مس کیا۔ انہوں نے مٹی پر اپنی دو انگلیاں رکھ کر کچھ پڑھا اور بولے۔ ''ناصر مرزا اس مٹی کو ساحل کی ناک کے نزدیک کر دو۔ پھر وہ ساحل عمر سے مخاطب ہوئے۔ ''ساحل تم نے اس مٹی کو سونگھنا ہے' تین مرتبہ گہرے مگر آہستہ سانس لے کر۔''

''جی اچھا۔'' ساحل عمر نے اپنی ناک سے پٹی کھول دی۔ روئی ہٹا لی۔ روئی خون سے تر ہو چکی تھی۔

ناصر مرزا نے اپنی ہتھیلی آگے کی۔ ساحل عمر نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر آگے کھینچا۔ ناک کے نزدیک لا کر اس نے اس مٹی کو سونگھا۔ اس مٹی میں گلاب کی سی خوشبو تھی۔ اس

نے تین گہرے سانس لئے۔ اسے فوری طور پر سکون محسوس ہوا' ساتھ ہی بہتا ہوا خون بند ہو گیا۔
"کچھ سکون ملا؟" انہوں نے پوچھا۔
"نہ صرف سکون ملا بلکہ ناک سے خون آنا بھی بند ہو گیا۔"
"ناصر مرزا یہ مٹی تم نے جہاں سے کھودی تھی اسے وہیں ڈال دو۔"
ناصر مرزا نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔
"ساحل عمر اب تم میری ایک بات غور سے سن لو لیکن میری بات سن کر پریشان بالکل مت ہونا۔"
"جی فرمائیے۔" ساحل عمر نے اس کی طرف دیکھا۔
"وہ سفلی والی اب تمہاری جان کے درپے ہو گئی ہے۔ اس پر جنون سوار ہو گیا ہے۔ انتقام کی آگ میں اندھی ہو گئی ہے۔ خیر ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ تمہاری موت نہیں بن سکتی۔ وہ خود اپنی موت ہے۔ اب تمہیں ایک کام کرنا ہے۔ وہ تلوار کہاں ہے؟"
"گھر پر ہے۔" ساحل عمر نے جواب دیا۔
"یہ کام تمہیں بارہ بجے سے پہلے کرنا ہے۔" حافظ موسیٰ نے ہدایت کی۔ "یہاں سے واپس جا کر یہ کام جتنی جلد ممکن ہو سکے کر لینا۔ اس تلوار کو تم اپنے گھر کے پچھواڑے ایک خاص مقام پر جس کی نشاندہی خود بخود ہو جائے گی۔ اس تلوار کو زمین میں دستے تک اتار دینا۔"
"کچھ پڑھنا بھی ہو گا۔" اس نے دریافت کیا۔
"ہاں بالکل...... میں تمہیں بتاتا ہوں۔ کیا پڑھنا ہے اور کیا کرنا ہے...... میری بات بہت غور سے سنو۔" حافظ موسیٰ نے پھر پوری تفصیل سے ساحل عمر کو سب کچھ سمجھا دیا۔

☆......☆......☆

سارلوک کی وہ خاندانی تلوار جسے وہ مقدس کہتا تھا اور جس تلوار سے ساحل عمر نے راعین کا خاتمہ کیا تھا۔ وہ تلوار ساحل عمر نے اپنے کپڑوں کی الماری میں ایک کونے میں کھڑی کر دی تھی۔
اس نے وہاں سے وہ تلوار نکالی اور اپنے مکان کے عقب میں پہنچ گیا۔ حافظ موسیٰ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس تلوار کو کس جگہ زمین میں گاڑنا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس بات کی نشاندہی خود بخود ہو جائے گی۔ ساحل عمر کے مکان کا عقبی حصہ پھولوں اور کیاریوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب وہ کہ تلوار لے کر عقبی حصے میں پہنچا تو اسے وہ جگہ فوراً ہی نظر آ گئی۔ حافظ موسیٰ نے سچ کہا تھا۔ اس جگہ کی نشاندہی بہت واضح انداز میں کر دی گئی تھی۔
مغربی دیوار کے سائے میں ایک گلاب کے پودے کے نزدیک پھول کی پتیوں سے ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ یہ گلاب کی پتیاں تھیں اور ان کا رنگ زرد تھا۔
وہ اس دائرے کے نزدیک گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس نے تلوار کا دستہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر کچھ پڑھتے ہوئے تلوار زمین پر زور سے ماری۔ تھوڑی سی تلوار زمین میں دھنس گئی۔ اب اسے تلوار کو اس طرح پکڑے پکڑے حافظ موسیٰ کی ہدایت کے مطابق پڑھنا تھا۔ ساحل عمر نے پورے اعتماد

اور یقین کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے پڑھتے اس نے محسوس کیا کہ تلوار خود بخود زمین میں دھنستی جا رہی ہے۔

آدھے گھنٹے کے بعد جب اس کا عمل مکمل ہوا تو وہ پوری تلوار دستے تک زمین میں دھنس چکی تھی۔ مٹی اس قدر نرم ہو گئی تھی کہ وہ تلوار زمین میں بغیر کسی دباؤ کے اندر گھستی چلی جا رہی تھی۔ ساحل عمر نے اس تلوار کا دستہ دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا لیکن اس نے تلوار پر کسی قسم کا زور نہیں ڈالا تھا۔ اس کے باوجود تلوار زمین میں اس طرح اترتی چلی جا رہی تھی جیسے کیک میں چھری۔

عمل مکمل ہونے کے بعد اس نے کھڑے ہو کر تلوار کو دونوں ہاتھوں سے زمین سے کھینچنا چاہا۔ اس کا خیال تھا کہ تلوار زمین سے اسی طرح آرام سے باہر آ جائے گی جس طرح گئی تھی لیکن تلوار ٹس سے مس نہ ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے پتھریلی زمین میں سیمنٹ کے ذریعے گاڑ دیا گیا ہو۔

ساحل عمر نے وہ تلوار وہیں زمین میں گڑی چھوڑ دی۔ کیونکہ حافظ موسیٰ نے یہی ہدایت کی تھی۔

ساحل عمر یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ انہوں نے ایسی ہدایت کیوں کی تھی۔ اس کے پیچھے کیا حکمت عملی تھی جبکہ اسے یہ بات اچھی طرح یاد تھی کہ جب حافظ موسیٰ اس کے گھر آئے تھے تو جاتے ہوئے اس تلوار کو بطور خاص حفاظت کی ہدایت کر کے گئے تھے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اس تلوار کے پیچھے چور لگیں گے۔ اسی ہدایت کے پیش نظر اس نے تلوار ایک ایسی جگہ رکھ دی تھی کہ چوری کرنے والا اس تلوار تک فوری طور پر نہ پہنچ سکے۔

اب حافظ موسیٰ نے اس تلوار کو کھلے آسمان تلے گڑوا کر چوروں کو کھلی دعوت دے دی تھی کہ دیوار کود کر اندر آؤ اور تلوار اکھاڑ کر لے جاؤ...... حافظ موسیٰ کا یہ طرز عمل اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

☆......☆......☆

ورشا یہ بات کئی دن سے محسوس کر رہی تھی...... لیکن وہ اسے اپنا وہم، کبھی آنکھوں کا فریب، نظروں کا دھوکا سمجھ کر نظر انداز کرتی آ رہی تھی۔ وہ سوچتی تھی کیونکہ یہ چیز اسے کئی مرتبہ خواب میں دکھائی دے چکی تھی اس لئے اس کے ذہن نے خواب کو حقیقت بنا کر پیش کر دیا ہے۔

اس نے اس خواب کو سات دن تک مسلسل دیکھا تھا۔ وہ دیکھتی تھی کہ وہ اپنے کمرے میں آئی ہے، جب وہ کھلے دروازے سے اپنے کمرے میں داخل ہوتی تو اسے ایک شخص اپنے بیڈ پر لیٹا دکھائی دیتا ہے جو اس کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اسے بڑی محبت سے دیکھتا اور پھر وہ بغلی دروازہ کھول کر کمرے میں چلا جاتا۔ یہ کمرہ کبھی برکھا کا بیڈ روم ہوتا تھا۔ مناف کو قتل کرنے کے بعد برکھا نے اپنا بیڈ روم تبدیل کر لیا تھا۔ اب اس کا بیڈ روم اس کمرے کو چھوڑ کر دوسرے کمرے میں تھا۔

تین دن تک جب ورشا کو یہ خواب بغیر کسی فرق کے نظر آتا رہا تو اس نے اس کا ذکر اپنی ماں سے کیا۔ یہ خواب سن کر برکھا کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہویدا ہو گئے۔ اس نے کرید کرید کر اس شخص کا حلیہ پوچھا۔ ورشا نے جب اس شخص کا حلیہ بتایا تو برکھا کے جسم پر سنسنی سی دوڑ گئی۔

''اوہ۔'' برکھا نے ٹھنڈا اور گہرا سانس لیا۔

''ممی کیا ہوا؟'' ورشا نے پوچھا۔

''ورشا کیا تو اس شخص کو نہیں جانتی؟'' برکھا نے سوال کیا۔

''ممی میں اگر جانتی ہوتی تو آپ کو فوراً اس کا نام بتاتی۔ آپ کو اس کا حلیہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

''وہ تیرا نانا ہے۔'' برکھا نے بڑے پراسرار انداز میں بتایا۔

''ہیں۔ وہ میرے نانا ہیں۔ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ ہمارے گھر میں تو ان کی کوئی تصویر بھی نہیں۔''

''میں حیران ہوں کہ اتنی طویل مدت کے بعد اس نے تیرے خوابوں میں کیوں آنا شروع کیا ہے۔'' وہ فکر مند تھی۔

''ممی حیران ہو یا پریشان؟'' ورشا نے سوال کیا۔

''میں حیران بھی ہوں اور پریشان بھی کیونکہ اس کا مسلسل تیرے خواب میں آنا کسی خطرے سے خالی نہیں۔''

''ممی آپ کو اپنے باپ سے کس طرح کا خطرہ ہو سکتا ہے۔'' ورشا نے پوچھا۔ ''وہ بھی مرے ہوئے باپ سے۔''

''کیا تو نہیں جانتی؟'' برکھا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''نہیں مجھے کیا معلوم؟'' ورشا نے معصومیت سے کہا۔

''میں نے تجھے بتایا تو تھا کہ میں نے اپنے باپ کو مار دیا تھا۔ اسے بھینٹ چڑھا دیا تھا۔''

''ہاں یہ بات تم نے بتائی تھی...... ممی تم نے تو میرے باپ کو بھی قتل کر دیا تھا۔ میں اس قتل کی چشم دید گواہ ہوں۔'' ورشا کی نظروں میں فوراً وہ منظر آ گیا جب اس نے اپنے باپ کو خون میں نہایا ہوا دیکھا تھا۔

''ہاں میں نے اسے بھی مار دیا تھا۔'' برکھا نے بڑی لاپروائی سے کہا۔

''ممی ابھی تم نے کتنے اور قتل کرنے ہیں۔ کتنے لوگوں کو بھینٹ چڑھانا ہے۔''

''میری راہ میں جو آئے گا...... میرے راستے کی جو رکاوٹ بنے گا وہ زندہ نہیں بچے گا۔'' برکھا نے بڑے اطمینان سے کہا۔ جیسے اس نے کسی کو قتل کرنے کی بات نہ کی ہو کسی کو کھانا کھلانے کی بات کی ہو۔

''ممی چاہے میں ہی کیوں نہ تمہارے راستے میں آ جاؤں۔'' ورشا نے اندازہ کرنے کیلئے سوال کیا۔

''میں نے کہا ناں جو بھی میرے راستے میں آئے گا' مارا جائے گا۔ چاہے وہ تم ہو یا ساحل عمر۔ ساحل عمر کو بہرحال میں نہیں چھوڑوں گی۔ میں اس کی موت بن جاؤں گی۔'' برکھا کے لہجے میں تپش آ گئی تھی۔

ورشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے اپنی اوقات کا اچھی طرح پتہ چل گیا تھا اور یہ بات اسے ہمیشہ سے معلوم تھی کہ جو عورت اپنے باپ کو مار سکتی ہے' شوہر کو مار سکتی ہے وقت آنے پر وہ اپنی بیٹی کا خاتمہ بھی کر سکتی ہے۔ یہ محض اس کا گمان تھا لیکن اپنی ماں کے منہ سے صاف صاف سن لینے کے بعد یہ گمان یقین میں بدل گیا تھا۔ پھر اس نے اپنی ماں کے پاس رکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر اس کے کمرے سے نکل کر جانے لگی۔ ابھی وہ دروازے پر ہی پہنچی تھی کہ برکھا نے آواز دی۔

''ورشا۔''

ورشا اس کی آواز سن کر دروازے پر ہی رک گئی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''میری جان ناراض ہو گئی۔'' برکھا نے اپنے لہجے میں شہد بھر کر کہا۔

''ممی آپ بھی خوب ہیں ایک طرف مجھے اپنی جان کہتی ہیں' دوسری طرف میری جان لینے کے درپے ہیں۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''ادھر آؤ' میرے پاس۔'' برکھا نے اسے اپنے پاس بلایا۔ لہجے میں خفگی بھرا پیار تھا۔

''جی ممی۔'' وہ دروازے پر کھڑی رہی' برکھا کی طرف نہیں بڑھی۔

تب برکھا خود اٹھ کر اس کے نزدیک آئی اور اسے اپنے گلے لگاتے ہوئے بولی۔ ''پگلی میں مذاق کر رہی تھی۔ بھلا کوئی اپنی جان بھی لیتا ہے تو تو میری جان ہے۔''

ورشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش کھڑی رہی پھر جب اس کے جسم کی بدبو ناقابل برداشت ہو گئی تو ورشا آہستگی سے الگ ہو گئی۔ ''اچھا ممی۔''

''ہاں' میں یہ کہہ رہی تھی کہ اب اگر تجھے تیرا نانا نظر آئے تو مجھے بتانا۔''

''اچھا ممی۔'' وہ بڑی فرمانبرداری سے بولی اور اس کے کمرے سے نکل آئی۔

ورشا کے نانا کالی داس نے اس کے خواب میں آنے کی شاید قسم کھا لی تھی۔ وہ چوتھے دن بھی اس کے خواب میں آ گیا اور پھر مسلسل آتا رہا۔ یہاں تک کہ سات دن پورے ہو گئے۔ برکھا نے ہدایت کی تھی کہ اب کالی داس اس کے خواب میں آئے تو وہ اسے ضرور بتائے۔

ورشا نے برکھا سے ذکر کر دیا۔ برکھا کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے ورشا کو ہدایت کی کہ آج رات وہ سونے سے پہلے ایک منتر پڑھ کر سوئے اس کے بعد وہ کبھی اس کے خواب میں نہیں آئے گا۔

ورشا نے وہ منتر یاد تو کر لیا مگر اس نے رات کو پڑھا نہیں۔ بھلا اسے اپنے نانا سے کیا دشمنی تھی۔ اگر وہ خواب میں آ رہے تھے تو شوق سے آئیں۔ وہ اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا رہے تھے۔

آٹھویں رات اس کا نانا بغیر منتر پڑھے ہی اس کے خوابوں سے غائب ہو گیا۔ صبح ہوتے ہی برکھا نے اس سے اس کے خواب کے متعلق دریافت کیا۔ ''کیا ہوا...... رات کو تو نہیں آیا وہ۔''

''نہیں ممی...... رات کو وہ خواب میں نہیں دکھائی دیئے۔'' ورشا نے بتایا اور یہ بات سچ تھی۔

یہ سن کر برکھا نے اطمینان کا سانس لیا جیسے کوئی متوقع خطرہ ٹل گیا ہو۔

لیکن یہ خطرہ ٹلنے والا نہ تھا۔ وہ اگر اس کے خوابوں میں آ رہا تھا اور اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا تو یہ سب کچھ بلا مقصد نہ تھا' بلا سبب نہ تھا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر جب ورشا اپنے کمرے میں آئی تو ایک دم ٹھٹک گئی۔ خواب والا منظر اس کے سامنے تھا۔ کالی داس اس کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسے بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر وہ اٹھا اور بغلی دروازے کو کھول کر اندر چلا گیا۔

ورشا بڑی حیران ہوئی اس نے دروازے کو دھکا دے کر دیکھا لیکن وہ دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ اب اسے یہ منظر اپنی جاگتی آنکھوں کا خواب محسوس ہوا۔

پھر یہ منظر اسے کئی دن تک نظر آیا۔ وہ اسے اپنا وہم' آنکھوں کا فریب' نظروں کا دھوکا سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی لیکن یہ وہم' فریب یا نظروں کا دھوکا نہ تھا۔

کالی داس اپنی زندگی میں ایک منصوبہ ساز شخص تھا۔ مرنے کے بعد بھی یہ منصوبہ بندی اس کی روح سے الگ نہ ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ورشا کے سامنے بہت دھیمے انداز میں زینہ بہ زینہ آیا تھا۔ اس کے خوابوں میں آنے کے بعد اس نے دوسرا قدم اٹھایا۔ وہ اسے جاگتی آنکھوں سے نظر آیا اور خوابوں کی طرح کئی دن نظر آتا رہا۔ اس طرح ورشا اس سے مانوس ہو گئی۔ اس کے دل سے سارا ڈر خوف نکل گیا۔

پھر جب ورشا چوتھے دن شام کو اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اٹھ کر کمرے سے غائب نہ ہوا بیٹھا رہا اور بڑے پیار بھرے انداز میں اسے پکارا۔ ''ورشا۔''

☆......☆......☆

وہ چیخ کی آواز تھی۔ رات کے سناٹے میں کوئی چیخا تھا۔ یہ ایک مردانہ چیخ تھی اور گھر کے پچھواڑے سے آئی تھی۔ اماں تہجد پڑھ کر ابھی لیٹی تھیں۔ آنکھوں میں ابھی نیند اترنے لگی تھی کہ اس چیخ نے ان کی آنکھوں سے نیند اڑا دی۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

چیخیں رہ رہ کر ابھر رہی تھیں۔ کوئی بڑی بھیانک آواز میں چیخ رہا تھا۔ ''ہائے میں مر گیا...... مجھے بچاؤ۔''

اماں نے فوراً ساحل عمر کے کمرے کا دروازہ بجایا۔ یہ چیخیں عذرا نے بھی سن لی تھیں۔ جب اماں نے دروازہ بجایا تو وہ ساحل عمر کو اٹھا چکی تھی۔

''کیا ہوا؟'' ساحل عمر نے آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

''باہر کوئی چیخ رہا ہے۔'' عذرا نے بتایا۔

اتنے میں دروازے پر اماں نے دوبارہ دستک دی۔

''دروازے پر کون ہے؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''شاید اماں ہیں۔'' عذرا نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

''تم ٹھہرو میں کھولتا ہوں دروازہ۔''

دروازے پر اماں پریشان کھڑی تھیں۔ وہ گھبرا کر بولیں۔ ''ساحل گھر کے پیچھے کوئی ہے۔''

''اچھا میں دیکھتا ہوں۔''

''ہائے تم اکیلے مت جاؤ۔''

''اماں میں لائٹ جلا کر پہلے کھڑکی سے دیکھتا ہوں پھر باہر جاؤں گا۔'' ساحل عمر نے اماں کو تسلی دی۔

ساحل عمر نے باہر دیوار پر لگی ٹیوب لائٹ روشن کی اور پھر پچھلی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر کا منظر ہی عجیب تھا۔ کوئی شخص گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ تلوار کے دستے پر تھے اور وہ بار بار اپنے جسم کو حرکت دے رہا تھا۔ اس نے چیخنا بند کر دیا تھا۔ جیسے ہی لائٹ جلی اس نے مڑ کر گھر کی طرف دیکھا۔ تب ساحل عمر نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ خبیث واسم تھا اور تلوار چرانے آیا تھا۔

ساحل عمر نے پہلی بار اس شخص کو اس وقت دیکھا تھا جب ورشا اسے ہاکس بے لے گئی تھی پھر یہ شخص ساحل عمر کو اغوا کر کے چتر وبھیل کے استھان پر لے گیا تھا۔ ساحل عمر اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ برکھا کا خادم خاص ہے۔ اس کے اشارے پر جان دینے والا۔

''ساحل صاحب بھگوان کے واسطے مجھے معاف کر دیں۔ آئندہ میں یہاں کبھی نہ آؤں گا۔'' وہ روشنی ہوتے ہی زور سے بولا۔

ساحل عمر نے اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ تب اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھ دستے پر جمے ہوئے ہیں۔ اس کے ہاتھ جیسے چپک گئے ہیں۔ وہ باوجود کوشش کے اپنے ہاتھ الگ نہیں کر پا رہا۔

اب ساحل پر حافظ موسیٰ کا طرز عمل واضح ہوا۔ انہوں نے اس تلوار کو باہر گڑوا کر جو چوروں کو دعوت دی تھی تو کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ یہ تلوار چور کیلئے پھندا ثابت ہوئی تھی۔

واسم کو دیکھ کر ساحل عمر کے تن بدن میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ گھر کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور واسم کے نزدیک پہنچتے ہی اس کے جسم پر ایک زور دار لات جمائی اور غصے سے بولا۔ ''کتے کے بچے تجھے یہاں تیری موت کھینچ لائی۔''

''ساحل صاحب مجھے اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ مجھے معاف کر دیں۔ میرے ہاتھ تلوار سے چپک گئے ہیں اور ہاتھوں میں سوئیاں سی چبھ رہی ہیں۔''

''خبیث کی اولاد تو یہاں کیا کرنے آیا تھا؟'' ساحل عمر نے غصے سے پوچھا۔

''ساحل صاحب میں آپ کو ہر بات صاف صاف بتا دوں گا۔ میرے ہاتھ آزاد کروا دیں میں بہت تکلیف میں ہوں۔''

''اب آزادی کو بھول جا پہلے یہ بتا کہ تجھے یہاں بھیجا کس نے اور کیوں؟''

''مجھے یہاں برکھا دیوی نے بھیجا تھا' میں یہ تلوار چرانے آیا تھا۔''

''تو پھر لے جا چرا اس تلوار کو..... تلوار تیرے ہاتھوں میں ہے جا جلدی کر۔'' ساحل عمر طنزاً ہنسا۔

''مجھ سے غلطی ہو گئی' مجھے معاف کر دیں۔''

"معاف کیسے کر دوں...... تجھے یاد ہو گا تو مجھے نیم بے ہوشی کے عالم میں اغوا کر کے چڑ دبیل کے استھان پر لے گیا تھا۔ تو نے میری موت کا سامان کر دیا تھا۔"

"میں مجبور ہوں۔ برکھا دیوی کے ہر حکم کا پابند...... ان کی شکتی نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔"

"اگر وہ اتنی شکتی والی ہے تو اسے آواز دے کر چھوٹ کیوں نہیں جاتا۔"

واسم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کیا جواب دیتا۔ اگر آزاد ہوتا اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ کب کا یہاں سے جا چکا تھا۔

"اچھا ایک بات بتا...... دیکھ بالکل سچ سچ بتانا۔"

"میں ہر بات سچ بتاؤں گا...... آپ پوچھیں...... بس مجھے اس عذاب سے نجات دلوا دیں۔"

"کچھ عرصے پہلے کلفٹن کے پلے لینڈ سے ایک لڑکی اغوا ہوئی تھی جس کی لاش بعد میں جھاڑیوں سے ملی تھی۔ اس لڑکی کا اغوا بھی تو نے کیا تھا۔"

"ناصر مرزا کی بھتیجی کی بات کر رہے ہیں؟" واسم نے سوال کیا۔

"ہاں۔" ساحل عمر بولا۔

"اس لڑکی کے اغوا میں میں نے مدد کی تھی۔ اغوا میں نے نہیں کیا تھا۔ اغوا سوناں نے کیا تھا۔"

"یہ سوناں کون ہے؟"

"میری طرح وہ بھی برکھا دیوی کی چیلی ہے۔ ہم دونوں نے مل کر برکھا دیوی کیلئے بہت کام کئے ہیں۔"

"ناصر مرزا کی بھتیجی کو قتل کس نے کیا تھا؟"

"قتل میں نے نہیں کیا...... میں صرف اس کی لاش پھینکنے کا ذمہ دار ہوں۔"

"قتل کس نے کیا تھا؟" ساحل عمر نے غصے سے پوچھا۔

"وہ برکھا دیوی کے ہاتھوں مری۔"

"ٹھیک ہے، اب تم یہاں صبح تک آرام سے بیٹھو۔ چند گھنٹوں کی بات ہے۔ صبح تمہارا حساب کتاب ہو گا۔ حساب کتاب تو تمہارا اب بھی ہو سکتا ہے لیکن اتنی رات گئے میں ناصر مرزا کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ تم ناصر مرزا کے مجرم ہو۔ تم میرے بھی مجرم ہو۔ تمہیں اب سزا بھگتنا ہو گی۔" یہ کہہ کر ساحل عمر واپس مڑا۔ اس نے پورے اطمینان سے گھر کا پچھلا دروازہ بند کیا اور اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔

دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے اس کی فریاد سنی تھی۔ "ساحل عمر صاحب ایسا نہ کریں۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں پھر کبھی......"

لیکن اس نے ایک مجرم کی فریاد پر کان نہیں دھرے تھے اور دروازہ دھاڑ سے بند کر دیا تھا۔

یہ تو حافظ موسیٰ کی مہربانی تھی ایک موذی اتنی آسانی سے ان کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔

ساحل عمر پھر صبح تک چین سے سو نہ سکا۔ وہ وقفے وقفے سے اسے اٹھ کر دیکھتا رہا۔ اسے یہ

بھی خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی طرح اس کے ہاتھ آزاد ہو جائیں۔ توقع یہی تھی کہ اب وہ آزاد نہ ہو سکے گا۔ اگر آزاد ہونا ممکن ہوتا تو وہ تلوار کی گرفت میں ہی کیوں آتا۔ وہ جب بھی اسے اٹھ کر دیکھتا اسے کرب میں مبتلا پاتا۔ اب وہ تلوار کے دونوں طرف ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔

صبح تڑکے ہی اس نے ناصر مرزا کو فون کیا۔ کافی دیر گھنٹی بجنے کے بعد اسے نیند میں ڈوبی ہوئی ناصر مرزا کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو کون؟''

''ناصر، میں ساحل بول رہا ہوں۔ بھائی حافظ موسیٰ نے تو کمال کر دیا۔''

''کیا ہوا؟'' ناصر مرزا ایک دم چونک کر بیٹھ گیا۔ ''کیا تم نے تلوار والا عمل کر دیا تھا۔''

''ہاں بھئی...... عمل بھی کر دیا تھا اور اس کا رزلٹ بھی فوری طور پر سامنے آ گیا۔ ایک چوہا پکڑا گیا۔'' ساحل عمر نے خوش ہو کر کہا۔

''چوہا پکڑا گیا...... کیا مطلب؟'' ناصر مرزا نے وضاحت چاہی۔

''بس تم فوراً آ جاؤ۔''

''میں ابھی آ جاتا ہوں...... لیکن کچھ بتاؤ تو۔''

''واسم تلوار چرانے آیا تھا۔ اس تلوار نے اس کے ہاتھ جکڑ لئے۔ جانتے ہو، یہ واسم کون ہے؟''

''برکھا کا کوئی بندہ ہوگا۔''

''ہاں، اس کا خاص آدمی ہے۔ میں نے اس سے بہت کچھ اگلوا لیا ہے۔ اسی خبیث نے تمہاری بھتیجی کو اغوا کیا تھا اور......''

''بس اتنا میرے لئے کافی ہے۔ میں فوراً آ رہا ہوں۔'' ناصر مرزا اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''تم ذرا اس کا خیال رکھنا دیکھو وہ بھاگنے نہ پائے۔''

پھر ناصر مرزا نے اس کا جواب سنے بغیر ٹیلی فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

برکھا اپنے کمرے میں بڑی بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ اس وقت دن کے بارہ بجے تھے لیکن واسم ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ایسی کوتاہی تو اس سے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اگر کسی وجہ سے کام نہیں ہو سکا تھا تو وہ اسے ٹیلی فون ضرور کر دیتا...... وہ خود آیا نہ اس کا ٹیلی فون آیا تھا۔

''کہیں وہ پکڑا تو نہیں گیا؟''

یہ خیال کئی بار اس کے ذہن میں آیا تھا لیکن وہ اس خیال کو سختی سے ذہن سے جھٹک دیتی تھی۔ اس نے واسم کو جو منتر پڑھا کر بھیجا تھا وہ ایسا تھا کہ بغیر کسی کی نظروں میں آئے وہ پورے گھر میں گھوم سکتا تھا۔ دیکھے جانے کی صورت میں وہ منتر پڑھ کر دیکھنے والے کو وقتی طور پر اندھا کر سکتا تھا۔ اسے کوئی گرفت میں نہیں لے سکتا تھا لیکن برکھا کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس نے واسم کو جو چیز چرانے بھیجا ہے وہ دیوار پھلانگ کر اندر پہنچتے ہی ٹارچ کی روشنی میں خودبخود چمک اٹھے گی اور اتنی آسانی سے اس چیز کے مل جانے کی خوشی میں وہ لپک کر اس کا دستہ پکڑے گا اور کسی کی گرفت میں نہ آنے والا اس چیز

کی گرفت میں آ جائے گا۔ جسے وہ چرانے آیا تھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور برکھا کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ اضطراری کیفیت میں وہ گھر کے گیٹ تک چلی گئی۔ گیٹ کھول کر وہ باہر نکلی اور اس نے یونہی دائیں بائیں سڑک کی طرف دیکھا۔

تب اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ واسم سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے ہوئے تھے اور سر جھکائے برکھا کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پھر اس نے گیٹ کے نزدیک پہنچ کر برکھا پر ایک نظر ڈالی اور خاموشی سے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ برکھا نے اس کو اندر جاتے ہوئے حیرت سے دیکھا۔ وہ جلدی سے اندر آئی اس نے پلٹ کر گیٹ بند کیا اور کسی قدر غصے سے پکاری۔ ''واسم۔''

واسم آگے جاتے جاتے ایک دم رک گیا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔ ''تلوار کہاں ہے؟''

واسم نے جواب میں خاموشی سے اپنے دونوں ہاتھ جیب سے نکالے اور اس کے سامنے کر دیئے۔ جب برکھا کی نظر اس کے دونوں ہاتھوں پر پڑی تو وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔

''نہیں۔''

☆......☆......☆

واسم کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے۔ اس کے دونوں کٹے ہاتھوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔

''تیرے ہاتھ کہاں غائب ہو گئے۔ یہ کیسے ہوا؟'' وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''آ میرے ساتھ اندر آ۔''

وہ اسے اپنے بیڈ روم میں لے گئی اور ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ''ہاں اب بتا...... تیرے ہاتھ کیسے کٹے...... میں نے تو تجھے تلوار لینے بھیجا تھا۔''

''برکھا جی...... میں آپ کے حکم کے مطابق تلوار ہی لینے گیا تھا۔ میں ساحل عمر کے گھر میں جیسے ہی کودا اور ٹارچ کی روشنی راستہ دیکھنے کیلئے ادھر ادھر ڈالی تو وہ تلوار مجھے چمکتی ہوئی نظر آ گئی۔ وہ تلوار باہر ہی گھر کے پچھواڑے زمین میں دستے تک گڑھی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھ کر خوش ہو گیا کہ چلو کام آسان ہو گیا' ورنہ پورے گھر میں جانے کہاں کہاں تلاش کرنا پڑتا...... خیر میں نے جیسے ہی دونوں ہاتھوں سے اس کا دستہ پکڑ کر کھینچا وہ تلوار ٹس سے مس نہ ہوئی البتہ میرے ہاتھ دستے سے ضرور چپک گئے اور ہاتھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ تکلیف اتنی بڑھی کہ میرے منہ سے باوجود ضبط کے چیخیں نکلنے لگیں۔ میری چیخیں سن کر ساحل عمر باہر نکل کر آ گیا۔ وہ مجھے اس طرح شکنجے میں جکڑے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ میں نے اس کی بہت خوشامد کی کہ وہ کسی طرح میرے ہاتھ آزاد کر دے مگر وہ منہ موڑ کر گھر میں چلا گیا اور پھر اس نے صبح تڑکے ہی ناصر مرزا کو بلا لیا۔ ناصر مرزا بہت غصے میں تھا۔ پہلے تو اس نے مجھے کئی ٹھوکریں ماریں...... پھر اپنے چاقو سے میرے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے۔'' یہ کہہ کر واسم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔

''چپ ہو جا۔'' برکھا غصے سے چیخی۔ ''مرد ہو کر روتا ہے...... یہ بتا تو نے اسے کچھ بتایا تو نہیں۔''

''نہیں برکھا جی۔'' اس نے اپنی آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے قسم لے لیں۔ میں نے آپ کے بارے میں' اپنے بارے میں اور سوناں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' اس نے سفید جھوٹ بولا۔

''یہ تو نے بہت اچھا کیا...... تجھ سے یہی امید تھی...... تو فکرمت کر میں ناصر مرزا سے ایسا انتقام لوں گی کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ اس نے تیرے ہاتھ کاٹے ہیں۔ میں اس کی آنکھیں نکال لوں گی۔'' برکھا نے تسلی دی۔

''ایک بات اور برکھا جی۔'' واسم نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے مجھ سے سوناں کو بھی فون کروایا تھا۔''

''فون؟'' برکھا اس طرح بولی جیسے کسی کا خون ہو گیا ہو۔ ''وہ لوگ سوناں کو کیا جانیں؟''

''ساحل عمر نے تو سوناں کو دیکھا ہے۔'' اس نے یاد دلایا۔

''واسم کیا وہ تیری موجودگی میں وہاں پہنچ گئی تھی۔'' برکھا نے پوچھا۔

''مجھے انہوں نے آزاد ہی اس وقت کیا جب وہ ان کے چنگل میں پھنس گئی۔

''اوہ اس نے ان کے سامنے سب اگل دیا ہو گا۔'' برکھا ایک دم فکرمند ہو گئی۔

''نہیں برکھا جی' سوناں اتنی کچی نہیں ہے۔ وہ ہرگز انہیں کچھ نہیں بتائے گی۔'' واسم نے جھوٹی تسلی دی۔

''یہ تو مجھے بساط ہی الٹتی نظر آ رہی ہے۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

''واسم خاموش رہا۔''

''سوناں اس وقت کہاں ہو گی؟'' اس نے واسم سے سوال کیا۔

''کہیں انہوں نے اس کو پولیس کے حوالے نہ کر دیا ہو۔'' واسم نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''اگر ایسا کر دیا ہو گا...... تو اچھا ہے ابھی پولیس سٹیشن سے فون آ جائے گا۔ وہ آدھا گھنٹے بھی پولیس کی تحویل میں نہیں رہے گی لیکن میں جانتی ہوں وہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔ وہ پولیس میں میرے تعلقات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اب دونوں ڈائریکٹ ایکشن کے قائل ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ اچھی طرح جان گئے ہیں کہ پولیس کبھی کسی مجرم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اب سوناں کے بارے میں کیسے پتہ کروں...... تو اسے ان کے حوالے کر کے وہاں سے نکل آیا۔'' برکھا نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔

برکھا کی اس بات پر واسم کو اندر ہی اندر بڑا غصہ آیا کہ ایک تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کیلئے کٹوا دیئے اب وہ سوناں کو بھی وہاں چھوڑ کر نہ آتا...... پھر تو وہاں سے اس کی لاش ہی آتی۔

اتنے میں کال بیل کی آواز سنائی دی۔ برکھا فوراً اٹھ گئی۔ وہ واسم کو بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے باہر نکل آئی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی گیٹ تک پہنچی۔

"گیٹ کھولا تو سامنے سوناں نظر آئی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر تھے۔

"سوناں اپنے ہاتھ میرے سامنے کر۔" برکھا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

سوناں نے خاموشی سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کر دیئے اور بے اختیار رو پڑی۔

اس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے اور دونوں کٹے ہاتھوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔

"تیرے ہاتھ کس نے کاٹے؟" وہ ناگن کی طرح پھنکاری۔

"ناصر مرزا نے۔" سوناں روتے ہوئے بولی۔

"ناصر مرزا میں تجھے کچا چبا جاؤں گی۔" وہ انتہائی طیش میں چیخی۔

☆......☆......☆

اندھیری رات......رات کا پچھلا پہر...... ٹھنڈی سنسناتی ہوا' جھینگروں کا شور...... پیپل کی کھڑکھڑاہٹ' گلی میں بھونکتے کتے...... ان سب چیزوں نے مل کر برکھا کے بنگلے کو انتہائی بھیانک بنا دیا تھا۔

برکھا اپنے بنگلے کے پچھلے حصے میں پیپل کے درخت کے نیچے پانی بھرے حوض میں کھڑی تھی۔ اس کا آدھا جسم ٹھنڈے پانی کے اندر تھا اور آدھا باہر...... اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے' سر جھکائے کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹ مل رہے تھے۔

حوض کے چاروں طرف اکیس دیئے روشن تھے۔ عمل کا وقت پورا ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ سارے دیئے خود بخود بجھتے جا رہے تھے۔ بس تین دیئے جل رہے تھے۔ اب ان تینوں دیوں کو ایک ساتھ بجھنا تھا اور ان تینوں دیوں کے بجھتے ہی اگور کی سواری کو آنا تھا۔

اندھیری رات خوفناک ہوتی جا رہی تھی۔ جھینگروں کا شور مزید بڑھ گیا تھا۔ اڑتی ہوئی چمگادڑوں کی پھڑ پھڑاہٹ مزید بڑھ گئی تھی۔ علاقے کے کتوں نے اور زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب علامتیں بتا رہی تھیں کہ وہ شیطان کا بیٹا اگور بس اب آیا ہی چاہتا ہے۔

پھر وہ منحوس گھڑی آ پہنچی جو برکھا کیلئے شبھ گھڑی تھی۔ تینوں دیئے بیک وقت بجھ گئے۔ چند لمحوں کیلئے مہیب سناٹا چھا گیا۔ ہوا جیسے ساکت ہو گئی۔ پیپل کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ بند ہو گئی۔

اس کی سواری آ پہنچی تھی۔ برکھا نے حوض کے کنارے رکھی ماچس سے جلدی جلدی سارے دیئے روشن کر دیئے اور جب اس نے سامنے نگاہ کی تو وہ شیطان کی اولاد اپنی سواری پر موجود تھا۔

اس کے سامنے ایک تین فٹ لمبی چھپکلی موجود تھی جس کی زبان باہر نکل رہی تھی اور چھپکلی کی گردن میں ایک سانپ رسی کی طرح بندھا تھا۔ اس سانپ کی دم اگور کے دونوں ہاتھوں میں تھی۔ یہ کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا بچھو تھا۔ اس بچھو کی دم اٹھی ہوئی تھی اور اس کی دم کا آخری حصہ چمک رہا تھا۔ بالکل کسی جگنو کی طرح

"سواگتم مہاراج۔ سواگتم مہاراج۔" برکھا ہاتھ جوڑ کر آدھی جھکی۔

"کیا ہوا؟" اگور نے پوچھا۔

''مہاراج انکاریوں کی ستائی ہوئی ہوں۔ انہوں نے پریشان کر رکھا ہے۔'' برکھا روہانسی ہو کر بولی۔

''اتنی پاٹھ پوجا والی ہے...... اتنے جنتر منتر جانتی ہے اس کے باوجود تجھ سے دو انکاری قابو میں نہیں آ رہے۔''

''مہاراج وہ اکیلے نہیں ہیں۔ وہ اجالے والے ہیں۔ ان کے پیچھے روشنی ہے۔''

''ان کے پیچھے روشنی ہے تو تیرے پیچھے تاریکی ہے۔ رات ہے' اندھیرا ہے۔''

''ہاں' مہاراج اسی لئے تو میں نے اپنی تاریک طاقتوں کو آواز دی ہے۔ مہاراج آپ کو بلایا ہے۔''

''تو نے بلایا تو ہم آ گئے ہیں...... ہم سے جو ہو گا کریں گے۔ میں اپنے باپ سے مدد لوں گا۔ آخر کو تو اس کی چیلی ہے۔ تو نے جانے کتنے انکاریوں کو اقراری بنایا ہے۔ شیطان پرست بنایا ہے۔ تیری بڑی خدمات ہیں۔'' اعور نے اسے تعریفی نظروں سے کہا۔

''بس مہاراج یہ سب آپ کی نظر عنایت ہے۔'' وہ ممنون دکھائی دی۔

''ہماری جو منظور نظر تھی اسے تو وہ اس بستی سے نکال لایا۔ کیا تو جانتی ہے؟''

''ہاں جانتی ہوں مہاراج...... اس نے اس سے شادی کر لی ہے۔ وہ اب میرے کام کا نہیں رہا۔''

''تو وہ کون سی میرے کام کی رہی ہے؟'' اعور نے غصے سے کہا۔ ''تو جانتی ہو گی؟''

''ہاں مہاراج میں جانتی ہوں اب مسئلہ یہ ہے کہ میں اس کی ہتھیا کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اس پر کئی حملے کئے ہیں لیکن اس پر کوئی حملہ کارگر نہیں ہو پا رہا ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اس نے میرے پیروکاروں کے ہاتھ کاٹ دیئے ہیں اس بات پر مجھے شدید غصہ ہے۔'' برکھا غصے سے کانپتی ہوئی بولی۔

''تو نہیں جانتی کہ اس نے میرے باپ کے ایک عظیم پیروکار کو جو صدیوں بعد جاگنے والا تھا صفحہ ہستی سے مٹا دیا ہے۔ میرے باپ کو اس بات پر کتنا غصہ ہو گا۔''

''میں نہیں جانتی۔'' برکھا ایک دم چونک کر بولی۔

''وہ کون تھا؟''

''وہ اپنے وقت کا بہت بڑا جادوگر تھا۔ میرے باپ کا دست و بازو تھا مگر وہ نہ رہا...... اب اس کی کھوپڑی جائے عبرت بنی اس بستی کے چوک میں لٹکی ہے۔ اس کا نام راعین تھا۔'' اعور نے بتایا۔

''اوہ...... مہاراج آپ نے بڑی زبردست بات بتائی...... میرا کام بن گیا۔''

''مہاراج مجھے اس عظیم جادوگر کی کھوپڑی بھجوا دیں...... پھر میں ان سارے انکاریوں کو دیکھ لوں گی۔ ایک ایک کر کے سب کے حساب چکا دوں گی۔''

''راعین کی کھوپڑی تجھے مل جائے گی۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں اور بول۔''

''بس مہاراج آپ نے میرا جی خوش کر دیا۔ آپ میرے لئے حکم کریں۔''

''تو اپنی بیٹی کا حال بتا...... اسے بھی کچھ سکھا رہی ہے یا اسے ناواقف ہی رکھے گی۔''
''مہاراج وہ بڑے اڑیل مزاج کی ہے۔ اچھی خاصی چلتے چلتے رک جاتی ہے۔ میں نے اسے کافی کچھ سکھا دیا ہے لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرتی۔ اسے مار مار کر چلانا پڑتا ہے۔'' برکھا نے خفگی سے کہا۔

''اس کی خبر رکھ...... کہیں وہ انکاریوں میں سے نہ ہو جائے۔ تو جانتی ہے کہ بالآخر اس نے تیری جگہ آنا ہے۔''

''ہاں مہاراج جانتی ہوں۔ میری کوشش یہی ہے کہ اسے وہ سب کچھ سکھا دوں جو میں جانتی ہوں۔ اب آگے دیواہ کالی جو کرے۔''

''ٹھیک ہے...... اچھا اب میں چلتا ہوں۔ راعین کی کھوپڑی تجھے کل مل جائے گی۔ اب تو دیئے بجھا جلدی کر۔'' اعور بولا۔

''اچھا مہاراج...... آپ کی بڑی مہربانی' آپ آ گئے۔'' یہ کہہ کر اس نے دیئے کی لو پر ہاتھ رکھ کر تمام دیوں کو بجھا دیا۔ جب اس نے سامنے نظر کی جہاں اعور کی سواری تھی وہاں اب کچھ نہ تھا۔ اندھیرا تھا اور مہیب سناٹا۔

☆......☆......☆

دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ برکھا کے منحوس بنگلے پر اس کے باوجود وحشت برس رہی تھی۔ برکھا شیطان کے بیٹے اعور سے رات کو ملاقات کے بعد مدہوش سو رہی تھی۔

بیل کی آواز پر ورشا کی آنکھ کھلی۔ کوئی کافی دیر سے گھنٹی بجا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے گھنٹی بجائی جا رہی تھی۔ ورشا فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر وہ اپنے جسم پر کالی چادر ڈال کر دروازے سے باہر آ گئی۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر اس نے باہر کا جائزہ لیا۔ برکھا کا دروازہ بند تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ رات کو جاگی تھی۔ اب پڑی سو رہی تھی۔

پھر وہ خود ہی گیٹ کی طرف بڑھی۔

گیٹ کھولنے سے پہلے اس نے حسب معمول گیٹ کے خلاء سے باہر جھانکا۔ اسے باہر کوئی نظر نہ آیا۔ تب اس نے زور سے پکار کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''برکھا دیوی ہیں جی؟'' باہر سے ایک بھاری مردانہ آواز آئی۔

''آپ کون؟''

''میں جی برکھا دیوی کیلئے سوغات لایا ہوں۔'' وہ گیٹ کے سامنے آتے ہوئے بولا۔

''وہ تو سو رہی ہیں۔'' ورشا نے کسی کو سامنے پا کر خلا میں سے باہر جھانکا۔

وہ ایک اونچے قد کا گہرے سانولے رنگ کا اور مضبوط کاٹھی کا شخص تھا۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کالے چمڑے کا تھیلا لٹک رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ انہیں سونے دیں آپ ان کی چیز لے لیں۔''

''اچھا ایک منٹ ٹھہریں...... میں گیٹ کھولتی ہوں۔'' ورشا نے کہا اور پھر گیٹ کھول کر

جھانکی۔

''یہ برکھا دیوی کو دے دیں۔'' اس نے چمڑے کا تھیلا آگے بڑھایا۔

ورشا نے وہ چمڑے کا تھیلا تھام لیا اور اس سے پوچھا۔

''اس میں کیا ہے؟''

''اس میں اس کیلئے ایک قیمتی چیز ہے۔''

''آپ کون ہیں؟'' ورشا نے سوال کیا۔ ''آپ کا کیا نام ہے؟''

''میں بے نام ہوں جب وہ تھیلا کھول کر دیکھیں گی تو وہ سمجھ جائیں گی کہ یہ چیز کہاں سے آئی ہے اور کس نے بھیجی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ واپس پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی نظروں سے دور ہو گیا۔

ورشا نے فوراً گیٹ بند کر کے اس چمڑے کے تھیلے میں جھانکا۔ تھیلا کافی گہرا تھا۔ اس کی تہہ میں کپڑے میں لپٹی کوئی گول سی چیز نظر آئی۔

پتہ نہیں اس میں کیا ہے؟ یہ ممی روز نت نئی چیزیں منگواتی رہتی ہے۔ جانے یہ کہاں جا کر ٹھہرے گی اور کیا کر کے دم لے گی۔ ورشا کے لاشعور میں بچپن سے ہی اپنی ماں کیلئے نفرت تھی لیکن برکھا کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا اس لئے وہ نفرت دبی رہتی تھی۔ جب برکھا کے رویئے میں تبدیلی آتی یا وہ اس کی ساحرانہ حرکتوں سے اکتاتی تو وہ نفرت کی چنگاری آہستہ آہستہ سلگ اٹھتی۔

آج کل یہ نفرت بار بار اپنا سر اٹھا رہی تھی۔

''برکھا کے دروازے پر پہنچ کر اس نے آہستہ سے دستک دینا چاہی تو دروازہ تھوڑا سا اندر ہو گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ برکھا کچھ اس انداز سے سو رہی تھی کہ ورشا نے ایک لمحے کیلئے سوچا کہ واپس چلی جائے پھر اس نے پائنتی پڑا ہوا ہلکا سا کمبل برکھا کے جسم پر ڈال دیا۔

تب فوراً ہی برکھا کی آنکھ کھل گئی۔ ورشا کو اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر بڑی بے نیازی سے اپنے گرد کمبل لپیٹ لیا۔ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

''یہ کیا ہے؟'' اچانک برکھا کی نظر ورشا کے ہاتھ میں لٹکے چمڑے کے تھیلے پر پڑی۔

''پتہ نہیں ممی۔'' ورشا نے کہا۔ ''ایک شخص آپ کیلئے دے گیا ہے۔''

برکھا نے جلدی سے اس سے وہ تھیلا لے لیا اور پھر اس نے تھیلے کے اندر جھانکا بڑی احتیاط سے کپڑے میں لپٹی چیز تھیلے سے باہر نکال لی۔ اس میں کوئی گول سی چیز سفید کپڑے کی پٹیوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے ڈھونڈ کر پٹی کا سرا نکالا اور اس چیز کو بیڈ پر ڈال کر پٹی کھولنے لگی۔ وہ ایک ہی پٹی تھی اور اتنی لمبی تھی کہ برکھا کے بیڈ پر ایک اونچا ڈھیر بن گیا۔

پھر اس میں سے جو چیز برآمد ہوئی اسے دیکھ کر خوشی کے مارے برکھا کی چیخ نکل گئی۔ ''زندہ باد مہاراج...... کالی دیواہ کے بیٹے زندہ باد۔''

''ممی یہ کیا ہے؟''

''یہ ایک بہت بڑے جادوگر کا سر ہے...... ورشا میں اب دیکھتی ہوں کہ میرا وار کیسے کارگر

نہیں ہوتا۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک آ گئی اور چہرے سے خباثت ٹپکنے لگی۔ ایک بدبو کا بھبکا اس کے جسم سے پھوٹا جو ورشا کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا۔ ورشا پھر وہاں نہ ٹھہر سکی۔

☆......☆......☆

ناصر مرزا شام کو اپنے دفتر سے آ کر تھوڑی دیر آرام کی خاطر لیٹ گیا تھا۔ ابھی اسے لیٹے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ اچانک اس کی نظر روشندان پر پڑی اور ایک بھیانک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ ناصر مرزا کی بیوی ساجدہ جو کچن میں چائے بنانے کی تیاریوں میں تھی اپنے شوہر کی چیخ سنی تو "اللہ رحم" کہتی ہوئی کمرے کی طرف بھاگی۔

جب وہ کمرے میں پہنچی تو ناصر مرزا کا حال دیکھ کر سہم گئی۔ ناصر مرزا جو اچھے تن و توش اور پروقار شخصیت کا مالک تھا اس وقت بیڈ کے کونے پر کسی چوہے کی طرح دبکا بیٹھا تھا اور وہ خوفزدہ آنکھوں سے روشندان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ساجدہ نے فوراً روشندان کی طرف دیکھا لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہ آیا۔

"کیا ہوا؟" ساجدہ ایک دم اپنے شوہر سے لپٹ کر بولی۔

"وہ، وہ۔" ناصر مرزا نے انتہائی خوفزدہ لہجے میں روشندان کی طرف اشارہ کیا۔

ساجدہ نے پھر روشندان کی طرف دیکھا لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہ آیا۔

"وہاں کیا ہے ناصر؟" وہ پریشان ہو کر بولی۔

"وہ، وہ مجھے مار دے گا۔" ناصر مرزا کی آواز کانپ رہی تھی خوف کے مارے۔

"اللہ...... ناصر آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ اتنے بہادر انسان اتنے ڈرپوک کیسے ہو گئے۔ ناصر وہاں کچھ نہیں ہے۔"

"میں ہوں آپ کے پاس...... آپ ڈریں نہیں۔" ساجدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ساجدہ مجھے کمبل اڑھا دو...... وہ مجھے گھور رہا ہے۔ وہ مجھے مار دے گا۔"

ساجدہ نے بغیر کچھ کہے ناصر مرزا کے اوپر کمبل ڈال دیا۔ اسے چاروں طرف سے اچھی طرح سے ڈھک دیا۔ تب ناصر مرزا جو بیڈ کے ایک کونے پر ڈرا سہما بیٹھا تھا آہستہ آہستہ بیڈ پر نیم دراز ہوتا گیا۔ پھر اس پر غشی طاری ہو گئی اور وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

ساجدہ گھبرائی ہوئی کمرے سے نکلی۔ وہ سیدھی ناصر مرزا کی امی کے ہاں پہنچی۔ وہ ابھی عصر کی نماز سے فارغ ہوئی تھیں۔ وہ ایک بزرگ خاتون تھیں۔ نمازی پرہیزگار۔ انہوں نے جب ناصر مرزا کا حال سنا تو فوراً ماتھا ٹھنکا۔ وہ فوراً چوکی سے اٹھیں اور چپل پاؤں میں ڈال کر ساجدہ کے ساتھ ہو لیں۔

کمرے میں آ کر ناصر کی امی نے کمبل اتار کر ناصر مرزا کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں پڑا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ امی نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے پکارا۔ "ناصر، بیٹے ناصر۔"

ناصر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی پیشانی تپ رہی تھی۔

"ساجدہ اسے تو تیز بخار ہے۔" امی نے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''امی، کیا کروں؟ ڈاکٹر کو بلواؤں۔''

''ذاکر ہے گھر میں؟''

''جی امی۔''

''پھر اس کو کہہ دو۔''

اتنے میں گھر میں موجود ہر فرد کو ناصر مرزا کے بارے میں پتہ چل گیا۔ سب آناً فاناً اس کے کمرے میں اکٹھا ہو گئے۔ ان میں ناصر مرزا کا چھوٹا بھائی ذاکر مرزا بھی تھا۔

امی نے اسے فوراً ڈاکٹر کو لانے کیلئے دوڑایا۔ پڑوس میں ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ گھر میں کلینک تھا۔ کلینک ابھی بند تھا۔ ناصر مرزا کی طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ فوراً اپنا بیگ اٹھا کر ذاکر کے ساتھ چلا آیا۔

اس نے ناصر مرزا کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ ناصر مرزا کو ایک سو پانچ درجے بخار تھا۔ اس پر غشی بدستور طاری تھی۔ ڈاکٹر نے ایک انجکشن لگایا اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے کی ہدایت کی اور نسخہ لکھ کر اور تسلی دے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ساجدہ نے اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنی شروع کیں۔

انجکشن اور ٹھنڈے پانی کی پٹیوں نے اپنا اثر دکھایا۔ اس کا بخار کم ہوا۔ غشی کی کیفیت میں افاقہ ہوا۔ اس نے کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھول دیں۔ اس نے پورے گھر کو اپنے بیڈ کے گرد موجود پایا۔ اس نے مسکرا کر سب کو دیکھا اور یہ ظاہر کرنا چاہا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔

''ناصر بیٹے کیسے ہو؟'' اس کی امی نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں امی...... فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔'' ناصر مرزا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

ساجدہ نے اسے فوراً دوا کھلائی۔ ناصر مرزا نے دوا کھانے کے بعد کہا۔ ''ساجدہ ذرا میرا چاقو مجھے دے دو۔ میرے بیگ میں ہو گا۔''

''اچھا ابھی لائی۔'' ساجدہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' امی نے ناصر مرزا سے پوچھا۔ ''تم کس چیز سے ڈر گئے تھے؟''

''کسی چیز سے نہیں۔'' ناصر مرزا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''امی ساجدہ نے پتہ نہیں آپ کو کیا کہہ دیا ہے۔''

''میں نے جو دیکھا اور سنا وہ امی سے کہا...... اور کچھ نہیں...... یہ لیجئے اپنا چاقو۔'' ساجدہ نے کمرے میں آ کر چاقو اس کی طرف بڑھایا۔

ناصر مرزا نے خاموشی سے چاقو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا اور ساجدہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ساجدہ ایک کام کرو...... ذرا ساحل عمر کو فون کر دو...... اس سے کہنا کہ رات کو عذرا کو لے کر ادھر آ جائے۔ کھانا یہیں کھا لے۔ اس کے علاوہ اس کو کچھ اور نہ بتانا۔''

''جی اچھا۔'' ساجدہ نے کہا اور فون کرنے کمرے سے باہر نکل گئی۔

ساجدہ کے جاتے ہی اس کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ اس نے اپنے جسم میں ایک خوف کی سی لہر محسوس کی۔ خودبخود اس کی نظریں روشندان کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ وہاں موجود تھا۔ اس کو دیکھتے ہی ناصر مرزا کی گھگھی بندھ گئی۔ ناصر مرزا نے تکیے کے نیچے رکھا اپنا چاقو نکالا اسے جلدی سے کھولا۔ اس نے چاقو والا ہاتھ اٹھا کر کچھ کرنا چاہا...... لیکن اس کا ہاتھ ایک دم بے جان ہو گیا۔ چاقو انگلیوں سے نکل گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑنے لگے اور پھر اس نے کسی خوفزدہ بچے کی طرح اپنی امی کی گود میں منہ چھپالیا۔ ”امی۔“

”کیا ہوا...... کیا ہوا میرے بچے؟“ وہ ایک دم گھبرا کر بولیں۔

”امی۔ امی...... وہ پھر آ گیا۔ مجھے بچالیں...... وہ مجھے مار دے گا۔“

”ارے کون ہے وہ کمینہ...... مجھے بتا تو وہ کدھر ہے۔“

ناصر مرزا نے اپنا چھپا ہوا منہ اپنی ماں کی گود سے اٹھایا اور خوفزدہ نظروں سے روشندان کی طرف دیکھا۔ ”وہ امی وہ ہے...... وہاں۔“

”بچو تم لوگ چلو یہاں سے۔“ امی نے ناصر مرزا کے بچوں اور اپنی چھوٹی بیٹی کی طرف دیکھا۔

امی کی ہدایت پر وہ فوراً چلے گئے۔ اب کمرے میں صرف ذاکر رہ گیا۔ چند لمحوں کے بعد ساجدہ بھی آ گئی۔ ”کیا ہوا؟“

”پھر سے وہی کیفیت ہو گئی ہے۔“ امی نے ساجدہ کو بتایا۔

”یا اللہ رحم۔“ ساجدہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ناصر مرزا کی امی نے روشندان کی جانب دیکھا۔ وہاں انہیں کچھ نظر نہیں آیا۔ انہوں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ”ناصر وہاں تو کچھ نہیں ہے۔“

”امی ہے...... آپ نہیں جانتیں...... وہ وہیں چھپا بیٹھا ہے۔“

”ناصر یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھالیں۔“ ساجدہ نے اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔

”امی! میرے اوپر کمبل ڈال دیں۔“ ناصر مرزا بولا۔

ساجدہ نے کمبل اٹھا کر ناصر مرزا کے اوپر ڈال دیا۔ ناصر مرزا کا سر ابھی امی کی گود میں تھا اور اس کے دونوں گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے۔ وہ گٹھری بنا پڑا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ پاؤں کھلنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی اور وہ لمبے لمبے بے ترتیب سانس لینے لگا۔

سات بجے کے قریب ساحل عمر عذرا کو ساتھ لے کر آ پہنچا۔ ساجدہ نے ناصر مرزا کی ہدایت کے مطابق اسے کچھ نہیں بتایا تھا لہٰذا وہ بڑا خوش خوش گھر میں داخل ہوا تھا۔ یہاں آ کر اسے گھر کا نقشہ ہی مختلف نظر آیا۔ جسے دیکھا اس کے چہرے پر پریشانی نظر آئی۔

جب وہ ناصر مرزا کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو ناصر مرزا کی حالت دیکھ کر ایک لمحے کو کانپ

گیا۔ دو اڑھائی گھنٹوں میں اس کے چہرے کی رنگت بدل چکی تھی۔ وہ عجب انداز سے آنکھیں بند کیے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

ساجدہ اور امی نے ناصر مرزا کے بارے میں پوری کیفیت بتائی۔ سارا حال سن کر ساحل عمر نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا پھر بولا۔ ''اوہ...... یہ تو بہت برا ہوا...... اس کا جادو چل گیا۔''

''اب کیا ہوگا؟'' امی گھبرا کر بولیں۔ ''کسی عامل کو بلاؤ...... اس جادو کا توڑ کرو۔''

ساحل عمر نے ہاتھ پر بندھی گھڑی پر نظر کی۔ سوا سات بج رہے تھے۔ اسے فوراً حافظ موسیٰ کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ ان کے پاس جائے۔ پتہ نہیں وہ رات کو ملنا پسند کریں گے یا نہیں کیونکہ مرزا جب بھی ان کے پاس گیا دن کی روشنی میں گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔

وہ چاہتا تھا کہ ناصر مرزا کو کچھ ہوش آ جائے تو اس سے بھی اس مسئلے پر بات کرے۔ اس کی پیشانی گرم ہو چکی تھی۔ ساجدہ نے اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنا شروع کر دی تھیں۔ پٹیاں رکھتے رکھتے اچانک ساجدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اپنے شوہر کی اس حالت پر بے اختیار رو پڑی۔

عذرا نے فوراً ساجدہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے کمرے سے باہر لے گئی۔

پٹیاں رکھنے کا کام خود ساحل عمر نے سنبھال لیا۔ امی اسے پٹیاں بھگو کر دیتی جا رہی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ناصر مرزا نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔

''کیسے ہو ناصر؟'' ساحل عمر نے بہت محبت سے پوچھا۔

''معاملہ بہت گڑبڑ ہے۔ تم صبح ہی حافظ موسیٰ کے پاس جاؤ۔'' اس نے بلا تمہید ہدایت کی۔

''وہ تو میں چلا جاؤں گا لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمہیں روشندان پر کیا دکھائی دیتا ہے۔'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' ناصر مرزا نے اسے وحشت بھری نظروں سے دیکھا جیسے وہ کچھ بتاتے ہوئے ڈرتا ہو۔

''ناصر گھبراؤ مت...... پوری بات بتاؤ تا کہ میں حافظ موسیٰ کو تفصیل سے بتا سکوں۔'' ساحل عمر نے کہا۔

''اوہ یار یہ کیا ہو رہا ہے۔'' ساحل کے چہرے پر اچانک کرب کے آثار دکھائی دینے لگے۔ وہ بے چین ہو کر ادھر ادھر کروٹیں لینے لگا۔

''کیا ہوا؟'' ساحل عمر نے اس کی بدلتی کیفیت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی نوکیلے اور تیز ناخنوں ۔۔ سے میرا جسم چھیل رہا ہو۔ اوہ۔'' اس نے کراہ کر اپنے بازو پر ہاتھ رکھا۔

ساحل عمر نے فوراً اس کی آستین کا بٹن کھول کر قمیض کی آستین بازو تک چڑھائی۔ تب اس

پر عجیب انکشاف ہوا۔ اس کے بازو پر کھرونچے سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔
پھر اس طرح کے نشانات بہت تیزی سے اس کے جسم کے ہر حصے پر نمودار ہوتے گئے۔ اس کا پورا جسم پنجہ مارنے کے نشانات سے بھر گیا۔ وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ ان کھرونچے کے نشانات میں سخت جلن ہو رہی تھی۔
''ساحل...... میرا چاقو پانی میں بھگو کر ان نشانات پر رکھو۔'' ناصر مرزا نے بمشکل اسے ہدایت کی۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔
ناصر مرزا کی امی جس پانی میں پٹیاں بھگو بھگو کر ساحل عمر کو دے رہی تھیں وہ پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔ ساحل عمر نے چاقو اٹھا کر پانی میں ڈالا اور بھیگا ہوا چاقو نشانات پر پھیرتے ہی وہ فوراً معدوم ہونے لگے۔ تب ساحل عمر نے جلدی جلدی اس عمل کو دوسرے نشانات پر دہرانا شروع کیا۔ اس طرح اس نے منٹوں سیکنڈوں میں پورے بازو پر بنے پنجے کے نشانات کو مٹا دیا۔ ایک بازو چھوڑ کر ابھی ساحل عمر دوسرے بازو پر بھیگا چاقو پھیر رہا تھا کہ پہلے بازو پر پھر سے وہ نشانات ابھرنے لگے۔
بس پھر یہی ہوتا رہا کہ وہ جلدی جلدی چاقو کے ذریعے ان کھرونچوں کو مٹاتا اور پھر وہ کچھ دیر کے بعد اسی جگہ نمودار ہو جاتے۔
ساحل عمر رات کے ساڑھے بارے بجے تک ناصر مرزا کے گھر رہا۔ جب تک وہ رہا یہی تماشا چلتا رہا۔ ناصر کی امی نے ساحل عمر کو زبردستی اپنے گھر بھیج دیا کہ خاصی رات ہو چکی تھی پھر انہوں نے خود اس چاقو کو سنبھال لیا۔

☆......☆......☆

حافظ موسیٰ اپنی لاٹھی دونوں ہاتھوں سے تھامے اس میں بنی آنکھ پر اپنی بے نور آنکھ رکھے بیٹھے تھے۔ ساحل عمر پالتی کی طرف بیٹھا انہیں بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ ناصر مرزا کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتا چکا تھا۔
چند منٹوں کے بعد حافظ موسیٰ نے اپنی آنکھ لاٹھی سے ہٹائی اور پھر گردن اٹھائے اپنی بے نور آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے رہے پھر گویا ہوئے۔
''اس مرتبہ سفلی والی نے بڑا پکا کام کیا ہے۔ ناصر مرزا کی زندگی شدید خطرے میں ہے۔ اس کے بچنے کے امکانات برائے نام ہیں۔''
حافظ موسیٰ کی زبان سے ایسی مایوس کن بات سن کر ساحل عمر کے چھکے چھوٹ گئے۔ ناصر مرزا اس کا بہت پیارا دوست تھا۔ اس کی جدائی کے تصور سے ہی اس کی روح کانپ اٹھی تھی۔
''حافظ صاحب...... ایسا نہ کہیں۔ آخر اس جادو کا کوئی توڑ تو ہوگا۔ مجھے بتائیں۔ اگر میرے کرنے کا کوئی عمل ہے تو میں کر گزروں گا۔ اگر آپ کے کرنے کا کوئی کام ہے تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ان شیطانوں کے بیچ ہمیں تنہا نہ چھوڑیں۔'' ساحل عمر نے بڑی عاجزانہ درخواست کی۔
حافظ موسیٰ کچھ نہ بولے۔ سر جھکا کر لاٹھی پیشانی سے لگالی جیسے مراقبے میں چلے گئے ہوں۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے سر اٹھایا اور بولے۔ ''اب جاؤ...... شام کو چار بجے میرے پاس آنا...... اللہ اپنا فضل کرے گا۔''

حافظ موسیٰ کی بات سن کر ایک آس بندھی' ایک امید کی کرن دکھائی دی۔

''بہت بہتر۔'' ساحل عمر نے بڑے مودبانہ انداز میں کہا اور ان کے گھر سے چلا آیا۔

☆......☆......☆

ورشا ابھی کچن میں جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور برکھا اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ سجی تھی۔ اگر برکھا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ بھی ہوتی تب بھی ورشا اس کے ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے دیکھ کر اندازہ لگا لیتی کہ اس کی ماں آج بہت خوش ہے۔

''آج میری ممی بہت خوش نظر آ رہی ہے...... خیر تو ہے۔'' ورشا نے اپنی ماں کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے کر بیڈ پر رکھ دی۔

''ہاں' میری جان' آج میں بہت خوش ہوں...... ناصر مرزا کو تو میں نے ٹھکانے لگا دیا۔'' وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کیا وہ مر گیا؟'' ورشا نے پوچھا۔

''مرا تو نہیں لیکن میں نے اس کی موت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اس کی موت یقینی ہے۔ بس چند گھنٹوں کا معاملہ ہے۔'' برکھا نے بہت خوش ہو کر بتایا۔ ''اس کے بعد ساحل عمر کا نمبر ہے۔ ورشا آج کی رات بہت اہم ہے۔ یہ فیصلے کی رات ہے۔ ناشتے کے بعد میں منتر والے کمرے میں چلی جاؤں گی۔ آج رات ٹھیک بارہ بجے میرا عمل پورا ہو جائے گا۔ عمل پورا ہوتے ہی اس مہان جادوگر راعین کی کھوپڑی حرکت میں آ جائے گی۔ بارہ بج کر پانچ منٹ پر ساحل عمر جہاں بھی ہو گا میرے اس وار سے بچ نہیں سکے گا۔ میں اس کے اندر آگ لگا دوں گی۔ وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر گھر سے باہر نکل آئے گا۔ اس کا دماغ الٹ جائے گا۔ اس کی آنکھوں سے ہر پہچان مٹ جائے گی۔ اس کے دماغ سے ہر یاد مٹ جائے گی۔ بس ایک آگ ہو گی جو اس کے بدن میں لگی ہو گی۔ وہ سڑکوں پر بے لباس چیختا پھرے گا۔ وہ یہاں بھی آئے گا۔ میں اور تم اس کا تماشا دیکھیں گے۔

تیرہ دن تک اس کی یہی حالت رہے گی پھر تیرہویں دن وہ سمندر کی طرف رخ کرے گا۔ اس کے اندر کی آگ کو صرف سمندر بجھا سکے گا اور جب وہ سمندر میں دور تک چلا جائے گا تو سمندر کی ایک بڑی لہر اسے اپنے ساتھ بہا لے جائے گی۔ اس کے اندر کی آگ تو بجھ جائے گی لیکن ساتھ ہی اس کی زندگی کا چراغ بھی بجھ جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔ ''وہ مر جائے گا...... وہ مر جائے گا...... ہاہاہا......''

''ممی چائے پیو۔'' ورشا نے اس کی طرف چائے سے بھرا کپ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لا۔'' برکھا نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ''چائے پلا...... شراب پلا یا خون پلا...... جو تیری مرضی میں آئے پلا۔ آج میں بہت خوش ہوں...... اور ہاں۔'' اچانک برکھا کو کچھ یاد آیا۔

ورشا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''جی ممی۔''

''ذرا میرا خیال رکھنا...... دروازہ کھلا ہو گا۔ ادھر کا چکر لگاتی رہنا۔ شاید مجھے تمہاری ضرورت پڑ جائے۔'' برکھا نے ہدایت کی۔

''اچھا' ممی ٹھیک ہے۔'' ورشا نے فرمانبرداری سے کہا۔

پھر جب برکھا ناشتے کے خالی برتن لے کر چلی گئی تو ورشا کے دل کو جیسے کسی نے جکڑ لیا۔ اس کے دل پر اداسی کے بادل چھا گئے۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور بیڈ پر لیٹنے کیلئے واپس پلٹی تو اس نے بیڈ پر اپنے نانا کالی داس کو بیٹھے دیکھا۔ وہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کالی داس متعدد بار اس کے سامنے ظاہر ہو چکا تھا۔ اس سے باتیں کر چکا تھا۔ اسے بہت کچھ سمجھا چکا تھا۔

''نانا یہ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ پریشان ہو کر بولی۔

''اس نے جیسا کہا ہے' ویسا ہی ہو گا...... یہ عمل بہت خطرناک ہے اس کا کوئی توڑ نہیں۔'' کالی داس نے اسے مزید مایوس کر دیا۔

''نانا وہ ساحل عمر کو مار دے گی۔''

''تو مار دے تجھے کیا پریشانی ہے؟''

''نانا' آپ نہیں جانتے میں ساحل عمر سے محبت کرتی ہوں۔ میں اسے نہیں مرنے دوں گی۔ چاہے کچھ ہو جائے۔'' ورشا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''اوہ بالآخر تو بھی برکھا ہی نکلی۔'' کالی داس نے اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔

☆......☆......☆

''ہاں نانا...... آپ مجھے برکھا ہی سمجھ لیں۔'' ورشا نے بڑے اعتماد سے کہا اس نے کالی داس کے غصے کی پروانہ کی۔

''برکھا' بہت کچھ جانتی تھی...... اسے میں نے اپنا سارا فن سکھا دیا تھا۔'' ورشا نے گردن اکڑا کر کہا۔

''تو نہیں جانتی' وہ شیر کی خالہ ہے۔ اس نے ایک داؤ بچا کر رکھا ہے۔'' کالی داس نے اسے ورغلایا۔

''نانا پھر تم کس مرض کی دوا ہو...... مجھے وہ آخری داؤ بتا دو۔'' ورشا نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

''بتا دوں گا...... پریشان مت ہو...... تجھے بہت کچھ سکھا دوں گا۔ آخر میں تیرے پاس آیا کس لئے ہوں۔ میری روح انتقام کی آگ میں جل رہی ہے۔ یہی وہ موقع ہے جب میں اس خودغرض کمینی اولاد سے بدلا لے سکتا ہوں۔ چل میری بچی۔ شروع ہو جا...... تک دھم دھم...... دھم دھم تک...... واہ کالی...... دیواہ کالی واہ۔''

ورشا اس وقت شلوار قمیض میں تھی' دوپٹہ گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے دوپٹہ گلے سے کھینچا اور کمر کے گرد باندھ کر شروع ہو گئی۔

''تک دھم دھم...... دھم دھم تک...... واہ کالی...... دیواہ کالی واہ......''

☆......☆......☆

شام چار بجے جب وہ حافظ موسیٰ کے گھر پہنچا تو وہ اس کے منتظر تھے۔ اس کی آہٹ سنتے ہی بولے۔ ''اب کیا حال ہے ناصر مرزا کا؟''

''اسے کسی کروٹ چین نہیں...... جسم پر جگہ جگہ ناخنوں کے نشان بن رہے ہیں البتہ اب وہ روشندان کی طرف دیکھ کر ڈرتا نہیں۔'' ساحل عمر نے اس کی کیفیت بیان کی۔

''میں اس طرح کے مسائل میں آج تک نہیں الجھا...... میں ایک گوشہ نشین انسان ہوں مجھے اس طرح کی فضولیات سے کیا سروکار بہرحال میں نے تمہیں چار بجے آنے کو کہہ دیا تھا اور تم ٹھیک وقت پر پہنچ بھی گئے ہو تو میری بات اچھی طرح سمجھ لو۔ غور سے سن لو۔ تم ناصر مرزا کے گھر جا کر اس کا بستر اچھی طرح جھڑوانا...... جب بستر جھاڑا جائے تو تمہیں بستر میں سے ایک باز کا کٹا ہوا پنجہ ملے گا۔

اسے اٹھا کر چھت پر لے جانا۔" یہ کہہ کر انہوں نے توقف کیا اور اپنا رخ بائیں جانب موڑا۔
ساحل عمر نے دیکھا کہ پلنگ پر سوکھے پتوں کا ایک ڈھیر ہے۔
پھر انہوں نے اس ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ سوکھے پتے اپنی جیبوں میں بھر لو جب تم چھت پر پہنچ جاؤ تو ان پتوں کو چھت کے ایک کونے میں اکٹھا کر دینا۔ اوپر اپنے ساتھ ماچس لے کر جانا اور اکیلے جانا اور نیچے سب لوگوں کو منع کر کے آنا کہ جب تک تم اوپر ہو کوئی اوپر آنے کی کوشش نہ کرے۔"
"جی ٹھیک ہے۔" ساحل عمر نے جواب دیا۔
"اس سفلی والی نے بڑا خطرناک عمل کیا ہے۔ مجھے بہت محنت کرنا پڑی۔ بہرحال اس پر اللہ کا فضل ہو گیا ہے۔ جب تم اوپر پہنچو تو تمہیں پانی کی ٹنکی دکھائی دے گی۔ اس پر چڑھ جانا۔ پھر وہاں تمہیں فساد کی جڑ دکھائی دے گی۔ اسے وہاں سے اٹھا کر نیچے لے آنا۔ اب میری بات بہت توجہ سے سنو۔ ذرا سی غلطی تمہیں مشکل میں پھنسا سکتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئے۔
پھر انہوں نے لاٹھی میں بنی آنکھ سے اپنی بے نور آنکھ لگالی اور اسے سمجھانا شروع کیا۔

☆......☆......☆

ساحل عمر گاڑی بہت تیزی سے بھگا رہا تھا۔ اسے ناصر مرزا کے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔
حافظ موسیٰ نے اسے جو کچھ بتایا جو کچھ سمجھایا اور جو کچھ پڑھنے کو کہا تھا وہ بار بار اسے دہرا رہا تھا۔ وہ حافظ موسیٰ کا بہت مشکور تھا کہ انہوں نے بڑے آڑے وقت میں اس کی مدد کی تھی۔ برکھا نے ناصر مرزا کے مارنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔ کوئی بڑے سے بڑا عامل بھی اس سحر کا توڑ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو حافظ موسیٰ کی نظر کرم ہو گئی ورنہ ناصر مرزا گیا تھا کام سے...... حافظ موسیٰ جیسے درویش انسان کو جادو ٹونے اور عملیات سے کیا واسطہ...... اگر وہ ان چکروں میں پڑ جاتے تو پھر انہیں کون گوشہ نشین رہنے دیتا...... البتہ ساحل عمر پر وہ خاص مہربان تھے۔ اس کی حفاظت کیلئے انہوں نے بہت کچھ کیا تھا۔ ورنہ برکھا، چترو بھیل اور راعین جیسے شیطان صفت لوگ اسے کب کا چٹ کر جاتے۔
حافظ موسیٰ کیونکہ اللہ لوگ تھے اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ساحل عمر طاغوتی طاقتوں کے فریب میں آ جائے۔ وہ اس پر قابض ہو جائیں اور اس کے ذریعے اپنی قوت بڑھا کر انسانوں کی ایذا رسانی کا مزید سامان بن جائیں۔
ساحل عمر ناصر مرزا کے گھر پہنچا تو سب لوگ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ناصر مرزا کی وہی کیفیت تھی۔ وہ جیسے بستر کے بجائے کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ اسے کسی کروٹ چین نہ تھا۔ اس کے جسم پر رہ رہ کر کھرونچے بن رہے تھے۔ ساحل عمر نے ناصر مرزا کے کمرے سے سب کو نکل جانے کو کہا۔
جب ناصر مرزا کا چھوٹا بھائی ذاکر جانے لگا تو اس نے اسے روک لیا۔ "ذاکر تم ٹھہرو۔"
کمرہ خالی ہو گیا تو ساحل عمر نے دروازہ بند کرنے کو کہا۔ ذاکر نے دروازہ بند کر دیا۔ ناصر مرزا ساحل عمر کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ حافظ موسیٰ نے اس کے

بارے میں کیا کہا لیکن ساحل عمر اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ وہ اس سے سوال نہ کر پایا۔

ساحل نے جیب سے ایک نیم کا سوکھا پتا نکال کر پانی سے بھرے گلاس میں ڈال دیا پھر اس نے حافظ موسیٰ کی ہدایت کے مطابق اس پر کچھ پڑھا اور گلاس ناصر مرزا کے منہ سے لگا دیا۔ ناصر مرزا نے غٹ غٹ کر کے سارا پانی پی لیا۔ پتا گلاس میں رہ گیا۔ پانی پیتے ہی جسم میں ایک ٹھنڈک کا احساس پیدا ہوا۔ اس کے چہرے پر ایک سکون کا احساس نمایاں ہوا۔

''ناصر مرزا تم بیڈ چھوڑ کر ادھر کرسی پر آ جاؤ۔''

ساحل عمر نے بیڈ کے نزدیک ایک کرسی رکھتے ہوئے کہا۔ ناصر مرزا نے فوراً ہی اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور پھر وہ سہارا لے کر اس پر بیٹھ گیا۔ چوبیس گھنٹے میں اس کی حالت کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی اور ہاتھوں میں لرزش آ گئی تھی۔ کمزور اتنا ہو گیا تھا کہ بغیر سہارے کے اٹھنا مشکل تھا۔

''ذاکر یہ بستر اچھی طرح جھاڑنا ہے۔'' ساحل عمر نے ذاکر کی طرف دیکھا۔ ''ایسا کرو اس بستر کی ہر چیز اٹھا کر دوبارہ بچھاؤ۔''

''جی اچھا۔'' ذاکر نے ساحل عمر کی ہدایت کے مطابق فوراً ہی عمل شروع کر دیا۔

پھر زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تکیے سے غلاف اتارتے ہی مطلوبہ چیز سامنے آ گئی۔ وہ کسی خونخوار پرندے کا کٹا ہوا پنجہ تھا۔

اس پنجے کو دیکھتے ہی ساحل عمر کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے اسے فوراً بستر سے اٹھا لیا اور اسے اپنی آنکھوں کے سامنے کر کے غور سے دیکھنے لگا۔

''ساحل یہ کیا ہے؟'' ناصر مرزا نے پرتجسس نظروں سے دیکھا۔

''یہ وہ چیز ہے جس نے تمہارے پورے جسم پر کھرونچے بنا دیئے تھے۔'' ساحل عمر نے کہا۔ ''میں اب چھت پر جا رہا ہوں۔ مجھے ایک ماچس دے دو اور دیکھو ذاکر میں جب تک چھت پر رہوں اوپر کوئی نہ آئے۔ ناصر مرزا تم بھی نہیں۔''

''اوپر کیا ہے؟'' ناصر مرزا نے پوچھا۔

''اوپر فساد کی جڑ ہے...... اسے نیست و نابود کر آؤں۔ پھر آ کر پوری تفصیل بتاؤں گا۔'' ساحل عمر نے کہا۔

پھر اس نے اس پنجے کو کوٹ کی جیب میں ڈالا اور ماچس ہاتھ میں لے کر زینہ چڑھنے لگا۔ زینہ چڑھتے ہوئے یکلخت اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ ایک خوف کی سی لہر اس کے پورے جسم سے گزر گئی۔

وہ ایک کھلی ہوئی چھت تھی۔ پانی کی ٹینکی کے علاوہ چھت پر کچھ اور نہیں بنا تھا۔ یہ چھت پانچ فٹ بلند چار دیواری سے گھری ہوئی تھی۔ پانی کی ٹینکی تھوڑی سی اونچائی پر بنی تھی لیکن اتنی اونچی نہ تھی کہ اس پر چڑھا نہ جا سکے۔

ٹینکی پر چڑھنے سے پہلے اس نے اپنے کوٹ اور پینٹ کی جیبوں میں ٹٹولتے ہوئے سوکھے

پتے نکال کر ایک کونے میں جمع کئے۔ ان پتوں کے ڈھیر پر باز کا پنجہ رکھا اور پھر وہ ٹینکی پر چڑھ گیا۔
سامنے ہی فساد کی جڑ موجود تھی۔ وہ ایک مردانہ موی مجسمہ تھا۔ سات آٹھ انچ لمبا رہا ہوگا۔
اس نے حافظ موسیٰ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس پر تین بار پڑھ کر کچھ پھونکا اور پھر اس مجسمے کو نیچے اتار لایا۔ اس مجسمے کو ہاتھ میں لیتے ہی اس کے دل کی دھڑکن ایک مرتبہ پھر تیز ہوگئی۔
اس نے اس موی مجسمے کو غور سے دیکھا۔ اس مجسمے کے سر اور بائیں جانب سینے میں دو سوئیاں گھسی ہوئی تھیں۔ ساحل عمر نے کچھ پڑھتے ہوئے ان سوئیوں کو اس موی مجسمے سے نکالا سوئیاں نکالتے ہی ایک دلخراش نسوانی چیخ گونجی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بہت نزدیک ہی چیخا ہو۔ ساحل عمر نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا لیکن آس پاس کچھ نہ تھا۔
پھر ساحل عمر اس موی مجسمے کو لے کر اس کونے کی طرف بڑھا جہاں سوکھے پتے ڈھیر تھے۔
اس نے ان سوکھے پتوں میں سے کچھ پتے الگ کر لئے اور اس موی مجسمے کے ساتھ رکھ دیئے۔ پھر اس نے ماچس سے تین تیلیاں نکالیں۔ ان پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور ایک تیلی سلگا کر پتوں میں آگ لگا دی۔ اس کے بعد اس نے باقی تیلیاں بھی جلا کر مختلف زاویوں سے پتوں میں رکھ دیں۔ آگ بہت تیزی سے بھڑک اٹھی۔ آگ بھڑکتے ہی پھر نسوانی چیخ کی آواز آئی اور وہ موی مجسمہ پتوں پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر ساحل عمر ایک دم پیچھے ہٹا۔ اسے شبہ ہوا کہ کہیں وہ موی مجسمہ اس پر اچھل کر نہ آ گرے...... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ مجسمہ اٹھتے ہی ایک دم پگھل گیا۔
اب ساحل عمر نے جو سوکھے پتے ایک طرف بچا کر رکھے تھے ان میں سے دو دو پتے اٹھا کر جلتی آگ پر ڈالنے شروع کئے۔ پتا پھینکنے سے پہلے کچھ پڑھتا پھر اسے آگ میں جھونک کر مزید کچھ پڑھتا۔
اس موی مجسمے سے شدید بدبو آ رہی تھی۔ بدبو اتنی شدید تھی کہ ساحل عمر کو اپنی جیب سے رومال نکال کر ناک پر باندھنا پڑا۔ بہرحال اس نے اس موی مجسمے اور اس باز کے پنجے کو اچھی طرح جلا دیا۔
پھر وہ نیچے جا کر ایک پلاسٹک کا لوٹا لایا۔ لوٹا لاتے ہوئے ذاکر سے کہہ آیا کہ گھر کے پیچھے کسی کیاری میں اتنا بڑا گڑھا کھودے کہ اس میں پلاسٹک کا لوٹا سما جائے۔ چھت پر آ کر اس نے بڑی احتیاط سے اس میں جلی راکھ بھری۔ اس لوٹے کے منہ پر کالا کپڑا باندھا اور ذاکر کے کھودے ہوئے گڑھے میں اسے رکھ کر پڑھ پڑھ کر مٹھیوں سے مٹی ڈالنا شروع کی۔ یہاں تک کہ وہ گڑھا پر ہو گیا۔ ساحل عمر نے کھرپی کے ذریعے زمین ہموار کر کے اس پر پڑھا ہوا پانی چھڑک دیا اور اللہ کا شکر ادا کیا ہر کام حافظ موسیٰ کی عین ہدایت کے مطابق ہو گیا تھا۔
جب وہ اس موی مجسمے کا ''کریا کرم'' کر کے ناصر مرزا کے کمرے میں پہنچا تو وہاں پورا گھر اکٹھا تھا۔ ناصر مرزا کے بڑے بھائی بھی آ چکے تھے جن کی بیٹی کو برکھا نے بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ سب اس کی آمد کے منتظر تھے۔ ساحل عمر بڑے اطمینان سے چلتا ہوا اندر آیا۔ اس نے ناصر مرزا کے چہرے کو بغور دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔ ''کیسے ہو؟''

"بالکل ٹھیک۔" اس نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔
"لیٹے رہو......" ساحل عمر نے کہا۔ پھر پوچھا۔ "اب جسم پر ناخنوں کے نشان تو نہیں بن رہے۔"
"نہیں۔" ناصر مرزا نے خوش ہو کر کہا۔ "نہ صرف نشان نہیں بن رہے بلکہ وہ نشان بھی غائب ہو گئے۔"
"ساحل عمر کچھ بتاؤ تو اوپر کیا تھا۔" اس بار ناصر مرزا کی امی مخاطب ہوئیں۔
"بس امی جو بھی تھا اسے بھول جائیں...... میں اسے دفن کر آیا ہوں۔ بس یوں سمجھ لیں امی کہ آپ کے بیٹے کو دوسری زندگی ملی ہے۔ ورنہ اس سور کی بچی نے تو مارنے کی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔" ساحل عمر نے غصے میں کہا۔
"وہ کم بخت مرتی بھی تو نہیں...... آخر اسے کون مارے گا؟" امی نے غصے اور دکھ کے عالم میں کہا۔
"امی! اسے اس کے اعمال ماریں گے۔ اب ظلم حد سے گزرنے لگا ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ جب ظلم بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔" ساحل عمر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
پھر اس نے کمرے سے بچوں کو نکال کر چھت پر ہونے والی کارروائی کی تفصیل بیان کی۔ موی مجسمے کے بارے میں سن کر سب حیران رہ گئے۔

☆......☆......☆

رقص سحر جاری تھا۔ ورشا کو جنونی کیفیت میں رقص کرتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ وہ رقص کے ساتھ ایک خاص انداز میں پیر مارتی اور منہ سے کوئی عجیب سا لفظ نکالتی تھی۔ یہی وہ لفظ تھا جو کالی داس نے اسے بتایا تھا۔ یہ لفظ سحر کی کنجی تھا جس کے ذریعے وحشت کا تالا کھلتا تھا۔
رقص کرتے کرتے اس کے ہاتھ کی انگلی کالی ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ سیاہی پورے جسم پر پھیل گئی۔ گوری چٹی ورشا ایک دم کالی بھجنگ ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں آگ بھر گئی تھی۔ صورت انتہائی مکروہ ہو گئی تھی۔ ایک فٹ لمبی زبان باہر نکل آئی تھی۔
پھر کمرے کے ہر کونے سے بچھوؤں نے برآمد ہونا شروع کیا اور چند لمحوں میں اتنے بچھو کمرے میں بھر گئے کہ کمرے کے فرش پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ ورشا اب بھی محو رقص تھی۔ رقص وحشت جاری تھا جو جنون کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ بچھو اس کے پیروں میں آ رہے تھے لیکن دب کوئی نہیں رہا تھا۔ مر کوئی نہیں رہا تھا۔
چند لمحوں بعد ایک مکروہ آواز گونجی۔ "اب بس کر۔"
اس حکم کو سنتے ہی ورشا ایک دم پتھر کی ہو گئی۔ کچھ دیر وہ اسی طرح ساکت کھڑی رہی۔ اتنی دیر میں سارے بچھو کہیں غائب ہو گئے۔
کالی داس نے اسے جو سکھایا تھا وہ اس پر حرف بہ حرف عمل کر رہی تھی۔ رقص بند کرنے کا حکم ہو چکا تھا۔ بچھو غائب ہو چکے تھے۔ اب وقت تھا خون سے پیالہ بھرنے کا۔ وہ فوراً آئینے کے

سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی قمیض کی پیچھے سے زپ کھولی۔ پیٹھ پر بنا بچھو نمایاں ہو گیا۔ اس کی کالی جلد پر اب وہ سفید نظر آ رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی سرنج اٹھا کر اس کی سوئی بچھو کے منہ پر رکھی گئی تو اس نے جلدی جلدی سرنج بھر بھر کر خون پیالے میں جمع کرنا شروع کیا یہاں تک کہ پیالہ خون سے لبالب بھر گیا۔

اس نے اپنی قمیض کی زپ بند کی اور اس خون سے بھرے پیالے کو اپنے سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے جان لیوا آخری منتر پڑھنا شروع کیا۔ وہ جیسے جیسے منتر پڑھتی جاتی تھی ویسے ویسے اس کی رنگت تبدیل ہوتی جاتی تھی پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ اپنی اصل حالت میں آ گئی۔

اپنی اصل حالت میں لوٹتے ہی اس پر سرشاری سی چھا گئی۔ وہ کھل اٹھی۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کے نانا نے جو بتایا تھا جو سکھایا تھا اس پر عمل کر کے اس نے اپنی منزل پا لی تھی۔

اس نے زمین سے خون سے بھرا پیالہ اٹھایا اور آئینے کے سامنے خود کو دیکھا اور بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔ پھر وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

وہ احتیاط سے چلتی ہوئی اس کمرے کے دروازے پر پہنچی جہاں برکھا عمل میں مصروف تھی۔

ورشا نے خون سے بھرا پیالہ برآمدے میں ایک طرف رکھ دیا اور پھر بہت آہستگی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ برکھا کی دروازے کی طرف پیٹھ تھی۔ وہ کمرے کے درمیان میں آسن جمائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے دائرے میں سات دیئے جل رہے تھے اور ان دیوں کے درمیان راعین کی کھوپڑی رکھی تھی۔ برکھا بہت زور زور سے کوئی منتر پڑھ رہی تھی۔ اسے اپنا ہوش نہ تھا۔

ورشا چاہتی تو خاموشی سے اس کے سر پر پہنچ سکتی تھی لیکن کالی داس نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ منتر والے کمرے میں جانے کی کوشش نہ کرے ورنہ پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ یہ فیصلے کی رات تھی۔ ورشا کو فکر تھی کہ کہیں برکھا کا عمل پورا نہ ہو جائے جو کرنا ہے عمل پورا ہونے سے پہلے کرنا ہے۔

سوال یہ تھا کہ وہ برکھا کو کمرے سے کیسے نکالے۔ وہ اندر جا نہیں سکتی تھی اور برکھا عمل پورا ہونے سے پہلے کمرے سے نکلے گی نہیں۔ وہ برآمدے میں کھڑی سوچتی رہی۔ اندھیری رات تھی۔ پورے بنگلے پر خوفناک وحشت چھائی ہوئی تھی۔ کتوں کے رونے کی آواز نے ماحول کو اور بھیانک بنا دیا تھا۔

سوچتے سوچتے اچانک ایک خیال اس کے دل میں جگمگایا۔ یہ خیال ایسا تھا کہ وہ ایک دم سرشار ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ خیال اس کے دماغ میں کیسے آیا لیکن یہ خیال بڑا زبردست تھا۔

اس نے ایک عزم، ایک حوصلے کے ساتھ خون سے بھرا پیالہ اٹھایا اور دروازے کے ساتھ دیوار کی اوٹ میں چھپ کر اس نے بڑی خوفزدہ آواز میں کہا۔ ’’ممی، ممی...... وہ اندھا آ گیا۔‘‘

برکھا نے منتر پڑھتے پڑھتے گردن گھمائی اور ہاتھ نچایا۔ جس کا مطلب تھا کہ کون اندھا؟

''ممی' وہ حافظ موسیٰ ہمارے بنگلے میں آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساحل عمر اور ناصر مرزا بھی ہیں۔'' وہ گھبرا کر بولی۔

''ہیں۔'' وہ گھبرا کر اٹھی۔ حافظ موسیٰ' ساحل عمر اور ناصر مرزا کے نام سن کر اس کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ یہ کیسے ہو گیا۔ سب سے زیادہ گھبراہٹ تو حافظ موسیٰ کا نام سن کر ہوئی تھی۔ وہ کیسے آ گیا؟''

وہ وحشت زدہ ہو کر کمرے سے باہر نکلی بس اتنی مہلت ورشا کیلئے کافی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر ورشا کی طرف دیکھتی ورشا نے بجلی کی سی سرعت سے خون سے بھرا پیالہ اس کے سر پر الٹ دیا اور خود بہت تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔

''اوہ' کمینی تو نے یہ کیا کیا؟'' وہ غصے سے چیخی لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ اور کہنے کے قابل نہ رہی۔

وہ خون میں نہا گئی تھی۔ سر پر' دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف خون ہی خون تھا۔ اس خون نے کسی خطرناک تیزاب کی طرح کام دکھایا۔ خون پڑتے ہی اس کی دونوں آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ جہاں جہاں خون پڑا وہاں کی کھال اترنا شروع ہو گئی۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑی۔ وہ آدھی دروازے میں تھی اور آدھی دروازے کے باہر تھی۔

ورشا نے اس کے گرتے ہی خوشی سے قہقہہ لگایا۔

''جاؤ ممی جاؤ...... تم نے اپنے باپ کو مارا' پھر اپنے شوہر کو مارا اور اب میرے ساحل کو مارنے چلی تھیں۔ ممی وہ میری محبت ہے' میرا عشق ہے۔ میں اسے کیسے مرنے دیتی۔''

پھر اچانک جانے کیسے جاپ والے کمرے میں آگ بھڑک اٹھی۔ شعلے لپکتے ہوئے برکھا کی طرف بڑھے۔ وہ تو ویسے ہی چل بسی تھی۔ جو رہا سہا تھا وہ شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس منتر والے کمرے کے ساتھ اور کئی کمرے آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس آگ کو دیکھ کر ورشا کے قہقہے گونجتے رہے۔ وہ جیسے پاگل ہو گئی تھی۔

جانے یہ کیسی آگ تھی کہ فائر بریگیڈ والے بھی اسے نہ بجھا سکے۔ وہ جتنا پانی ڈالتے اتنے شعلے مزید اونچے ہو جاتے۔ تب انہوں نے تھک کر پانی ڈالنا بند کر دیا۔ بالآخر یہ آگ خود ہی بجھ گئی۔ لیکن آدھا بنگلہ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ پہلے اس بنگلے پر کیا کم وحشت برستی تھی کہ اس ادھ جلے بنگلے نے اس دحشت کو دوبالا کر دیا۔ اب یہ بنگلہ بھوتوں کا بدروحوں کا مسکن لگتا تھا۔ لوگ اس بنگلے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔

لیکن ورشا اب بھی اسی بنگلے میں رہتی تھی۔ وہ اس بنگلے میں گھومتی ہوئی کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ وہ واقعی بھٹک گئی تھی۔

☆......☆......☆

اب اس کی زندگی میں کچھ سکون آیا تھا۔ جینے کا مزہ آنے لگا تھا' ورنہ ساحل عمر کی زندگی میں پے درپے پریشانیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ بچپن سے لیکر آج تک اس کی زندگی میں حادثات ہی

حادثات تھے۔ برکھا کی موت کے بعد اس کی زندگی میں استحکام آیا۔ سکون میسر آیا تو اماں نے رخت سفر باندھ لیا۔

اماں کی موت ساحل عمر کیلئے کسی سانحہ سے کم نہ تھی۔

انہیں شاید اپنی موت کا احساس ہو گیا تھا۔ جانے سے پہلے انہوں نے اپنی الماری خالی کر دی تھی۔ اپنے بیشتر کپڑے مرجینا کے حوالے کر دیئے تھے۔ جو نقد رقم ان کے پاس جمع تھی۔ وہ انہوں نے عذرا کے حوالے کر دی تھی۔

کئی دن سے ان کے خواب میں والدین نظر آ رہے تھے۔ کبھی اماں دکھائی دیتیں تو کبھی والد نظر آتے۔ وہ دونوں کو خوش دیکھتیں۔ انہیں اپنی والدہ گھر کی صفائی کرتی نظر آتیں تو والد گھر میں سودا سلف لاتے ہوئے دیکھائی دیتے۔ ان دونوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا وہ کسی مہمان کے منتظر ہوں۔ جیسے ان کے گھر کوئی مہمان آ رہا ہو۔

اماں کو جب سے ان کے والدین خواب میں دکھائی دیئے تھے تب سے ان کی یاد شدت اختیار کر گئی تھی۔ وہ عذرا سے اپنے بچپن اور جوانی کی باتیں کرنے بیٹھ جاتیں۔

پھر انتقال سے چند گھنٹے قبل اماں نے آواز دے کر ساحل عمر کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ ایک لمحے کو وہ انہیں دیکھ کر پریشان ہوا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''اماں آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اماں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''اماں، مجھے تو گڑبڑ دکھائی دے رہی ہے۔'' وہ ان کے قریب بیٹھا ہوا بولا۔

''اماں نے پہلے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے تکتی رہیں پھر اس کی پیشانی چوم لی۔ ساحل عمر نے ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے دیکھے۔ وہ ان کی بدلتی کیفیت کو خصوصی طور پر نوٹ کر رہا تھا۔

''اماں کیا ہوا؟'' ساحل عمر عجب کشمکش میں تھا۔ اس نے اماں کی ایسی حالت کبھی نہ دیکھی تھی۔ ''آپ کو کسی نے کچھ کہا ہے۔ عذرا نے گستاخی کی ہے یا مرجینا آپ کے منہ کو آئی ہے یا پھر مجھ سے نادانستگی میں کوئی قصور ہوا ہے۔''

''ارے بھیا...... کیسی باتیں کرتے ہو...... میں تو فرشتوں کے درمیان رہ رہی ہوں۔ میں نے اس وقت تمہیں کچھ باتیں کرنے کیلئے بلایا ہے۔ بیٹا بات یہ ہے کہ میرے پاس اب وقت کم ہے۔ نہیں ساحل اب تم بیچ میں بولنا مت۔ میری بات سن لو۔ میں چند گھڑی کی مہمان ہوں۔ میں جو کچھ محسوس کر رہی ہوں وہ بتا نہیں سکتی۔ جو بتا سکتی ہوں وہ کہے دیتی ہوں۔ بیٹا تمہاری امی ایک فرشتہ عورت تھی۔ اس نے ایک ایسی انجان عورت کو سہارا دیا تھا جو سڑک پر بیٹھی رو رہی تھی۔ بیٹا جب میں اپنے شوہر کے گھر سے نکلی تھی تو عہد کیا تھا کہ اب اس گھر میں واپس نہیں آؤں گی۔ ساحل پھر میں نے زندگی بھر پلٹ کر نہیں دیکھا کہ میرا شوہر کس حال میں ہے۔ جب تمہاری امی نے مجھے سہارا دیا تو اس

وقت میں نے اپنے دل میں ایک اور عہد کیا کہ اس گھر سے اب مر کر نکلوں گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرا یہ عہد بھی پورا ہوا۔ تمہاری امی نے مجھے بہت عزت دی۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے اپنی امی سے بھی بڑھ کر احترام دیا۔ تم نے مجھے کبھی اس گھر کی ملازمہ نہیں سمجھا۔ تم نے مجھے اپنی ماں جیسا سمجھا۔ میں نے اس گھر میں ایک مطمئن زندگی گزاری ہے لیکن بیٹا میں انسان ہوں۔ مجھ سے کبھی کوئی کوتاہی ہو گئی ہو، کوئی غلطی ہو گئی ہو تو میرے بیٹے مجھے معاف کر دینا...... بس بیٹا مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔ اللہ تمہیں سدا خوش رکھے۔

"ارے اماں، یہ آپ کیا فضول باتیں لے بیٹھیں...... مرنے جینے کی باتیں کر کے مجھے ڈرائیں نہیں۔ اماں آپ چلی جائیں گی تو میرے بچوں کو کون کھلائے گا۔ وہ کس کو دادی کہیں گے۔" ساحل عمران کا ہاتھ تھام کر بولا۔

اس کی بات سن کر اماں کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ پھر اچانک ان کے چہرے کا رنگ بدلا اور وہ بے اختیار سسک سسک کر رو پڑیں۔ ساحل عمر نے بڑی مشکل سے انہیں چپ کرایا۔

ساحل عمر سے بات کرنے کے بعد انہوں نے پورے گھر کا ایک چکر لگایا۔ کچھ دیر عذرا سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ اسے ہمیشہ ساحل عمر کا خیال رکھنے کی تلقین کی پھر مرجینا سے گپ شپ لگائی اور پھر سو گئیں۔

عصر کے وقت اٹھیں۔ نماز پڑھنے کھڑی ہوئیں۔ سجدے میں گئیں تو پھر سر اوپر نہ اٹھ سکا۔ یہ سجدہ ان کی زندگی کا آخری سجدہ ثابت ہوا۔

اماں کی موت ساحل عمر کیلئے کسی سانحہ سے کم نہ تھی۔ اس نے انہیں بچپن سے دیکھا تھا۔ وہ ان کا عادی ہو گیا تھا۔ ان کی یاد اس کے دل سے نکلنا آسان نہ تھی۔

☆......☆......☆

ابھی اماں کا غم اس کے دل سے پوری طرح نکلا نہ تھا کہ اس کی زندگی میں ایک اور سانحہ رونما ہوا اور یہ سانحہ بڑا جان لیوا تھا۔

عذرا جب سے ساحل عمر کے ساتھ آئی تھی بے انتہا خوش تھی۔ بس بیچ میں برکھا نے کچھ حالات خراب کر دیئے تھے تو وہ اداس رہنے لگی تھی لیکن جب سے برکھا جہنم رسید ہوئی تھی عذرا کے دل کی کلی پھر سے کھل اٹھی تھی۔

وہ روز ہی شام کو کہیں گھومنے نکل جاتے تھے۔ کبھی سمندر پر، کبھی کسی ریستوران میں، کبھی فلم دیکھنے تو کبھی کسی کے گھر...... اس دن وہ سمندر کے کنارے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے تھے۔

عذرا کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔ وہ بار بار ہنس رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی اور ساحل عمر اسے چونک چونک کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر کہیں بہت دور ایک خوف کی سی لہر اٹھ رہی تھی۔

"عذرا خیر تو ہے...... آج تم کچھ ضرورت سے زیادہ خوش نہیں؟" بالآخر اس نے اپنا اندیشہ ظاہر کر دیا۔

"ہاں ساحل...... آج میں واقعی بہت خوش ہوں' ضرورت سے زیادہ خوش ہوں۔ میں بار بار سوچتی ہوں اور سوچ سوچ کر خوش ہو جاتی ہوں۔"

"آخر اس خوشی کی کوئی وجہ تو ہو گی۔" ساحل عمر نے پوچھا۔

"تم ہو وجہ؟" ساحل تم...... میرے خواب تم...... میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ میں نے جس کے خواب دیکھے اسے پا لیا۔ ساحل ایسا کہاں ہوتا ہے بھلا...... اپنا آئیڈیل آج تک کون پا سکا ہے بھلا۔ میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ تمہیں دیکھا اور تمہیں پا لیا۔"

"بس اس وجہ سے خوش ہو...... یہ خوشی تو اب پرانی ہو گئی۔"

"ہاں ساحل میں بس اس وجہ سے خوش ہوں۔ میرے لئے یہ خوشی کبھی پرانی نہیں ہو گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت بڑھتی جائے گی۔ تم کیا جانو ساحل...... میں نے تمہیں کتنی مشکلوں سے پایا ہے۔" وہ اپنا سر اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے بولی۔

"عذرا جانے کیا بات ہے کہ میں تمہیں جب بھی بہت زیادہ خوش دیکھتا ہوں تو میرے اندر کہیں دور ایک خوف کی سی لہر اٹھنے لگتی ہے۔ میں ڈر جاتا ہوں' شاید اس لئے کہ مجھے خوشی کبھی راس نہیں آتی۔ تمہیں یاد ہو گا مرنے سے دو تین دن پہلے اماں کتنی خوش تھیں۔ انہیں خوش دیکھ کر میرا دل بھی بہت خوش تھا۔ دیکھ لو وہ چل بسیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے والدین ہنستے مسکراتے گھر سے نکلے تھے' اس دن وہ کتنے خوش تھے۔ وہ پھر گھر نہ لوٹے۔ ان کی لاشیں آئیں...... عذرا اسی لئے میں اب خوشی سے ڈرنے لگا ہوں۔"

"بدھو۔" عذرا نے اس کی طرف دیکھ کر اتنے پیار سے کہا کہ ساحل عمر مسکرائے بغیر بنا نہ رہ سکا۔

وہ بدھو تھا یا عقل مند...... اس بات کا اسے اندازہ نہ ہو سکا لیکن وقت نے آنے والے وقت نے عذرا کے ساتھ عجب کھیل کھیلا۔ اس دن سمندر پر شاید وہ اس کے آخری قہقہے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے گرد مایوسیوں نے ڈیرے ڈال لئے۔ اسے امید نہ تھی کہ یہ وقت اس پر جلد آ جائے گا۔ وہ اس بات سے تو آگاہ تھی کہ ایسا ہو گا۔ یہ وقت اس پر آ کر رہے گا۔ جب وہ اپنی بستی سے رخصت ہوئی تھی تو اس کے باپ سار ملوک نے اسے صاف صاف سمجھا دیا تھا۔ اسے بتا دیا تھا کہ ایک لمحہ وہ آئے گا جب وقت پتھر ہونے لگے گا اور جب وقت پتھر ہونے لگے تو اسے کیا کرنا ہو گا' یہ بھی سمجھا دیا تھا...... لیکن اس نے اپنے دل میں کچھ اور ہی ٹھان لی تھی۔

جب وقت نے آنکھیں دکھانا شروع کیں تو ایک دن اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھوں کے ناخنوں پر پڑی۔ اس کی انگلیوں کے تمام ناخن سفید پڑ چکے تھے۔ اپنے سفید ناخن دیکھ کر ایک دم اس کا دل کانپ اٹھا۔ وقت معلوم شروع ہو چکا تھا۔ وہ ان ناخنوں کو ساحل عمر سے چھپانے اور اپنے آپ کو فریب دینے کیلئے ہر وقت نیل پالش لگانے لگی۔

چند ہفتے اور گزرے تو اس کی انگلی کی ایک پور پر سفیدی نمودار ہوئی اور پھر یہ تیزی سے دوسری انگلیوں پر بھی دکھائی دینے لگی۔ چند دنوں کے اندر اس کی انگلیوں کی پہلی پوریں بالکل سفید ہو

گئیں۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی انگلیاں برص زدہ ہو گئی ہوں۔

ساحل عمر پریشان ہو کر اسے ایک ڈاکٹر کے پاس سے دوسرے ڈاکٹر کے پاس لئے گھومتا رہا۔ اس نے کوئی اچھا ڈاکٹر کوئی اچھا ہسپتال نہ چھوڑا۔ اس کے مرض کی کوئی تشخیص نہ کر سکا لیکن سارے ڈاکٹر اس بات پر متفق تھے کہ جلدی بیماری نہیں ہے۔

وہ عذرا کو لے کر حافظ موسیٰ کو دکھانے بھی پہنچا۔ ناصر مرزا اس کے ساتھ تھا مگر بار بار گھر کی گھنٹی بجانے کے باوجود کسی نے گیٹ نہ کھولا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے پھر ناصر مرزا نے اکیلے بھی حافظ موسیٰ کے گھر کے کئی چکر لگائے لیکن گھر کا کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ اس نے سوچا ممکن ہے کال بیل خراب ہو یہ سوچ کر زور زور سے گیٹ بجایا مگر باہر کوئی نہ آیا۔ پاس پڑوس سے معلوم کیا تو وہ لوگ بھی اطمینان بخش جواب نہ دے سکے۔ کسی کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔

وقت تیزی سے کروٹ لے رہا تھا۔ اب عذرا کا پورا ہاتھ سفید ہو چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں دستانے پہننے شروع کئے تھے لیکن پھر وہ ان دستانوں کو مستقل پہنے رکھنے کیلئے مجبور ہو گئی۔ اس لئے کہ اس کی انگلیاں جس نرم چیز کو بھی چھو لیتیں وہ سخت ہو جاتی۔ پتھر بن جاتی۔

ساحل عمر کیلئے یہ دن بڑے عذاب ناک تھے۔ عذرا اب اپنے بیڈ روم تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس کے ہاتھوں کی سفیدی اب ہاتھوں تک محدود نہ رہی تھی۔ اس نے اب پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور یہ سفیدی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ صورتحال روز بہ روز خراب ہوتی جا رہی تھی۔

ایک شام جب وہ سرتاپا سفید ہو چکی تھی۔ اس نے ساحل عمر سے عجیب فرمائش کی۔ ''ساحل میں دلہن بننا چاہتی ہوں۔''

ساحل عمر نے اس کی یہ فرمائش فوری طور پر پوری کر دی۔ وہ جوڑا جو اس نے شادی پر پہنا تھا اسے پہنا دیا گیا۔ ساحل عمر نے اسے بہت محبت سے بہت توجہ سے دلہن بنایا۔ ایک لیڈی بیوٹیشن کو بلا کر اس کا میک اپ کروایا۔ کپڑے تبدیل کرنے سے لے کر میک اپ ہونے تک اس نے ساحل عمر کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھتی رہی جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔

دونوں خاموش تھے۔ دونوں کے دلوں میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ بہت کچھ تھا کہنے کو، بہت کچھ تھا سننے کو...... مگر کوئی نہیں بول رہا تھا۔ لفظ زبان پر آ کر جیسے دھواں بن جاتے۔ بس دونوں کے منہ سے ایک آہ نکلتی تھی۔

جب عذرا کے جسم میں جھٹکے سے لگنے لگے۔ اس کی آنکھیں ان جھٹکوں سے بند ہونے لگیں تو عذرا نے ساحل سے کہا۔ ''ساحل اپنے سٹوڈیو کا دروازہ کھول دو۔ میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔''

''دروازہ کھلا ہے آؤ۔'' ساحل عمر نے سہارا دینے کیلئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اس کے سٹوڈیو میں پہنچ کر وہ کمرے کے بیچ سٹول ڈال کر بیٹھ گئی اور حتی الامکان مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''میری تصویر نہیں بناؤ گے؟'' عذرا کی آواز میں ایک عجیب درد تھا۔ جیسے اس نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی بھرپور کوشش کی ہو۔

"ہاں کیوں نہیں۔" ساحل عمر نے جلدی سے ایک بورڈ پر پنوں سے کاغذ کی شیٹ لگائی اور اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ کر اسے سکیچ کرنے لگا۔ پنسل سے کاغذ پر اس کے نقش ابھارنے لگا۔

وہ بار بار اسے دیکھتا جاتا تھا اور اسکیچ کرتا جاتا تھا۔ جب اس کی صورت کاغذ پر ابھرنے لگی تو اچانک اسے احساس ہوا کہ عذرا بہت دیر سے ساکت بیٹھی ہے۔ وہ ذرا سا بھی نہیں ہلی تھی۔ تب اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر دیکھتا رہا۔ وہ اسے کئی منٹ تک دیکھتا رہا۔ عذرا اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

وہ بورڈ اور پنسل ایک طرف پھینکتے ہوئے چیخا۔ "عذرا"

اس کی چیخ سننے کے باوجود عذرا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کی کھلی آنکھوں میں بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ وہ اسے ساکت بیٹھی کھلی آنکھوں سے گھورتی رہی۔ وہ بیٹھے بیٹھے پتھر ہو گئی تھی۔

عذرا نے ساحل کے نام ایک خط لکھا تھا۔ یہ خط اس نے مرجینا کے حوالے کرتے ہوئے ہدایت کی تھی کہ وہ صبح ساحل عمر کو دے دے...... ساحل عمر سٹوڈیو میں موجود تھا۔ وہ پوری رات یونہی بیٹھا رہا تھا۔ وہ بس ایک ٹک عذرا کو دیکھے جاتا تھا۔ تب مرجینا نے دھیرے سے وہ گلابی رنگ کا بند لفافہ ساحل عمر کے سامنے کر دیا۔ ساحل عمر نے لفافہ چاک کر کے خط پڑھا لکھا تھا۔ "میری زندگی...... میرے ساحل...... میں وقت کا کھلونا ہوں' جس طرح کسی بولنے والی گڑیا کے سیل ختم ہونے پر وہ بولنا چھوڑ دیتی ہے کچھ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ میرے جسم میں لگے سیل بھی اب ختم ہو گئے ہیں۔ اور میں بے جان ہو گئی ہوں۔ میرے والدین مجھے لینے آئے تھے' وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ اپنی بستی میں چلی جاؤں اور اپنی زندگی بچا لوں لیکن ساحل میں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ تمہاری خاطر میں نے اپنی زندگی ہار دی ہے لیکن یہ خوشی میرے لئے کیا کم ہے کہ میں ہر وقت تمہارے سامنے رہوں گی۔ تم مجھے دیکھو گے تو مجھے یوں محسوس ہو گا جیسے میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ میں پتھر بن گئی ہوں لیکن ہوں تو تمہارے پاس' تمہارے گھر میں...... میں تمہارا شاہکار ہوں۔ ایک انوکھا مجسمہ...... ایسا انوکھا مجسمہ کسی نے آج تک کہاں تراشا ہو گا۔"

خط پڑھتے پڑھتے اس کے لفظ دھندلانے لگے۔ پھر خط اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر عذرا کے قدموں میں جا گرا۔

☆......☆......☆

کئی روز سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا۔ وہ آتی...... بیل بجاتی...... مرجینا دروازہ کھولتی تو وہ آنکھیں اٹھا کر چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی۔ پھر بڑے کرب آمیز لہجے میں کہتی۔ "پیاسی ہوں۔"

"اچھا ٹھہرو...... میں پانی لاتی ہوں۔"

جب مرجینا پانی سے بھرا گلاس لے کر دروازے پر جاتی تو وہ جا چکی ہوتی اور اگر کبھی ٹھہری بھی ہوئی ہوتی تو چند لمحے خالی نگاہوں سے گلاس کو دیکھتی اور بغیر کچھ کہے ایک طرف کو چل دیتی۔ مرجینا اسے حیرت سے دیکھتی رہ جاتی۔

جب کئی روز تک ایسا ہوتا رہا تو مرجینا نے اس انوکھی فقیرنی کے بارے میں ساحل عمر کو بتایا اور کہا۔ "صاحب جی پہلے تو وہ کبھی کبھی آتی تھی مگر اب تو وہ کئی دن سے روز آ رہی ہے۔"

"اچھا اب آئے تو مجھے بتانا۔" ساحل عمر نے اسے ہدایت کی۔

پھر اگلے دن گھنٹی بجی۔ مرجینا دوڑی ہوئی دروازے پر گئی۔ وہ دروازے پر موجود تھی۔ اس نے اسی کربناک لہجے میں کہا۔ "میں پیاسی ہوں۔"

"پانی لاتی ہوں...... تم ٹھہرو، دیکھو چلی مت جانا۔" مرجینا نے اسے تاکید کی۔

گھر میں آ کر مرجینا نے ساحل عمر کو بتایا کہ وہ دروازے پر موجود ہے۔ مرجینا نے ساحل عمر کے ہاتھ میں پانی سے بھرا گلاس دے دیا۔

ساحل عمر گلاس لے کر دروازے پر پہنچا۔ کالے کپڑے پہنے ایک عورت سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے بال بے ترتیب تھے جیسے مہینوں سے نہ سنوارے گئے ہوں۔ کالا لباس سفید ہو رہا تھا جیسے ایک لمبے عرصے نہ دھویا گیا ہو۔ اچانک اس نے اپنا چہرہ اٹھایا۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

ساحل عمر نے اسے غور سے دیکھا تو اندر ہی اندر لرز اٹھا۔ یہ وہ چہرہ تھا جسے کوئی ایک بار دیکھ لیتا تھا تو پھر پلکیں جھپکانا بھول جاتا تھا اور اب اسے ایک نظر دیکھنا مشکل تھا۔ وہ ورشا تھی......

"میرے رانجھن......" اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔

ساحل عمر کو دیکھتے ہی وہ چیل کی طرح جھپٹی۔ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر گلاس کو ذرا سا ٹیڑھا کر کے اسے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس نے بڑی بے قراری سے پانی پیا۔

پھر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس کی آنکھوں کے دیئے ایک دم جگمگا اٹھے۔ وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی جیسے اپنی آنکھوں میں اس کی تصویر اتار لینا چاہتی ہو۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور سڑک پر دوڑتی چلی گئی۔ ساحل عمر نے دیکھا وہ ننگے پاؤں تھی۔

وہ ورشا کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

اب اس واقعہ کو گزرے تین برس ہو چکے ہیں۔ عذرا کا مجسمہ اس کے سٹوڈیو میں اسی جگہ جوں کا توں موجود ہے۔

وہ آج بھی اس مجسمے کے سامنے بیٹھا اس کی تصویر بناتا رہتا ہے لیکن یہ تصویر آج تک مکمل نہیں ہوئی۔ تصویر مکمل کیسے ہو؟ وہ ادھوری تصویر بورڈ سے اتار کر جو ایک طرف ڈال دیتا تھا اور نیا کاغذ لگا کر پھر نئے سرے سے تصویر بنانے لگتا تھا۔

ناصر مرزا روز شام کو اس کے پاس آتا ہے۔ مسعود آفاقی بھی آتا رہتا ہے لیکن اپنی مصروفیت کی وجہ سے روز نہیں آ پاتا۔ وہ دونوں اسے اسٹوڈیو سے نکال لاتے ہیں اور زبردستی باہر لے جاتے ہیں۔

مرجینا اس گھر میں بدستور موجود ہے۔ اس کا باپ کئی بار اسے لینے آ چکا ہے۔ وہ اس کی

شادی کرنا چاہتا ہے لیکن مرجینا نے ساحل عمر کا گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اگر میں بھی اس کے گھر سے چلی گئی تو صاحب جی جو پہلے ہی مرے ہوئے ہیں اکیلے کتنے دن زندہ رہیں گے۔ میں صاحب جی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں انہیں مرنے نہیں دوں گی۔

ناصر مرزا اور مسعود آفاقی نے کتنی مرتبہ کوشش کی ہے کہ وہ عذرا کے اس مجسمے کو یہاں سے ہٹانے کیلئے راضی ہو جائے۔ اسے زمین کے سپرد کرنے پر آمادہ ہو جائے...... لیکن وہ اس طرح کے ذکر پر بھی زور سے چیخ پڑتا ہے۔

"نہیں۔ میری عذرا کو مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔"

شاید اسے امید ہے کہ یہ موم کی گڑیا ایک دن خود بخود بول اٹھے گی۔

ختم شد

the

end